حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے مواعظ کا مجموعہ

مواعظ اشرفیہ

حکیم الامت حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ

مکتبہ تھانوی دفتر رسالہ الابقاء

مولوی مسافر خانہ ایم اے جناح روڈ کراچی ۱

فون: ۷۷۷۷۶۲۰، ۷۷۷۰۰۹۴

رسالہ الابقاء ماہ صفر ۱۴۰۰ھ شمارہ ۱ جلد ۱۵ ۔ مطابق ماہ جنوری ۱۹۸۰ء

قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالیٰ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ آیَۃً

(رواہ البخاری)

سلسلہ التبلیغ کا وعظ مسمّٰی بہ

تفصیل الدین

منجملہ ارشادات

حکیم الامۃ مجدد الملۃ حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی

رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

ناشر:۔ محمد عبد المنان غفرلہ

مکتبہ تھانوی —— دفتر الابقاء

مسافر خانہ بندر روڈ کراچی ۱

ایم۔ اے جناح روڈ

ضروری اطلاع:۔ خط و کتابت کرتے وقت یا پتہ بدلتے وقت نمبر خریداری ضرور لکھیں۔

سلسلۃ التبلیغ کا وعظ

مسمّٰی بہ

تفصیل الدین

این	متی	کم	کیف	لم	ماذا	من ای شان	من ضبط	المستمعون	الاشتات
کہاں ہوا	کب ہوا	کتنی دیر ہوا	کس طرح ہوا	کیوں ہوا	کیا مضمون تھا	کس طرف خطاب تھا	کس نے ضبط کیا	سامعین کی تعداد	متفرقات
جامع مسجد تھانہ بھون	شب ۲۳ محرم ۱۳۴۳ھ	۳ گھنٹہ ۳۰ منٹ		[illegible] کی درخواست پر ہوا	اصل مقصود کی مقصودیت کا اعتقاد [illegible] اور اعمال صالحہ [illegible] تفصیل بیان فرمائی	عوام سب مسلمانوں کو	مولانا سعید احمد صاحب [illegible] نے ضبط کیا اور حضرت [illegible] نے تفصیل کی	اندازاً سو دو سو [illegible] تھی	تسوید تفصیلی ۸ جمادی الثانیہ ۱۳۴۳ھ کو شروع ہو کر ۱۸ جمادی الثانیہ ۱۳۴۳ھ بروز چہارشنبہ تمام ہوئی۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

الحمد للہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ ونشھد ان سیدنا و مولانا محمداً عبدہ ورسولہ صلی اللہ تعالٰی علیہ وعلٰی آلہ واصحابہ وبارک وسلم

اما بعد فاعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم۔ بسم اللہ الرحمٰن الرّحیم۔ اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَیَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا۝

(جو لوگ ایمان لائیں اور نیک کام کریں ان کے لئے حق تعالیٰ محبوبیت پیدا کر دیں گے)

صاحبو! یہ وہی آیت ہے جس کے متعلق کل ایک ضروری مضمون بیان کیا گیا تھا چونکہ وہ دو اجزا سے مرکب تھا اور کل ایک ہی جزو کا تفصیلاً ذکر ہوا تھا اور دوسرا جزو تفصیل سے رہ گیا تھا گو مجملاً اس کا ذکر بھی ہو چکا تھا اور وہ اجمال گو شافی نہ تھا مگر کافی ضرور تھا حتیٰ کہ اگر آج کا بیان نہ بھی ہوتا تب بھی کچھ ضرر نہ تھا کیونکہ ایک جزو کی تفصیل بھی ہو چکی تھی اور دوسرے جزو کے متعلق ایک قاعدہ کلیہ بیان کر دیا گیا تھا جس کے پیش نظر رکھنے کے بعد تفصیل کا نہ ہونا مضر نہ تھا مگر جب تفصیل کا موقع مل گیا تو میں نے چاہا کہ اس کی بھی کسی قدر تفصیل کر دی جائے۔ کسی قدر کی قید اس لئے بڑھا دی کہ تفصیل علیٰ قدر اتم کے لئے ایک جلسہ کافی نہیں ہو سکتا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تیئیس ۲۳ برس تک اس کی تفصیل فرمائی پھر بھی اس کے لئے توضیح کی ضرورت ہوئی اور اس کے لئے حق تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ہر زمانہ میں حاملان دین کو پیدا فرمایا جو برابر اس کی توضیح کرتے رہے۔ حتیٰ کہ خیر القرون کے ختم تک (یعنی قرن ثالث پر جو تبع تابعین کا زمانہ ہے اور جملہ ائمہ مجتہدین اسی زمانہ میں ہوئے ہیں) وہ توضیح بھی علیٰ وجہ الکمال ہو گئی (تو جس مضمون کی تفصیل اتنے عرصہ دراز میں ہوئی ہو اس کو علیٰ قدر اتم ایک جلسہ میں کیونکر بیان کیا جا سکتا ہے۔ اب سمجھئے کہ اس مضمون کی تفصیل و توضیح تو خیر القرون کے ختم تک پوری ہو گئی ۱۲) لیکن اب دو مرتبے باقی رہ گئے۔ ایک تفریع کہ قیامت تک انہی اصول پر حوادث جزئیہ کے احکام کی تفریع کرتے رہنا یہ کام علم و فہم کا ہے اگرچہ حق تعالیٰ نے اجتہاد مطلق کو ختم کر دیا ہے نہ اس وجہ سے کہ خداوند کریم کی رحمت (معاذ اللہ) ختم ہو گئی بلکہ اس لئے کہ خداوند تعالیٰ کا قاعدہ اور ان کی عادت مستمرہ یہ ہے کہ جب کسی چیز کی ضرورت نہیں رہتی اس وقت اس کو

ختم کر دیتے ہیں اس عادت کے موافق چونکہ حضرات مجتہدین کے بعد اجتہاد کی ضرورت نہ رہی تھی اس لئے اس کو ختم کر دیا البتہ تفریع کی ضرورت قیامت تک رہے گی اس لئے اتنا اجتہاد اور اتنا فہم قیامت تک کے لئے باقی ہے جس سے مجتہدین کے اصول پر علماء جزئیات کو متفرع کرتے رہیں چنانچہ ہر زمانہ میں ایسے لوگ پیدا ہوتے رہیں جو نئے نئے جزئیات میں حکم شرعی بتلاتے رہتے ہیں اور مجتہدین کے اصول ہی پر جزئیات حادثہ کو متفرع کرتے رہتے ہیں دوسرے اس کی ضرورت بھی باقی ہے کہ ہر زمانہ میں حق کو باطل سے ممتاز کر دیا جائے کیونکہ زمانہ نبوت سے بُعد ہو جانے کی وجہ سے بعض دفعہ حق و باطل مختلط ہو جاتا ہے خواہ عوام کی بے تمیزی سے یا اہل غرض علماء کی وجہ سے تو ایسے وقت میں حق تعالیٰ کسی ایسے مقبول بندے کو پیدا فرماتے ہیں جو حق کو باطل سے ممتاز کر کے صراط مستقیم کو واضح کر دیتا ہے یہ درجۂ تجدید ہے اس کے متعلق حدیث میں پیشین گوئی ہے اِنَّ اللّٰہَ یَبْعَثُ فِیْ اُمَّتِیْ عَلٰی رَاْسِ کُلِّ مِائَۃٍ مَنْ یُّجَدِّدُ لَھَا دِیْنَھَا کہ حق تعالیٰ میری امت میں ہر سو برس کے بعد ایک ایسے شخص کو مبعوث فرماتے ہیں جو دین کی تجدید کر دیتا ہے یعنی حق کو باطل سے ممتاز کر دیتا ہے چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ہر صدی پر کوئی نہ کوئی مجدد ضرور ہوا ہے تو یہ دو درجے اب بھی باقی ہیں اور قیامت تک رہیں گے ایک تفریع ایک تجدید اور یہ دونوں خدمتیں الگ الگ ہیں اور اگر کوئی اللہ کا بندہ دونوں کا جامع[۱] ہو تو یہ خدا تعالیٰ کی رحمت ہے تو اب توضیح و تفصیل کا

---

[۱] قلت ومن الجامعین لہما سیدی حکیم الامۃ مجدد الملۃ ادام اللہ فیوضہم وبرکاتہم سالت العارف باللہ سیدی مولانا محمد یحیی رحمۃ اللہ علیہ الخادم الخاص لسیدی قطب زمانہ الشیخ مولانا رشید احمد گنگوہی عن مجدد ہذہ السنۃ الحاضرۃ فقال کنت اظن اولاً انہ شیخی مولانا رشید احمد قدس اللہ سرہ ثم رأیتہ قد انتقل الی ربہ علی راس المائۃ والآن مجدد ہذہ المائۃ عندی خالی مولانا اشرف علی ادام اللہ فیوضہ اھ قلت اذعن بہذا القول طائفۃ من المقبولین وایدہ عموم فیضہ اطال اللہ بقاءہ وبہ شاعۃ صیتہ فی العالم وامتیازہ من بین العلماء بکثرۃ الرحلۃ الیہ من الطالبین وبزیادت ایضاح الحق علی یدیہ بالتصانیف المفیدۃ فی کل علم من علوم الدین وبالمواعظ المتکثرۃ الممتازۃ بشانہا وبتسہیل طریق الباطن وتوضیحہ بحیث یدری القشر من اللباب واللہ اعلم ۱۲

جو درجہ ہے اس کو اگر ابہام کے ساتھ بیان کیا جائے تو ایک جلسہ میں بیان ہو سکتا ہے مگر یہ بیکار ہے کیونکہ جس تفصیل کو کوئی نہ سمجھے وہ فضول ہے اور پوری طرح بیان کیا جائے تو بتلایئے اس کے لئے ایک دو جلسہ کیسے کافی ہو سکتا ہے اس لئے میں نے کسی قدر کی قید لگائی یعنی یہ تفصیل اضافی ہوگی جو تفصیل اتم کے مقابلہ میں تو اجمال ہے اور اجمال سابق کے مقابلہ میں تفصیل ہے تو یہ درجہ تفصیل اضافی کا باقی رہ گیا تھا اس کو میں آج بیان کرنا چاہتا ہوں اور اسی لئے اُسی آیت کو اختیار کیا گیا جس کو کل بیان کیا گیا تھا باقی یہ جو میں نے کہا ہے کہ کل جزو ثانی کو بھی اجمالاً بیان کر چکا ہوں تو شاید کسی کے ذہن میں وہ اجمال نہ رہا ہو اس لئے میں اس کو بھی یاد دلاتا ہوں کہ میں نے اخیر مضمون میں کہا تھا کہ حق تعالٰی نے وُدّ (اور محبوبیت) کا مدار ایمان اور عمل صالح پر رکھا ہے اس کے متعلق میں نے کہا تھا کہ اس کا طریقہ علوم دین ہیں جو دو طرح حاصل ہو سکتے ہیں یا تعلیم و تعلم سے یا علماء کی مخالطت اور ان کے اقوال و مواعظ سننے سے پس کل گو اس مضمون کی تفصیل نہ کی گئی تھی مگر وہ طریقہ بتلا دیا گیا تھا جس سے عمر بھر تفصیل ہو سکتی تھی تو وہ بیان بھی مکمل تھا اس میں ابہام نہ تھا کیونکہ ابہام کی صورت یہ ہوتی ہے کہ کلام مفہم مراد نہ ہو اور یہ اجمالی بیان غیر مفہم نہ تھا بلکہ کافی تھا اگر آج کا بیان نہ ہوتا تب بھی کوئی جزو سمجھنے سے باقی نہ رہا تھا البتہ ایک جزو کی تفصیل پہلے جزو کی برابر نہ ہوئی تھی۔ تو اس کے بیان کے لئے خدا تعالٰی نے اس وقت موقعہ دے دیا ہے تو اس وقت میں اس کی بھی تفصیل کرنا چاہتا ہوں یہ حاصل ہے آج کے بیان کا۔

توضیح اس کی یہ ہے کہ ہر مقصود میں دو چیزیں ہوتی ہیں۔ ایک نفس مقصود اور ایک اس کا ذریعہ اب سمجھو کہ حق تعالٰی نے اس آیت میں ایمان و عمل صالح پر وُدّ کا مدار رکھا ہے اس میں بھی دو چیزیں ہیں ایک مقصود جس کا بیان سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا میں ہے اور ایک طریق ایمان و عمل صالح جس کا

بیان الذین آمنوا وعملوا الصلحٰت میں ہے توکل کے بیان کا حاصل مقصود کی تفصیل تھی۔ اور آج طریق کی تفصیل ہے۔ اور مقصود بہت ہی مختصر ہے اور اس کی تفصیل میں بھی کچھ طول نہیں ہے۔ یعنی محبوبیت اس میں بہت سی اقسام بیان کرنے کی حاجت نہیں بس یہ سمجھ لینا کافی ہے کہ ہم حق تعالےٰ کے محبوب بن جاویں گے اور اس کے فروع میں سے یہ بھی بتلا دیا گیا تھا کہ یہ شخص خلق کا بھی محبوب ہو جاوے گا تو یہ مضمون زیادہ تفصیل کا محتاج نہ تھا مگر اس کی تفصیل اس لئے بیان کی گئی تھی کہ آجکل لوگ ثمرات آخرت کو بہت ہی بے وقعت سمجھتے ہیں بس ان کے نزدیک بڑا ثمرہ یہ ہے کہ کچھ روپیہ مل جائے۔ چنانچہ ایک عہدہ دار کی بیوی نماز پڑھتی تھی تو وہ اس سے پوچھا کرتے تھے کہ تجھ کو نماز پڑھ کر کیا ملا۔ اسی طرح سودا کی حکایت ہے کہ وہ اپنی بیوی سے ایک دن پوچھنے لگا کہ تو نماز کس واسطے پڑھا کرتی ہے۔ اس نے کہا ہمیں جنت ملے گی تو سودا کیا کہتا ہے کہ جا باؤلی تو وہاں بھی غریبوں ملانوں طالب علموں اور جلاہوں کے ساتھ رہے گی اور دیکھ ہم جہنم میں جائیں گے جہاں بڑے بڑے بادشاہ اور وزرا اور امرا ہوں گے فرعون۔ ہامان۔ نمرود۔ شداد۔ قارون وغیرہ۔

یہ تو سودا قصہ ہے مگر آجکل بھی قلوب کو ٹٹولا جائے تو معلوم ہوگا کہ جتنی وقعت لوگوں کے قلوب میں ایک ہزار روپیہ کی ہے اس سے نصف بھی دین کی وقعت نہیں ہے نہ ثمرات آخرت کی حالانکہ ان کی وہ قیمت ہے کہ

قیمت خود ہردو عالم گفتۂ ؎
نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز

(تونے اپنی قیمت دونوں جہان بیان کی ہے نرخ بڑھا ابھی تو ارزاں ہے)

دونوں جہاں بھی بخدا اس کی قیمت میں کم ہیں۔ اور یہیں سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ جو لوگ قرآن کو تراویح میں اجرت لیکر سناتے ہیں اس میں علاوہ فقہی گناہ کے

بے غیرتی بھی کس قدر ہے کہ قرآن کو جو خدا تعالےٰ کا کلام ہے ادنیٰ سی اجرت کے معاوضہ میں سناتے پھریں۔ اور یہ ساری بے قدری اس لئے ہے کہ قرآن سستا مل گیا ہے اس دولت کے حصول میں ہم کو کچھ خرچ کرنا نہیں پڑا اسی کو مولانا فرماتے ہیں ؎

اے گراں جاں خوار دیدستی مرا
زانکہ بس ارزاں خریدستی مرا

(اے کاہل تو نے مجھ کو بیقدر سمجھ رکھا ہے وجہ یہ ہے کہ میں تجھ کو مفت مل گیا ہوں)

یعنی قرآن زبان حال سے کہہ رہا ہے کہ مجھے اس واسطے بے قدر کر رکھا ہے کہ میرے حاصل کرنے میں تمہارے کچھ دام نہیں لگے۔

حضرت ابراہیم بن ادھم رحمۃ اللہ علیہ جب کسی فقیر کو فقر و فاقہ کی شکایت کرتے ہوئے دیکھتے تو فرمایا کرتے کہ تم اس کی قدر کیا جانو تم کو گھر بیٹھے یہ دولت مل گئی ہے اس کی قدر ابراہیم بن ادھم کے دل سے پوچھو جس نے سلطنت بیچ کر اس کو خریدا ہے۔ اسی طرح ہم نے ایمان کی دولت کو باپ ماں سے لیا ہے بے محنت و مشقت ہم کو مل گئی ہے اس لئے اس کی بے قدری ہے ورنہ خدا کا نام وہ چیز ہے جس کے مقابلہ میں تمام دنیا ہیچ ہے کیونکہ جنت کی سلطنت اسی کے عوض میں ملے گی جس کے سامنے دنیا کی ہزار سلطنتیں بھی گرد ہیں مگر افسوس آجکل دو پیسہ کے برابر بھی خدا کے نام کی قدر نہیں چنانچہ وہ عہدہ دار اپنی بیوی سے پوچھتے ہی تھے کہ تجھ کو نماز سے کیا ملا وہ تو ملنا اس کو سمجھتے تھے جیسے ایک شخص کو ملا کرتا تھا۔ قصہ یہ ہے کہ ایک عہدہ دار رشوت لیا کرتے تھے اور نماز کے بھی بہت پابند تھے حتیٰ کہ فجر کی نماز کے بعد اشراق تک وظیفہ بھی پڑھا کرتے تھے اور یہی وقت مقدمہ والوں سے رشوت طے کرنے کا تھا مقدمہ والے آتے اور اشاروں سے رشوت کی رقم طے ہوتی تھی کیونکہ پیر نے وظیفہ میں بولنے سے منع کر رکھا تھا بس وہ اشاروں سے سوکہتا اور یہ دو انگلیاں اٹھا دیتے کہ دو سولوں گا پھر اشاروں ہی سے

کوئی رقم طے ہو جاتی تو یہ مصلیٰ کا کونا پکڑ کر اٹھا دیتے کہ یہاں روپیہ رکھدو پھر کوئی دوسرا آتا اور اس سے بھی یوں ہی گفتگو ہوتی۔

غرض یہ ظالم اشراق پڑھ کر کئی سو روپے لے کر اٹھتا تھا تو آجکل تو ملنا اسے کہتے ہیں اور اسی واسطے وظیفے بھی پڑھے جاتے ہیں پھر غضب ہے کہ بعض لوگ قرآن پڑھنے میں تو بول پڑتے ہیں اور وظیفے میں نہیں بولتے گویا نعوذ باللہ قرآن کی وقعت وظیفوں کی بھی برابر نہیں یہ کیسی بیقدری ہے۔

اسی جہل کا ایک یہ اثر ہے کہ حدیث و قرآن کی دعاؤں کا لوگوں کے ذہن میں وہ درجہ نہیں جو پیرزادوں کی گھڑی ہوئی دعاؤں کا درجہ ہے چنانچہ جب میں حج کو گیا تھا تو اس وقت میرے ابتدائی کتابوں کے استاد کانپور میں میری جگہ تدریس کے لئے تشریف لے آئے تھے۔ وہاں ان سے ایک شخص نے اپنے قرض کے لئے وظیفہ پوچھا انھوں نے ایک دعا بتلا دی اس نے بڑی رغبت سے یاد کی اور انھوں نے زیادہ رغبت دلانے کے لئے یہ بھی فرمادیا کہ یہ دعا حدیث میں آئی ہے اور اس کی یہ فضیلت ہے۔ بس یہ سنکر اس شخص کا منہ پھیکا سا ہوگیا اور کہنے لگا حضرت میں تو کوئی ایسا وظیفہ چاہتا ہوں جو آپ کے پاس سینہ بسینہ چلا آرہا ہو حدیث کی دعا تو عام ہے سب ہی پڑھ لیتے ہیں۔

سو لوگ آجکل ایسی ہی بے قدری کرتے ہیں۔ ایک شخص مجھ سے خود کہتے تھے کہ میری نماز تو قضا ہو جاتی ہے مگر پیر نے جو وظیفہ بتلایا ہے وہ کبھی قضا نہیں ہوتا۔ عجیب حالت ہے کہ اول تو دین کی طرف توجہ ہی نہیں اور جو توجہ بھی ہے تو اس خوبصورتی کے ساتھ۔

اسی طرح ان عہدہ دار صاحب کو پیر نے منع کر دیا تھا کہ وظیفہ میں بولنا نہیں اس لئے ان کو بولنا تو ناجائز تھا مگر رشوت لینا جائز تھا بلکہ شاید وہ وظیفہ بھی اسی واسطے پڑھتے ہوں کہ رشوت خوب ملے اور رشوت کے لئے

بھی نہ سہی تو اس میں تو شک نہیں کہ آج کل وظائف زیادہ تر دنیا کے واسطے پڑھے جاتے ہیں کہ مال میں برکت ہو نوکری مل جائے قرض اتر جائے رضائے حق کے واسطے بہت ہی کم پڑھے جاتے ہیں میں یہ تو نہیں کہتا کہ دنیا کے کاموں کے لئے وظیفہ پڑھنا ناجائز ہے مگر یہ ضرور کہوں گا کہ دنیا کے لئے اگر چالیس بار پڑھتے ہو تو آخرت کے لئے کم سے کم چار بار تو کوئی وظیفہ پڑھو مگر اس کی ذرا بھی فکر نہیں اور جب آپ کو دین کی فہم کامل حاصل ہو گی اس وقت میں یہ کہوں گا کہ ؎

از خدا غیر خدا را خواستن
ظن افزونی ست کلی کاستن

خدا تعالیٰ سے غیر خدا کو چاہنا حقیقت میں پستی ہے یہ سلطنت نہیں ہے کہ خدا سے دنیا مانگو بلکہ یہ پست ہمتی اور دنارت ہے مگر اس کے دو طریقے ہیں۔ ایک تو دنیا کے واسطے خدا تعالیٰ سے دعا کرنا اور دعا کے ذریعہ سے مانگنا یہ مذموم نہیں ہے بلکہ یہ تو شان عبدیت ہے اور ایک وظیفہ پڑھ کر مانگنا یہ مذموم ہے اور ان دونوں میں بڑا فرق ہے وہ یہ کہ دعا کر کے مانگنے میں ایک ذلت کی شان ہے اور یہ اس مقصود کے موافق ہے جو بندوں کے پیدا کرنے سے اصل مقصود ہے جس کو حق تعالیٰ نے اس آیت میں بیان فرمایا ہے۔ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُوْنَ (میں نے جن و انسان کو عبادت کے لئے پیدا کیا ہے) اسی لئے حدیث میں ہے اَلدُّعَاءُ مُخُّ الْعِبَادَةِ (کہ دعا عبادت کا مغز ہے) اور میں نے عبادت کو جو اصل مقصود کہا ہے اس میں اصل کی قید اس واسطے لگائی کہ کوئی یوں نہ سمجھیں کہ کھانا کمانا اور دنیا کے کاروبار کرنا ناجائز ہے سو خوب سمجھ لو کہ یہ ناجائز نہیں بلکہ جائز ہے بلکہ ایک درجہ میں مطلوب بھی ہے مگر اصل مقصود نہیں بلکہ تابع مقصود ہے اس کی ایسی مثال ہے جیسے ایک شخص کھانا پکوائے جس میں پانچ روپے صرف ہوں تو گو اصل مقصود کی لاگت اس سے کم ہے مگر جب کوئی پوچھتا ہے کہ اس کھانے کی تیاری میں کیا خرچ ہوا ہے

تو جواب یہی دیا جاتا ہے کہ پانچ روپے صرف ہوئے ہیں اور جب وہ تفصیل پوچھے تو آپ کہتے ہیں کہ ایک روپیہ کا گھی اور ایک روپیہ کا آٹا اور ایک روپیہ کا گوشت اور آٹھ آنے کا مسالہ وغیرہ اور آٹھ آنے کی لکڑیاں کوئلے اور چار آنے پکانے والے کی مزدوری وعلیٰ ہذا۔

اس جواب کو سن کر وہ سائل کہنے لگے کہ کیا آپ لکڑیاں اور کوئلے بھی کھایا کرتے ہیں جو اس کو کھانے کے حساب میں شمار کیا تو بتلایئے کہ آپ کیا جواب دیں گے یقیناً یہی کہیں گے کہ لکڑیاں گو مقصود نہیں مگر مقصود کے تابع ضرور ہے اس لئے ان کو بھی مقصود کے ساتھ شمار کیا جائے گا تو بعینہ یہی تعلق دنیا کا آخرت سے ہے کہ گو وہ بھی کسی درجہ میں مطلوب ہے مگر اصل مقصود نہیں بلکہ تابع مقصود ہے۔ اب اگر کوئی شخص صرف دنیا ہی کے جمع کرنے میں لگا رہے اس کو ایسا سمجھا جاوے گا جیسے کوئی کھانا تو تیار کرے نہیں نہ کھانے کی چیزیں خریدے صرف لکڑیاں گھر میں بھر لے تو بتلایئے اگر کوئی اپنے گھر میں لکڑیاں ہی بھر لے تو اس کو کوئی شخص عاقل کہے گا ہرگز نہیں۔ اسی طرح محض دنیا طلبی میں رہنا بھی عاقل کا کام نہیں اور اگر کوئی کھانے کا سارا سامان کر لے مگر ایندھن نہ خریدے تو اس کو بھی کھانا میسر نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح محض دین میں لگا رہنا اور باوجود حاجت دنیا کی مطلق فکر نہ کرنا بھی غیر مطلوب ہے بلکہ اصل مقصود دین کو سمجھے اور اس میں زیادہ مشغول ہو اور کچھ فکر دنیا کی بھی رکھے مگر اس میں منہمک نہ ہو بلکہ اتنا سامان کر لینا چاہیے کہ مثلاً ایک سال کے لئے علی اختلاف الاحوال کافی ہو جائے کیونکہ اَلضَّرُوْرَةُ يَتَقَدَّرُ بِقَدْرِ الضَّرُوْرَةِ (ضرورۃ بقدر ضرورۃ ہوتی ہے) اور رفع ضرورت کے لئے اتنا سامان کافی ہے۔

لوگ کہتے ہیں کہ مولوی دنیا چھڑاتے ہیں یہ غلط ہے۔ چھڑاتے کہاں ہیں بلکہ وہ تو دنیا کو دین کا ذریعہ بتاتے ہیں اتنا فرق ہے کہ آپ اسی کو مقصود سمجھتے ہیں اور میں اس کو بقدر ضرورت ضروری کہتا ہوں پس دنیا تابع ہے

اور اصل مقصود آخرت ہے اس لئے میں نے اصل کا لفظ بڑھا دیا تھا کہ خلقت عالم سے اصل مقصود عبادت ہے اب سمجھئے کہ دعا میں ایک خاصہ ہے جس کی وجہ سے دعا کے دنیا مانگنا جائز ہے اور وظیفہ میں وہ بات نہیں اس لئے مذموم ہے۔ دعا کی حقیقت وہ ہے جو عبادت کی روح ہے یعنی تذلل واظہار احتیاج اور یہ وہ چیز ہے کہ اگر کوئی سادہ طبیعت آدمی کسی بادشاہ یا امیر کو دعا کرتے دیکھے اور دعا کے وقت جو عاجزی کے الفاظ وہ کہہ رہا ہے ان کو سُنے تو اس کو حیرت ہو جائے گی کہ اللہ یہ شخص بھی اتنا محتاج ہے جو اس عاجزی سے اپنی احتیاج کو ظاہر کر رہا ہے۔

اکبر بادشاہ کی حکایت ہے کہ ایک دفعہ شکار میں وہ کسی طرف رستہ بھول کر جا نکلا وہاں ایک دیہاتی زمیندار تھا اس نے بادشاہ کو پہچانا تو نہیں مگر اپنی کریم النفسی سے اس کی خوب خاطر مدارات کی اکبر بہت خوش ہوا تھوڑی دیر میں لشکر بھی آملا۔ تب دیہاتی کو معلوم ہوا کہ یہ تو بادشاہ تھا اکبر نے چلتے وقت کچھ دیا بھی اور کہدیا کہ جب یہ ختم ہو جاوے ہمارے پاس پھر آجانا اور دربانوں سے کہدیا کہ یہ جب آوے روکنا نہیں۔ چنانچہ ایک بار وہ آپہونچا اور اس کو محل میں پہونچا دیا گیا۔ اتفاق سے اکبر اس وقت نماز پڑھ رہے تھے۔ اس دیہاتی کو بڑی حیرت ہوئی کہ یہ بادشاہ ہو کر کسی کے سامنے جھک رہا ہے جب اکبر نماز سے فارغ ہوئے اور ہاتھ اٹھا کر دعا کرنے لگے تو دیہاتی کو اور بھی حیرت ہوئی کہ یہ کس سے مانگ رہا ہے۔ آخر جب وہ دعا سے فارغ ہو کر اس کی طرف متوجہ ہوئے تو دیہاتی نے پوچھا کہ تم کس کے سامنے جھکتے اور کس سے ہاتھ پسار کر مانگ رہے تھے۔ اکبر نے کہا کہ میں خدا تعالیٰ کی عبادت کر رہا تھا اور اس سے اپنی حاجتیں مانگ رہا تھا۔ یہ سن کر دیہاتی پر ایک حالت طاری ہوئی اور کہنے لگا کہ جب خدا تمھاری حاجت پوری کر سکتا ہے تو کیا میری حاجت پوری نہ کرے گا بس میں اب تم سے کچھ نہیں مانگتا میں بھی خدا ہی سے مانگوں گا تو صاحبو! دعا کا یہ رنگ ہے جس سے سراسر احتیاج اور عاجزی ٹپکتی ہے اور

وظیفہ پڑھنے میں یہ بات نہیں (بلکہ اکثر تو یہ ہے کہ وظیفہ پڑھ کر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ وظیفہ کے زور سے ہمارا مقصود ضرور حاصل ہوگا تو اس حالت میں عجز و احتیاج کہاں ہیں دنیا کے واسطے وظیفہ پڑھنا اور دنیا کے لئے دعا کرنا برابر نہیں ۱۲)

اس لئے اگر کوئی دنیا کے واسطے دعا مانگے اور یوں کہے کہ اے خدا مجھے سو روپے دیدیجئے تو یہ جائز ہے بلکہ اس میں بھی وہی ثواب ہے جو آخرت کے لئے دعا کرنے میں ہے بشرطیکہ دعا ناجائز کام کے لئے نہ ہو کیونکہ دنیا کے لئے ہر دعا جائز نہیں بلکہ جو شریعت کے موافق ہو وہی جائز ہے۔ مثلاً کوئی شخص ناجائز ملازمت کے لئے دعا مانگے تو یہ جائز نہیں اس کی ایسی مثال ہے جیسے حاکم کے یہاں ایک تو تحصیلداری کی درخواست دینا اور ایک ڈکیتی کی درخواست دینا ظاہر ہے کہ جس کام کو حاکم نے ممنوع قرار دے دیا ہے اس کی درخواست حاکم سے کرنا اور حاکم کو اس کے حصول کا ذریعہ بنانا بھی ممنوع ہوگا تو جو دعا حدود شرعیہ سے باہر ہو وہ تو پسندیدہ ہے ہی نہیں پھر اس کو پیش کرنا کیونکر جائز ہوسکتا ہے۔ آجکل لوگ اس کی بھی رعایت نہیں کرتے کہ دعا شریعت کے موافق ہو۔ واقعی بات یہ ہے کہ ہم لوگ بڑی غفلت میں ہیں جس کی وجہ زیادہ تر بے علمی ہے ہم لوگ بعض دفعہ خدا تعالیٰ سے ایسی چیزیں مانگتے ہیں جو خدا تعالیٰ کو ناپسند ہیں چنانچہ اس وقت بہت سی ایسی نوکریاں ہیں جو ناجائز ہیں اور ان کے لئے دعا کرائی جاتی ہے اور اگر وہ مل جائے تو مبارکباد دی جاتی ہے افسوس کس کس بات کی اصلاح کی جائے۔

تن ہمہ داغ داغ شد پنبہ کجا کجا نہم

(تمام بدن داغ داغ ہوگیا ہے پھوئے کہاں کہاں رکھیئں)

اور غضب یہ ہے کہ ایسی ناجائز ملازمتوں کے لئے اہل اللہ سے جاکر دعا کرائی جاتی ہے۔ اور اس سے بڑھ کر یہ کہ مُردوں کے پاس جاکر کہتے ہیں کہ آپ ہمارا یہ کام کردیجئے گویا سارا اختیار ان کے ہاتھوں میں ہے۔

حضرت مولانا فضل الرحمنؒ صاحب کے پاس ایک شخص آیا اور کہنے لگا کہ حضرت میرا یہ کام کر دیجئے شاہ صاحب نے فوراً حکم دیا کہ نکالو اس مشرک کو یہ مجھ سے کہتا ہے کہ میرا کام کر دیجئے ارے کیا تیرا کام کر دینا میرے اختیار میں ہے۔

پس آجکل لوگ یوں سمجھتے ہیں کہ یہ تسبیح چلانے والے خدا تعالےٰ کے رشتہ دار ہو گئے کہ جو یہ کہدیں گے ضرور ہو جائے گا خدا تعالےٰ فرماتے ہیں یَا اَھْلَ الْکِتَابِ لَا تَغْلُوْا فِیْ دِیْنِکُمْ (اے اہل کتاب دین میں غلو مت کرو) اس میں غلو فی الدین سے منع فرمایا گیا ہے۔ پس گو حضرات اولیاءؒ کی تعظیم ضروری ہے اور دین میں داخل ہے مگر اس کے یہ معنے نہیں کہ ان کی ایسی تعظیم کی جائے کہ خدا تعالیٰ کی توہین ہونے لگے اور شرک لازم آجائے۔ دیکھو اگر کوئی حاکم کے پاس جا کر سرشتہ دار کو بھی سلام کرلے تو اس کا مضائقہ نہیں لیکن اگر اس سے وہ باتیں کہنے لگے جو حاکم سے کہنا چاہئیں مثلاً یوں کہے کہ سرشتہ دار صاحب بس سارا معاملہ آپ ہی کے ہاتھ میں ہے آپ جو چاہیں کر سکتے ہیں اور اس کی ویسی ہی تعظیم کرنے لگے جیسی حاکم کی کی جاتی ہے تو کیا حاکم اس سے خوش ہوگا یقیناً حاکم اس شخص کو دربار سے نکال دیگا اور یقیناً سرشتہ دار بھی ایسی تعظیم گوارا نہیں کر سکتا اور جو گوارا کرے گا تو وہ بھی دربار سے نکالا جائے گا ۱۲

اب بتلاؤ کہ جو معاملہ خدا تعالےٰ سے کیا جاتا ہے وہ غیر خدا کے ساتھ کیونکر پسندیدہ ہو سکتا ہے یقیناً اس سے حق تعالےٰ ناخوش ہوتے ہی ہیں وہ بزرگ بھی ناراض اور ناخوش ہوتے ہیں جن کی ایسی تعظیم کی جاتی ہے۔ پھر حیرت ہے کہ لوگ بزرگوں کے مزارات پر جا کر ایسے بیہودہ کلمات سے ان کا دل دکھاتے ہیں۔ غرض ناجائز ملازمتوں کے لئے زندوں اور مردوں کو دونوں کو جا کر دق کرتے ہیں پھر زندوں میں بعض تو صاف ہوتے ہیں جو ان کے منہ ہی پر کہدیتے ہیں کہ ہم ناجائز کام کے لئے دعا نہ کریں گے ان کو تو بدمزاج اور سخت کہکر بدنام کیا جاتا ہے اور اکثر اپنے اخلاق سے کہدیتے ہیں کہ ہاں

دعا کریں گے یہ بہت خوش اخلاق شمار ہوتے ہیں اور اس وقت اہل الرائے کی رائے یہی ہے کہ علماء کو ایسے ہی اخلاق چاہئیں جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ حق بات کو ظاہر نہ کیا کریں۔ غرض بعض اہل اللہ اپنے اخلاق سے مجمل وعدہ بھی کر لیتے ہیں مگر لوگوں کو یہ معلوم نہیں کہ وہ دعا کس طرح کرتے ہیں ذرا خلوت میں کبھی ان کی دعاؤں کو سنو تو معلوم ہو اور بعض تو خلوت میں خدا تعالےٰ کے سامنے بھی اخلاق برتتے ہیں مگر یہ غیر محقق ہیں اکثر اہل اللہ خلوت میں یوں دعا کرتے ہیں کہ یا اللہ اگر یہ ملازمت شریعت کے موافق ہو اور اس شخص کے دین کو مضر نہ ہو تو اسے نصیب کر دیجئے ورنہ ہرگز نہ دیجئے۔

مولانا شاہ فضل الرحمٰنؒ صاحب سے ایک شخص نے آکر عرض کیا کہ حضرت میرے مقدمے کے واسطے دعا کیجئے اسی وقت دوسرا فریق بھی آیا اس نے بھی دعا چاہی اس مقام پر اس گلجھڑی کو سلجھانا ہر ایک کا کام نہیں۔ اب یا تو دوسرے فریق سے انکار کریں تو ترجیح بلا مرجح لازم آتی ہے اور اس سے بھی وعدہ کریں تو کس طرح کریں۔ ہاں جس کو خدا تعالےٰ نورِ باطن عطا فرمائیں وہ اس گتھی کو سلجھا سکتا ہے۔ چنانچہ شاہ صاحب نے اسی وقت اس طرح دعا کی کہ اے اللہ جس کا حق ہو اُسے مل جاوے۔ لیجئے دونوں کا حق پورا ہو گیا سو مولانا نے تو جلوت ہی میں یہ دعا کر دی باقی اور بزرگ بھی گو جلوت میں تم سے کیسا ہی وعدہ کر لیں خلوت میں وہ بھی اسی طرح دعا کرتے ہیں کہ اگر یہ کام خلاف شریعت نہ ہو تو پورا ہو جائے ورنہ ہرگز پورا نہ ہو۔ وجہ یہ ہے کہ وہ خدا کے مقرب ہیں پھر وہ خدا تعالےٰ کی مرضی کے خلاف کوئی دعا کیسے کر سکتے ہیں بلکہ عوام الناس تو خدا تعالےٰ سے کچھ کھلے ہوئے بھی ہوتے ہیں (جیسے بعض دیہاتی حکام کے سامنے بے تکلف باتیں کر لیتے ہیں)

اور یہ حضرات نہایت ہیبت زدہ ہوتے ہیں وہ ناجائز امور کے لئے

تو کیا دعا کرتے مباح امور میں بھی دعا کرتے ہوئے ان کی یہ حالت ہوتی ہے سہ

اُحِبُّ مُنَاجَاۃَ الْحَبِیْبِ بِاَوْجُہٖ وَلٰکِنْ لِسَانَ الْمُذْنِبِیْنَ کَلِیْل

(مناجات حبیب کے پسندیدہ بہت سے طریقے ہیں۔ مگر گناہ گاروں کی زبان توتلی اور کند ہے)

بعض دفعہ وہ بہت کچھ مانگنا چاہتے ہیں لیکن اپنی خطاؤں کے استحضار سے زبان سے کچھ نکلتا نہیں۔ حضرات! مغفرت کی دعا کس قدر محبوب اور سراپا محمود ہے مگر اس میں بھی بعض دفعہ استحضار ذنوب کے سبب ان کی زبان رک جاتی ہے گو پھر امر کی وجہ سے دعا کرتے ہیں اور کرنا چاہئے کیونکہ وہ صاحب حال ہونے کے ساتھ صاحب عرفان بھی ہوتے ہیں اس لئے امر کی وجہ سے دعا کرتے ہیں اور اپنے جی کو سمجھاتے ہیں کہ شرماویں کس سے اور شرم کی وجہ تو یہی ہے کہ ہم اپنے کو ناپاک سمجھتے ہیں کہ اس وجہ سے اُس دربار میں کچھ عرض کرنے کے قابل اپنے کو نہیں سمجھتے مگر پھر دور دور رہ کر پاک کیسے ہوں گے پاک ہونا بھی تو حاضری دربار ہی پر موقوف ہے اب اگر حاضری اس پر موقوف ہو کہ پہلے پاک ہولیں تو دور لازم آتا ہے اس لئے وہ شرم کو بالائے طاق رکھ کر طبیعت پر جبر کرکے دعا کرتے ہیں مولانا نے ایک حکایت لکھی ہے کہ ایک آلودہ بنجاست دریا پر سے گذرا دریا نے کہا کہ آمیرے اندر چلا آ اس نے جواب دیا کہ میں ناپاک اور تو پاک وصاف میں تجھ تک کیسے آؤں پاک ہو کر آؤں گا دریا نے ہنس کر کہا کہ اے بیوقوف پاک ہونے کا بھی طریقہ یہی ہے کہ تو اسی حالت میں میرے پاس چلا آ مجھ سے دور رہ کر تو پاک ہی نہیں ہوسکتا ایک بار تو ناپاکی کی حالت ہی میں چلا آنا پھر پاک ہو کر بھی آنا نصیب ہوگا۔

اور جو اس انتظار میں رہا کہ پہلے پاک ہولوں پھر پانی کے پاس جاؤں گا

تو عمر بھر نہ تجھے پاکی نصیب ہوگی نہ پانی کا قرب نصیب ہوگا۔

صاحبو! اسی طرح خدا تعالے کے دربار میں آنے کے لئے تم اس کا انتظار نہ کرو کہ پہلے دنیا کے جھگڑوں سے فارغ ہولیں پھر یکسو ہوکر خدا کی یاد میں لگیں گے کیونکہ یوں تو ساری عمر گذر جائے گی اور تم کو خدا کے ساتھ علاقہ نصیب نہ ہوگا یہ شیطانی اغواہے کہ اس نے علم کے پیرایہ میں جہل کے اندر مبتلا کر رکھا ہے کہ عام لوگوں کو یہ پٹی پڑھادی ہے کہ بیٹے بیٹیوں کی شادی کر کے بہت سی جائداد اور روپیہ حاصل کر کے پھر اللہ کی یاد میں لگنا اس وقت تو دل دنیا کی گندگیوں سے ملوث ہے ان سے پاک ہوکر آنا مگر ان لوگوں کو عمر بھر بھی خدا کی یاد نصیب نہیں ہوتی کیونکہ دنیا کے تعلقات بدون خدا سے علاقہ پیدا کئے قطع ہو ہی نہیں سکتے۔ دنیا کے کاموں کی یہ حالت ہے کہ ؎

لَا یَنْتَھِیْ اِرْبٌ اِلَّا اِلٰی اِرْبٍ

(ایک حاجت گئی دوسری حاجت درپیش آگئی)

ان کی انتہا ہی کہیں نہیں ہے ایک کام کے بعد دوسرا کام نکلتا چلا جاتا ہے۔ بس ان لوگوں کی ہمیشہ وہ حالت رہتی ہے۔

ہر شبے گویم کہ فردا ترک ایں سودا کنم

باز چوں فردا شود امروز را فردا کنم

روز یہی کہتے رہتے ہیں کہ کل کو یہ کام چھوڑ دیں گے مگر جب کل ہوتی ہے پھر وہی حال ہوجاتا ہے۔ تو صاحبو! اس کا انتظار نہ کیجئے آپ جس حال میں ہیں اُسی حال سے چلے آیئے دور رہ کر پاک ہونے کا انتظار نہ کیجئے پاک ہونے کا بھی طریقہ یہی ہے کہ ایک بار ناپاکی کی حالت ہی میں آجایئے۔ اس لئے فرماتے ہیں ؎

باز آ باز آ ہر آنچہ ہستی باز آ گر کافر و گبر و بت پرستی باز آ

ایں درگہ ما درگہ نومیدی نیست صد بار اگر توبہ شکستی باز آ

(واپس آ واپس آ جو کچھ بھی تو ہے واپس آجا اگرچہ کافر وآتش پرست اور بت پرست ہے واپس آجا ہمارا دربار نا امیدی کا دربار نہیں ہے سو بار اگر تونے توبہ توڑی ہے واپس آجا)

ان شاء اللہ تعالیٰ خدا کے دربار میں حاضر ہونے سے بہت جلد یہ دلدّر دھل جاویگا اور ایک دن یوں ہی بیڑا پار ہو جائے گا۔ بہت لوگ بزرگوں کے پاس اسی خیال سے نہیں جاتے کہ یہ دنیا کا پاخانہ لیکر ان کے پاس کیا جاویں وہ اپنے دل میں کیا کہیں گے۔

صاحبو! اس کا وسوسہ ہرگز نہ لاؤ وہ حضرات تَخَلَّقُوْا بِاَخْلَاقِ اللّٰہِ (اللہ تعالیٰ جیسے اخلاق اختیار کرو) سے متصف ہوتے ہیں وہ کسی آنے والے کو حقیر نہیں سمجھتے وہ عیب پوش اور کریم النفس ہوتے ہیں بلکہ بخدا ان کی نظر میں اپنے سے زیادہ کوئی بھی ذلیل نہیں ہوتا پھر وہ کسی کو نظر حقارت سے کیا دیکھتے اس لئے تم اس ناپاکی سمیت ہی ان کے پاس چلے آؤ مجھے ایک صاحب کی حالت تو نہیں مگر اس کی بنا بہت ہی پسند آئی۔ وہ جونپور سے میرے پاس بیعت ہونے آئے تھے اور اس حال سے آئے کہ پاجامہ ٹخنوں سے نیچے اور ڈاڑھی منڈی ہوئی مونچھیں خوب بڑھی ہوئی۔ اور آکر مجھ سے اپنے سب حالات کہدیئے پھر بیعت کی درخواست کی میں نے بعد مغرب کا وقت مقرر کر دیا وہ دن جمعہ کا تھا۔ بھلے مانس نے اس دن بھی حجامت بنوائی تو جو کچھ بال ڈاڑھی کے نکل آئے تھے وہ بھی منڈوا دیئے یہ حرکت مجھے بہت ناگوار ہوئی کہ یہاں آکر بھی انھوں نے اس گناہ کو نہ چھوڑا مگر بعد نماز جمعہ کے انھوں نے اپنے اس فعل کی جو بنا بیان کی اس پر مجھے وجد آگیا۔ کہنے لگے کہ غالباً آپ کو آج میرا ڈاڑھی منڈانا ناگوار ہوا ہوگا میں نے کہا بے شک کہنے لگے کہ خیال مجھے بھی ہوا تھا کہ آپ کو ناگوار ہوگا۔ مگر میں نے یہ چاہا کہ طبیب کے سامنے

اپنے مرض کی اصلی حالت صاف صاف ظاہر کردوں اس لئے میں نے اس شکل سے اپنے کو پیش کردیا۔ اب آپ جو تصرف چاہیں مجھ میں فرمائیں میں سب کے لئے حاضر ہوں۔

سو وہ گو فعل مجھے ناگوار ہوا مگر اس بناء کی قدر ہوئی اور معلوم ہو گیا کہ اس شخص پر صدق کا حال غالب ہے گو بوجہ جہل کے بری طرح ظاہر ہوا مگر واقعی میں اس کے صدق کی قدر کرتا ہوں اور یہ ایسی قدر ہے جیسے حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک چور کی قدر کی تھی انھوں نے ایک شخص کو سولی پر لٹکا ہوا دیکھا تھا ساتھ والوں سے پوچھا کہ اس کو سولی کیوں دیگئی لوگوں نے کہا کہ حضرت یہ بڑا پکّا چور تھا۔ ایک بار اس نے چوری کی تو دایاں ہاتھ کاٹا گیا پھر باز نہ آیا اور دوبارہ چوری کی تو بایاں پیر کاٹا گیا۔ پھر باز نہ آیا تو قید کر دیا گیا اس نے قیدخانہ میں بھی چوری کی تو حاکم نے سولی کا حکم دیا یہ سن کر حضرت جنید نے دوڑ کر اس کے قدم چوم لئے۔ اہلِ ظاہر نے اعتراض کیا کہ آپ ایک ایسے پکّے چور کے قدم چومتے ہیں فرمایا میں نے چور کے قدم نہیں چومے بلکہ اس کے استقلال کے قدم چومے ہیں کہ وہ جیسا بھی کچھ تھا اپنی طلب کا پکّا تھا۔ اس کا محبوب گو کیسا ہی برا تھا مگر اس نے اس کے پیچھے جان دے دی اس کا یہ حال تھا کہ ؎

دست از طلب ندارم تا کامِ من برآید
یا تن رسد بجاناں یا جاں ز تن برآید

(طلب سے ہاتھ نہ روکونگا جب میرا مقصد پورا نہ ہو جائے بدن یا تو محبوب کے پاس پہونچ جائے یا جان تن سے نکل جائے)

پس اس کے استقلال کی قدر کرتا ہوں۔

اے لوگو! اگر ہم کو حق پر ثابت قدم رہنے میں ایسا استقلال حاصل ہو جائے تو ہمارا کام بن جائے۔ دیکھئے حضرت جنیدؒ نے اس شخص کے استقلال

کی قدر کی گو اس استقلال کی صورت بری تھی۔ اسی طرح گو ان صاحب نے ایک بری حرکت کی کہ ڈاڑھی منڈائی مگر چونکہ یہ حرکت صدق پر مبنی تھی اس لئے مجھے اس کی قدر ہوئی (کیونکہ ایسے سچے اور صاف دل آدمی سے یہ امید قوی ہوتی ہے کہ وہ بیعت کے وقت جو کچھ اقرار کرے گا سچے دل سے کرے گا پھر اس کے خلاف نہ کرے گا۔

چنانچہ ان صاحب نے تھانہ بھون سے جا کر پھر عمر بھر ڈاڑھی نہیں منڈائی بلکہ ایک وقت میں ان کی اتنی بڑی ڈاڑھی ہو گئی تھی کہ دیکھنے والے پہچانتے بھی نہ تھے کہ یہ وہی شخص ہے جو پہلے بالکل آزاد رند تھا غرض وہ پورے نیک صالح بن گئے (بات یہ ہے کہ صفات حمیدہ ہر حال میں حمیدہ ہیں جس میں کوئی صفت حمیدہ ہوتی ہے گو ایک وقت میں بری صورت سے اس کا ظہور ہو رہا ہو مگر جب اصلاح ہو گی تو کامل ہو گی خوب سمجھ لو ۱۲)

تو میں کہتا ہوں کہ آپ کو اس شخص کی طرح گندگی اور بدحالی ہی میں اپنے کو کسی بزرگ کے سپرد کر دینا چاہیئے اس کا خیال نہ کیجئے کہ اس صورت سے ہم بزرگوں کے پاس کیسے جائیں۔ یہ گفتگو اس پر چلی تھی کہ بعض دفعہ اہل اللہ کو دعائے مغفرت سے بھی شرم آتی ہے مگر وہ اس سے رکتے نہیں بلکہ وہ دل کو سمجھاتے ہیں کہ شرم کس سے کریں اگر اسی شرم میں رہے اور خدا تعالےٰ سے دعا نہ کی تو یہ نا پاکی کیونکر دھلے گی۔ تو جب وہ حضرات امور مباحہ کی دعا سے بھی شرماتے ہیں (گو اس پر عمل نہ کریں) تو آپ کے ناجائز کاموں کے لئے تو کیوں دعا کی ہمت کریں گے اس لئے زندہ یا مردہ بزرگوں سے ایسی دعائیں کرانا محض بے سود اور صرف ان کو تکلیف دینا ہے۔ پس ناجائز دعائیں تو مستثنیٰ ہیں رہی جائز دعا چاہے دنیا ہی کی کیوں نہ ہو وہ تو عبادت ہے۔ چنانچہ حدیث میں ہے اَلدُّعَاءُ مُخُّ الْعِبَادَةِ دعا عبادت کا مغز ہے کیونکہ دعا میں تذلل اور عاجزی کی شان ہوتی ہے دعا کرنے والا اپنے کو ذلیل و محتاج سمجھ کر دعا کرتا ہے بخلاف اس کے جو وظیفہ پڑھتا ہے اس کی

حالت تذلل کی نہیں ہوتی بلکہ اس کی حالت دعوے کی ہوتی ہے وہ یہ سمجھتا ہے کہ وظیفہ سے کامیابی ضروری ہے ان کے مکالمات سے یہ بات ظاہر ہے چنانچہ وہ کہا کرتے ہیں کہ حضرت ایسا وظیفہ بتلایئے کہ تیر بہدف ہو اور اگر کسی وظیفہ کی نسبت یہ لکھدیا جائے کہ یہ مجرب ہے تو اس پر ایسا بھروسہ ہوجاتا ہے کہ گویا تخلف ہوگا ہی نہیں تو چونکہ اس میں دعوے کی شان ہے اس لئے یہ ناپسند ہے مگر آجکل لوگ اکثر دعا کو چھوڑ کر وظائف پڑھتے ہیں گو ان کا پڑھنا جائز تو ہے (اگر ان میں کوئی بات خلاف شریعت نہ ہو)

مگر اس میں ثواب کچھ نہ ہوگا کیونکہ ثواب کے لئے یہ قاعدہ ہے اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ (اعمال کا ثواب نیت پر موقوف ہے) اور وظائف میں ثواب کی نیت نہیں ہوتی بلکہ محض دنیا ملنے کی نیت ہوتی ہے اس لئے ثواب کچھ نہ ہوگا بخلاف دعا کے کہ وہ اپنی ذات سے عبادت ہے حتیٰ کہ اس میں اگر دنیا مانگی جائے تب بھی شریعت اس کو عبادت کہتی ہے۔ چنانچہ خود شریعت نے اس کو دنیا مانگنے کا طریق تجویز فرمایا ہے پس دنیا کی نیت کرنا دعا کے منافی نہیں کیونکہ احادیث میں دنیا کی نیت سے بھی دعا کرنے کا حکم ہے مثلاً ایک حدیث میں ہے وَسَلُوا اللّٰہَ الْعَافِیَۃَ کہ اللہ تعالیٰ سے عافیت کی دعا مانگو۔ اسی طرح حصول رزق و حصول غنا و اداء دین وغیرہ کے لئے بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دعائیں تعلیم فرمائی ہیں۔ اور اگر احادیث میں غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی دنیوی راحت کو نہیں چھوڑا جس کے لئے کوئی دعا نہ بتلائی ہو اور کسی مصیبت کو نہیں چھوڑا جس سے پناہ مانگنے کا طریقہ نہ بتلایا ہو بلکہ راحت و مصیبت کے علاوہ بھی ہر حالت کے متعلق ایک نہ ایک دعا آپ نے مقرر فرمائی ہے مثلاً گھر میں آنا گھر سے باہر جانا سونا جاگنا اٹھنا بیٹھنا بیمار کی عیادت کرنا مسجد میں جانا وہاں سے نکلنا بازار میں جانا سفر شروع کرنا سفر میں کسی جگہ اترنا پھر وطن کو واپس آنا۔ بیت الخلاء میں جانا وہاں سے نکلنا، خوشی یا رنج کی بات دیکھنا،

چاند دیکھنا وغیرہ وغیرہ سب کے لئے احادیث میں الگ الگ دعائیں وارد ہیں۔ تو دنیا کے لئے دعا مانگنا بھی عبادت اور طاعت ہے بخلاف عملیات کے کہ وہ دین کے لئے ہوں تو طاعت ہیں ورنہ نہیں۔

اس سے آپ کو معلوم ہوا ہوگا کہ دعا زیادہ قابل توجہ ہے مگر اس وقت بالکل برعکس معاملہ ہو رہا ہے کہ وظیفہ کی قدر دعا سے زیادہ ہے بلکہ قرآن سے بھی زیادہ کہ قرآن پڑھتے ہوئے تو بات چیت کر لیتے ہیں مگر وظیفے میں بولنا حرام سمجھتے ہیں جیسے وہ عہدہ دار صاحب وظیفہ میں ہوں ہوں کیا کرتے اور اشاروں سے رشوت کی مقدار طے کیا کرتے تھے اور جب اشراق کی نماز کو کھڑے ہوتے تو اس سے پہلے کئی سو روپے مصلے کے نیچے آجاتے تھے۔ یہ قیمت تھی ان کی نماز کی آجکل تو اس کو ملنا کہتے ہیں اور اسی اصطلاح کے موافق وہ دوسرے عہدہ دار اپنی بیوی سے پوچھتے تھے کہ تجھے نماز پڑھنے سے کیا ملتا ہے تو چونکہ لوگ آجکل دینی ثمرات کو ثمرات ہی نہیں سمجھتے اس لئے ضرورت ہوتی ہے ان ثمرات کو تفصیل سے بیان کرنے کی چنانچہ میں نے اسی واسطے کل کے بیان میں ان کو ذرا تفصیل سے بیان کر دیا تھا ورنہ اصلی مقصود محتاج تفصیل نہ تھا اس کا حاصل تو صرف اتنا ہے کہ ہم دین کو اختیار کر کے خدا تعالیٰ کے محبوب ہو جاویں گے یہ اس آیت کا جزو تھا جس کو مقصود کہنا چاہیئے اور اس کا بیان کل ہو چکا اب اس کا ایک دوسرا جزو ہے یعنی طریق کی تفصیل اس کو آج بیان کیا جائے گا اور ممکن ہے کہ آج کا بیان کل کی برابر مفصل و مطول نہ ہو کیونکہ اس وقت کچھ طبیعت مضمحل ہے مگر ضروری اجزاء ان شاء اللہ تعالیٰ ضرور بیان ہو جاویں گے اور ایسی تفصیل ہو جائے گی جس سے کچھ بے خبری دور ہو جائے۔ یہ تو آپ کو معلوم ہو چکا کہ یہ آیت دو جزو پر مشتمل ہے۔ ایک مقصود۔ دوسرے طریق مقصود کا بیان وعظ سابق میں ہو چکا۔ اب سمجھئے کہ طریق مقصود کیا ہے۔ وہ دو چیزیں ہیں اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ (ایمان لائیں اور نیک کام کریں) کیونکہ حق تعالیٰ یہی تو فرماتے ہیں کہ

عہ دعاء ماثورہ مناجات مقبول کے ہمراہ ترجمہ کی صورت میں شائع ہوئی ہے۔ ۲۱

جو لوگ ایمان لائیں اور نیک کام کریں ان کے لئے حق تعالیٰ محبوبیت پیدا کر دیں گے جس میں محبوبیت کو ایمان و عمل صالح پر مرتب کیا گیا ہے تو مقصود اور نتیجہ تو وُدّ ہے اور ایمان و عمل صالح اس کے ترتب کی شرط ہے یہی حاصل ہے طریق ہونے کا اس۔ سے ایک بات تو یہ معلوم ہوئی کہ جو محبوب و مقبول بننا چاہے اس کو پہلے ایمان لانا اور عمل صالح اختیار کرنا چاہیئے اور یہاں سے یہ ثابت ہو گیا کہ جب ایمان و عمل صالح مقبولیت و نجات کا طریق ہے تو بدون اس کے تمام نسبتیں نجات کے لئے ناکافی ہیں مثلاً کسی بزرگ کی اولاد ہونا یا اپنے پاس کسی بزرگ کا تبرک ہونا یہ تنہا نجات کے لئے کافی نہیں۔

صاحبو! ہمیں بزرگوں کی تبرکات سے انکار نہیں مگر ان کی اصل اتنی ہے جیسے ایک مثال سے واضح ہوگا اور مجھے مثال دیتے ہوئے شرم بھی آتی ہے کہ ایک دینی مسئلہ کے لئے دنیا کی مثال دوں مگر کیا کیا جائے کہ آج کل لوگوں کے ذہن میں خدائی معاملات کی اتنی قدر نہیں جتنی دنیوی معاملات کی قدر ہے اس۔ لئے جب کسی خدائی معاملہ کو دنیوی معاملہ سے مطابق کر دیا جاتا ہے تو وہ جلدی لوگوں کے ذہن میں آجاتا ہے اس لئے میں شرماتا ہوا مثال دیتا ہوں کہ ان تبرکات کا اتنا اثر ہے جیسے دو شخصوں نے بی اے کا امتحان پاس کیا ہو اور نوکری کی درخواست دی ہو مگر ان میں ایک تو ایسا ہے جس کا خاندان خیر خواہ سرکار ہونے میں مشہور ہے اور دوسرا ایسا نہیں تو ان دونوں میں اول ملازمت سے وہ کامیاب ہوگا جس کا خاندان خیر خواہ سرکار ہے اور اگر دونوں ساتھ ہی ملازم ہو جائیں تو اس شخص کو بڑا عہدہ ملے گا اور دوسرے کو اس سے کم۔ غرض معزز خاندان والے کا ضرور لحاظ ہوتا ہے خواہ جلدی کامیاب ہونے میں یا بڑا عہدہ ملنے میں کیونکہ وہ ایسے خاندان کی طرف منسوب ہے جو خیر خواہ سرکار ہے لیکن اگر یہ نرا صاحب انتساب ہی ہو اور کوئی امتحان اس۔ نے پاس نہ کیا ہو بلکہ خود جاہل اور بد معاش ہو تو اس صورت میں اس کو

یہ کہنا کچھ مفید نہ ہوگا کہ پدر من سلطان بود (میرا باپ بادشاہ تھا) بلکہ اس کے جرائم پر دوسروں سے زیادہ قوی مقدمہ قائم ہوگا اور اس سے کہا جائے گا کہ افسوس تم باوجود حقوق سلطنت سے واقف ہونے کے سلطنت کی مخالفت کرتے ہو تم تو حکومت کے آشنا تھے تمہارے تو بچہ بچہ کی زبان پر حکومت کے حقوق واحسانات کا تذکرہ تھا تجھ پر کیا مار آئی جو مخالفت قانون پر پیشقدمی کرنے لگا تو عجب نہیں کہ اس شخص کے جرم پر ایسا سنگین مقدمہ قائم ہو جو ایک جلاہے دھوبی کے جرم پر نہ قائم ہوا اور یہ حکومت کی نظر میں زیادہ مبغوض وقابل نفرین قرار پائے۔ چنانچہ واقعات اس پر شاہد ہیں۔

اسی طرح بزرگوں کی طرف انتساب سے یہ نفع ضرور ہوتا ہے کہ یہ شخص اگر ایمان وعمل صالح اختیار کرے تو دوسروں سے جلدی کامیاب ہوتا یا بڑے درجہ میں پہنچ جاتا لیکن اگر یہ سرکشی سے پیش آوے تو اس وقت ترا انتساب کافی نہ ہوگا۔ اس وقت مجھے اپنے استاد علیہ الرحمۃ کا ایک ارشاد یاد آیا جو ایک حدیث کی شرح میں انھوں نے فرمایا تھا اول میں حدیث سنا دوں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ایک منافق تھا عبد اللہ بن ابی یہ رئیس المنافقین تھا مگر اس کے لڑکے صحابی اور مؤمن مخلص تھے۔ جب اس منافق کا انتقال ہوا تو اس کے لڑکے حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) میرے باپ کا انتقال ہوگیا ہے اس کے کفن کے لئے اپنا کرتہ عطا فرما دیجئے (شاید اس کی برکت سے خدا اس کی مغفرت فرما وے) حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا کرتہ دے دیا اور تجہیز وتکفین میں بھی شریک ہوئے حتیٰ کہ نماز جنازہ بھی پڑھانا چاہی اس وقت حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو جوش آگیا۔ انھوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی چادر مبارک پکڑ لی کہ آپ کس کی نماز پڑھانا چاہتے ہیں ایک منافق کی جن کے بارہ میں حق تعالیٰ فرماتے ہیں اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ اِنْ

تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ یعنی چاہے آپ منافقین کے لئے ستر مرتبہ بھی دعا و استغفار فرمائیں خدا تعالٰے ان کو نہ بخشیں گے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حق تعالٰے نے مجھ کو استغفار سے منع نہیں فرمایا اور اگر مجھے معلوم ہو جائے کہ ستر دفعہ سے زیادہ استغفار کرنے سے ان کی مغفرت ہو جائے گی تو میں زیادہ استغفار کر لوں گا۔ یہ سن کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ خاموش ہو گئے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جنازہ کی نماز پڑھا دی۔ واقعی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بھی کیا عجیب شفقت ورحمت تھی کہ دشمنوں سے بھی رحمت میں آپ کو دریغ نہ تھا۔

صاحبو! ہم بڑے خوش قسمت ہیں کہ ہم کو ایسے رحیم وکریم پیغمبر (صلی اللہ علی سیدی وروحی وسلم) نصیب ہوئے ہمیں تو آپ سے بہت کچھ امیدیں ہیں ؎

نماند بعصیاں کسے در گرو
کہ دارد چنیں سید پیشرو

(وہ شخص دوزخ میں گناہوں کی وجہ سے نہیں رہے گا جو ایسا سردار پیشرو رکھتا ہو)

جب دشمنوں پر بھی آپ کی یہ رحمت ہے تو اپنے غلاموں پر تو کیا کچھ ہو گی۔ غرض آپ نماز پڑھ چکے اور دفن میں بھی شریک ہوئے اور اس منافق کے قبر میں رکھے جانے کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا لعاب مبارک بھی اس کے منہ میں ڈال دیا اس کے بعد آیت نازل ہوئی وَلَا تُصَلِّ عَلٰٓى اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا وَّلَا تَقُمْ عَلٰى قَبْرِهٖ ؕ اِنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَمَاتُوْا وَهُمْ فٰسِقُوْنَ۔ (اور ان میں کوئی مر جائے تو اس پر کبھی نماز نہ پڑھئے اور نہ اس کی قبر پر کھڑے ہوجئے انھوں نے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کفر کیا ہے اور وہ حالت کفر ہی میں مرے ہیں) جس میں منافقین پر نماز جنازہ پڑھنے اور ان کے دفن وغیرہ میں شرکت کرنے کی

صاف صاف ممانعت ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مجھے بعد میں بڑی ندامت و شرمندگی ہوئی کہ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کیسی جرأت کی آپ کو ایک کام سے روکنے لگا (میرا کیا منصب تھا حضور صلی اللہ علیہ وسلم تو سب سے زیادہ ہر ایک بات کو جاننے والے ہیں ۱۲)

خیر یہ تو واقعہ تھا اس میں بہت گفتگو اور کلام ہے کہ آپ نے باوجود لَنْ یَّغْفِرَ اللّٰہُ لَھُمْ (ہرگز نہ بخشے گا اللہ ان کو) وارد ہو چکنے کے پھر اس منافق کی نماز کیوں پڑھی مگر یہ تو طالب علمانہ مباحث ہیں طالب علم ان کو خود حل کر لیں گے۔ مگر اس میں اس بات کا بتلانا مقصود ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس منافق کو اپنا کرتہ کیوں پہنایا اور اس کے منہ میں لعاب دہن مبارک کیوں ڈالا۔

شراح حدیث نے تو یہ لکھا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے بیٹے کی خاطر سے جو مخلص مومن تھے یہ سب کچھ کیا (تاکہ ان کو معلوم ہو جائے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اس کی نجات کی سعی میں کوئی کوتاہی نہیں رہی آپ نے دعا بھی کر دی نماز بھی پڑھ دی اپنے تبرکات بھی عطا فرما دیئے اب بھی اگر اس کی مغفرت نہ ہو تو یہ خود اسی کا قصور ہے ۱۲) اور بعض نے کہا ہے کہ اس منافق نے جنگ بدر کے موقعہ پر حضرت عباس رضی اللہ عنہ (عم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) کو ایک کرتہ پہنایا تھا آپ نے اس کی مکافات میں مرنے کے بعد اُسے کرتہ پہنا دیا (بلکہ مع شئے زائد) یہ سب توجیہات شراح نے کی ہیں مگر ان باتوں سے ہم کو شفا نہیں ہوئی ہمیں تو اپنے استاد علیہ الرحمۃ کی بات پسند آئی کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے اس منافق کے ساتھ یہ معاملہ اس لئے فرمایا تاکہ امت کو یہ ضروری مسئلہ بتلا دیں کہ اگر کسی میں ایمان نہ ہو تو پھر چاہے اس کے پاس لاکھ تبرکات ہوں اور چاہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جیسا شخص اس کے جنازہ کی نماز بھی پڑھ دے اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا قمیص

اس کا کفن ہو جائے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا لعاب مبارک بھی اس کے منہ میں پڑ جائے جب بھی نجات نہیں ہو سکتی اس لئے تنہا ان تبرکات کے بھروسہ پر کوئی نہ رہے چنانچہ عبد اللہ بن ابی کے پاس اصل سرمایہ ایمان کا نہ تھا اس لئے اس کے بارہ میں کہا گیا اِنَّ الْمُنَافِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ کہ منافقین جہنم کے سب سے نیچے کے طبقہ میں ہیں جس کو عذاب سب سے زیادہ سخت ہے ۱۲) تو اب معلوم ہو گیا کہ بعض لوگوں کا یہ کہنا کہ ہم فلاں بزرگ کی اولاد یا سلسلہ میں ہیں اور ہمارے بزرگوں نے اللہ تعالیٰ سے یہ عہد کر لیا تھا کہ ہماری اولاد میں سے یا اتباع میں سے کوئی دوزخ میں نہ جائے کیا کارآمد ہو سکتا ہے جب تک اپنے پاس کچھ سرمایہ نہ ہو۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر جب یہ آیت نازل ہوئی وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ (اپنے قریبی رشتہ داروں کو (آتش دوزخ سے) ڈرائیے) تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے سب خاندان کو جمع کیا اور سب کے ساتھ صاحبزادی صاحبہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو خطاب کر کے فرمایا يَا فَاطِمَةُ بِنْتُ مُحَمَّدٍ اِنْقِذِيْ نَفْسَكِ مِنَ النَّارِ لَا اُغْنِيْ عَنْكِ مِنَ اللّٰهِ شَيْئًا اے فاطمہ بنت محمد صلی اللہ علیہ وسلم رہا کر اپنے نفس کو آتش (دوزخ) سے میں تجھ سے کسی چیز کو اللہ تعالیٰ سے بے پرواہ نہیں کر سکتا) اور اپنی پھوپھی صاحبہ کو خطاب کر کے فرمایا يَا صَفِيَّةُ عَمَّةَ رَسُوْلِ اللّٰهِ اِنْقِذِيْ نَفْسَكِ مِنَ النَّارِ لَا اُغْنِيْ عَنْكِ مِنَ اللّٰهِ شَيْئًا۔ (اے صفیہ عمہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے نفس کو (اعمال صالحہ کر کے) دوزخ سے بچا میں کسی چیز سے تجھ کو اللہ سے بے پرواہ نہیں کر سکتا) اسی طرح سب اعزہ سے فرمایا کہ اپنے آپ کو جہنم سے بچا لو میں تمہارے کام نہ آسکوں گا یعنی اگر نرے میرے بھروسہ پر رہو گے تو اس صورت میں میں کچھ کام نہ آؤں گا ہاں خود بھی کچھ سرمایہ جمع کر لو تو بیشک آپ کام آئیں گے۔ بس یہ درجہ ہے انتساب اور تبرکات کا کہ وہ بدون اپنے عمل کے تنہا کافی نہیں ہوتے باقی اپنے پاس بھی کچھ عمل ہو تو پھر وہ ضرور

نافع ہیں ان کی برکت کا انکار نہیں ہو سکتا اگر تبرکات نافع نہ ہوتے تو سلف صالحین اس کا اہتمام نہ کرتے حالانکہ سلف سے اس کا اہتمام منقول ہے خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تبرکات دیئے ہیں ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا چادرہ مبارک ایک صحابی کو عطا فرمایا اور حج کے موقع پر اپنے بال تقسیم فرمائے۔ اور بعض واقعات سے ثابت ہوتا ہے کہ تبرکات واقعی کام بھی آتے ہیں مگر نرے تبرکات کام نہیں آتے بلکہ اصل سرمایہ کے ساتھ یہ بھی مل جائیں تو نفع بڑھ جاتا ہے۔ اس کی تو ایسی مثال ہے جیسے کھانے کے ساتھ چٹنی اور مربہ کہ اس سے کھانے کا لطف بڑھ جاتا ہے اب اگر کوئی شخص دوستوں کی دعوت کرے اور سارا دستر خوان چٹنی اور مربوں ہی سے بھر دے تو کیا یہ دعوت ہوگی یہ تو مسخرا پن ہوگا۔ اسی طرح جو چیزیں زوائد میں سے ہیں وہ سب ایسی ہی ہیں کہ ان پر حصول مقصود موقوف نہیں ہوتا اور وہ تنہا مقصود سے مغنی نہیں ہوتیں ہاں ضروریات کے ساتھ جمع ہو جائیں تو مفید ہوتی ہیں۔ دیکھو اگر دستر خوان پر چٹنی مربے نہ ہوں تو وہ دعوت ضرور ہے اور اگر چٹنی مربا ہی ہو کھانا نہ ہو تو اسے دعوت نہیں کہہ سکتے اور دونوں جمع ہو جائیں تو اعلیٰ درجہ کی اور لذیذ دعوت ہوگی۔

اسی طرح تبرکات نافع ضرور ہیں مگر ان کی نافعیت کے لئے کچھ شرطیں ہیں (یعنی ایمان و عمل صالح) جیسے گورنمنٹ اپنے وفاداروں کی رعایت کرتی ہے بشرطیکہ وہ بغاوت و اقدام جرائم نہ کریں بلکہ تعلیم و تہذیب سے آراستہ ہو کر گورنمنٹ کی اطاعت بھی کریں تو ان کا خیال دوسروں سے زیادہ کیا جاتا ہے اسی لئے سلف نے بزرگوں کی نیک اولاد کا ہمیشہ احترام کیا ہے اور واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بزرگ بھی اپنی اولاد کا خیال رکھتے ہیں۔

میری ایک رشتہ کی پھوپی تھیں جو بچیوں کو پڑھایا کرتی تھیں، ہمارے یہاں رسم یہ ہے کہ لڑکیاں گھروں ہی میں تعلیم پاتی ہیں ان کے لئے کوئی زنانہ اسکول

نہیں اور نہ یہ مناسب ہے (اس میں بہت مفاسد ہیں جن کا تجربہ رات دن ہوتا جاتا ہے ۱۲) تو اسی طرح میری پھوپی صاحبہ اپنے گھر پر لڑکیوں کو پڑھاتی تھیں اور کسی سے معاوضہ وغیرہ کچھ نہ لیتی تھیں ایک مرتبہ ان کے یہاں ایک سید کی لڑکی پڑھنے آئی وہ فرماتی تھیں کہ اسی روز رات کو میں نے حضرت فاطمہ زہرہ رضی اللہ عنہا کو خواب میں دیکھا فرماتی تھیں کہ عمدۃ النساء دیکھو ذرا میری بچی کو محبت سے پڑھانا۔ اسی طرح اور بہت سی بشارتیں اور منامات ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ اہل اللہ کو اپنی اولاد کا خیال رہتا ہے اور آخرت میں اس نسبت سے یہ نفع ہوگا کہ حق تعالیٰ بزرگوں کی اولاد کو انہی بزرگوں کے درجوں میں پہنچادیں گے چنانچہ ارشاد ہے وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِاِيْمَانٍ اَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَمَآ اَلَتْنٰهُمْ مِّنْ عَمَلِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ اس میں افراط وتفریط دونوں کا علاج کر دیا گیا فرماتے ہیں کہ جو لوگ ایمان لائے اور ان کی اولاد ایمان لائے اور ان کی اولاد ایمان کے ساتھ ان کی پیروی کرتے رہیں یعنی گو فروشریر نہ ہوں تو ہم ان کو بھی اون ہی کے ساتھ ملادیں گے یعنی گو عمل میں دونوں برابر نہ ہوں مگر پھر بھی سب کو برابر کر دیا جائیگا جیسے کوئی بادشاہ کہیں مہمان بن کر جائے اور اس کا بیٹا بھی اس کی ہمراہ ہو تو وہ بھی اسی جگہ ٹھہرے گا جہاں بادشاہ ٹھہرے گا اب یہاں کسی کو شبہ ہو سکتا تھا کہ شاید اس برابری کی صورت یہ ہو کہ اوپر کے درجہ والوں کو نیچے کر دیا جائے یا کچھ ان کو گھٹایا جائے اور کچھ ان کو بڑھایا جائے اور اوسط پورا کر کے درمیانی درجہ دے دیا جائے تو اس کا جواب دیتے ہیں وَمَآ اَلَتْنٰهُمْ مِّنْ عَمَلِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ کہ ہم بلند درجہ والوں کے اعمال میں سے کچھ بھی کم نہ کریں گے بس معلوم ہو گیا کہ برابری کی صورت یہ ہو گی کہ ناقص الاعمال کو کامل الاعمال کے درجہ میں بھیج دیا جائے گا کاملین کے درجات میں کمی نہ کی جائے گی اب اس کو سن کر شاید کسی کو ہوس ہوتی کہ پھر ہم کو عمل کی کیا ضرورت ہے تو آگے ایسا فیصلہ

فرمایا ہے جس سے اس خیال کا استیصال ہو گیا۔ فرماتے ہیں کُلُّ امْرِئٍ بِمَا کَسَبَ رَهِينٌ کہ ہر شخص اپنے کئے ہوئے (اعمال) کے ساتھ مقید ہوگا معلوم ہوا کہ عمل کی پھر بھی ضرورت ہے بدون عمل کے یہ دولت نصیب نہیں ہو سکتی۔ یہاں سے یہ مسئلہ حل ہو گیا کہ شرف نسب نافع ہے یا نہیں اس وقت اس بارے میں غلو ہو رہا ہے۔ بعض تو اسی کو اصل قرار دیتے ہیں اور بعض اس کو مٹاتے ہیں کہ یہ کوئی چیز نہیں اور دیکھا یہ گیا ہے کہ جو لوگ ذی نسب نہیں ہیں وہی زیادہ تر اس کو مٹاتے ہیں اور دونوں کا منشا تکبر ہے جو لوگ نسبت تو اصل قرار دیتے ہیں وہ بھی بڑا بننا چاہتے ہیں کہ ہمارے پاس اتنی بڑی چیز ہے ہم کو بڑا سمجھو اور جو اس کو مٹاتے ہیں وہ بھی بڑا بننا چاہتے ہیں کہ ہم شرفا سے کسی بات میں کم نہیں ہیں کیونکہ شرافت نسب کوئی چیز نہیں۔ بعض نے تو یہ کیا کہ نسبت ہی کا استیصال کر دیا اور بعض نے یہ کیا کہ اپنے کو کھینچ تان کر شرفا میں داخل کر دیا۔ میں ایک مقام پر گیا وہاں کی چھوٹی قوموں نے اپنی چار قسمیں کر لیں۔ شیخ، سید، مغل، پٹھان اور اپنے محلہ کا نام بھی بدل دیا۔ میں اس جگہ کا نام نہیں لینا چاہتا جب میں وہاں گیا تو مجھ سے بیان کی درخواست کی گئی تو اتفاقاً میں نے نسب ہی کا بیان کیا (حالانکہ مجھے اس واقعہ کی اطلاع نہ تھی نہ کسی نے مجھ سے کچھ کہا تھا ۱۲) تو وہ لوگ بہت ناراض ہوئے جنھوں نے اپنے کو شرفا میں داخل کیا تھا اور کہنے لگے کہ بھلا یہی مضمون بیان کے لئے رہ گیا تھا۔

وہ یہ سمجھے کہ وہاں کے شیخ زادوں نے یہ مضمون فرمائش کر کے بیان کرایا ہے۔ اس لئے وہ شیخ زادوں سے بھی بہت خفا ہوئے (حالانکہ میری یہ بالکل عادت نہیں کہ فرمائشی مضمون بیان کروں بس وقت پر جو بات دل میں آجاتی ہے بیان کر دیتا ہوں ۱۲) غرض نسبت کے بارہ میں یہ غلو ہو رہا ہے اور منشا اس کا محض تکبر ہے جنھیں قدرت ہوتی ہے ان کا تکبر زیادہ ظاہر ہوتا ہے اور جن کو قدرت نہیں ان کے بھی برتاؤ سے

پتہ چل جاتا ہے کہ یہ اپنے کو بڑا بنانا چاہتے ہیں۔ چنانچہ میں ایک قصبہ میں جس کا نام کاندھلہ ہے گیا ہوا تھا وہاں ایک نائی نے مجھ سے مسئلہ پوچھا کہ جو شخص السلام علیکم کہنے سے چڑھے وہ کیسا ہے۔ یہ سوال اس نے بھرے مجمع میں کیا تھا جہاں وہ رؤسا بھی موجود تھے جو اس شخص کے زعم میں السلام علیکم سے چڑتے تھے وہ بڑے متفکر ہوئے کہ دیکھئے کیا فتوٰے لگتا ہے۔ میں نے کہا کہ جو السلام علیکم سے چڑے وہ بہت برا اور جو السلام علیکم مساوات اور برابری جتلانے کے لئے تان کر اور لٹھ سا مار دے وہ اس سے بھی برا چھوٹا آدمی بڑوں کو سلام کرے تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ چھوٹا بن کر نرمی سے السلام علیکم کہے لٹھ سا نہ مارے بس اس طرح کہے جیسے بیٹا باپ کو السلام علیکم کہا کرتا ہے اس سے نہ کوئی چڑے گا نہ کسی کو ناگواری ہوگی۔ پس کہو السلام علیکم ہی مگر اس طرح کہو۔

جب سائل چلا گیا تو سارے رؤسا ہنسنے لگے اور کہا کہ صاحب تم نے اس مرض کو سمجھا واقعی یہ جب سلام کرتا ہے لٹھ سا مارتا ہے جیسے کوئی برابری جتلاتا ہو۔ اسی سے ہم کو ناگواری ہوتی ہے ورنہ آدمیت سے سلام کرے تو کون چڑتا ہے۔ غرض شرفاء کو تو متکبر کہا ہی جاتا ہے مگر یہ غریب بھی کچھ کم نہیں ہوتے۔ ا

ایک قصہ اس کے مقابل مجھ کو یاد آگیا کہ ایک نائی کسی کا خط لیکر ایک قصبہ میں گیا وہاں جا کر اس نے السلام علیکم کہا تو شہزادوں نے اسے خوب پیٹا اس نے پوچھا کہ حضور پھر کیا کہوں لوگوں نے کہا کہ حضرت سلامت کہا کرو۔ اس کے بعد نماز جمعہ کا وقت آیا تو جب امام نے السلام علیکم ورحمۃ اللہ کہا تو اس نائی نے پکار کر کہا حضرت سلامت ورحمۃ اللہ حضرت سلامت ورحمۃ اللہ۔ امام نے اسے بلا کر پوچھا کہ یہ کیا حرکت ہے۔ اس نے کہا کہ حضرت میرا قصہ سن لیجئے بات یہ ہے کہ میں نے یہاں کے رئیسوں کو السلام علیکم کہہ کر سلام کیا

تھا تو انھوں نے مجھے بہت مارا اور یہ کہا کہ حضرت سلامت کہنا چاہیئے مجھے ڈر ہوا کہ اگر کہیں فرشتے بھی السلام علیکم سے خفا ہوگئے تو ان میں ایک فرشتہ ملک الموت بھی ہے وہ تو میری جان ہی نکال لیں گے اس لئے میں نے نماز میں بھی حضرت سلامت ہی کہا اس پر امام صاحب نے وعظ میں ان رئیسوں کی خبر لی کہ یہ کیا واہیات ہے تم لوگوں کو طریق سنت سے منع کرتے ہو سو کچھ لوگ ایسے بھی ہیں۔

ایک اور قصہ یاد آیا' کانپور میں ایک دفعہ میرے پاس دیہات کے ایک قاضی صاحب تشریف لائے اور السلام علیکم کہہ کر بیٹھ گئے تھوڑی دیر میں کہنے لگے کہ کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں میں نے کہا کہ فرمایئے کہنے لگے کہ اس عملداری میں شرفا اور غربا میں بالکل مساوات ہوگئی۔ البتہ صرف ایک فرق السلام علیکم کا رہ گیا تھا ہمارے مولویوں نے یہ بھی اٹھا دیا سب کے لئے وہی السلام علیکم۔ میں نے کہا قاضی صاحب شرفا اور غربا میں جو فرق ہے تو یہ دینی امور میں ہے یا دنیوی امور میں۔ اگر دینی امور میں بھی ہے تو جا کر اپنے شہر میں غربا سے کہہ دیجئے کہ ظہر و عصر و عشا کی تین رکعت پڑھا کرو (اور مغرب کی دو اور صبح کی ایک) اور اگر وہ نہ مانیں تو تم چار کی پانچ اور تین کی چار اور دو کی تین پڑھا کرو تاکہ برابری نہ ہو جاوے وہ بہت ہی چپ ہوئے پھر میں نے کہا کہ اب بتلایئے کہ السلام علیکم دین کا کام ہے یا دنیا کا ظاہر ہے کہ دین کا کام ہے پھر اس میں امیر و غریب کا فرق کیوں ہو باقی دنیوی امور میں فرق کرنے سے ہم منع نہیں کرتے یہی فرق بہت ہے کہ تم سرہانے بیٹھتے ہو اور غربا پائینتی پر بیٹھتے ہیں (اگر کوئی غریب آدمی امیر کی برابر سرہانے پر چڑھ کر بیٹھے گا تو ہم اس کو ضرور منع کریں گے ۱۲) غرض نسبت کے باب میں جانبین سے یہ غلو ہو رہا ہے کہ بعض نے اسی کو اصل قرار دے لیا ہے اور بعض کہتے ہیں کہ یہ بالکل کوئی چیز نہیں اس لئے میں اس کا فیصلہ کرتا ہوں جو اسی آیت کے مضمون سے اور اسی مقام سے مستنبط ہوتا ہے۔ میں پوچھتا ہوں کہ اس وقت جو لوگ شریف ہیں

اور اپنے کو صدیقی یا فاروقی یا سید کہتے ہیں تو وہ بتلائیں کہ ان کے اسلاف میں شرف کہاں سے آیا ظاہر ہے کہ یہ حضرات منتسب الیہم چونکہ دین میں کامل تھے اس لئے ان کی طرف انتساب سبب شرف ہو گیا تو اصل وجہ شرف دین وایمان ٹھہرا یہی سبب ہے ہمارے اسلاف کے شرف کا اور اسی وجہ سے ان کی طرف انتساب بھی سبب شرف ہو گیا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ اس کے ساتھ وہ حضرات عالی خاندان بھی تھے مگر تنہا یہی سبب شرف نہیں (کیونکہ عالی خاندان تو ابوجہل وابولھب بھی تھے مگر ان کی طرف انتساب کسی کو بھی گوارا نہیں ۱۲) بلکہ اس کے ساتھ چونکہ ان حضرات کا کمال دین بھی مل گیا ہے اس لئے انتساب میں شرف آ گیا تو یہ بالکل بے اصل چیز نہیں ہے بلکہ شریعت نے اس شرف کا اعتبار کیا ہے دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ چنانچہ دنیا میں تو اس طرح اعتبار کیا گیا ہے کہ حدیث میں حکم ہے کہ نکاح اکفاء میں کیا کرو اور شریعت نے کسی شریف زادی کا کفو غیر شریف کو نہیں مانا اور آخرت میں بھی اتنا نفع ہے کہ جو شخص ان شرفاء کی اولاد میں ہوگا وہ اگر ایمان وعمل صالح کو اختیار کرے تو اس کو دوسروں سے کچھ زیادہ ملے گا اور جنت میں وہ اپنے اسلاف کے درجہ میں ہوگا گو اعمال اس درجہ کے نہ ہوں لیکن یہ نفع کچھ عرفی شرفاء ہی کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ اگر کوئی جلاہا بھی ولی ہو تو اس کے بیٹے کو بھی وہی نفع حاصل ہوگا جو ان شرفاء کے بیٹوں کو ہوگا غرض شرافت میں آخرت کا بھی نفع ہے مگر وہ اصطلاحی شریف کے ساتھ خاص نہیں بلکہ جو بھی مقبول عنداللہ ہوگا اس کی طرف انتساب نافع ہوگا پس یہ کہنا غلط ہے کہ شرف نسب نافع نہیں نافع ضرور ہے مگر وہ شرف انتسابی کے ساتھ خاص نہیں بلکہ جو شریف عنداللہ ہو اس کی طرف انتساب نافع ہے خواہ وہ تمہاری اصطلاح کے موافق شریف ہوں یا نہ ہوں پس آخرت میں تو شریف اور غیر شریف میں اس طرح تفاوت ہوگا باقی دنیا میں تو تفاوت ہے ہی کہ غیر شریف کو شریف زادی کا کفو نہیں مانا گیا۔

(باقی ان شاء اللہ آئندہ)

دنیز عقل وفہم تہذیب واخلاق وغیرہ میں بھی شریف وغیر شریف کا تفاوت ظاہر ہو جاتا ہے ۱۲) مگر اس کا یہ اثر نہ ہونا چاہئے کہ تم دوسروں کو ذلیل سمجھو بس ایسا تفاوت سمجھنا چاہئے جیسے چھوٹے بھائی اور بڑے بھائی یا باپ اور بیٹے میں اور حاکم و محکوم میں ہوا کرتا ہے اس تفاوت کا یہ اثر نہیں ہوا کرتا کہ بڑا بھائی چھوٹے کو یا باپ بیٹے کو حقیر سمجھنے لگے یہ فیصلہ ہوا اس اختلاف کا یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ اصل میں میں یہ ذکر کر رہا تھا کہ نرا انتساب کافی نہیں بلکہ اس کے ساتھ ایمان وعمل صالح بھی ضروری ہے چنانچہ اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِاِيْمَانٍ (جو لوگ ایمان لائے اور ان کی ذریت (اولاد) نے ایمان میں ان کا اتباع کیا) سے یہ مضمون صاف طور سے نکل آیا۔ پس اب کسی کو اس پر قناعت نہ کرنا چاہئے کہ ہم بزرگوں کی اولاد یا سلسلہ میں ہیں یا ہمارے پاس ان کے تبرکات ہیں بلکہ ایمان وعمل کا اہتمام کرنا چاہئے اس کے ساتھ اس انتساب کی برکت بھی کام دے گی ورنہ بیکار ہے یہی مضمون اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا (جو لوگ ایمان لائیں اور نیک کام کریں اللہ تعالٰے ان کے لئے محبوبیت پیدا کر دیں گے) اسے بھی مستفاد ہوتا ہے کیونکہ اس میں مقبولیت کا مدار ایمان وعمل صالح ہی کو ٹھہرایا گیا ہے معلوم ہوا کہ ان کے سوا اور کوئی شئے مدار کار نہیں بلکہ زوائد کی قبیل سے ہیں۔ بہرحال مقصود مقام یہ ہے کہ اس آیت کے اول جز میں طریق حصول مقصود مذکور ہے اور اس کی فہرست بتلائی گئی ہے جس کے دو جزو ہیں ایک ایمان ایک عمل صالح اور اس وقت میں اسی طریق کی تفصیل کرنا چاہتا ہوں سو ایمان کی تفصیل کے لئے تو باب العقائد دیکھنے کی ضرورت ہے اگر میں تمام عقائد کی تفصیل کروں تو اس کے لئے ایک جلسہ ناکافی ہے اس لئے میں اس وقت پوری تفصیل تو ذکر کرنا نہیں چاہتا صرف اقسام اولیہ ذکر کرنا چاہتا ہوں جن میں

آجکل لوگوں نے غلطی کر رکھی ہے تو سمجھئے کہ آجکل لوگوں کو عقائد کے باب میں دو قسم کی غلطیاں واقع ہو رہی ہیں۔ ایک تو وہ لوگ ہیں جو عقائد کو ضروری سمجھتے ہیں مگر ضرورت کو اسی میں منحصر کرتے ہیں یعنی اعمال کی ضرورت نہیں سمجھتے چنانچہ عام طور سے یہ عقیدہ ہے کہ مَنْ قَالَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ دَخَلَ الْجَنَّةَ (جس شخص نے لا الہ الا اللہ کہا جنت میں داخل ہوا) کہ جو توحید و رسالت کا قائل ہو اور لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ کا معتقد ہو بس وہ جنتی ہے اب اسے کسی عمل کی ضرورت نہیں پھر بعض نے اور انتخاب کیا کہ ایمان کا بھی اختصار کر لیا کیونکہ ایمان کی حقیقت تو یہ ہے اَلتَّصْدِیْقُ بِمَا جَاءَ بِهِ النَّبِیُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ (ان تمام چیزوں کی تصدیق کرنا جن کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم لائے ہیں) یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو جو خبریں دی ہیں کہ اللہ واحد ہے، قیامت آنے والی ہے، وزن حق ہے، حساب کتاب حق ہے، دوزخ جنت حق ہے، تقدیر کا مسئلہ حق ہے، فرشتوں کا وجود حق ہے، پلصراط پر چلنا حق ہے، نماز کی فرضیت حق ہے، زکوٰۃ اور روزہ و حج سب کی فرضیت حق ہے کیونکہ یہ طاعات گو اعمال ہیں مگر ان کی فرضیت کا اقرار کرنا ایمان میں داخل ہے۔ یعنی ایک تو نماز کا پڑھنا ہے اور روزہ رکھنا زکوٰۃ دینا، حج کرنا یہ تو عمل ہے اور ایک ان کی فرضیت کا اعتقاد رکھنا ہے یہ ایمان کا جزو ہے بدون اس اعتقاد فرضیت کے ایمان کا تحقق نہیں ہو سکتا تو ایمان نام تھا ان سب چیزوں کی تصدیق کا مگر آجکل لوگوں نے اس میں بھی انتخاب کر لیا ہے۔ بعضے وزن اعمال کی تصدیق کو ضروری نہیں سمجھتے بعضے صراط کی تصدیق کو ایمان میں داخل نہیں سمجھتے کوئی تقدیر کے مسئلہ کا انکار کرتا ہے وعلیٰ ہذا اور پھر بھی وہ اپنے کو مسلمان سمجھتے ہیں تھوڑے دنوں پہلے یہ حالت تھی کہ ان عقائد میں کسی کو اختلاف نہ تھا گو فروع میں اختلاف تھا کیونکہ اختلاف کی دو قسمیں ہیں ایک تو ایسے امور میں اختلاف جن میں اختلاف کی گنجائش ہے یہ تو فروع ظنیہ میں ہوتا ہے جیسا کہ مجتہدین میں اختلاف ہوا ہے

یا ان کے بعد ان کے اتباع میں ہوا ہے یہ تو سب اعمال کے درجہ میں اختلاف ہے عقائد میں کسی کو اختلاف نہ تھا اور عقائد میں بھی کسی نے اختلاف کیا ہے تو وہ عقائد مہمہ مقصودہ میں نہ تھا بلکہ عقائد مہمہ کی فروع میں تھا مگر کچھ دنوں سے ایک ایسا اختلاف پیدا ہوا ہے جس کے ذکر کرنے کو بھی جی نہیں چاہتا یعنی اب ان امور میں بھی اختلاف ہونے لگا ہے جن میں کچھ دن پہلے کسی کو شبہ بھی نہ تھا مگر اس وقت اس نئی تعلیم کی بدولت بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ علم دین نہ ہونے یا دین سے محبت اور علمار کی صحبت نہ ہونے کی بدولت عقائد مہمہ میں بھی اختلاف ہونے لگا ہے۔ ہمارے بزرگوں میں گو علم دین تو عام طور پر کامل نہ ہوتا تھا عالم دو چار دس پانچ ہی ہوتے تھے مگر یہ دو چیزیں ان کے پاس بڑی کام کی تھیں یعنی دین کی محبت اور علمار کی صحبت مگر اس وقت ہمارے بھائیوں نے علم دین کو تو چھوڑا ہی تھا ساتھ میں ان دونوں کو بھی چھوڑ دیا اور یہی وجہ ہے ہماری خرابیوں کی کیونکہ جو شخص طبیب کے پاس نہ جائے گا اس کو صحت نہیں ہو سکتی اور طبیب کے پاس وہ جائے گا جس کو صحت مطلوب ہو۔ تو آجکل ہمارے بھائیوں کو دراصل دین ہی سے محبت نہیں اسی لئے اطبار دین کے پاس بھی نہیں جاتے اسی لئے ان کے ایمان و دین کو قسم قسم کے روگ لگ جاتے ہیں جن کی ان کو خبر بھی نہیں ہوتی اور سب سے بڑی بیماری یہ ہے کہ بیمار کو بیماری کی اطلاع بھی نہ ہو اور اس سے سخت یہ ہے کہ وہ تندرستوں کو بیمار سمجھنے لگے جیسے ایک نکٹا ناک والوں کو ناکو کہتا تھا یہی حالت ہمارے بھائیوں کی ہے کہ وہ پرانے لوگوں کو جو ایمان میں کامل ہیں تندرست تو کیا سمجھتے ان کے لئے ایسے ایسے لقب تجویز کرتے ہیں کہ وہ اپنے جواب ہی کی فکر میں پڑ جاویں عجیب الٹا زمانہ آگیا ہے۔

صاحبو! پرانے لوگوں میں بھی گنہگار تو ہیں فاسق بھی ہیں مگر ان کی حالت یہ ہے کہ اہل علم کے سامنے جھک جاتے ہیں اگر ان کو عذاب آخرت سے ڈرایا جائے تو ڈر جاتے ہیں وہ اپنے کو اہل الرائے نہیں سمجھتے اسی لئے ان کا

ایمان سلامت ہے۔ باقی جہاں نئی تعلیم ہے اور نری تعلیم ہی تعلیم ہے وہاں تو ایمان کی خیر صلّا ہے نہ ان میں دین کی محبت ہے نہ اہلِ دین کی عظمت ہے۔ ہر شخص اپنے کو صاحب رائے سمجھتا ہے اور علماء سے مسائل دینیہ میں مزاحمت کرتا ہے باقی جہاں نئی تعلیم کے ساتھ یہ دونوں دولتیں بھی ہوں یعنی دین کی محبت اور اہل اللہ کی صحبت تو وہاں اس سے دین کا کچھ ضرر نہیں ہوتا بلکہ وہاں دنیا کے ساتھ دین بھی جمع ہوتا ہے اسی محبت و علم دین کی نسبت کہتے ہیں۔

؎ دریں زمانہ رفیقے کہ خالی از خلل است
صراحی مے ناب و سفینۂ غزل ست

(اس زمانہ میں جو رفیق خلل سے خالی ہے وہ محبت الٰہی اور علم دین ہے)

صراحی مے ناب سے محبت مراد ہے یہ ان کی خاص اصطلاح ہے اور سفینۂ غزل سے علمِ دین مراد ہے جس کا ایک طریق تو تعلیم ہے اگر یہ میسر نہ ہو تو صحبت اہل اللہ ہے اگر یہ بھی نہ ہو تو دین کی کتابوں کا مطالعہ ہے مگر کتاب کے لئے بھی صحبت کی ضرورت ہے نری کتب بینی سے دین کا صحیح علم حاصل نہیں ہو سکتا جب تک کسی عالم سے سبقاً سبقاً نہ پڑھا جاوے خواہ وہ کتاب اردو زبان ہی میں کیوں نہ ہو جیسے اردو میں طب کی کتابیں دیکھ کر کوئی شخص طبیب نہیں بن سکتا جب تک کسی طبیب کے پاس رہ کر نہ پڑھے پھر اس زمانہ میں تو لوگ کتابیں بھی ایسی مختلف دیکھتے ہیں کہ خدا کی پناہ بس جو کتاب سامنے آئی دیکھنے لگے چاہے اس کا مصنف محقق ہو یا غیر محقق پھر مختلف لوگوں کی کتابیں دیکھ کر خود ہی فیصلہ بھی کرتے ہیں کہ فلاں شخص نے اس مسئلہ کو دوسرے سے اچھا لکھا ہے اور غضب یہ کہ اپنے فیصلہ کو معتبر بھی سمجھتے ہیں بھلا اگر کوئی ایسا شخص جو قانون گورنمنٹ سے ناواقف ہو کر کسی مقدمہ کا فیصلہ کرنے لگے تو کیا اس کا فیصلہ معتبر ہوگا؟ ہرگز نہیں پھر حیرت ہے کہ جو شخص خدا کے قانون سے ناواقف ہے اس کے فیصلہ کو معتبر مانا جاوے اگر ایسا ہے تو پھر وکلاء اور بیرسٹوں کی کیا حاجت ہے بس ہر شخص کو قانون کو

دیکھ کر فیصلہ کرلیا کرے مگر یہاں سب اس پر متفق ہیں کہ قانون سلطنت کا سمجھنا ہر اک کا کام نہیں بلکہ جس نے اس کو باقاعدہ پڑھا ہو اور اس میں امتحان دے کر پاس ہو گیا ہو اسی کی رائے معتبر ہے مگر حیرت ہے کہ قانون الٰہی کے سمجھنے کے لئے کسی امتحان اور پاس کی ضرورت نہیں بلکہ ہر شخص اس میں رائے زنی کرنے کے لئے تیار رہے اور دو چار اردو کی کتابیں دیکھ کر فیصلہ کرنے کو آمادہ ہے اور فیصلہ بھی کیسے صحیح اصول پر مبنی کہ جو سمجھ میں نہیں آیا اس کی نفی کر دی بس ہمارے بھائیوں نے یہی ایک سبق یاد کر لیا ہے جن سے ایک استاد نے اپنے ایک بیوقوف شاگرد کو سکھلا دیا تھا کہ جو مسئلہ تجھ سے پوچھا جاوے اگر معلوم ہوا تو بتلا دیا اور جو معلوم نہ ہوا تو یہ کہدیا کہ اس میں اختلاف ہے (اس سے جہالت کا عیب چھپا رہے گا لوگ سمجھیں گے کہ ان کو معلوم تو ہے مگر اختلاف کی وجہ سے ایک شق کو معین نہیں کرتے اور مختلف فیہ مسائل بکثرت ہیں اس لئے اکثر مواقع میں یہ جواب صحیح ہوگا مگر وہ بیوقوف تو تھا ہی اس نے بعض متفق علیہ مسائل میں بھی کہدیا کہ اس میں اختلاف ہے بالآخر اس کی حماقت ظاہر ہو کر رہی ۱۲) اسی طرح ہمارے بھائیوں نے ایک سبق پڑھ لیا ہے کہ جو بات ان کی سمجھ میں نہ آئی کہدیا کہ یہ عقل کے خلاف ہے اس لئے قابل قبول نہیں اور لگے نصوص میں تحریف و تاویل کرنے چنانچہ ان کے نزدیک صراط بھی خلاف عقل ہے اور ساری معادیات اور معجزات خلاف عقل ہیں تو اس طرح انھوں نے عقائد میں بھی اختصار و انتخاب کرنا شروع کیا (اب ایمان کے معنے وہ نہ رہے جو پہلے تھے یعنی تصدیق بِمَا جَاءَ بِهِ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ (جو چیزیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم لائے ہیں ان کی تصدیق بلکہ یہ معنے ہو گئے کہ تصدیق بِمَا وَافَقَ الْعَقْلُ مِمَّا جَاءَ بِهِ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔ یعنی ان کے نزدیک ایمان کہتے ہیں اس چیز کے ماننے کو جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بیان کردہ باتوں میں سے ان کی عقل کے مطابق ہو ۱۲) میں کہتا ہوں کہ یہاں دو مقدمے ہیں ایک یہ کہ جو بات شریعت میں عقل کے خلاف ہے، تو وہ کس کی عقل کے خلاف ہے

تمہاری عقل کے یا سب عقلاء کی عقل کے دوسری شق تو مسلم نہیں کیونکہ علماء راسخین جن کی عقل کے سامنے اہل دنیا کی عقل کچھ حقیقت نہیں رکھتی ان کو خلاف عقل نہیں کہتے اور ہر زمانہ میں ان مسائل کو اسی صورت پر تسلیم کرتے آئے ہیں جس صورت سے شریعت میں تعلیم دی گئی ہے چنانچہ حضرات صحابہ و تابعین و علماء و صلحاء امت سب ان کا اعتقاد ظاہر کے مطابق رکھتے آئے ہیں اگر یہ کہو کہ تمہاری عقل کے خلاف ہے تو اس صورت میں صغریٰ تو مسلم مگر یہ کبریٰ مسلم نہیں کہ جو تمہاری عقل کے خلاف ہو وہ غلط اور ناقابل قبول ہے کیونکہ قوانین سلطنت میں بہت سی باتیں تمہاری عقل میں نہیں آتیں مگر تم قانون دانوں کی عقل پر اعتماد کر کے ان کو تسلیم کرتے ہو اسکو بھی جانے دو میں تمہیں سے پوچھتا ہوں کہ ماں کے پیٹ سے تم جس طرح پیدا ہوئے ہو کیا یہ تمہاری عقل میں آتا ہے۔ واللہ ہم کو اس پر حیرت اس لئے نہیں ہوتی کہ رات دن اس کا مشاہدہ ہو رہا ہے اگر اس کا مشاہدہ نہ ہوتا اور صرف بیان سے یہ طریقہ معلوم ہوتا تو ہر گز عقل میں نہ آتا اس کا امتحان اس طرح ہو سکتا ہے کہ تم ایک نوزائیدہ بچہ کی اس طرح نگرانی کرو کہ وہ یہ بات سننے یا دیکھنے نہ پائے کہ بچہ ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا کرتا ہے اس کے بعد آپ اس کو فلسفہ اور سائنس اور طب سب کچھ پڑھا دیں مگر یہ مسئلہ نہ پڑھائیں جس میں طریق ولادت کا ذکر ہو پھر جب وہ بی اے اور ایم اے اور ایل ایل بی ہو جائے اس وقت اس سے کہو کہ خبر بھی ہے تو کیونکر پیدا ہوا تھا اور اس سے بیان کرو کہ اول تیرا باپ تیری ماں کے پاس گیا تھا جس سے منی کے کچھ قطرے تیری ماں کے پیٹ میں اندر جو رحم ہے اس میں گرے تھے پھر رحم کے اندر اس کی پرورش ہوئی کہ خون بنا اور خون سے علقہ پھر مضغہ بنا پھر گوشت میں ہڈیاں بنیں پھر جسم کامل تیار ہو گیا تو اس میں روح پڑی جس کی پرورش عرصہ تک خون رحم سے ہوتی رہی پھر نو ماہ کے بعد تو شرمگاہ مادر سے نکلا اور اب وہی خون رحم دودھ کی شکل میں ماں کی پستان میں آگیا جس سے دو برس تک پرورش پاتا رہا الیٰ آخرہ تو میں سچ کہتا ہوں کہ

واللہ العظیم وہ نہایت سختی سے آپ کی مخالفت کرے گا اور کہے گا کہ ایک قطرے سے ایسے حسین جسم کا بننا پھر اس کا شرمگاہ سے جو نہایت تنگ راستہ ہے نکل آنا عقل کے بالکل خلاف ہے۔ اب بتلایئے کہ اگر یہ قاعدہ مان لیا جائے کہ جو بات جس کی عقل میں نہ آئے وہ غلط ہوا کرے تو پھر آپ کا ماں کے پیٹ سے پیدا ہونا بھی غلط ہے۔ بات یہ ہے کہ آپ خلاف عادت کو خلاف عقل کہتے ہیں جیسے وہ نوزائیدہ بچہ جس کی ایسی نگرانی کی گئی ہو جس کا اوپر ذکر ہوا ماں کے پیٹ سے پیدا ہونے کو خلاف عقل کہے گا کیونکہ اس نے یہ بات کبھی دیکھی یا سنی نہ تھی اور آپ اس کو خلاف عقل اس لئے نہیں کہتے کہ آپ کو اس کی عادت ہو گئی ورنہ آپ بھی وہی کہتے جو وہ کہتا ہے اور ظاہر ہے کہ خلاف عقل کا وقوع نہیں ہو سکتا تو معلوم ہوا کہ آپ خلافِ عقل ایسی باتوں کو بھی کہتے ہیں جن کا وقوع مشاہدہ ہو جائے تو وہ خلاف عقل نہ رہیں معلوم ہوا کہ آپ دراصل خلاف عادت کو خلاف عقل کہہ رہے ہیں اور کسی بات کو صحیح ہونے کے لئے خلاف عادت ہونا مضر نہیں اور نہ یہ غلط ہونے کی دلیل ہے ورنہ پھر اس لڑکے کے قول کو بھی مان لینا چاہیئے جو ماں کے پیٹ سے انسان کے پیدا ہونے کو غلط کہتا تھا اور نیز بہت سی باتوں کو جنھیں آپ چار دن پہلے مستبعد اور محال سمجھتے تھے اور آج ان کا مشاہدہ ہو رہا ہے غلط کہنا چاہیئے (جیسے ریل کا ایک گھنٹہ میں ساٹھ میل طے کر لینا اور پانچ منٹ میں لندن سے تار کے ذریعہ سے خبر آجانا وغیرہ وغیرہ ۱۲) اس کے علاوہ دنیا میں بہت سے امور عادت کے خلاف ہوتے رہتے ہیں۔

میں نے ایک مرغی کا بچہ دیکھا ہے جس کے چار پیر تھے (اور آجکل دہلی میں دو لڑکیاں جڑی ہوئی نمائش میں آئی تھیں جن کے تمام اعضا جدا جدا تھے مگر کمر جڑی ہوئی تھی اور پیشاب گاہ الگ الگ تھی مگر پیشاب نکلتا ایک کے رستہ سے تھا ۱۲) تو بتلایئے کیا خلاف عادت کے لئے بھی کوئی ضابطہ ہو سکتا ہے جس کے اوپر بنا کرکے بعض امور کو مانا جائے کسی بات کے متعلق یہ کہا جائے

کہ چونکہ یہ خلاف عادت ہے اس لئے ہم نہیں مانتے صاحب آپ کا عدم سے وجود میں آنا ہی عادت کے خلاف ہے کیونکہ عادت کا مقتضا تو یہ ہے کہ ہر شے اپنی اصلی حالت پر رہے جو معدوم ہے معدوم رہے اور جو موجود ہے وہ کبھی فنا نہ ہو مگر رات دن اس کے خلاف مشاہدہ ہو رہا ہے ہزارہا معدوم وجود میں آتے اور لاکھوں موجود معدوم ہو جاتے ہیں معلوم ہوا کہ کسی بات کا خلاف عادت ہونا اس کے غلط ہونے کو مستلزم نہیں۔ اب دوسرا مقدمہ یہ سمجھ لیجئے کہ آپ خلاف عادت کو خلاف عقل کہتے ہیں اور ان دونوں میں فرق نہیں کرتے حالانکہ یہ بڑی سخت غلطی ہے۔ سنئے میں اس کا فرق بتلاتا ہوں۔

خلاف عادت تو وہ ہے جو عقلاً ممکن ہو مگر مشاہدہ نہ ہونے کی وجہ سے دشوار و مستبعد معلوم ہوتا ہے (اور خلاف عقل وہ ہے جو عقلاً ناممکن ہے یعنی عقل اس کے استحالہ پر دلیل قائم کر سکے اور استحالہ کہتے ہیں اجتماع نقیضین کو تو خلاف عقل وہ ہے جس کے ماننے سے نقیضین کا ایک محل میں ایک آن میں ایک جہت سے مجتمع ہونا لازم آجائے ۱۲)

اب جو لوگ معادیات کو اور صراط و وزن اعمال وغیرہ کو خلاف عقل کہتے ہیں وہ مہربانی کر کے ان کے استحالہ پر دلیل عقلی قائم کریں (اور بتلائیں کہ ان کے ماننے سے اجتماع نقیضین کیونکر لازم آتا ہے ۱۲) یقیناً وہ ہرگز کوئی دلیل عقلی ان کے استحالہ پر نہیں قائم کر سکتے بس بہت سے بہت یہی کہیں گے کہ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کیونکر ہو جائے گا اس کی نظیر دکھلاؤ بس آجکل تمام شبہات کا حاصل یہ ہے کہ اس کی کوئی نظیر نہیں ملتی اس لئے یہ محال ہے اور جو دعوائے امکان کا کرتا ہے وہ اس کی نظیر دکھلائے۔ عجب اندھیر ہے کہ نظیر پر ثبوت شے کو موقوف بتلایا جاتا ہے اور جس چیز کی نظیر نہ ملے اس کو خلاف عقل اور محال کہا جاتا ہے لوگوں کو ثبوت کی حقیقت ہی معلوم نہیں نظیر پر ثبوت کو موقوف سمجھتے ہیں (میں کہتا ہوں کہ جو صنائع اور عجائبات اس زمانہ میں ایجاد یا مشاہد ہوئی ہیں کیا اس زمانہ سے

پہلے کسی کے پاس ان کی نظیر تھی اوراگر نہ تھی تو کیا اس وقت یہ خلاف عقل اور محال تھیں اگر محال تھیں تو پھر آج ان کا وقوع کیونکر ہوا معلوم ہوا کہ کسی شئے کا امکان نظیر کے ملنے پر موقوف نہیں ۱۲) تو خوب سمجھئے کہ کسی دعوٰی کا ثبوت نظیر کے ملنے پر موقوف نہیں بلکہ نظیر تو محض توضیح اور تنویر کے لئے ہوا کرتی ہے مدعی ثبوت کے ذمہ نظیر کا پیش کرنا ہرگز لازم نہیں خصوصًا ایسے مدعی کے ذمہ جو کسی امر کے ثبوت کا دعوٰے یہ کہہ کر کرتا ہو کہ یہ امر خلاف عادت بطور معجزہ کے واقع ہوا یا قیامت میں خلاف عادت یوں ہوگا اس کے ذمہ تو کسی قاعدہ سے بھی نظیر کا پیش کرنا لازم نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ تو اپنے دعوے میں تصریح کر رہا ہے کہ مدعی بے نظیری کی صفت کے ساتھ متصف ہے (اگر نظیر کا پیش کرنا مدعی کے ذمہ کسی درجہ میں لازم بھی ہوسکتا ہے تو صرف اس مدعی کے ذمہ ہو سکتا ہے جو اپنے مدعٰی کو موافق عادت بتلائے اور جو خرق عادت کا مدعی ہو اس سے نظیر کا مطالبہ کرنا عجب ہے ۱۲)

اب میں آپ کو ثبوت کی حقیقت بتلاتا ہوں جس کے نہ جاننے کی وجہ سے لوگوں کا مذاق ایسا بگڑ گیا ہے کہ آج علماء سے معراج کی نظیر کا سوال ہوتا ہے شق القمر کی نظیر کا مطالبہ ہوتا ہے تو سنئے یہ عقلی مسئلہ ہے کہ کسی خبر کا صحیح ہونا یا کسی امر کا واقع ہونا نظیر پر ہرگز موقوف نہیں چنانچہ جن کو عقلیات سے کچھ بھی مس ہے وہ اس کو جانتے ہیں مدعی اگر نظیر بیان کردے تو یہ اس کا تبرع ہے بلکہ ثبوت خبر کے لئے دو چیزوں کی ضرورت ہے ایک مخبر بہ کا ممکن ہونا دوسرے مخبر کا صادق ہونا پس ہمارے ذمہ تمام معجزات اور معادیات کے متعلق دو باتوں کا ثابت کرنا ہے ایک یہ کہ وہ فی نفسہ ممکن ہوں دوسرے مخبر صادق نے ان کے وقوع کی خبر دی ہو ان دو باتوں کے ثابت کرنے کے بعد کسی کو انکار کا حق نہ ہوگا۔

اب ہم معراج وغیرہ اور صراط و وزن اعمال وغیرہ کے ثبوت پر دلیل قائم کرتے ہیں کہ یہ معجزات اور معادیات فی نفسہ ممکن ہیں یہ تو دلیل کا پہلا مقدمہ ہے اگر کسی کو اس مقدمہ میں کلام ہو تو اس پر لازم ہے کہ ان کے امتناع پر دلیل قائم کرے اور ہم کو

امکان پر دلیل قائم کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ امکان کی کوئی علت نہیں ہوتی بلکہ امتناع پر دلیل نہ ہونا یہی امکان کی دلیل ہے (اور اوپر معلوم ہو چکا کہ امتناع کہتے ہیں اجتماع نقیضین کو محل واحد میں آن واحد میں جہت واحدہ سے تو جس کو ان امور کے امکان میں کلام ہو وہ ثابت کرے کہ ان میں اجتماع نقیضین کس طرح لازم آتا ہے ۱۲)
دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ جس امر ممکن کے وقوع کی کوئی مخبر صادق خبر دے وہ ثابت ہے (اور ان معجزات و معادیات کے وقوع کی خبر مخبر صادق نے دی ہے) پس یہ امور واقع و ثابت ہیں۔ اب ان مقدمات میں اگر کوئی کلام کرے تو اس کا جواب ہمارے ذمہ ہے باقی نظیر کا پیش کرنا ہمارے ذمہ نہیں مثلاً اگر کوئی کہے پلصراط پر چلنا عقل کے خلاف ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا تو میں کہوں گا کہ بتلاؤ کیوں سمجھ میں نہیں آتا اس میں کیا استحالہ ہے کہ ایک باریک چیز پر پیر آجائے جب یہ محال نہیں اور مخبر صادق اس کے وقوع کی خبر دے رہا ہے تو پھر انکار کی کیا وجہ اگر کوئی انکار کرے تو اس کو یہ حق تو ہے کہ امکان کو رد کرے اور امتناع کو ثابت کرے یا دوسرے مقدمہ میں کلام کرے کہ یہ مخبر صادق کی خبر نہیں تو ہم دلیل امتناع سننے کے لئے تیار ہیں اور کلام اللہ کو کلام اللہ ثابت کرنا بھی ہمارے ذمہ ہے اور جب یہ دونوں باتیں ثابت ہو جائیں پھر ہم نظیر پیش کرنے کے ذمہ دار نہیں اور اگر نظیر ہم کو معلوم بھی ہو تب بھی نہ بتلائیں گے کیونکہ یہ ہمارے ذمہ نہیں ہے کہ ہم اپنے سب معلومات آپ کو بتلا دیا کریں ہاں اگر تم یہ ثابت کر دو کہ مستدل کے ذمہ نظیر کا پیش کرنا ضروری ہے تو جب ثابت کر دو گے اس وقت دیکھا جائے گا بدون اس کے ہم زوائد کے ساتھ جواب نہ دیں گے یہ عوام کو زیادہ تر جواب دینے والوں ہی نے خراب کیا ہے کہ وہ ہر بات میں تبرعاً نظیریں بیان کرنے لگے عوام سمجھے کہ یہ بھی مجیب کے ذمہ ہے تو میں اس کا فیصلہ کرتا ہوں کہ مستدل کے ذمہ یہ ہرگز نہیں اور جو دعویٰ لزوم کا کرے وہ دلیل قائم کرے۔ یہ ہے دلیل مطرد جو تمام معجزات و معادیات میں برابر چل سکتی ہے اور جو دلیلیں آجکل بیان کی جاتی ہیں جن میں زیادہ تر نظیر سے جواب دیا جاتا ہے وہ مطرد نہیں ہیں اب میں

عقلاً یہ ثابت کرتا ہوں کہ کسی واقعہ کا ثبوت نظیر پر موقوف نہیں تقریر اس کی یہ ہے کہ یہ ظاہر ہے کہ نظیر بھی ایک واقعہ ہے میں پوچھتا ہوں کہ اس کے لئے بھی نظیر کی ضرورت ہے یا نہیں ہے وعلیٰ ہذا اگر ہر نظیر کے لئے نظیر کی ضرورت رہی تو تسلسل مستحیل لازم آئے گا اور نظیر سے ایک دعوی بھی ثابت نہ ہو سکے گا اور اگر کہیں جاکر ٹھہر و گے کہ اس نظیر کے لئے کسی نظیر کی ضرورت نہیں تو معلوم ہوا کہ کسی واقعہ کا ثبوت بدون نظیر کے بھی ہو گیا تو پھر پہلے ہی کے لئے نظیر کی کیوں ضرورت ہے اور جس طرح تم نے اخیر میں ایک واقعہ کو بلا نظیر مان لیا تو پہلے ہی کو بلا نظیر کیوں نہیں مان لیتے غرض کسی دلیل سے مستدل کے ذمہ نظیر کا بیان کرنا نہیں ہے ہاں اگر بیان کر دے تو یہ اس کی شفقت ہے اور اس کا موقعہ اس وقت ہے جبکہ سائل دلیل کے مقدمات پر کلام کرنے سے عاجز ہو جاوے اور تسلیم کر لے کہ واقعی دلیل سے یہ دعوے ثابت ہو گیا اور مجھے اب انکار کا کوئی حق نہیں اس وقت اگر مجیب تقریب فہم کے لئے کوئی نظیر دیدے تو اس کا احسان ہے (اور اگر وہ نظیر پر ثبوت دعوے کو موقوف بتلا رہا ہے تو مستدل نظیر ہرگز نہ بتلائے بلکہ اس سے اس توقف علی النظیر کی دلیل مانگے ۱۲) چنانچہ اس وقت میں ثبوت پل صراط پر دلیل قائم کر کے اس کی ایک نظیر تبرعاً بتلاتا ہوں اول پلصراط کی حقیقت سمجھئے مگر یہ کہے دیتا ہوں کہ یہ مضمون ظنی ہے اس طور پر پلصراط کو سمجھنا واجب نہیں اصل تو یہی ہے کہ آدمی عملاً پختہ عقیدہ رکھے باقی بعض طبائع ضعیف ہوتی ہیں ان کے لئے میں یہ مضمون بیان کرتا ہوں اگر وہ اس طرح بھی پلصراط کو سمجھ لیں تو کچھ حرج نہیں مگر لازم بھی نہیں لازم تو وہی اجمالاً مان لینا ہے۔ اس تنبیہ کے بعد کہتا ہوں کہ اول اس کی حقیقت سمجھو جس کے لئے اول یہ مقدمہ سنو کہ اس عالم کے سوا ایک عالم اور بھی ہے (مسلمان تو اس کا انکار نہیں کر سکتے اور مخالفین اگر انکار کریں تو ہمارے پاس ان کے جواب کے لئے وہی دلیل مطرد ہے جو اوپر مذکور ہوئی کہ دوسرے عالم کا ہونا ممکن ہے کسی کو امکان پر کلام ہو تو دلیل

امتناع قائم کرے اور جس ممکن کی خبر مخبر صادق نے دی ہو وہ ثابت ہے پس دوسرا عالم ثابت ہے اور مخبر کے صادق ہونے کو ہم دلائل سے ثابت کر سکتے ہیں)
دوسرا مقدمہ یہ سنئے کہ عالم کے اختلاف سے بعض احکام اور حالات بدل جاتے ہیں (اس کی بھی دلیل تو وہی ہے جو مذکور ہوئی اور تقریب فہم کے لئے ایک نظیر بھی بتلاتا ہوں ۱۲) جیسے اقالیم کے بدلنے سے بھی دنیا ہی میں حالات بدل جاتے ہیں (مثلاً یہاں اس وقت رات ہے اور ایک اقلیم میں اس وقت دن ہے یہاں آجکل گرمی ہے اور کسی اقلیم میں اس وقت سردی ہے وعلیٰ ہذا یہاں ۲۴ گھنٹے کا دن ہے اور بعض اقالیم میں چھ مہینہ کا دن اور چھ مہینہ کی رات ہے اور یہیں سے معلوم ہوا ہوگا کہ قرآن میں جو آیا ہے کہ عالم آخرت کا ایک دن ہزار برس کے برابر ہے. اور اس پر بعض لوگ ہنستے ہیں تو یہ ان کی حماقت ہے اس میں استبعاد کیا ہے جب عالم دنیا ہی میں اقلیم کے بدلنے سے یہ بات مشاہد ہے کہ بعض جگہ چھ ماہ کا دن ہوتا ہے تو اختلاف عالم کے بعد عالم آخرت میں اگر ہزار برس کے برابر ایک دن ہو تو کیا تعجب ہے۔ تیسرا مقدمہ یہ ہے کہ اختلاف کی کوئی حد نہیں ہے نہ یہ منضبط ہو سکتا ہے (یہ مقدمہ بدیہی ہے محتاج دلیل نہیں اور جو شخص کسی حد پر انتہاء اختلاف کا دعوےٰ کرے اور اس سے آگے اختلاف ہونے کو ممتنع کہے وہ اس پر دلیل قائم کرے ۱۲)
چوتھا مقدمہ یہ ہے کہ ممکن ہے جو چیز یہاں عرض ہو اس عالم میں جاکر جوہر ہو جائے (اس کا ممکن ہونا بھی ظاہر ہے یہ تو مسلم کہ ایک آن اور ایک محل میں شئے واحد عرض و جوہر نہیں ہو سکتی مگر یہ ہو سکتا ہے کہ ایک شے یہاں عرض ہو اور دوسری جگہ جوہر ہو جائے اس کے امتناع پر کوئی دلیل قائم نہیں ہو سکتی اگر کسی کے پاس دلیل ہو پیش کرے ۱۲) اور استیناس کے طور پر اس کو یوں سمجھئے کہ اس زمانہ میں بعض آلات کے ذریعہ سے حرارت و برودت وغیرہ کا وزن ہوتا ہے حالانکہ پہلے حکماء ان کو مقولہ کیف سے سمجھتے تھے جس کے لئے وزن و مقدار نہیں ہو سکتی

مگر اس زمانہ میں ان کے لئے وزن ہونا ثابت ہوگیا اسی لئے میں تو کہا کرتا ہوں کہ جتنی یہ نئی نئی ایجادات ہیں سب معادیات کے سمجھنے کے لئے معین و ممد ہیں چنانچہ گراموفون ہاتھ پیر کے بولنے پر بڑی دلیل ہے کیونکہ گراموفون میں تو روح بھی نہیں اور کلام کرتا ہے تو اعضاء انسانی کے بولنے میں کیا تعجب ہے جن میں حیات کا تلبس ہے اسی طرح ایک حدیث میں ہے جو نسائی میں موجود ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صلوٰۃ کسوف کے موقع پر فرمایا کہ میں نے مسجد کی دیوار کے قریب جنت و دوزخ کو دیکھا بعض لوگ اس پر ہنستے تھے کہ جنت و دوزخ تو آسمان زمین سے بھی بڑی بتلائی جاتی ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو دیوار پر کیونکر دیکھ لیا اور اصلی حالت پر کیسے دیکھ لیا مگر خدا تعالیٰ نے فوٹو اور خوردبین کو ایجاد کرا کے اس استبعاد کو دور کر دیا فوٹو میں بڑی سے بڑی شے کو چھوٹا کر کے دکھایا جا سکتا ہے اور خوردبین سے چھوٹی سے چھوٹی چیز پہاڑ بنا کر دیکھائی جا سکتی ہے تو کیا خدا تعالیٰ کو یہ قدرت نہیں کہ اس نے جنت و دوزخ کا فوٹو مسجد کی دیوار پر اتار دیا ہو اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شعاع میں خوردبین کی قوت رکھدی ہو جس سے فوٹو کی چھوٹی چیزیں آپ کو اصلی حالت پر نظر آگئیں ہوں۔ اور حدیث میں یہی لفظ وارد ہے مُثِّلَتْ لِیَ الْجَنَّةُ وَالنَّارُ (ممثل ہوگی واسطے میرے جنت اور دوزخ) یہ نہیں فرمایا کہ جنت و دوزخ زمین میں اتر آئی تھیں بلکہ آپ نے فرمایا کہ وہ میرے لئے ممثل ہوگئیں اسی لئے جب کوئی نئی ایجاد ہوتی ہے تو میں خوش ہوتا ہوں کیونکہ ان سے شرعیات کا استبعاد دور ہوتا جاتا ہے چنانچہ ایک عجیب بات اس زمانہ میں یہ ہے کہ آجکل حرارت و برودت کا بھی وزن ہونے لگا کہ اس مکان میں کس وزن کی حرارت ہے اور کس درجہ کی برودت ہے (اور بخار میں تھرمامیٹر سے مریض کی حرارت کا وزن کیا جاتا ہے ۱۲) اب اگر کسی گنوار سے کہئے کہ گرمی بھی تلتی ہے تو اس کو کتنا تعجب ہوگا۔ تو جب دنیا ہی میں بعض اعراض کا وزن ہونے لگا جس کی حقیقت ہے مابہ الوزن کے انخفاض وارتفاع سے مقدار کا معلوم ہو جانا جو کہ سرسری نظر

میں خواص جوہر سے ہے تو اگر دوسرے عالم میں جا کر وہ جوہر ہی بن جاوے تو کیا تعجب ہے اور لیجئے اگر ایک برتن ٹھنڈا پانی بھر کر وزن کرو تو اور وزن ہوگا اور اسی میں گرم پانی بھر کر وزن کرو تو اور وزن ہوگا آخر کمی بیشی کیوں ہے پانی کی مقدار تو دونوں حالتوں میں یکساں تھی معلوم ہوا کہ برودت وحرارت کا بھی کچھ وزن ہے اب خواہ اس کو یوں تعبیر کر لیجئے کہ وزن پانی ہی کا ہے مگر بشرط برودت وحرارت کے مگر آخر ان کو وزن میں دخل تو ہوا تو اس عالم میں اگر یہی دخل درجہ موزونیت میں اس طرح ہو جاوے کہ یہ عرض جوہر بنجائے تو کیا تعجب ہے اور سنئے اطبار کہتے ہیں کہ جس شخص میں صفرا کا غلبہ زیادہ ہو وہ خواب میں آگ بہت دیکھتا ہے دیکھئے جو چیز یہاں عرض تھی یعنی حرارت صفراوی وہ عالم خیال میں آگ بن گئی جو کہ جوہر ہے پس اس عالم میں عرض کا جوہر بن جانا کچھ بعید نہیں۔ اب پلصراط کی حقیقت سمجھئے گو اس کے بیان کی ضرورت نہیں کیونکہ مسلمان کا مذاق تو یہ ہونا چاہیے

حدیث مطرب و مے گو و راز دہر کمتر جو
کہ کس نکشود و نکشاید بحکمت ایں معما را

(محبت اور عشق الٰہی کا بیان کرو راز دہر کے پیچھے نہ پڑو اس لئے کہ کسی نے حکمت اور دانائی سے اس معمہ کو حل نہیں کیا اور نہ کوئی حل کر سکے)

اور میں کہہ چکا ہوں کہ میرے ذمہ اس کا بیان کرنا لازم نہیں میرے ذمہ تو وہی تھا جو میں بیان کر چکا ہوں مگر اس میں حظ نہ آیا تھا اس لئے تبرعاً بیان کرتا ہوں کہ خیر جس طرح بھی کام چلے اچھا ہے تو سنئے پلصراط کی حقیقت شریعت ہے (کما قال اَصْحَابُ الْکَشْفِ مِنَ الْعُرَفَاءِ ۱۲) (جیسا عارفین صاحب کشف نے بیان کیا ہے) پس دنیا میں پلصراط کی نظیر شریعت موجود ہے اتنا فرق ہے کہ یہاں یہ عرض ہے اور وہاں جا کر جوہر بن جائے گی باقی اور تمام صفات میں یہ اس کی نظیر ہے جیسے وہ بال سے باریک اور تلوار سے تیز ہے جس پر چلنا دشوار ہے اسی طرح طریق شریعت نہایت باریک اور نازک ہے جس پر استقامت کے ساتھ چل لینا ہر ایک کا

کام نہیں کیونکہ شریعت مقدسہ مرکب ہے علم و عمل سے تو اس پر چلنے کے لئے دو قوتوں کی ضرورت ہے۔ ایک قوتِ علمیہ کی دوسرے قوت عملیہ کی قوت علمیہ کا تعلق عقل سے ہے اور قوت عملیہ کا ارادہ سے پھر عمل بعض مفید ہیں اور بعض مضر تو اس میں کہیں تو جلب منفعت کی ضرورت ہے اور کہیں دفع مضرت کی اور جو ارادہ جلب منفعت سے متعلق ہو اس کو قوت شہویہ کہتے ہیں اور جو دفع مضرت کے متعلق ہو اس کو قوت غضبیہ کہتے ہیں تو شریعت پر چلنے کے لئے تین قوتوں کی ضرورت ہوئی۔ قوتِ عقلیہ، قوتِ شہویہ، قوتِ غضبیہ۔ یہی اصول اخلاق کہلاتے ہیں۔ پھر ان میں سے ہر ایک کے تین درجے ہیں۔ افراط، تفریط، توسّط۔ اور شریعت نام ہے توسط کا شریعت میں افراط عقل سے بھی کام نہیں چلتا نہ تفریط سے کام چلتا ہے بلکہ توسط کی ضرورت ہے جس کا نام حکمت ہے اور قوت عقلیہ کے افراط کا نام جز بزہ ہے یہ نہایت مضر ہے۔ جب عقل بہت بڑھ جاتی ہے تو ہر چیز میں احتمالات عقلیہ پیدا ہونے لگتے ہیں جس سے آدمی وہمی ہو جاتا ہے۔ جیسے اہلِ فلسفہ میں ایک فرقہ لاادریہ مشہور ہے وہ کسی حقیقت کا وجود تسلیم نہیں کرتے اور کہتے ہیں کہ بہت دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ ہم ایک چیز کو دور سے دیکھ کر آدمی سمجھتے ہیں اور وہ گدھا نکلتا ہے بہت لوگ ایک شخص کو حسین سمجھتے ہیں اور بہت سے اس کو بدصورت سمجھتے ہیں۔ بعض لوگ ایک چیز کو میٹھا بتلاتے ہیں اور بخار والا اس کو کڑوی بتلاتا ہے۔ اسی طرح مسائل عقلیہ میں کوئی ایک دلیل کو صحیح کہتا ہے کوئی غلط تو جب ہمارے حواس ظاہرہ اور باطنہ میں اتنا خلاف ہے اور کبھی ان سے غلطی بھی ہو جاتی ہے تو یہ کیا اطمینان ہے کہ جس کو ہم نے آدمی سمجھا ہے وہ آدمی ہی ہے گدھا نہیں اور جس کو ہم زمین کہتے ہیں وہ زمین ہی ہے آسمان نہیں ممکن ہے ہماری نظر نے غلطی کی ہو اور جس بات کو ہم حق سمجھتے ہیں ممکن ہے وہاں ہماری فہم نے غلطی کی ہو بس اب ان کا حال یہ ہو گیا کہ ہر بات میں ان کو شک ہے اور شک میں بھی شک ہے فَهُوَ شَاكٌّ

وَشَاكٌ فِيْ اَنَّهُ شَاكٌّ (وہ شک کرنے والا اور اس بات میں شک کرنے والا کہ وہ شک کرنے والا) تو حضرت یہ عقل جب بڑھتی ہے تو اتنا پریشان کرتی ہے کہ زندگی تباہ کردیتی ہے اور یہی وجہ ہے بہت سے عقلاء کی تباہ ہونے کی کہ انہوں نے عقل سے وہ کام لیا جو اس کی حد سے آگے تھا اور ہر چیز کا اپنی حد سے نکل جانا مضر ہے میں تو عقل کے متعلق ایک مثال دیا کرتا ہوں کہ یہ ایسی ہے جیسے گھوڑا پہاڑ پر چڑھنے والے کے لئے۔ اب تین قسم کے لوگ ہیں ایک تو وہ جو گھوڑے پر سوار ہوکر پہاڑ تک پہونچے اور پھر پہاڑ پر بھی اسی پر سوار ہوکر چڑھنے لگے یہ غلطی پر ہیں ضرور کسی سیدھی چڑھائی پر سوار اور گھوڑا دونوں گریں گے اور ایک وہ ہیں جو یہ سمجھ کر کہ گھوڑا پہاڑ پر تو کام دیتا ہی نہیں تو اس سے صاف سڑک پر بھی کام لینے کی کیا ضرورت ہے وہ گھر ہی سے پیدل چل پڑے نتیجہ یہ ہوا کہ پہاڑ تک پہونچ کر تھک گئے یہ بھی نہ چڑھ سکے تو ان دونوں کی رائے غلط تھی پہلی جماعت نے گھوڑے کو ایسا باکار سمجھا کہ اخیر تک اُسی سے راستہ طے کرنا چاہا اور دوسرے نے ایسا بیکار سمجھا کہ پہاڑ تک بھی اس سے کام نہ لیا صحیح بات تو یہ ہے کہ گھوڑا پہاڑ تک کارآمد ہے اور پہاڑ پر چڑھنے کے لئے بیکار اس کے لئے کسی اور سواری کی ضرورت ہے یہی حال عقل کا ہے کہ عقل سے بالکل کام نہ لینا بھی حماقت ہے اور اخیر تک کام لینا بھی غلطی ہے بس عقل سے اتنا کام تو لو کہ توحید و رسالت کو سمجھو اور کلام اللہ کا کلام اللہ ہونا معلوم کرلو اس سے آگے فروع میں عقل سے کام نہ لینا چاہیئے بلکہ اب خدا و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کے آگے گردن جھکا دینی چاہیئے چاہے ان کی حکمت عقل میں آوے یا نہ آئے دیکھئے قانون سلطنت کے منوانے کی دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ پہلے یہ سمجھا دیا جائے کہ جارج پنجم بادشاہ ہیں اس کے بعد تمام احکام کے متعلق یہ کہدیا جائے کہ یہ بادشاہ کے احکام ہیں اس لئے ماننا پڑیں گے تو یہ صورت آسان ہے اور تمام عقلاء ایسا ہی کرتے ہیں

دوسری صورت یہ ہے کہ ایک شخص جارج پنجم کو بادشاہ مان کر پھر بھی ہر قانون میں الجھنے لگے کہ میں اس دفعہ کو نہیں مانتا تو بتلایئے اس شخص کا کیا حال ہوگا ظاہر ہے کہ ہر جگہ ذلیل ہوگا اور عقلا کہیں گے کہ جب بادشاہ ہونا مسلم اور اس قانون کا قانون سلطنت ہونا معلوم تو پھر انکار کی کیا وجہ ضرور ماننا پڑے گا چاہے سمجھ میں آئے یا نہ آئے معلوم ہوا کہ صاحب سلطنت کے پہچاننے کے لئے تو عقل سے کام لینے کی اجازت ہے اس کے بعد عقل سے کام لینے کی اجازت نہیں پھر کیا وجہ کہ آپ دین کے معاملہ میں اخیر تک عقل سے کام لینا چاہتے ہیں یہ سخت غلطی ہے جس سے بجز ذلت کے اور کچھ حاصل نہ ہوگا۔ جب خدا کا ہونا مسلم تو رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کا رسول ہونا مسلم کلام اللہ کا کلام اللہ ہونا معلوم۔ پھر ہر حکم میں الجھنے کا آپ کو کیا حق ہے اور ہر شخص آپ کو بیوقوف بنائے گا۔ اور تمام عقلاء کی نظروں میں آپ ذلیل ہوں گے سچ یہ ہے ؎

عزیزیکہ از درگہش سر بتافت
بھر در کہ شد ہیچ عزت نیافت

(وہ (اللہ) ایسے غالب اور قادر ہیں کہ جس نے ان کی درگاہ سے سر پھیرا جس دروازہ پر گیا کچھ عزت نہ پائی بلکہ ذلیل ہوا)

غرض عقل سے اس وقت تک کام لو جب تک وہ کام دے سکے اور جہاں اس کا کام نہیں وہاں اس کو چھوڑ دو اور حکم کا اتباع کرو تو عقل کی بھی ایک حد ہوئی اور کیوں نہ ہو وہ بھی تو ایک قوت ہے، جیسے آنکھ کی ایک قوت ہے اور اس کی ایک حد ہے اس سے آگے دوربین لگانے کی ضرورت ہے ایسے ہی شریعت کے معاملہ میں اصول تک تو عقل کام دیتی ہے اور فروع میں یہ تنہا بیکار ہے دوربین وحی سے کام لینا ضروری ہے۔ ایسے ہی کان کی ایک قوت ہے جس کے لئے ایک حد ہے کہ اس سے آگے ٹیلیفون سے مدد لینے کی ضرورت ہے۔ پیروں کی ایک قوت ہے جس سے آگے سواری سے مدد لینے کی ضرورت ہے

توجب ہر قوت محدود ہے تو عقل کیسے محدود نہ ہوگی، ضرور ہوگی۔ اس سے آگے وحی سے کام لو ورنہ یاد رکھو کہ عمر بھر رستہ نہ ملے گا کیونکہ سمعیات میں عقل کا کام نہیں وہاں تو اتباع رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ضرورت ہے اور سہ

خلاف پیمبر کسے رہ گزید
کہ ہرگز بمنزل نخواہد رسید

(پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے راستہ کے خلاف جس نے اور راستہ اختیار کیا وہ ہرگز منزل مقصود نہ پہنچیگا)

صاحبو! دنیا میں بھی تو آپ بہت جگہ عقل کو چھوڑ کر کسی نہ کسی کا اتباع کرتے ہیں دیکھئے جب آپ بیمار ہوتے ہیں تو عقل سے اتنا کام تو لیتے ہیں کہ اطباء موجودین میں سے کون زیادہ حاذق و تجربہ کار ہے، اور جب ایک طبیب کا حاذق ہونا معلوم ہوگیا تو پھر آپ اس کے پاس جاتے ہیں اور وہ نبض دیکھ کر نسخہ تجویز کرتا ہے پھر آپ اس سے یہ نہیں پوچھتے کہ اس نسخہ میں فلاں دوا کیوں لکھی اور فلاں کیوں نہیں لکھی اور اس دوا کا وزن چار ماشہ کیوں لکھا چھ ماشہ کیوں نہ لکھا ہمنے کسی کو طبیب سے ان باتوں میں الجھتا ہوا نہیں دیکھا اور اگر کوئی اس سے الجھنے لگے تو سب عقلا اس کو بیوقوف بناتے ہیں اور طبیب بھی صاف کہدیتا ہے کہ اگر تم میرے پاس مجھ کو طبیب سمجھ کر آئے ہو تو جو نسخہ میں تجویز کردوں اس میں تم کو چون وچرا کا کوئی حق نہیں اور اگر چون وچرا کرتے ہو تو اس کے معنے ہیں کہ تم مجھ کو طبیب نہیں سمجھتے پھر میرے پاس کیوں آئے تھے۔ اور اس کے اس جواب کو تمام عقلاء صحیح کہتے ہیں۔ پھر حیرت ہے کہ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کو رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) تسلیم کرنے اور کلام اللہ کو کلام اللہ مان لینے کے بعد عقل کو ان کے تابع نہ کیا جاوے اور بات بات میں الجھا جاوے کہ یہ تو خلاف عقل ہے ہم اسے کیونکر مان لیں۔ صاحب اگر تم نے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) مان لیا ہے تو پھر ہر بات کو بلا چون وچرا ماننا پڑے گا اور یہ کہنے کا حق نہ ہوگا کہ ہماری عقل میں

یہ بات نہیں آتی ورنہ اس کے معنے یہ ہیں کہ تم نے اب تک رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کو رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) ہی نہیں سمجھا اور کلام اللہ کو کلام اللہ ہی نہیں مانا۔ افسوس دنیا کے کاموں میں تو عقل کی ایک حد ہو اور طبیب کو طبیب مان لینے کے بعد اس کی تجویز میں عقل کو دخل نہ دیا جائے اور امور آخرت میں اس کی کوئی بھی حد نہ ہو۔

صاحبو! جب دنیا کے کام بدون اس کے نہیں چل سکتے کہ عقل کو ایک حد پر چھوڑ دیا جائے اور بلاچون وچرا دوسرے کا اتباع کیا جائے تو آخرت کا کام بدون اس کے کیونکر چلے گا۔ کیونکہ دنیا کی چیزیں تو دیکھی ہوئی ہیں ان میں کسی قدر عقل چل سکتی ہے پھر بھی اس کو چھوڑ کر کاملین و ماہرین کی تقلید کی جاتی ہے اور آخرت سے تو ہم سب اندھے ہیں وہاں بدون تقلید وحی کے کیسے کام چلے گا اور اگر اس میں عقل سے کام لیا گیا تو وہی مثال ہو گی جیسے ایک اندھے نے کہا تھا کہ یہ تو بڑی ٹیڑھی کھیر ہے۔ شان ورود اس کا یہ ہے کہ ایک لڑکا اپنے اندھے حافظ کے لئے گھر سے کھیر کی دعوت کرنے آیا۔ پوچھا کہ کھیر کیسی ہوتی ہے کہا سفید ہوتی ہے حافظ جی نے سفید سیاہ میں کیوں فرق کیا تھا ان کے نزدیک تو نہ کوئی چیز سفید تھی نہ سیاہ کیونکہ آنکھیں ہی نہ تھی تو آپ پوچھتے ہیں کہ سفید کیسا ہوتا ہے اس نے کہا جیسا بگلا حافظ جی نے پوچھا کہ بگلا کیسا ہوتا ہے لڑکے نے ہاتھ کو اس طرح موڑ کر (ا) کہا کہ ایسا ہوتا ہے حافظ جی نے جو اپنا ہاتھ پھیر کر اس شکل سے تصور کیا تو کہنے لگے بھائی یہ تو بڑی ٹیڑھی کھیر ہے میرے گلے سے کیونکر اترے گی تو دیکھئے جو چیز آنکھ سے دیکھی نہ ہو اس میں عقل سے کام لینے کا یہ نتیجہ ہوا کہ معمولی سی کھیر کا کیا سے کیا بن گیا جس میں چبانے اور نگلنے کی بھی مشقت نہ تھی اب وہ گلے میں پھنسنے لگی تو واقعی اندھے کو کوئی کیونکر سمجھائے کہ سفید رنگ کیسا ہوتا ہے اگر حافظ جی ساری عمر بھی اسی سبق میں رہیں تب بھی نہیں سمجھ سکتے۔ بس اس کا طریقہ تو یہ ہے کہ کسی خیر خواہ سوانکھے کی تقلید کر لی جائے۔

اسی طرح اگر تم کسی ولائتی کو جس نے آم کبھی نہ کھایا ہو آم کا مزہ سمجھانا چاہو تو کیا وہ سمجھ جائے گا ہرگز نہیں تم کہو گے کہ آم میٹھا ہوتا ہے وہ کہے گا کہ ہم تو روز گڑ کھاتے ہیں بس آم ایسا ہی ہوتا ہوگا صاحب اس کو سمجھانے کا طریقہ یہ ہے کہ ایک آم لاکر اسے کھلا دو اور اگر یہ نہیں تو پھر اس کو تقلیداً مان لینا چاہئے اور اپنی عقل سے اس کی نظیریں نہ نکالنا چاہئیں، اسی طرح امور آخرت کو اگر پوری طرح سمجھنے کا شوق ہے تو اس کی صورت یہ ہے کہ موت کے منتظر رہو مرنے کے بعد صراط اور وزن اعمال وغیرہ سب کی حقیقت سامنے آجائے گی اور اگر دنیا ہی میں سمجھنا چاہتے ہو تو اس کے سوا چارہ نہیں کہ قرآن و رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کہہ دیا ہے اس کی تقلید کرو اور ان کی نظیریں دریافت کرنے کے درپے نہ ہو۔ مثالوں سے تم آخرت کی حقیقت ایسی ہی سمجھو گے جیسے حافظ جی نے کھیر کو ٹیڑھا بتلایا تھا بس خوب سمجھ لو کہ عقل کی ایک حد ہے جس سے بڑھ جانا مضر ہے۔ اطباء نے بھی تو اس کو مضر لکھا ہے اور امراض میں سے شمار کیا ہے کیونکہ افراط عقل کا نتیجہ اوہام و شکوک میں ابتلاء ہے جس سے قلب و دماغ دونوں ضعیف ہو جاتے ہیں۔

فارابی کی حکایت ہے کہ ایک شخص حلوا بیچتا پھرتا تھا اس سے پوچھا کَیْفَ تَبِیْعُ الْحَلْوَاءَ تو حلوا کس طرح بیچتا ہے اُس نے جواب دیا کَذَا بِدَانِقٍ کہ ایک دانگ میں اتنا دیتا ہوں تو آپ کہتے ہیں اَسْئَلُكَ عَنِ الْکَیْفِیَّۃِ وَتُجِیْبُنِیْ عَنِ الْکَمِیَّۃِ میں تو کیفیت سے سوال کرتا ہوں اور تو کمیت سے جواب دیتا ہے آپ حلوائی سے الجھ گئے اس کو عقل کا ہیضہ کہتے ہیں کہ ہر وقت اسی کے چکر میں رہے چنانچہ افراط عقل ہی کا یہ نتیجہ تھا کہ فلاسفر نے انبیاء علیہم السلام کا مقابلہ کیا اور جب عاجز ہو گئے تو ان کی نبوت کا تو اقرار کیا مگر کہنے لگے کہ یہ جاہلوں کے واسطے نبی ہیں ہم کو نبی کی ضرورت نہیں نَحْنُ قَوْمٌ قَدْ هَذَّبْنَا نُفُوْسَنَا بِالْحِکْمَۃِ ہم نے تو اپنے کو حکمت سے مہذب بنا لیا ہے حق تعالےٰ ایسے ہی لوگوں کے حق میں فرماتے ہیں فَرِحُوْا بِمَا عِنْدَهُمْ مِّنَ الْعِلْمِ یہ لوگ اپنے علم پر نازاں ہو گئے

اور یہ نہ سمجھے کہ علوم نبوت عقل سے باہر ہیں چنانچہ الٰہیات میں فلاسفہ نے جو تحقیقات بیان کی ہیں ان میں اتنی ٹھوکریں کھائی ہیں کہ آج مسلمان کا ایک ادنیٰ طالب علم بھی ان پر ہنستا ہے یہ تو افراط فی العقل ہے اور ایک ہے تفریط کا درجہ یعنی عقل کی کمی اس کو حماقت کہتے ہیں شریعت میں یہ دونوں درجے بیکار اور مذموم ہیں بلکہ مطلوب توسط ہے جس کو حکمت کہتے ہیں دوسری قوت شہویہ ہے اس میں بھی تین درجے ہیں ایک افراط جس کا نام فجور ہے شریعت میں یہ بھی مطلوب نہیں کیونکہ اس کا انجام فسق ہے اور ایک تفریط ہے کہ آدمی نامرد بن جائے کہ ضروری انتفاعات سے بھی محروم ہو یہ بھی مطلوب نہیں (کیونکہ اس سے ہمت اور حوصلہ پست ہو جاتا ہے اور الوالعزمی اور اخلاق عالیہ مفقود ہو جاتے ہیں جو بڑا نقص ہے ۱۲) اور ایک ہے توسط جس کا نام عفت ہے یہ مطلوب ہے۔ تیسری چیز قوت غضبیہ ہے اس میں بھی تین درجے ہیں ایک افراط جس کو طہور کہتے ہیں کہ موقع بے موقع کچھ نہ دیکھے اندھا دھند جوش دکھلانے لگے جیسا آجکل ہو رہا ہے کہ جس طرف چلتے ہیں جوش میں اندھے بن کر چلتے ہیں یہ بھی نہیں دیکھتے کہ اس جوش سے نفع ہوگا یا نقصان یہ بھی شریعت میں مطلوب نہیں اور ایک ہے تفریط جس کو جبن اور بزدلی کہتے ہیں کہ موقع اور ضرورت کے وقت بھی ہمت سے کام نہ لیا جائے جیسے بعض لوگ ایسے ڈرپوک ہوتے ہیں کہ حکام کے سامنے ادب اور تہذیب سے بھی اپنی حاجات ظاہر نہیں کر سکتے یہ بھی مطلوب نہیں اور ایک درجہ توسط کا ہے جس کا نام شجاعت ہے یہ مطلوب ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ ضرورت اور موقع پر جوش ظاہر کیا جائے جہاں نفع کا ظن غالب ہو اور بے موقع جوش سے کام نہ لیا جائے جہاں نفع کی کچھ امید نہیں محض نقصان ہی نقصان ہے۔ غرض اخلاق پسندیدہ کے اصول تین ہیں حکمتؔ، عفتؔ، شجاعتؔ۔ اور ان کے مجموعہ کا نام عدل ہے اور یہی شریعت

کا حاصل ہے۔ اور قرآن میں جو فرمایا ہے وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا
اس سے بھی عدل مراد ہے مطلب یہ ہے کہ ہم نے (ایک ایسی شریعت دیکر جو کہ
سراپا عدل ہے) امت وَسَط یعنی امۃ عادلہ بنایا ایک مقدمہ اور لیجیے کہ وسط
دو قسم کا ہوتا ہے ایک وسط حقیقی ایک وسط عرفی وسط حقیقی وہ خط ہے
جو بالکل بیچوں بیچ ہو وہ قابل تقسیم نہیں ہوتا اور ایک وسط عرفی ہے جیسے
کہا کرتے ہیں کہ یہ ستون مکان کا وسط ہے تو وہ وسط حقیقی نہیں کیونکہ وہ تو منقسم
ہے اس کے اندر بھی ایک جزو دائیں اور ایک بائیں اور ایک بیچ میں
نکل سکتا ہے پھر وہ وسط حقیقی کہاں ہوا حقیقی وسط تو وہ ہے جس میں
دایاں بایاں کچھ نہ نکل سکے سو ایسا وسط ہمیشہ غیر منقسم ہوگا۔ پس سمجھو لو کہ
شریعت اس (وقت) وسط کا نام ہے جس میں افراط تفریط کا ذرا بھی نام نہ ہو
بلکہ عین توسط ہو یہی وسط حقیقی روح شریعت ہے اور یہی کمال ہے اور
اوپر معلوم ہو چکا کہ وسط حقیقی ہمیشہ غیر منقسم ہوتا ہے تو شریعت کی روح بھی
غیر منقسم ہے۔ چنانچہ جن اصول اخلاق کو میں نے بیان کیا ہے ان میں افراط تفریط
کو چھوڑ کر جو ایک وسط نکلے گا جس کو نہ افراط کی طرف میلان ہوگا نہ تفریط کی
طرف وہ ہمیشہ غیر منقسم ہوگا اور ایسے وسط پر رہنا ضرور دشوار ہے پس
شریعت ان دونوں جانبوں پر نظر کر کے اپنی دشواری کی وجہ سے تلوار سے
تیز اور بوجہ غیر منقسم ہونے کے بال سے باریک ہوگی کیونکہ بال بھی منقسم
ہے اور وسط حقیقی غیر منقسم ہے پس قیامت میں یہی روح شریعت یعنی وسط
حقیقی جوہر بن کر پل صراط کی شکل میں ظاہر ہوگا جس پر سے مسلمانوں کو چلایا
جائے گا پس جو شخص دنیا میں شریعت پر تیزی و سہولت کے ساتھ چلا
ہوگا وہ وہاں بھی تیزی کے ساتھ چلے گا کیونکہ وہ یہی شریعت تو ہوگی
جس پر دنیا میں چل چکا ہے اور جو یہاں نہیں چلا یا کم چلا ہے وہ پل صراط
پر بھی نہ چل سکے گا یا سستی کے ساتھ چلے گا لیجیے میں نے آپ کو پل صراط کی

نظیر بھی دکھلادی. اب تو کوئی اشکال نہیں رہا۔ اسی طرح ہمارے پاس تمام شرعیات کے لئے عقلی نظائر موجود ہیں یہ نہ سمجھئے کہ یہ پل صراط ہی کی خصوصیت ہے لیکن ہم ان تحقیقات کو مقصود نہیں سمجھتے ہمارا اصلی مذہب تو یہ ہے کہ ؎

ما قصۂ سکندر و دارا نخواندہ ایم

از ما بجز حکایت مہر و وفا مپرس

(ہم نے سکندر و دارا کے قصے نہیں پڑھے ہم سے مہر و وفا کے قصوں کے علاوہ نہ دریافت کرو)

باقی میں نے نمونہ کے طور پر یہ تحقیق اس لئے بیان کردی تاکہ معلوم ہوجائے کہ ہمارے پاس ہر مسئلہ میں ایسی ہی تحقیقات موجود ہیں اور سمجھ میں آجائے کہ علوم شرعیہ کے سامنے علوم فلسفہ کی کچھ بھی وقعت نہیں جس میں سے نمونہ کے طور پر اس وقت میں نے کچھ بیان کردیا ہے تاکہ آپ علمائے اسلام کو تحقیقات سے خالی نہ سمجھیں بحمداللہ ہمارے پاس ان تحقیقات کا ذخیرہ بھی بہت زیادہ ہے لیکن ؎

مصلحت نیست کہ از پردہ بروں افتد راز

ورنہ در مجلس رنداں خبرے نیست کہ نیست

(راز کا فاش کرنا مصلحت کے خلاف ہے ورنہ عارفین کی مجلس میں کوئی چیز چیز ایسی نہیں ہے کہ نہ ہو)

مصلحت اس واسطے نہیں کہ ہر شخص اس قسم کی تحقیقات بتلانے کے قابل نہیں اور جو قابل ہوں اُن کو بھی ہم نہیں بتلاتے کیونکہ ان کا بتلانا ہمارے ذمہ نہیں (کیونکہ طبیب کے ذمہ صرف نسخہ بتلانا ہے اس کی رعایت اور ترکیب کی اسرار اور وزن کی علت بتلانا اس کے ذمہ نہیں ۱۲) ہاں بعض قابلوں کو بتلا بھی دیتے ہیں جو ہمارے پاس آکر رہیں اور ہمارے کہنے کے موافق

عمل کریں اطاعت میں پختگی ظاہر کریں ایسے شخص کو کبھی نشاط میں آکر خود ہی بتلا دیتے ہیں اور پوچھنے پر اُسے بھی نہیں بتلاتے کیونکہ یہ اسرار ہیں جن کو نشاط کے وقت خود ہی بیان کر دیا جاتا ہے اور ان کا از خود کسی کا پوچھنا ناگوار گزرتا ہے (جیسے طبیب بعض دفعہ خوشی میں آکر مریض سے خود اپنے نسخہ کی تعریف اور حقیقت بیان کر دیتا ہے اور اگر مریض پوچھے تو اسے ناگوار ہوتا ہے اور ۱۲) جیسے کوئی شخص بادشاہ کا مطیع و محبوب ہو تو بادشاہ اُسے کبھی اپنے محل کی سیر بھی کرا دیتا ہے کہ دیکھو یہ خزانہ ہے اور یہ چور دروازہ ہے اور یہ ہماری بیگمات کے رہنے کی جگہ ہے۔ یہ آرام گاہ ہے لیکن اگر وہ از خود پوچھنے لگے کہ حضور کی بیگم کہاں رہتی ہیں اور خزانہ کہاں ہے تو ایسی بے نقط سنائی جائے گی کہ حواس باختہ ہو جائیں گے۔ پس اسرار کے دریافت کرنے کی درخواست بھی ایسی ہی درخواست کے مشابہ ہے لو میں نے اسرار کی حقیقت بھی بتلا دی ان کے معلوم کرنے کا طریقہ بھی بتلا دیا اگر کسی کو شوق ہو تو اس طریقے سے عمل شروع کر دے یعنی اطاعت میں لگ جائے میں سچ کہتا ہوں کہ تم ہمارے اس کہنے پر عمل کرنے لگو تو پھر تم کو دریافت کی بھی ضرورت نہ ہوگی خود ہی سب حقائق منکشف ہو جائیں گے اور یہ حال ہوگا ؎

بینی اندر خود علوم انبیاء
بے کتاب و بے معید و اوستا

(اپنے اندر بے کتاب و بے مددگار و استاد کے انبیاء جیسے علوم دیکھو گے)

اور جن کو یہ حقائق حاصل ہوئے ہیں محض عمل اور اطاعت ہی سے حاصل ہوتے ہیں ؎

فہم و خاطر تیز کردن نیست راہ
جز شکستہ می نگیرد فضل شاہ

(عقل و فہم کو تیز کرنا طریق نہیں ہے فضل الٰہی بجز شکستگی کے متوجہ نہیں ہوتا)
یہ اسرار عقل پرستی اور فہم کے تیز کرنے سے معلوم نہیں ہوتے بلکہ شکستگی اور انقیاد سے خدا کا فضل متوجہ ہو جاتا ہے۔ آگے بتلاتے ہیں کہ اس شکستگی پر فضل کس طرح ہو جاتا ہے ؎

ہر کجا پستی ست آب آنجا رود
ہر کجا مشکل جواب آنجا رود

(جس جگہ نیچان ہو اسی طرف پانی رواں ہوتا ہے جہاں مشکل پیش آئی وہاں ہی جواب دیا جاتا ہے)

ہر کجا دردے دوا آنجا رود
ہر کجا رنجے شفا آنجا رود

(جہاں بیماری ہوتی ہے وہیں دوا کا استعمال کیا جاتا ہے اور جہاں مرض ہوتا ہے وہیں شفا جاتی ہے)
پس فضل اطاعت و عبدیت سے ہوتا ہے کہ آدمی اپنے کو فنا کر دے اپنی عقل و فہم کو ناقص سمجھ کر چھوڑ دے۔ فرماتے ہیں ؎

سالہا تو سنگ بودی دلخراش
آزموں را یک زمانے خاک باش

(برسوں تم دل خراش پتھر بنے رہے ہو آزمائش کے طور پر کچھ زمانہ خاک بنکر بھی دیکھ لو)
یعنی عقل کی اطاعت میں سنگدل بنے ہوئے تو بہت دن ہو گئے اس نے کچھ بھی حقیقت نہ بتلائی اب ذرا کچھ دنوں خاک ہو کر دیکھو پھر کیا ہوگا۔ فرماتے ہیں ؎

در بہاراں کے شود سرسبز رنگ
خاک شو تا گل بروید رنگ رنگ

(بہار کے موسم میں پتھر سرسبز نہیں ہوتے خاک بنو تا کہ رنگ برنگ کے پھول اُگیں)

پھر تمہارے اندر عجیب عجیب علوم القا ہوں گے صاحب یہ ہے طریقہ علوم عالیہ حاصل کرنے کا خوب سمجھ لیجئے مگر اس وقت مذاق ایسا فاسد ہوا ہے کہ ہر شخص علوم عالیہ کے در پے ہے اور اپنی عقل سے ان کو دریافت کرنا چاہتا ہے حالانکہ عقل سے تو یہ بھی معلوم نہیں ہوسکتا کہ میں کس کا بیٹا ہوں اور میرا باپ کون ہے۔ کانپور میں ایک جنٹلمین نے اپنے باپ کو لکھا تھا کہ یہ کاہے سے معلوم ہوا کہ آپ میرے باپ ہیں اس کی عقلی دلیل کیا ہے اس نے واقعی درایت پر عمل کیا عقل کا تو مقتضا یہ ہے کہ جاہل کی اولاد بھی جاہل ہی ہو یہ عقل میں کیونکر آسکتا ہے کہ باپ تو جاہل لٹھ ہو اور بیٹا انٹرینس پاس کر کے فلسفی بن جائے دلیل عقلی تو اس کو ثابت کر نہیں سکتی اسی لئے اس نے کہا کہ بتلاؤ کاہے سے معلوم ہوا کہ تم میرے باپ ہو اس کا جواب اگر ہے تو یہی ہے کہ دایہ سے پوچھ لے جس نے تجھے ماں کے پیٹ سے جنایا تھا اور ماں سے پوچھ لے کہ وہ کیونکر حاملہ ہوئی تھی تو یہ عقل تو بڑی نکمی چیز نکلی جس سے باپ کا باپ ہونا بھی ثابت نہیں ہوسکتا یہ ہے خرابی عقل کے اتباع میں اسی لئے کہتے ہیں ؎

آزمودم عقل دور اندیش را
بعد ازیں دیوانہ سازم خویش را

(عقل دور اندیش کو آزمالیا جب اس سے کام نہ چلا تو اپنے کو دیوانہ بنالیا)

دیوانگی سے مراد اطاعت کاملہ ہے جس میں بلا چون وچرا اتباع ہو اگر کوئی اس حالت پر ہنسے تو اس کے جواب میں فرماتے ہیں ؎

ما اگر قلاش وگر دیوانہ ایم
مست آں ساقی وآں پیمانہ ایم

(ہم اگر قلاش و دیوانہ ہیں تو کیا پرواہ ہے یہی کیا دولت کم ہے کہ ہم محبوب حقیقی اور اس کی محبت کے متوالے ہیں)

یعنی جو کوئی ہنسے اس سے کہدو کہ ہماری دیوانگی ہی تمہاری عقل سے اچھی ہے

ہمارے نزدیک تو جو ایسا دیوانہ نہیں ہوا وہی دیوانہ ہے ؎

اوست دیوانہ کہ دیوانہ نشد
مرعسس را دید در خانہ نشد

(جو دیوانہ نہیں وہی دیوانہ ہے جو شخص کوتوال کو دیکھتا ہے گھر میں چلا جاتا ہے اسی طرح جب محبوب حقیقی کا عشق غالب ہوتا تو عقل رفو چکر ہو جاتی ہے)

تو یہ کیسا بھدا مذاق ہے کہ ہر بات کو عقل ہی سے معلوم کرنا چاہتے ہیں پھر اس کا نتیجہ وہی ہو گا جو اس جنٹلمین میں ظاہر ہوا کہ باپ سے بھی دلیل عقلی مانگتا تھا اس کے باپ ہونے پر اور جب یہ لوگ خدا و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بھی عقل سے معارضہ کرتے ہیں تو باپ کے ساتھ کریں تو کیا تعجب ہے مگر افسوس یہ ہے کہ باپ کے ساتھ ایسا معارضہ کیا جائے تو باپ کو بھی ناگوار ہوتا اور وہ ایسے بیٹے کو نالائق سمجھ کر عاق کر دیتا ہے اور دنیا بھی اس کو بُرا بھلا کہتی ہے مگر احکام خدا اور رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ساتھ کوئی یہ برتاؤ کرے تو نہ باپ اسے کچھ کہتا ہے نہ دنیا والے کچھ کہتے ہیں بلکہ اور الٹا ایسے شخص کو عاقل اور فاضل کا خطاب دیتے ہیں۔

صاحبو! کچھ تو انصاف کرو کہ جس عقل کا معاوضہ آپ کو اپنے ساتھ بھی گوارا نہیں وہ معارضہ خدا و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کیونکر گوارا کیا جاتا ہے میں اسی کی شکایت کر رہا تھا کہ بعض لوگوں نے اتباع عقل سے عقائد میں اتنا اختصار کر لیا ہے کہ وہ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ اور مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ کے اعتقاد ہی کو ایمان کے لئے کافی سمجھتے ہیں بقیہ معادیات کی تصدیق کو ایمان کے لئے ضروری نہیں سمجھتے اور بعض نے یہ غضب کیا کہ مُحَمَّدٌ رسول اللہ کو بھی اڑا دیا کیونکہ حدیث میں تو اتنا ہی آیا ہے مَنْ قَالَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ دَخَلَ الْجَنَّةَ (جس نے لا الہ الا اللہ کہا جنت میں داخل ہوا) اس میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قید کہاں ہے چنانچہ انھوں نے کہدیا کہ جو شخص موحد ہو خواہ کسی مذہب کا ہو اور گو رسالت محمدیہ (صلی اللہ علیہ وسلم کا منکر ہو وہ جنتی اور ناجی ہے۔ میں

اس وقت ان لوگوں کا نام نہیں لینا چاہتا مگر ان کے استدلال پر مجھے ایک حکایت یاد آگئی رامپور میں مجھ سے ایک طالب علم نے کسی ضرورت کے لئے وظیفہ پوچھا میں نے کہدیا کہ لاحول کثرت سے پڑھا کرو کچھ دنوں کے بعد وہ پھر ملے اور کہنے لگے کہ میں وظیفہ پڑھتا ہوں مگر نفع نہیں ہوا میں نے ویسے ہی اتفاقاً پوچھ لیا کہ تم نے کیا پڑھا تھا تو آپ کہتے ہیں کہ اسی طرح لاحول لاحول لاحول میں سنے کہا کہ تمہارے اس لاحول پر بھی لاحول تو اگر اس طالب علم کا یہ سمجھنا صحیح تھا تو ان لوگوں کی دلیل بھی صحیح ہو سکتی مگر کون نہیں جانتا کہ لاحول ایک پوری دعا کا پتہ ہے یعنی لَاحَوْلَ وَلَاقُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ الْعَلِیِّ الْعَظِیْمِ کا جیسے بسم اللہ ایک پوری آیت کا پتہ ہے اور الحمد پوری سورت کا اسی طرح قُلْ ھُوَ اللّٰہُ اَحَدٌ۔ یٰسین پوری سورت کا پتہ ہے (اور آکر ایک پورے سیپارہ کا پتہ ہے ۱۲) پس اگر ہم کسی سے یہ کہیں کہ نماز میں الحمد پڑھنا واجب ہے اور یٰس کا ثواب دس قرآن کے برابر ہے اور وہ اس کا یہ مطلب سمجھے کہ صرف لفظ الحمد نماز میں واجب ہے اور اتنا ہی کافی ہے اور محض یٰس یٰس کہنے کا ثواب دس قرآن کے برابر ہے تو بتلایئے وہ احمق ہے یا نہیں اور کیا ہر شخص یہ نہ کہے گا کہ بیوقوف یہ لفظ تو پتہ کے طور پر تھا اور اس سے مراد پوری سورت ہے اسی طرح حدیث میں لا الہ الا اللہ پورے کلمہ کا پتہ ہے بلکہ پوری شریعت کا پتہ ہے اور مطلب حدیث کا یہ ہے کہ جو شخص مسلمان ہو جائے وہ جنتی ہے اب یہ شریعت کے دوسرے مقامات سے پوچھو کہ مسلمان ہونا کسے کہتے ہیں تو معلوم ہوگا کہ اس کے لئے رسالت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اعتقاد بھی شرط ہے اور جنت و دوزخ کا بھی اور ملائکہ کے وجود کا بھی اور تقدیر کے حق ہونے کا بھی اور صراط و وزن وحساب وکتاب کا قائل ہونا بھی اور فرضیت صلوٰۃ وزکوٰۃ وصوم وحج کا اقرار بھی الخ مگر ان عقلمندوں نے اس طالب علم کی طرح صرف لا الہ الا اللہ کو کافی سمجھ لیا۔

بلند شہر میں بھی ایک بڑے عہدہ دار اس خیال کے ساتھ کہ وہ بھی صرف توحید کے قائل ہونے کو نجات کے واسطے کافی سمجھتے تھے میں نے سُن کر ایک تقریر میں کہا کہ جو رسالت کا قائل نہیں وہ توحید کا بھی قائل نہیں بدون اقرار رسالت کے توحید کا تحقق ہی نہیں ہوسکتا کیونکہ توحید کے یہ تو معنے ہیں نہیں کہ خدا تعالیٰ کو صرف ایک مان لے چاہے اس کے ساتھ عیوب سے بھی اس کو متصف مانتا رہے یقیناً اس کو توحید کوئی نہیں کہہ سکتا بلکہ توحید کے معنے یہ ہیں کہ حق تعالیٰ کو تمام عیوب سے منزہ اور تمام کمالات الوہیت کے ساتھ متصف مانے جن میں سے ایک کمال صدق بھی ہے جس سے خدا تعالیٰ کو متصف اور کذب سے منزہ ماننا لازم ہے اور جو شخص منکر رسالت ہے وہ حق تعالیٰ کو کاذب قرار دیتا ہے کیونکہ حق تعالیٰ تو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں اور یہ اس میں خدا تعالیٰ کو صادق نہیں مانتا تو ایک عیب سے خدا کو موصوف مانتا ہے اور یہ توحید نہیں پس منکر رسالت موحد نہیں ہوسکتا (اور قرآن کے کلام الٰہی ہونے پر عقلی ونقلی دلائل ہر وقت قائم کرسکتے ہیں ۱۲) پھر میں نے کہا کہ اس کے جواب کے لئے میں قائل کو دس برس کی مہلت دیتا ہوں آخر میں وہ سمجھ گئے تھے اور اس عقیدہ سے توبہ کرلی تھی اس کے بعد جو ملاقات ہوئی تو اس وقت وہ صحیح عقیدہ پر جمے ہوئے تھے اور اب وہ خیال نہ رہا تھا تو ان بعض نے تو عقائد میں سے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اختصار کیا تھا جن کی غلطی معلوم ہوگئی اور بعض نے عقائد میں تو اختصار نہیں کیا مگر وہ اعمال کا اختصار نہیں کیا مگر وہ اعمال کا اختصار کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ نجات کے لئے مسلمان ہونا کافی ہے اور مسلمان توحید ورسالت کے اقرار سے ہوجاتا ہے پھر اور چیزوں کی کیا ضرورت ہے اور دلیل وہی کہ

مَنْ قَالَ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ اَیْ مَعَ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ۔

صاحبو! یوں تو اس کا حل جواب بہت عمیق ہے مگر میں اس وقت ایک

موٹی سی بات عرض کرتا ہوں وہ یہ کہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ کو کافی سمجھنا ایسا ہے جیسے ایک شخص نے نکاح کے وقت ایجاب وقبول کیا ہو اور جب بیوی اس سے نفقہ وکپڑا مانگے تو کہنے لگے کہ میں نے تو صرف تجھے قبول کیا تھا کھانا کپڑا کب قبول کیا تھا یہ میرے ذمہ نہیں تو بتلایئے کیا اس کی یہ بات قبول کی جائے گی ہرگز نہیں بلکہ ہر شخص یہی کہے گا کہ بیوقوف بیوی کا قبول کرنا نکاح کے سب لوازم کو قبول کرنا ہے اور ساری برادری اس کو احمق بنائے گی۔ صاحبو! اسی طرح لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کہنا تو مذہب کے قبول کرنا ہے یہ بھی محض ایجاب وقبول ہے جس میں سارے لوازم مذہب کا قبول داخل ہے۔ حضرت! یہ سب کم فہمی کی باتیں ہیں جو آجکل کہی جاتی ہیں بلکہ کم فہمی بھی نہیں یوں کہنا چاہیئے کہ کم فہم بن گئے ورنہ کیا وجہ ہے کہ جو برتاؤ خدا ورسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کیا جاتا ہے وہی برتاؤ اور اور برادری کے ساتھ کیوں نہیں کیا جاتا اگر آپ ایسے ہی محقق ہیں کہ بدون لم اور کیف کے کوئی بات مانتے ہی نہیں اور آپ کے نزدیک ہر چیز کا لازم ہونا صراحۃً قبول کرنے پر موقوف ہے تو پھر یہاں نکاح کے معاملہ میں لم اور کیف کیوں نہیں کیا جاتا اور نان ونفقہ کے بدون قبول صریح کے کیوں لازم مان لیا جاتا ہے بلکہ ہونا تو یوں چاہیئے تھا کہ مخلوق کے ساتھ لم اور کیف ہوتا اور خدا کے ساتھ نہ ہوتا مگر اب الٹا معاملہ ہے اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام میں چون وچرا اور بیوی برادری کے معاملہ میں تسلیم ورضا پس حدیث مَنْ قَالَ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ دَخَلَ الْجَنَّۃَ (جس نے لا الہ الا اللہ کہہ لیا وہ جنت میں داخل ہوگا) اسے عدم ضرورت اعمال پر استدلال کرنا محض غلط ہے یہ تو وہ لوگ تھے جو عقاید میں اختصار کرتے اور اعمال کو غیر ضروری سمجھتے تھے ایک جماعت ان کے علاوہ اور پیدا ہوئی جنھوں نے عقائد میں تو اختصار نہیں کیا اور نہ اعمال کو غیر ضروری سمجھا مگر انھوں نے اعمال میں اختصار کیا کچھ اعمال کو لے لیا اور بہت سے اعمال کو چھوڑ دیا بس جو چیز آسان معلوم ہوئی وہ تو

لے لی اور جس میں ذرا سی بھی دقت معلوم ہوئی اس کو اڑا دیا اور اس میں طبائع مختلف ہیں بعض کو عبادات بدنیہ آسان ہیں اور مالیہ مشکل ہیں، انھوں نے نماز اور روزہ تسبیح ونوافل کو اختیار کیا مقدس صورت بنالی مگر وہ ایسے مقدس ہیں کہ نہ حج فرض ادا کرتے ہیں نہ زکوٰۃ دیتے ہیں نہ معاملات میں احتیاط کرتے ہیں ان کا لین دین نہایت خراب ہے اور بعضے ایسے ہیں جن کو مال خرچ کرنا آسان ہے وہ حج بھی کرتے ہیں زکوٰۃ خیرات بھی دیتے ہیں مگر جان کا خرچ کرنا ان کو دشوار ہے اس لئے نماز روزہ سے جان چراتے ہیں اور بعض ایسے ہیں جو طاعات بدنیہ اور مالیہ دونوں کو بجالاتے ہیں مگر انھوں نے طاعات قلب کو چھوڑ رکھا ہے ظاہر میں بڑے مقدس ہیں مگر دل میں تکبر وحسد ریا وعجب بھرا ہوا ہے محبت وخشیت الٰہی برائے نام ہے مگر اس کو وہ ضروری نہیں سمجھتے بعض نے ان اخلاق کا بھی اہتمام کیا مگر ان کی معاشرت گندی ہے ذکر وشغل کرتے ہیں مگر اس کا اہتمام نہیں کہ ہمارے ہاتھ سے دوسروں کو ایذا نہ پہونچے غرض ہر ایک کو جو بات آسان لگی وہ تو لے لی اور جس میں کچھ محنت کرنی پڑی اس کو چھوڑ دیا۔ میں تو کہا کرتا ہوں کہ آجکل سائنس کی ترقی ہے ہر چیز کا ست نکالا جاتا ہے تو ہمارے بھائیوں نے بھی اعمال کا ست نکالا مگر صاحبو! ست کا ست نہیں نکلا کرتا۔ دین تو سارا کا سارا خود ہی ست ہے اس کا ہر جزو ضروری ہے اب آپ دوبارہ اس کا ست نہیں نکال سکتے اور اگر نکالوگے تو وہ ست نہ ہوگا بلکہ اجزاء ضروریہ کو فوت کرنا ہوگا جیسے کوئی شخص انسان کا ست نکالنا چاہے کہ اس کا ایک ہاتھ کاٹ دے اور ایک پیر اور ایک آنکھ پھوڑ دے اور ایک کان بند کردے تو کیا اس کو ست کہا جائے گا ہرگز نہیں بلکہ یہ کہا جائے گا کہ اس نے ضروری اجزا کو حذف کرکے ایک آدمی کو بیکار بنا دیا یہی حال ہمارے بھائیوں نے دین کا بنا رکھا ہے کسی نے یہ کیا کہ اعمال تو بہت اچھے مگر عقائد میں کتاب وسنت کو چھوڑ کر رسوم بدعت کو داخل کرلیا اور اپنے کو دیندار سمجھتے ہیں بعض نے عقائد کو سنت کے موافق رکھا اور اعمال میں نہایت کوتاہی

کی اور ان کو اپنے متبع سنت ہونے کا ناز ہے غرض یہ مختلف فرقے ہمارے اندر پیدا ہو گئے اور ساری خرابی کا منشا یہ ہے کہ لوگوں نے دین کے اجزاء کو پوری طرح نہیں سمجھا تو غور سے سن لیجئے کہ دین کے پانچ اجزاء ہیں ایک جزء تو ہے عقائد کا کہ دل سے اور زبان سے یہ اقرار کرنا کہ اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس چیز کی جس طور پر خبر دی ہے وہی حق ہے اس کی تفصیل کتب عقائد سے معلوم ہوگی) دوسرا جزء عبادات ہیں یعنی نماز روزہ زکوٰۃ و حج وغیرہ تیسرا جزء و معاملات ہیں یعنی احکام نکاح و طلاق و حدود و کفارات و بیع و شراء و اجارہ و زراعت وغیرہ اور ان کے جزء و دین ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ شریعت یہ سکھاتی ہے کہ کھیتی یوں بویا کرو اور تجارت فلاں فلاں چیز کی کیا کرو بلکہ ان میں شریعت یہ بتلاتی ہے کہ کسی پر ظلم و زیادتی نہ کرو اور اس طرح معاملہ نہ کرو جس میں نزاع کا اندیشہ ہو غرض جواز و عدم جواز بیان کیا جاتا ہے چوتھا جزء و ہے معاشرت یعنی اوٹھنا بیٹھنا ملنا جلنا، مہمان بننا کسی کے گھر پر جانا کیونکر چاہیئے اور اس کے کیا آداب ہیں بیوی بچوں عزیزوں اور اجنبیوں اور نوکروں وغیرہ کے ساتھ کیونکر برتاؤ کرنا چاہیئے۔ پانچواں جزء جس کا نام ڈراؤنا ہے تصوف ہے اور ڈراؤنا اس لئے ہے کہ آجکل لوگوں نے یہ سمجھ لیا ہے کہ تصوف کے لئے بیوی بچوں کو چھوڑنا پڑتا ہے تو خوب سمجھ لیجئے کہ یہ بالکل غلط ہے یہ جاہل صوفیوں کا مسئلہ ہے جو تصوف کی حقیقت کو نہیں جانتے غرض یہ پانچواں جزء ہے جس کو شریعت میں اصلاح نفس کہتے ہیں تو یہ پانچ اجزاء دین کے ہیں ان پانچوں کے مجموعہ کا نام دین ہے اگر کسی میں ایک جزء بھی ان میں سے کم ہو تو وہ ناقص الدین ہے جیسے کسی کے ایک ہاتھ نہ ہو تو وہ ناقص الخلقت ہے اب دیکھ لیجئے کہ ہم نے ان پانچوں کا کتنا اہتمام کر رکھا ہے حالت یہ ہے کہ بعض نے تو عقائد و عبادات کو کم کر رکھا ہے اور بعض میں معاملات کی کمی ہے اور معاملات کی تو یہ حالت ہے کہ بڑے بڑے اتقیاء معاملات کو دین ہی نہیں سمجھتے چنانچہ برتاؤ سے یہ بات معلوم ہو جاتی ہے وہ برتاؤ یہ ہے کہ نماز و روزہ کے مسائل تو مولویوں سے پوچھے جاتے ہیں مگر معاملات کو کوئی اکثر نہیں پوچھتا مثلاً کوئی گانوں خریدیں یا کسی مورث کے مرنے کے بعد تقسیم جائداد کا قصہ ہو تو اس میں آپنے کہیں نہ دیکھا ہوگا کہ دستاویز نہ علماء کو بلا کر دکھائی جاتی ہو کہ دیکھئے اس میں

(بقیہ ملاحظہ ہو)

کوئی بات خلاف شرع تو نہیں اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ معاملات کو دین ہی نہیں سمجھتے حالانکہ معاملات کا دین میں داخل ہونا بالکل بدیہی ہے قرآن میں آیت مداینہ کو دیکھئے صرف قرض لینے کے کتنے احکام بیان فرمائے ہیں۔ چنانچہ ارشاد ہے کہ جب تم مدت معلومہ کے لئے ادھار قرض کا معاملہ کیا کرو تو اسے لکھ لیا کرو اور خود لکھنا نہ جانتے ہو تو کسی سے لکھوا لیا کرو۔ اور کاتب کے لئے حکم ہے وَلَا يَأْبَ كَاتِبٌ أَنْ يَكْتُبَ كَمَا عَلَّمَهُ اللّٰهُ فَلْيَكْتُبْ کہ لکھنے والا لکھنے سے انکار نہ کرے بلکہ لکھدیا کرے اگر لکھنے والا کوئی نہ ہو تو حکم ہے کہ دو آدمیوں کو گواہ بنا دو اور گواہوں کو ضرورت کے وقت گواہی دینا لازم ہے کتمان سے گناہ ہوگا جس پر وعید مذکور ہے۔

اسی طرح اور بہت سے معاملات کے احکام قرآن میں موجود ہیں اور احادیث میں تو بہت ہی زیادہ ہیں پھر فقہ میں تو اتنی تفصیل ہے کہ کوئی قانون بھی اس سے زیادہ مفصل نہیں ہو سکتا اس سے تو ان لوگوں کا جواب نکل آیا جو معاملات کو دین میں داخل تو سمجھتے ہیں مگر وہ علماء پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ ان کو سوائے لا یجوز (ناجائز ہے) کے کچھ نہیں آتا۔ کوئی دستاویز ان کو دکھلاؤ تو ناجائز۔ کسی ملازمت کو دریافت کرو تو ناجائز بس مولوی صاحب نے تو ایک لَا يَجُوْزُ (یہ ناجائز ہے) کا سبق پڑھ لیا ہے یہ تو ایک عام الزام ہے بعض نے اس سے بڑھ کر یہ کیا کہ مذہب ہی بڑا سخت ہے (پہلی جماعت تو علماء ہی کو الزام دیتی تھی انھوں نے خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی الزام لگا دیا ۱۲) میں ان لوگوں کے اقوال کی کیا حکایت کروں ڈر بھی لگتا ہے اور غصہ بھی آتا ہے۔

لکھنؤ میں ایک کمیٹی ہوئی تھی جس میں سب مسلمان ہی جمع ہوئے تھے اور اس بات کی تحقیق کی جا رہی تھی کہ مسلمانوں کے تنزل کا کیا سبب ہے بالآخر یہ طے کیا گیا کہ تنزل کا اصل سبب اسلام ہی ہے۔ صاحبو! یہ وہ لوگ ہیں جن کا دعویٰ یہ ہے کہ ٹھیٹ اسلام ہمارا ہی اسلام ہے اور ہم ہی حامی اسلام ہیں ان کی تجویز یہ ہے کہ مذہب اسلام ہی تنزل کا سبب ہے افسوس وہ اسلام جس کی بدولت حضرات صحابہؓ کو وہ ترقی حاصل ہوئی تھی کہ عالم میں

ضروری اطلاع:۔ اگر کسی صاحب کو اپنا پتہ بدلوانا ہو تو خط و کتابت کرتے وقت اپنا خریداری نمبر ضرور تحریر کیا کریں۔

اس کی نظیر نہیں مل سکتی آج اس کو تنزل کا سبب کہا جاتا ہے۔ بخدا ان لوگوں نے اسلام کو سمجھا ہی نہیں عمل تو درکنار جن لوگوں نے اسلام کو سمجھا اور اس پر عمل کیا تھا ان کو تو کبھی تنزل ہُوا ہاں جو اُس پر عمل ہی نہ کریں ان کو تنزل ہونے لگے تو اس کا کیا علاج مگر اس کا سبب اسلام ہوگا یا ترک اسلام ۱۲) ان لوگوں کی صحبت کا یہ اثر ہے کہ میں ایک دفعہ بریلی گیا تھا تو وہاں ایک بوڑھے میاں اپنے پوتے کو میرے پاس لائے کہ یہ نماز نہیں پڑھتا اسے کچھ نصیحت کر دیجئے میں نے اس سے پوچھا کہ بھائی تم نماز کیوں نہیں پڑھتے تو وہ کہنے لگا کہ مجھے تو خدا کے وجود ہی میں شک ہے نماز کس کی پڑھوں اور یہ کہکر اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے میں نے بوڑھے میاں سے کہا کہ تم کو نماز کی فکر ہے صاحبزادے کو تو ایمان بھی نصیب نہیں پہلے اس کی فکر کرو وہ مجھ ہی سے اس کی تدبیر پوچھنے لگے میں نے کہا کہ یہ کس جگہ تعلیم پاتا ہے معلوم ہوا کہ مسلمانوں کے ایک کالج میں پڑھتا ہے میں نے کہا کہ آپ اس کو بجائے کالج کے کسی گورنمنٹ اسکول میں داخل کر دیجئے۔ اس وقت تو ان کی سمجھ میں یہ علاج نہ آیا مگر انھوں نے اسی کے موافق عمل کیا اگلے سال جو میں گیا تو معلوم ہوا کہ لڑکا بڑا پکا مسلمان ہے اور نماز بھی خوب پڑھتا ہے۔ اس وقت لوگوں نے مجھ سے اس کی وجہ دریافت کی کہ کالج میں رہ کر اسکا اسلام کیوں کمزور ہوا اور گورنمنٹی اسکول میں داخل ہوکر کیسے محفوظ ہو گیا حالانکہ اس کالج میں سب لڑکے مسلمان ہی ہیں وہاں تو اسلام کو قوت ہونا چاہیئے تھی اور گورنمنٹی اسکول میں ہندو مسلمان سب قسم کے ہوتے ہیں میں نے کہا کہ کالج میں جتنے بھی مسلمان ہیں سب آزاد ہیں اور وہاں رات دن ایسے ہی لوگوں کی صحبت ہے وہی مشغلہ ہے تو حالت بھی وہی ہو جاتی ہے جو سب کی ہے کیونکہ ان سے نفرت کی کوئی وجہ نہیں ہوتی ظاہر میں سب مسلمان معلوم ہوتے ہیں اس لئے ان کے خیالات اور صحبت کا اثر جلدی ہوتا ہے اور گورنمنٹی اسکول میں چونکہ مسلمان لڑکوں کو ہندوؤں کے مذہب سے دلی نفرت ہے اس لئے ان کی صحبت کا مذہب پر برا اثر نہیں پڑتا اور نفرت کی وجہ سے چونکہ مقابلہ رہتا ہے اس لئے مقابلہ آکر یہ اپنے مذہب پر پہلے سے زیادہ مضبوط ہو جاتے ہیں اس سے معلوم ہوا ہوگا کہ مولوی انگریزی پڑھانے سے منع نہیں کرتے بلکہ عقائد کے بگاڑنے سے روکتے ہیں۔

بعض لوگ اس کا جواب دیا کرتے ہیں کہ ہم تو انگریزی کے ساتھ اب دین کی تعلیم بھی دینے لگے ہیں تو اب تو اس سے منع نہ کرنا چاہیئے مگر صاحبو! محض دین کی تعلیم دینا کافی نہیں کیونکہ دین کی تعلیم دینے والے بھی تو وہی لوگ ہیں جن کے خیالات آزادی کی طرف مائل ہیں بلکہ تعلیم دین کے ساتھ صحبت نیک بھی ضرور تجویز کرنا چاہیئے اگر وہ بھی کچھ نہ ہو تو کم از کم تعطیلوں ہی میں ان لڑکوں کو کسی محقق کی صحبت میں بھیجدیا کیجئے میں یہ نہیں کہتا کہ آپ دین کے لئے اپنا قیمتی وقت صرف کریں کیونکہ اتنی ہمت کی آپ سے مجھے امید نہیں کیونکہ آجکل ہماری حالت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے لئے خراب سے خراب چیزیں تجویز کی جاتی ہیں تو آپ اپنا اچھا وقت خدا کے لئے کیوں صرف کریں گے اس پر مجھے ایک حکایت یاد آئی کہ ایک عورت نے کھیر پکا کر رکابی میں نکال کر رکھدی اتفاق سے اس رکابی میں کتا منہ ڈال گیا تو اس نے مٹی کی دوسری رکابی میں اسے نکال کر اپنے لڑکے کو دی کہ مسجد کے ملا کو دے آ وہ ملاجی کے پاس لایا تو وہ بڑے خوش ہوئے اور فوراً ہاتھ مارنے لگے اور ادھر ہی سے منہ مارا جدھر سے کتے نے کھائی تھی لڑکے نے کہا کہ ادھر سے نہ کھاؤ ادھر سے کتے کی کھائی ہوئی ہے۔ یہ سن کر تو ملاجی جھلا گئے اور رکابی کو بہت دور پھینکا وہ پھوٹ گئی تو بچہ رونے لگا کہ ہائے میری ماں مارے گی۔ ملاجی نے کہا کہ ابے مٹی ہی کی تو تھی کہنے لگا اجی میری ماں میرے چھوٹے بھائی کو اس میں ہگایا کرتی تھی یہ سن کر تو ملاجی کو متلی ہونے لگی (کہ ظرف و مظروف دونوں ہی تو برے تھے ۱۲) یہ حالت ہے ہم لوگوں کی اللہ کے واسطے خراب اور ناپاک چیزیں تجویز کرتے ہیں پھر غضب یہ کہ مسجد کے ملاؤں کے ساتھ خود ہی تو یہ برتاؤ کرتے ہیں اور خود ہی ان کو ذلیل سمجھتے ہیں ارے بھائی جب تم اپنے آپ اچھے سے اچھا کھاؤ اور ان کو کبھی نہ پوچھو اور جو پوچھو بھی تو ایسے وقت جبکہ تم خود نہ کھا سکو تو بتلاؤ وہ حریص ہوں گے یا نہیں پھر تنخواہ ان کی ایسی قلیل مقرر کی جاتی ہے جس میں روکھی روٹی بھی وہ نہیں کھا سکتے تو پھر وہ حریص نہ ہوں تو اور کیا ہوں اسی لئے میں تو

کہا کرتا ہوں کہ جب محلہ میں کوئی رئیس بیمار ہوتا ہے تو مسجد کے موذن تو اس کی صحت کے لئے ہرگز دعا نہ کرتے ہوں گے وہ تو یہ چاہتا ہوگا کہ اچھا ہے یہ مرے تو تیجے دسویں چالیسویں کو فاتحہ کا کھانا خوب فراغت سے ملے گا کیونکہ خوشی میں ان کو کون پوچھتا ہے ایسے ہی مواقع میں پوچھا جاتا ہے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ وہ ان مواقع کے منتظر رہیں گے اور اس حرص کی یہاں تک نوبت پہونچ گئی ہے کہ کیرانہ میں ایک شخص کا انتقال ہوا تو کفن کا چادرہ لوگوں نے قبرستان کے تکیہ دار کو نہ دیا کسی دوسرے غریب کو دے دیا وہ تکیہ دار جھگڑنے لگا کہ یہ تو میرا حق ہے لوگوں نے کہا بھائی ہمیشہ تم کو دیا جاتا ہے آج اس غریب کو دینے دو تو وہ تکیہ دار کیا کہتا ہے کہ واہ حضور خدا خدا کرکے تو یہ دن آتا ہے اسی میں آپ ہمارا حق دوسروں کو دیتے ہیں لوگوں نے کہا کمبخت کیا تو اس دن کا متمنی رہتا ہے کہ کوئی مرے تو تجھے کپڑا ملے جو یہ دن تیرے لئے خدا خدا کرکے آتا ہے وہ بات بنانے لگا مگر دل کی بات زبان پر آ ہی گئی تو صاحبو! اس کی بھی کیا خطا جب تم اس وقت کے سوا کبھی بھی اسے نہ پوچھو جب اسکی آمدنی یوں ہی ٹھہری تو وہ تو اسی کا وظیفہ پڑھے گا غرض چونکہ ہماری حالت یہ ہے کہ ہم خدا کی راہ میں نکمی ہی چیز دیا کرتے ہیں اس لئے میں وقت کے بارہ میں بھی یہی کہتا ہوں کہ یہ تعطیل کا نکما اور فالتو وقت خدا کی راہ میں نکال دو اور اگر سارا وقت نہیں دے سکتے تو کم از کم آدھا ہی دے دو اور اس وقت میں بچوں کو محقق کی صحبت میں بھیجدیا کرو کیونکہ ؎

دین ہوتا ہے بزرگوں کی نظر سے پیدا

محض کتابیں پڑھانے سے دین پیدا نہیں ہوتا بلکہ اس کے لئے صحبت صالحین کی بھی بہت ضرورت ہے پس میں انگریزی پڑھانے سے منع نہیں کرتا بلکہ یہ کہتا ہوں کہ تم علماء سے پوچھکر اپنے لڑکوں کے دین سنبھالنے کا بھی کوئی انتظام کرو چنانچہ میں نے اس لڑکے کی اصلاح کا طریقہ بتلایا اور بحمداللہ نفع ہوا اب تو لوگ علماء سے اس لئے نہیں دریافت کرتے کہ یوں سمجھ رکھا ہے کہ وہ سب سے

پہلے انگریزی کو حرام بتائیں گے حالانکہ ان کو دنیا سے کچھ ضد تھوڑا ہی ہے وہ تو یہ چاہتے ہیں کہ آپ دنیا کمائیں مگر دین برباد نہ ہو رہی یہ بات کہ مولویوں نے لایجوز ہی کا سبق پڑھا ہے اس کا جواب یہ ہے کہ جب آپ ساری باتیں چھانٹ چھانٹ کر ایسی ہی پوچھیں گے جو ناجائز ہوں تو ان کا جواب لایجوز کے سوا کیا ہوگا صاحب اس کے بعد ان سے یہ بھی تو پوچھیے کہ تجارت و زراعت کے جائز طریقے کتنے ہیں اور ملازمتیں جائز کون کون سی ہیں پھر دیکھیے وہ جائز کا کتنا وسیع دفتر آپ کے سامنے کھولتے ہیں وسعت قانون کے معنے یہ نہیں ہیں کہ اس میں ممنوعات بالکل نہ ہوں ایسا تو کوئی بھی قانون نہ ہوگا اور اگر کوئی قانون اس شان کا ہو بھی تو وہ قانون کہلانے کا مستحق نہیں بلکہ وسعت قانون کے معنے یہ ہیں کہ اس میں ممنوعات کی فہرست کم ہو اور جائزات کی فہرست زیادہ ہو تو آپ قانون شرع کو بغور مطالعہ کریں تو معلوم ہو جائے گا کہ ہر باب کے اندر اس میں ممنوعات کم اور مباحات زیادہ ہیں لیکن اگر کوئی تمام صورتوں میں سے ممنوعات ہی انتخاب کر کے سوال کرنے لگے تو ظاہر ہے کہ سب کے جواب لایجوز ہی کہا جائیگا۔ پھر اگر بالفرض یہ مان لیا جائے کہ علماء نے لایجوز ہی کا سبق یاد کر لیا ہے تب بھی ان سے پوچھ لینے میں آپ کا نفع ہی ہے گو ان کے لایجوز کہنے سے اس عمل کو ترک نہ کیا جائے وہ یہ کہ اگر آپ بدون پوچھے عمل ترک کرتے تو شاید حرام کو جائز سمجھ کر کرتے اور اب ناجائز سمجھ کر کریں گے پہلی صورت میں گناہ کر کے اپنے کو گنہگار بھی نہ سمجھتے اور یہ حالت زیادہ خطرناک ہے اور دوسری صورت میں آپ اپنے کو گنہگار تو سمجھیں گے اور اس میں امید ہے کہ شاید کسی وقت توبہ کی توفیق ہو جاوے یہ تو معاملات کی حالت تھی اور بعض نے اگر لین دین کے اس جزو کو بھی درست کر لیا تو اس نے معاشرت کو خراب کر رکھا ہے پھر بعض نے تو یہ کیا کہ گو تہذیب قدیم کو نہیں لیا مگر تہذیب جدید کو بھی نہیں لیا اور بعض نے تہذیب قدیم کو چھوڑ کر تہذیب جدید کو لے لیا میں کہتا ہوں کہ اس میں جواز و ناجواز کی بحث تو الگ رہی اس سے قطع نظر کر کے ایک دوسری خرابی یہ ہے کہ یہ لوگ رات دن جس قومیت کا سبق رٹا کرتے ہیں کہ

ہر تقریر و تحریر میں ان کی زبان و قلم پر قوم قوم کا لفظ چڑھا ہوا ہے۔ تہذیب جدید کے اختیار کرنے میں اس قومیت کا ابطال ہے کیونکہ ہر قوم کا ایک خاص امتیاز ہوتا ہے اور اس امتیاز کو باطل کرنا قومیت کا ابطال ہے تو عجیب بات ہے کہ زبان سے تو یہ اپنے کو حامی قوم اور ہمدردی قوم ثابت کرتے ہیں اور طرزِ عمل سے قومیت کی جڑیں اکھاڑتے ہیں کہ ان کی صورت سے اور بات سے کوئی اسلامی امتیاز ظاہر ہی نہیں ہوتا بلکہ اپنی قوم سے جدا معلوم ہوتے ہیں بس ان کی وہ حالت ہے ؎

یکے بر سر شاخ و بن می برید
خداوند بستاں نگہ کرد و دید

(ایک شخص شاخ کی جڑ میں بیٹھا ہوا شاخ کاٹ رہا تھا مالک باغ نے نگہ ڈالی اور کہا)

علاوہ ازیں دوسری قوم کی معاشرت اختیار کرنا گویا اس بات کا اقرار ہے کہ (نعوذ باللہ) اسلام میں معاشرت نہیں ہے یا ہے تو عمدہ اور کافی نہیں ہے۔ ورنہ پھر یہ لوگ دوسری قوموں کی معاشرت کیوں اختیار کرتے ہیں واللہ اسلام میں تو معاشرت ایسی ہے کہ کہیں بھی اس کی نظیر نہیں مگر معاشرت اس کو نہیں کہتے کہ باجا بھی ہو اور تکلفات بھی ہوں (اور تکبر کا سامان بھی ہو کیونکہ تکبر اور تکلف تو معاشرت کی جڑیں اکھاڑتا ہے اس لئے کہ متکبر دوسروں سے بڑا بن کر رہتا ہے پھر دوسروں کے ساتھ مساوات اور ہمدردی کہاں رہی اسلام میں معاشرت کی تعلیم اس طرح دی گئی ہے جس سے انسان میں تواضع پیدا ہو اور تجربہ کر لیا جائے کہ بدون تواضع کے ہمدردی اور اتفاق پیدا نہیں ہو سکتا اور یہی معاشرت کی جڑ ہے بس ۱۲) اصل معاشرت اسلام ہی میں ہے مثلاً کھانے پینے میں اسلامی معاشرت سنئے کہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زبان سے بھی ارشاد فرمایا ہے اور کرکے بھی دکھلایا ہے اٰکُلُ کَمَا یَاکُلُ الْعَبْدُ کہ میں تو اس طرح کھاتا ہوں جیسے غلام کھایا کرتا ہے۔ آپ کی عادت تھی کہ جھک کر اوکڑو بیٹھ کر کھانا کھاتے تھے۔ اب ہمارے بھائیوں کی نشست ملاحظہ ہو جو سراسر متکبرانہ ہے۔ اس کے بعد یہ دیکھئے کہ عقل کے قریب کونسا طریقہ ہے اس کو ایک مثال میں سمجھئے میں پوچھتا ہوں کہ آپ جارج پنجم کے دربار میں جاویں اور وہاں آپ کو کوئی چیز کھانے کے لئے دی جائے اور حکم ہو کہ ہمارے سامنے کھاؤ تو بتلایئے اس وقت آپ کس طرح کھائیں گے۔ کیا وہاں بھی آپ میز کے منتظر ہوں گے اور پالتھی مار کر بیٹھیں گے یا غلاموں کی طرح جھک کر کھائیں گے۔ اور لیجئے کہ اس وقت جو چیزیں آپ کو دی جائیں اگر ان میں سے کوئی شے مرغوب نہ ہو تو انصاف سے کہئے کہ آپ اس کو بے رغبتی ظاہر کرکے ناز و انداز سے کھائیں گے یا رغبت سے کھائیں گے، یقیناً آپ رغبت ظاہر کرکے کھائیں گے۔ بے رغبتی ہرگز ظاہر نہ ہونے دیں گے۔ بس یہی اسلامی تہذیب ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حالت تھی کہ کَانَ یَاکُلُ اَکْلاً ذَرِیْعًا کہ آپ (رغبت ظاہر کرکے) جلدی جلدی کھاتے تھے مگر ہم لوگوں کی یہ حالت ہے کہ نہایت ہی ناز و انداز سے کھاتے ہیں۔ حضرت یہ ساری باتیں اس وقت تک ہیں جب تک حقیقت منکشف نہیں ہوئی اور اگر حقیقت کھل جائے اور معلوم ہو جائے کہ احکم الحاکمین کے دربار سے ہم کو یہ چیز کھانے کے لئے ملی ہے اور وہ ہم کو دیکھ رہے ہیں تو پھر خودبخود یہی طرز اختیار کرنا پڑے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بتلایا ہے۔

چنانچہ اسی مثال میں غور کر لیجئے کہ آپ جارج پنجم کے عطیہ کو اس کے سامنے بے رغبتی اور بے پروائی سے کھائیں گے یا نہایت رغبت سے اور

لیجئے حدیث میں ہے کہ اگر لقمہ گر پڑے تو اس کو صاف کر کے کھالو اس کو بعض متکبر تہذیب کے خلاف سمجھتے ہیں مگر میں اسی مثال میں پوچھتا ہوں کہ اگر جارج پنجم کی دی ہوئی چیز میں سے کچھ گر پڑے تو آپ کیا کریں گے کیا اس کو ویسے ہی چھوڑ دیں گے یا اٹھا کر سر پر دھریں گے۔ حضرت سارے مرحلے یہیں طے ہو جاتے ہیں جبکہ قلب میں کسی کی عظمت ہو بس فرق یہ ہے کہ ہم لوگ یہ بات نہیں دیکھتے کہ اللہ تعالےٰ دیکھ رہے ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس کو دیکھتے تھے اگر ہماری بھی آنکھیں کھل جائیں تو وہی کرنے لگیں جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا ہے اور جہاں جا کر یہ آنکھیں کھلتی ہیں اور کسی کی عظمت دل میں مستحضر ہوتی ہے وہاں اب بھی آپ کا یہی برتاؤ ہے تو جبکہ اسلام میں معاشرت علی وجہ اتم موجود ہے تو پھر دوسروں سے کیوں لیتے ہو غیرت اور حمیت (اور دعویٰ قومیت) کا مقتضا تو یہ تھا کہ اگر اسلامی معاشرت ناتمام بھی ہوتی جب بھی آپ دوسروں کی معاشرت اختیار نہ کرتے چنانچہ کسی نے کہا ہے ؎

کہن خرقۂ خویش پیراستن
بہ از جامہ عاریت خواستن

(اپنی پرانی گدڑی پہننا مانگے ہوئے کپڑے سے بہتر ہے)

اپنا تو پرانا کمبل بھی دوسروں کی شال سے زیادہ عزیز ہوا کرتا ہے۔ نہ یہ کہ اپنے پاس دوشالہ موجود ہے اور تم اس کو اتار کر دوسروں کا پھٹا ہوا کمبل اوڑھتے ہو۔ اسی طرح لباس میں بھی ہمارے بھائیوں نے دوسروں کی معاشرت اختیار کر لی ہے حالانکہ اسلامی معاشرت کے برابر لباس میں بھی کوئی معاشرت نہیں ہو سکتی کتنی کھلی ہوئی بات ہے کہ اسلام میں لباس کے متعلق ماذونات کی فہرست بڑی اور ممنوعات کی چھوٹی ہے اور ہمارے بھائیوں کی معاشرت میں ماذونات کی فہرست تنگ اور

ممنوعات کی بڑی ہے حیرت کی بات ہے کہ آپ رات دن وسعت وسعت پکارتے ہیں اور علماء کو رائے دیتے ہوئے یہ کہتے کہ معاشرت میں تنگی نہ ہونا چاہیئے اور طرز عمل یہ ہے کہ آپ نے ایسی معاشرت اختیار کر رکھی ہے جس میں سراسر تنگی ہے بھلا جس میں ماذونات کم اور ممنوعات زیادہ ہوں وہاں وسعت کہاں آپ خود ہی تو ایک قاعدہ بناتے ہیں کہ وسعت ہونی چاہیئے اور خود ہی اس کو توڑتے ہیں اور یہاں سے معلوم ہوا ہوگا کہ درحقیقت آزادی شریعت ہی کی معاشرت میں ہے کیونکہ اس میں ماذونات زیادہ اور ممنوعات وقیود کم ہیں برخلاف جدید معاشرت کے کہ اس میں سراسر تنگی ہی تنگی ہے یہ لوگ اس وقت تک کھا نہیں سکتے جب تک کرسی اور میز نہ ہو اور ہم لوگ پلنگ پر کھالیں بستر پر کھالیں بوریئے پر کھالیں بلکہ زمین پر بھی کھالیں ہمارے لئے کوئی قید نہیں بتلایئے آزادی کی حالت میں کون ہے۔ اب جدید معاشرت کو دیکھیے میں ایک مرتبہ اپنے بھائی کے یہاں کھانا کھا رہا تھا تو ہم لوگ فرش پر بیٹھے ہوئے کھا رہے تھے اس وقت ایک جنٹلمین بھی مہمان تھے وہ کھانے کے لئے اس حلیہ سے آئے کہ کوٹ پتلون میں جکڑے ہوئے تھے بیچارے آکر کھڑے ہوگئے اور اس کے منتظر رہے کہ شاید میرے واسطے کرسی لائی جاوے مگر بھائی نے میری وجہ سے کرسی وغیرہ کا انتظام نہ کیا دیر تک وہ کھڑے رہے مجھے شرم بھی آئی کہ ایسے کھڑے ہیں جیسے کوئی مانگنے آیا ہو بالآخر وہ بہ تکلف اس طرح بیٹھے کہ دونوں پیر ایک طرف لمبے کر دیئے اور دھم سے گر پڑے اور کہنے لگے کہ معاف فرمایئے گا میں پیر لمبے کرنے پر مجبور ہوں میں نے کہا کہ معاف فرمایئے گا میں کرسی پر کھانے سے معذور ہوں۔ ان کو پیر لمبے کرنے سے شرم آتی تھی اور مجھے کرسی پر کھانے سے شرم آتی میری شرم ایسی تھی جیسے علامہ تفتازانی کی شرم تھی اور ان کی شرم تیمور لنگ جیسی تھی واقعہ یہ ہے کہ تیمور لنگ دربار میں پیر پھیلا کر بیٹھا تھا کیونکہ اس کا ایک پیر بوجہ لنگ کے سیدھا نہ ہوتا تھا علامہ تفتازانی اس کے زمانہ میں بہت بڑے عالم تھے تیمور ان کی اتنی وقعت کرتا تھا کہ دربار میں ان کو اپنے پاس تخت پر بٹھلاتا تھا جب

پہلی مرتبہ علامہ تفتازانی دربار میں بلائے گئے اور تیمور نے ان کو تخت پر بٹھلایا تو یہ بھی تیمور کی طرح ایک پیر لمبا کر کے بیٹھے تیمور نے ناگواری سے کہا معذور دارکہ مرا لنگ ست یعنی مجھے معذور سمجھے کیونکہ میرے پیر میں لنگ ہے میں نے قصداً پیر لمبا نہیں کیا جس کا آپ نے مقابلہ کیا ہے علامہ نے جواب دیا معذور دارکہ مرا ننگ ست یعنی آپ بھی مجھے معذور سمجھئے کیونکہ مجھے ننگ و عار آتا ہے کہ ظاہر میں بادشاہ کی وضع سے کمتر وضع اختیار کروں کیونکہ اس میں دیکھنے والوں کی نظر میں علم کی تحقیر ہے تیمور خاموش ہوگیا پھر ہمیشہ یہی دستور رہا کہ علامہ پاؤں پھیلا کر ہی تخت پر بیٹھتے تھے اسی لئے میں نے بھی ان حضرات کے لئے کرسی نہ منگوائی کیونکہ اس میں اسلامی معاشرت کی توہین تھی میں نے کہا اچھا ہے ذرا آج یہ اپنی معاشرت کا مزا تو چکھیں کہ اس میں کتنی مصیبت ہے تو یہ کیا آزادی ہے کہ انسان بدون کرسی اور میز کے بیٹھ ہی نہ سکے۔ ایک دفعہ میں کانپور میں مسجد میں حدیث شریف پڑھا رہا تھا کہ ایک انسپکٹر پولیس جو کہ جنٹلمین تھے اسی طرح کوٹ پتلون میں جکڑے ہوئے تشریف لائے اور لب فرش کھڑے منتظر کھڑے رہے کہ یہ اٹھ کر میرے پاس آئے اور میں باتیں کروں مگر میں حدیث کو ان کے لئے کیوں چھوڑتا بالآخر تھوڑی دیر کھڑے رہ کر چل دیئے۔ واللہ اس لباس سے زیادہ کیا جیلخانہ ہوگا جس میں کرسی کے آنے تک انسان کو مجرموں کی طرح کھڑا رہنا پڑے تو میں اس وقت جائز و ناجائز سے بحث نہیں کرتا یہ تو دوسری بات ہے ان سب سے قطع نظر کر کے میں کہتا ہوں کہ دوسری قوموں کی معاشرت اختیار کر کے وہ امتیاز قومی کہاں رہا جس کے یہ لوگ بڑے مدعی ہیں اور اسلام کی وقعت کہاں رہی جس کے حامی اور خادم ہونے کا ان کو دعویٰ ہے کیا اسلام کی یہی وقعت ہے کہ تم دوسروں کی معاشرت اختیار کر کے زبان حال سے اسلامی معاشرت کا ناکافی ہونا ظاہر کرو نیز اس میں یہ خرابی الگ ہے کہ جس میں معاشرت کو آپ لے رہے ہیں اس میں تنگی اور قید بہت زیادہ ہے کہ ایک چیز کو دوسری لازم اور اس کو تیسری چیز لازم ان قیود کی پابندی میں وہ آزادی کہاں رہی جس کا آپ سبق پڑھا کرتے ہیں آجکل ہمارے نوجوان آزادی کا سبق پڑھ کر شادی بیاہ کی رسموں کو منع کرنے لگے ہیں مگر میں نے ایک موقع پر کہا تھا کہ یہ ہمارے لئے خوش کن بات نہیں کیونکہ آپ ان رسموں کو اپنی رسموں کے پورا کرنے کے لئے منع کرتے ہیں خدا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ممانعت کی وجہ سے منع نہیں کرتے البتہ رسوم کو رد کرنا علماء کا حق ہے جن کا مذہب ہے تَرَكْتُ اللَّاتَ وَالْعُزّٰى جَمِيْعًا میں نے لات اور عزی

بتوں کو چھوڑ دیا) اور لیجئے سلام وکلام میں بھی ہمارے بھائیوں نے دوسروں کا طریقہ اختیار کر لیا ہے گویا شریعت کی معاشرت کو بالکل چھوڑ دیا (کوئی ٹوپی اتار کر سلام کرتا ہے کوئی انگریزی لفظوں میں سلام کرتا ہے کوئی آداب وتسلیمات کہتا ہے وغیرہ وغیرہ ۱۲) اور معاشرت کے بعض اجزاء کے متعلق تو بعض لوگوں کو یہ بھی خبر نہیں رہی کہ یہ شریعت کا حکم ہے بھی یا نہیں بلکہ اکثر لوگ اس کو اسلام سے خارج سمجھتے ہیں جیسے استیذان کا مسئلہ اس کو بہت لوگ نئی بات سمجھتے ہیں اور اگر کوئی شخص یہ قانون مقرر کر دے کہ جب کوئی ملنے آئے تو پہلے اطلاع کر دے تو اس کو بدنام کرتے ہیں کہ اس نے انگریزوں کا طریقہ اختیار کر لیا حالانکہ استیذان کا مسئلہ اسلام ہی سے سب نے سیکھا ہے چنانچہ یہ حکم قرآن میں موجود ہے، حدیث میں موجود ہے اور سلف کا طرز عمل بھی یہی تھا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اس پر عمل کر کے دکھلایا ہے البتہ اس کی حقیقت سمجھ لیجئے کیونکہ جس طرح آجکل نوجوانوں نے طرز اختیار کیا ہے یہ انہوں نے حکم اسلامی کے اتباع کے لئے نہیں کیا بلکہ اس میں بھی وہ دوسری قوموں کا اتباع کرتے ہیں تو سن لیجئے کہ اسلام میں استیذان کے لئے کارڈ بھیجنے کی ضرورت نہیں اور نہ ہر جگہ اور ہر مکان کے لئے اجازت مانگنے کی ضرورت ہے بلکہ جب قرائن سے یہ معلوم ہو جاوے کہ کوئی شخص خلوت میں بیٹھا ہے مثلاً بیٹھک کے کواڑ بند کر رکھے یا پردے چھوڑ رکھے ہیں یا زنانہ مکان ہے تو اس وقت استیذان کی ضرورت ہے اور اگر مردانہ مکان ہے اور کواڑ بند نہیں نہ پردے چھوٹے ہوئے ہیں تو بلا استیذان کے جانا جائز ہے (مگر یہ کہ قرائن سے معلوم ہو جائے کہ اس وقت کسی ضروری کام میں مشغول ہے جس میں دوسروں کے آنے سے خلل واقع ہوگا ۱۲) اور جہاں استیذان کی ضرورت ہے وہاں یہ طریقہ ہے کہ پہلے جا کر سلام کرو السلام علیکم پھر اپنا نام بتلا کر کہو کہ میں اندر آسکتا ہوں اگر وہ اجازت دے چلے جاؤ ورنہ تین دفعہ اس طرح کہہ کے لوٹ جاؤ چنانچہ حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ ایک مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور تین دفعہ اسی طرح کر کے واپس ہو گئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خادم سے فرمایا کہ میں نے ابو موسیٰ کی آواز سنی تھی ان کو بلالو اس نے باہر آکر دیکھا تو وہ واپس ہو چکے تھے آکر عرض کیا تو فرمایا کہ جہاں ہوئیں ہیں سے بلالاؤ جب وہ تشریف لائے تو پوچھا کہ آپ واپس کیوں ہو گئے تھے فرمایا کہ ہم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی حکم فرمایا ہے کہ تین دفعہ سلام واستیذان کے بعد جواب نہ آئے تو واپس ہو جایا کرو۔ حضرت

عمر رضی اللہ عنہ کو یہ مسئلہ معلوم نہ تھا اس لئے فرمایا کہ تمہارے پاس کوئی گواہ ہے جو تمہارے موافق حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کو بیان کر سکے حضرت ابو موسیٰ گواہ کی تلاش میں مسجد نبوی میں آئے جہاں انصار کا مجمع موجود تھا انہوں نے فرمایا کہ ہم سب اس مسئلہ پر گواہ ہیں مگر تمہارے ساتھ ہم اپنے میں سب سے چھوٹے کو بھیجیں گے تاکہ حضرت عمر کو معلوم ہو جائے کہ انصار کے بچے بھی اس مسئلہ کو جانتے ہیں چنانچہ ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ اس مجمع میں سب سے چھوٹے تھے وہ گواہی کے لئے حاضر ہوئے اور آکر بیان کیا کہ واقعی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تین دفعہ کے بعد لوٹ جانے کا حکم دیا ہے یہ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم ارشادی تھا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عمل سے بھی اس حکم کو ظاہر فرمایا ہے چنانچہ ایک بار حضور صلی اللہ علیہ وسلم حضرت سعد بن عبادہ کے گھر تشریف لے گئے اور تین مرتبہ فرمایا السلام علیکم ءادخل (السلام علیکم میں اندر آؤں) حضرت سعد تینوں دفعہ اس خیال سے خاموش رہے کہ اچھا ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم بار بار سلام فرمائیں تو ہم کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا کی برکت زیادہ نصیب ہو جب تیسری دفعہ کے بعد بھی آپ نے سلام نہ کیا تو وہ گھر سے نکلکر دوڑے اور دیکھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم واپس تشریف لیجا رہے ہیں۔ جاکر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) میں تو مزید برکت حاصل کرنے کے لئے خاموش ہو رہا تھا آپ واپس کیوں چلے۔ فرمایا کہ مجھ کو یہی حکم ہے کہ تین دفعہ سے زیادہ استیذان نہ کروں غرض پھر آپ واپس تشریف لائے۔ اگر آج کوئی ایسا قانون مقرر کر دے کہ اجازت لیکر آؤ اور تین دفعہ میں جواب نہ ملے تو واپس ہو جاؤ تو لوگ اس کو فرعون اور مغرور سمجھیں مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اور حضرات سلف کا یہی طریقہ تھا اور تین دفعہ اجازت مانگنے پر اگر اجازت نہ ملے تو وہ بخوشی واپس چلے جاتے تھے گرانی مطلق نہ ہوتی تھی تو دیکھئے یہ صورت کیسی آسان ہے اور اس میں کس قدر مصالح ہیں پس ہماری معاشرت ہر طرح سے مکمل ہے کھانے پینے میں بھی اور ملنے ملانے میں بھی مگر افسوس ہم لوگ اس کی قدر نہیں کرتے اور خوامخواہ دوسروں کے دروازے پر دریوزہ گری کرتے ہیں۔ پانچواں جزو دین کا تصوف ہے اس کو تو لوگوں نے بالکل ہی چھوڑ رکھا ہے اکثر لوگوں نے تو تصوف کے متعلق یہ سمجھ لیا ہے کہ یہ بہت ہی مشکل ہے کیونکہ اس میں بیوی بچوں کو چھوڑنا پڑتا ہے یہ بالکل غلط ہے صاحبو! تصوف کی حقیقت ہے خدا تعالیٰ سے تعلق بڑھانا سو اس میں تعلقات ناجائزہ تو بیشک چھوڑنا پڑتے ہیں باقی تعلقات جائزہ ضرور یہ تو پہلے سے بھی بڑھ جاتے ہیں صوفیہ کے تعلقات اور معاملات بیوی بچوں کے ساتھ ایسے خوشگوار ہوتے ہیں کہ اہل تمدن کے بھی ویسے نہیں ہوتے لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ تصوف والے سنگدل ہو جاتے ہیں حالانکہ وہ ایسے رحمدل ہوتے ہیں کہ انسان تو انسان جانوروں تک پر رحم

کرتے ہیں چنانچہ ان حضرات کے پاس رہ کر معلوم ہو سکتا ہے کہ وہ ہر شخص کی راحت کا کس قدر خیال کرتے ہیں لہٰذا اس سے متوحش ہونا نادانی ہے جس کی وجہ سے اسلام کا ایک ضروری جزو لوگوں سے فوت ہو رہا ہے یہ جزو ایسا ضروری ہے کہ قرآن شریف میں اس کی تحصیل کا جابجا امر ہے حق تعالیٰ فرماتے ہیں یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ حَقَّ تُقَاتِہٖ یعنی اے ایمان والو حق تعالیٰ سے ڈرو جیسا کہ حق ڈرنے کا ہے اس میں تکمیل تقویٰ کا امر ہے یہی تصوف کا حاصل ہے اور مشاہد ہے کہ ایسا ڈرنا سوائے صوفیہ کرام اہل اللہ کے کسی کو بھی نصیب نہیں ہے ان کی بات بات میں خشیت ہوتی ہے بیباکی اور آزادی کہیں نام کو بھی نہیں ہوتی۔ اب حدیث میں اسکی تاکید لیجئے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں اِنَّ فِیْ جَسَدِ ابْنِ اٰدَمَ مُضْغَۃً اِذَا صَلُحَتْ صَلُحَ الْجَسَدُ کُلُّہٗ وَاِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ کُلُّہٗ اَلَا وَھِیَ الْقَلْبُ یعنی انسان کے بدن میں ایک ٹکڑا ہے جب وہ درست ہو جاتا ہے تمام بدن درست ہو جاتا ہے اور جب وہ بگڑتا ہے تو تمام بدن بگڑ جاتا ہے سن لو وہ دل ہے اس میں اصلاح قلب کی کتنی تاکید ہے کہ اسی کو مدار اصلاح قرار دیا گیا ہے اور یہی تصوف کا حاصل ہے اس میں بھی اصلاح قلب ہی کا اہتمام ہوتا ہے ایک اور حدیث میں ہے (جو حدیث جبریل کے نام سے مشہور ہے) کہ ایک دفعہ حضرت جبریل علیہ السلام بصورت انسان حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت مبارک میں حاضر ہوئے اور صحابہ کی تعلیم کے لئے انھوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے چند سوالات کئے جن میں پہلا سوال یہ تھا یَا مُحَمَّدُ اَخْبِرْنِیْ عَنِ الْاِسْلَامِ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم مجھے بتلایئے کہ اسلام کی حقیقت کیا ہے قَالَ الْاِسْلَامُ اَنْ تَشْھَدَ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰہِ وَتُقِیْمَ الصَّلٰوۃَ وَتُؤْتِیَ الزَّکٰوۃَ وَتَصُوْمَ رَمَضَانَ وَتَحُجَّ الْبَیْتَ اِنِ اسْتَطَعْتَ اِلَیْہِ سَبِیْلًا آپ نے فرمایا کہ اسلام یہ ہے کہ اللہ کے لَا شَرِیْکَ لَہٗ (اس کا کوئی شریک نہیں) ہونے کی اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہونے کی گواہی دو اور نماز کی پابندی کرو اور زکوٰۃ ادا کرو اور رمضان کے روزے رکھو اور بیت اللہ کا حج کرو اگر وہاں تک پہونچنے کی استطاعت ہو۔ قَالَ فَاَخْبِرْنِیْ عَنِ الْاِیْمَانِ قَالَ اَنْ تُؤْمِنَ بِاللّٰہِ وَمَلٰٓئِکَتِہٖ وَکُتُبِہٖ وَرُسُلِہٖ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْقَدْرِ خَیْرِہٖ وَشَرِّہٖ حضرت جبریل نے پھر پوچھا کہ مجھے ایمان کی حقیقت بتلایئے آپ نے فرمایا کہ ایمان یہ ہے کہ تم اللہ پر اور اس کے فرشتوں پر اور سب کتابوں اور سب رسولوں پر اور قیامت کے دن پر اور تقدیر پر ایمان لاؤ اور ان سب کی تصدیق کرو اس سے معلوم ہو گیا کہ اسلام کے لئے تصدیق رسالت اور ایمان کے لئے قیامت اور تقدیر اور ملائکہ کی تصدیق کی بھی ضرورت ہے اس کے بدون آدمی مومن نہیں ہو سکتا اور ظاہر ہے کہ قیامت کا ماننا اسکا نام نہیں کہ جس طرح جی چاہے مان لے بلکہ جس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بتلایا ہے اس طرح مانے تو اس میں حساب کتاب اور وزن اعمال

اور پل صراط وغیرہ سب کا ماننا داخل ہے اسی طرح یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اسلام کا ایک جزو اعمال بھی ہیں پس اس سے ان لوگوں کی غلطی واضح ہو گئی جنھوں نے اجزاء دین میں انتخاب کر رکھا ہے جیسا کہ اوپر مفصل ذکر ہو چکا ہے ۱۲) قَالَ فَاَخْبِرْنِیْ عَنِ الْاِحْسَانِ قَالَ اَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ فَاِنْ لَّمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَاِنَّهٗ يَرَاكَ پھر حضرت جبریلؑ نے پوچھا کہ بتلائیے احسان (و اخلاص) کیا چیز ہے آپ نے فرمایا احسان یہ ہے کہ تم خدا تعالیٰ کی عبادت اس طرح کرو گویا اسے دیکھ رہے ہو کیونکہ اگر تم اسے نہیں دیکھتے تو وہ یقیناً تم کو دیکھ رہا ہے (اور اس کا بھی مقتضا یہی ہے کہ جیسی عبادت خود ان کو دیکھ کر کرتے ویسی ہی اب بھی کرو کیونکہ نوکر کو اگر یہ معلوم ہو جائے کہ حاکم مجھے دیکھ رہا ہے گو اُسے نظر نہ آتا ہو جب بھی وہ ویسا ہی کام کرتا ہے جیسا کہ خود اُسے آنکھوں سے دیکھ کر کرتا ۱۲) اس سے معلوم ہوا کہ اسلام و ایمان کی تکمیل کرنے والی ایک تیسری چیز اور ہے جس سے عبادت بدرجۂ کمال ادا ہوتی ہے وہ احسان ہے اور اسی کی تحصیل تصوف میں مطلوب ہے حقیقت اس کی یہ ہے کہ اعمال دو قسم کے ہیں ایک اعمال جوارح دوسرے اعمال قلب۔ اعمال جوارح تو عبادات و معاملات و معاشرت وغیرہ ہیں۔ اور اعمال قلب کی دو قسمیں ہیں ایک وہ جن کا معلوم کرنا اور یقین کر لینا کافی ہے ان کو عقائد کہتے ہیں دوسرے وہ جن کو قلب کے اندر پیدا کرنا اور ان کی اضداد سے دل کو پاک کرنا ضروری ہے جیسے اخلاص صبر شکر محبت و خشیت و رضا توکل و تواضع و قناعت وغیرہ ان کا تو حاصل کرنا ضروری ہے اور ان کے اضداد کا دل سے نکالنا ضروری ہے جیسے ریا، کبر، غصہ، طمع، حب دنیا وغیرہ غرض کچھ کرنے کے کام ہیں اور کچھ نہ کرنے کے اور اسی سے اعمال جوارح عبادات وغیرہ درجۂ کمال پر پہنچتے ہیں اور ان سب کی تکمیل کا نام احسان ہے۔ اب قرآن و حدیث سے دیکھئے کہ ان اعمال باطنہ کی تاکید ہے یا نہیں اور یہ معلوم ہوتا ہے امر و نہی اور وعدہ وعید سے سو قرآن میں ہے فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ الَّذِيْنَ هُمْ يُرَاءُوْنَ (بڑی خرابی ہے جو اپنی نماز کو بھلا بیٹھتے ہیں جو ایسے ہیں کہ ریاکاری کرتے ہیں) اس میں نماز میں ریا و غفلت پر سخت وعید ہے ۱۲) اور حدیث میں ہے لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ مَنْ كَانَ فِيْ قَلْبِهٖ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ مِّنْ كِبْرٍ یعنی جنت میں وہ شخص داخل نہیں ہوگا جس کے دل میں ذرہ برابر بھی تکبر ہو اسی طرح قرآن و حدیث کو دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ جا بجا اخلاق رذیلہ کی ممانعت اور ان پر وعید مذکور ہے اور اخلاق حمیدہ کی تاکید اور ان پر وعدہ موجود ہے تو اس جزو اخلاق کا حاصل کرنا واجب ہوا اور یہی حقیقت ہے تصوف کی پس تصوف کا جزو دین ہونا ثابت ہو گیا مگر قاعدہ ہے کہ ہر چیز کے کچھ توابع اور ذرائع

ہوا کرتے ہیں جیسے حج کے لئے سفر کرنا اور زادراہ ساتھ لینا جس سے وصول میں سہولت ہو اسی طرح تصوف میں اصل مقصود تو اصلاح قلب ہے کہ اخلاق حمیدہ حاصل اور رذیلہ زائل ہوں مگر اس مقصود کے لئے کچھ توابع وذرائع ہیں جن سے مقصود میں آسانی ہو جاتی ہے جیسے اذکار و اشغال و احوال و کیفیات جن کو آجکل لوگوں نے غلطی سے مقصود قرار دے رکھا ہے مگر یہ محض توابع و ذرائع ہیں اصل مقصود اصلاح قلب ہے اور اس مقصود کا بھی ایک مقصود ہے یعنی رضاء حق جس کا ثمرہ ہے قرب باری تعالیٰ پس حاصل یہ ہوا کہ دین کی ترتیب اس طرح ہوئی کہ اول تو عقائد کو صحیح کرے پھر اعمال جوارح عبادات و معاملات و معاشرات کو درست کرے پھر اصلاح قلب کا اہتمام کرے جس کا طریقہ کسی شیخ کامل سے پوچھے اور اس کے کہنے کے موافق ذکر و شغل میں لگے اس سے اعمال قلب کی اصلاح آسانی سے ہوگی کیونکہ ذکر و شغل سے حق تعالیٰ کے ساتھ تعلق بڑھ جاتا ہے تو قلب میں اخلاق حمیدہ کی قابلیت جلدی پیدا ہو جاتی ہے اسی لئے ذکر کے ساتھ اخلاق کی طرف بھی توجہ رکھنا چاہئے (کیونکہ اصل چیز یہی ہے جس کی تحصیل ضروری اور فرض ہے رہا ذکر و شغل وہ تو امر مستحب ہے جو اس مقصود کا ذریعہ ہے ۱۲) یہ ہے امر مہم اور یہ ہے اصل درس مگر بعض لوگ صرف ذکر و اشغال پر اکتفا کرتے ہیں اخلاق کی درستی کا اہتمام نہیں کرتے یہ حقیقت سے ناواقفی کی دلیل ہے اور اخلاق باطنیہ کی درستی اس طرح ہوتی ہے کہ شیخ کے سامنے اپنے امراض قلبیہ بیان کئے جائیں کہ ہمارے اندر فلاں فلاں امراض ہیں ریا یا عجب کبر وغیرہ پھر جو تدبیر شیخ بتلائے اس پر عمل کرے جیسا کہ امام غزالیؒ نے ہر ہر مرض کی حقیقت اور ہر ایک کا جدا جدا علاج (احیاء العلوم میں) بیان فرمایا ہے. صحیح طریقہ تو یہ ہے تصوف کا اور ایک وہ ہے جو آجکل لوگوں نے اپنی رائے سے سمجھ رکھا ہے کہ بس ذکر و شغل ہی پر کفایت کرنے لگے. یاد رکھو اس طرح باطن کی اصلاح نہیں ہوتی بلکہ صورت وہی ہے کہ امراض کا علاج بھی کرو مثلاً ایک شخص میں تکبر ہے تو شیخ کو چاہئے کہ ذکر و شغل کے ساتھ اس کے سپرد ایسا کام بھی کرے جس سے نفس میں تواضع پیدا ہو مثلاً نمازیوں کے لئے لوٹے بھر بھر کے رکھنا ان کی جوتیاں سیدھی کرنا وغیرہ اور اگر شیخ نہ بتلادے تو طالب کو خود ایسے کام کرنا چاہئیں جن سے نفس میں تذلل پیدا ہو وعلیٰ ہذا اگر کسی میں حسد ہے تو اس کو چاہئے کہ محسود کی تعریفیں کیا کرے اس سے قلب کا غبار نکل جائیگا. اسی طرح ہر ہر مرض کا ایک خاص علاج ہے جو تصوف کی کتابوں سے معلوم ہو سکتا ہے یہ ہے تہذیب اخلاق اس کے بعد اس کا ثمرہ ہے یعنی رضاء حق مگر آجکل لوگوں نے ثمرہ اس کو سمجھ لیا ہے کہ کچھ

لطائف جاری ہو جائیں کچھ گریہ اور رقت طاری ہونے لگے۔ صاحبو! یہ تو احوال ہیں جو غیر اختیاری ہیں یہ مطلوب نہیں ہیں مطلوب وہ امور ہیں جو بندہ کے اختیار میں ہیں یعنی اخلاق حمیدہ کا حاصل کرنا اور رذائل کا علاج کرنا اسی طرح کشف بھی مطلوب نہیں جس کو کشف ہوتا ہو اس کے لئے نعمت ہے شکر کرے بشرطیکہ غوائل کبر و عجب وغیرہ سے محفوظ ہو اور جس کو نہ ہوتا ہو وہ اس کے درپے نہ ہو وہ سمجھ لے کہ میرے لئے کامیابی کا طریقہ یہی تجویز کیا گیا ہے کہ کشف نہ ہو کیونکہ بعض دفعہ کشف سے انسان بہت ہی بلاؤں میں پھنس جاتا ہے بس تم اپنے لئے کوئی طریقہ تجویز نہ کرو ؎

بدرد و صاف ترا حکم نیست دم درکش ؛ کہ انچہ ساقی ماریخت عین لطاف ست

(تجھے صاف اور گدلے سے مطلب نہیں خاموش رہ جو کچھ ساقی نے ہمارے پیالہ میں ڈال دیا ہے وہ عین لطف ہے)

اور فرماتے ہیں ؎ تو بندگی چو گدایاں بشرط مزد مکن

کہ خواجہ خود روش بندہ پروری داند

(حافظ! تو بندگی بشرط مزدوری فقیروں کی طرح مت کر اس لئے آقا بندہ پروری کا طریقہ خود جانتا ہے)

اور ساری وجہ پریشانی کی یہی ہوتی ہے کہ لوگ حالات و کیفیات کو مقصود سمجھتے ہیں حالانکہ میں نے بتلا دیا کہ یہ مقاصد میں سے نہیں محض توابع و ذرائع ہیں جو ہر اک کو مختلف طور پر پیش آتے ہیں بس یہ خلاصہ ہے دین کا کہ ان پانچوں اجزاء کو حاصل کیا جائے اسی کا بیان مختصر لفظوں میں اس آیت میں حق تعالیٰ نے فرمایا ہے اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَیَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا ؕ (جو لوگ ایمان لائیں اور عمل صالحہ کریں اللہ تعالیٰ ان کے لئے محبوبیت پیدا کر دیں گے) پانچوں اجزاء کی تحصیل پر آپ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ (ایمان لائے اور اعمال صالحہ کئے) کے مصداق بنیں گے پھر اس پر وہ ثمرہ مرتب ہوگا جو آیت میں مذکور ہے یعنی حق تعالیٰ کی محبوبیت حاصل ہوگی جس کا تفصیل کے ساتھ پہلے ذکر ہو چکا ہے آج تو تفصیل طریق کا بیان تھا سو بحمد اللہ اس وقت بقدر ضرورت طریق کی تفصیل بھی میں نے بیان کر دی ہے اب عمل کرنا آپ کا کام ہے۔ اب دعا کیجئے کہ حق تعالیٰ ہم کو فہم سلیم عطا فرمائیں اور عمل کی ہمت دیں آمین۔

وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ خیر خلقہ سیدنا و مولانا محمد و علیٰ آلہ و اصحابہ اجمعین

والحمد للہ الذی بعزتہ وجلالہ تتم الصلحت

تمت

شاہنامہ اسلام:۔ حفیظ جالندھری، کامل مجلد چار جلدوں میں چند نسخے دستیاب ہیں۔

قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ اٰیَۃً

(رواہ البخاری)

سلسلۃ التبلیغ کا وعظ المسمیٰ بہ

الدوام علی الاسلام والاعتصام بالانعام

منجملہ ارشادات

حکیم الامۃ مجدد الملۃ حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی

رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

ناشر:۔ محمد عبد المنان غفرلہٗ

مکتبۂ تھانوی ــــ دفتر الابقاء

مسافر خانہ بندر روڈ / ایم۔ اے جناح روڈ کراچی ۱

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سلسلہ التبلیغ کا وعظ مسمّٰی بہ

الدوام علی الاسلام والاعتصام بالانعام

این	متی	کم	کیف	لم	ماذا	من ای شان	ضبط من	المستمعون	الاشتات
کہاں ہوا	کب ہوا	کتنی دیر ہوا	کس ہیئت سے ہوا	کیوں ہوا	کیا مضمون تھا	کس طبقہ کو زیادہ مفید تھا	کس نے ضبط کیا	سامعین کی تخمینی تعداد	متفرقات
مسجد خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون	۲ شوال ۱۳۴۵ھ بروز شنبہ بوقت صبح	۳ گھنٹے ۵۴ منٹ	جالسًا علی الکرسی	مولانا الحافظ الحاج مولوی عبداللطیف صاحب مدرس اول مدرسہ مظاہر العلوم کی درخواست پر	اسلام کی حقیقت تفویض ہے اور تفویض سے زیادہ کسی چیز میں راحت نہیں	ہر طبقہ کو عمومًا اور طلبہ وسالکین کو خصوصًا	ظفر احمد عفا اللہ عنہ وغفر لوالدیہ	تقریبًا پچاس ۵۰	یہ بیان اپنے علوم میں واحد ہے

الحمد للہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشہد ان لا الٰہ الا اللہ وحدہٗ لا شریک لہ ونشہد ان سیدنا ومولانا محمدًا عبدہٗ ورسولہٗ صلی اللہ تعالٰی علیہ وعلٰی آلہٖ واصحابہٖ وبارک وسلم اما بعد فاعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ

اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ○ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَیْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖۤ اِخْوَانًا وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا كَذٰلِكَ یُبَیِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰیٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ○

اے ایمان والو اللہ تعالیٰ سے ڈرنے کا حق اور بجز اسلام کے اور کسی حالت پر جان مت دینا اور مضبوطی سے پکڑے رہو اللہ تعالیٰ کے سلسلہ کو اس طور پر کہ باہم متفق بھی رہو اور باہم نا اتفاقی مت کرو اور تم پر جو اللہ کا انعام ہے اس کو یاد کرو جبکہ تم دشمن تھے پس اللہ تعالیٰ نے تمہارے قلوب میں الفت ڈالی سو تم خدا تعالیٰ کے انعام سے آپس میں بھائی بھائی ہو گئے اور تم دوزخ کے گڑھے کے کنارہ پر تھے سو اس سے خدا تعالیٰ نے تمہاری جان بچائی اسی طرح اللہ تعالیٰ تم لوگوں کو اپنے احکام بیان کر کے بتلاتے رہتے ہیں تاکہ تم لوگ راہ پر رہو۔

یہ آیتیں ہر چند کہ ایک خاص قصہ میں نازل ہوئی ہیں مگر مقصود اسی قصہ کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ حق تعالیٰ نے ان میں ہم کو ایک دستور العمل بتلایا ہے تاکہ پھر ویسے قصے رونما نہ ہوں اور دیگر آفات سے بھی محفوظ رہیں۔ قصہ یہ ہے کہ سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کے پہلے آپ کے دو خاندانوں میں جن کا نام اوس و خزرج ہے سخت عداوت تھی جب مدینہ والے مسلمان ہو گئے تو یہ عداوت اتحاد سے اور وہ بغض و نفرت دوستی اور محبت سے مبدل ہو گئی اور جب سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ مکرمہ سے ہجرت کر کے مدینہ طیبہ میں رونق افروز ہوئے اس وقت تو یہ اتحاد اور بھی زیادہ مستحکم ہو گیا۔ اور یہ اتحاد یہود کو بہت ناگوار گذرا اور ایک یہودی نے جو اوس و خزرج دونوں قبیلوں کے آدمیوں کو ایک جلسہ میں باہم شیر و شکر دیکھا تو حسد سے جل مرا اور اس نے ایک شخص کو اس کام پر مقرر کیا کہ اوس و خزرج میں جو وقائع و حروب ہوئے ہیں اور ان کے متعلق ہر قبیلے کے شعراء نے اشعار کہے ہیں وہ اشعار انصار کی مجلسوں میں پڑھ دے

چنانچہ اس میں وہ کسی قدر کامیاب ہوگیا کہ اشعار کا پڑھنا تھا فوراً ایک آگ سی بھڑک اٹھی اور آپس میں تو تو میں میں ہونے لگی یہاں تک کہ لڑائی کا موقع اور وقت بھی مقرر ہوگیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جو اطلاع ہوئی آپ ان کے پاس تشریف لائے اور فرمایا یہ کیا اندھیر ہے کہ میرے سامنے ہی کہ میں تمہارے اندر زندہ موجود ہوں پھر مسلمان ہو جانے اور باہم متفق و متحد ہو جانے کے بعد یہ واہیات حرکت۔ کیا تم اسلام کے بعد پھر اسی حالت کفر کی طرف عود کرنا چاہتے ہو۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد سے سب کو تنبہ ہوا اور سمجھے کہ یہ شیطانی حرکت تھی اور ایک دوسرے کے گلے لگ کر بہت روئے اور توبہ کی جس سے حاسدین کی کوشش اکارت گئی۔ وَاَرَادُوْا بِهٖ كَيْدًا فَجَعَلْنٰهُمُ الْاَخْسَرِيْنَ (ان لوگوں نے ان کے ساتھ برائی کرنا چاہا تھا سو ہم نے ان ہی لوگوں کو ناکام کر دیا) کیونکہ اب پہلے سے بھی زیادہ اتحاد ہوگیا اور صحابہ کو معلوم ہوگیا کہ نفسانیت کی بناء پر باہم قتال و جدال علی کفر ہے اس لئے ہمیشہ کے واسطے اس کا دروازہ[۵] بند ہوگیا۔ جس سے دشمنوں کی تدابیر الٹی ہوگئیں اور صحابہ میں پہلے سے بھی زیادہ محبت و الفت قائم ہوگئی مضلین کو بھی بعض دفعہ دھوکہ ہو جاتا ہے کہ وہ ایک کام کرتے ہیں اہل حق کو ضرر پہنچانے کے لئے اور اس کا انجام خیر ہوتا ہے بلکہ بعض دفعہ شیطان کو بھی جو رئیس المضلین ہے دھوکہ ہو جاتا ہے کہ وہ بندہ سے ایک معصیت کرانا چاہتا ہے تاکہ خدا تعالیٰ سے اس کو بعد ہو جائے مگر اس کو پہلے سے بھی زیادہ قرب بڑھ جاتا ہے بعض دفعہ تو اس طرح کہ وہ گناہ کا ارادہ کر کے پھر خدا کے خوف سے رک جاتا ہے اور بعض دفعہ گناہ کا ارتکاب بھی ہو جاتا ہے مگر اس کے بعد ندامت

---

۵ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد جو حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ میں جنگ ہوئی اس کا منشا جاہلیت کی عداوت نہ تھی بلکہ اس کا منشاء محض دین تھا کہ ایک فریق دوسرے کو دین کے خلاف عمل کرنے والا سمجھتا تھا اس لئے ہر ایک اپنے زعم میں دوسرے کو دین پر لانے کے لئے جنگ کر رہا تھا گو ان میں ایک فریق واقع میں غلطی پر تھا مگر اپنے اجتہاد میں ہر ایک حق پر تھا اور خطا اجتہادی معصیت نہیں بلکہ اس پر بھی اجر کا وعدہ ہے ۱۲ جامع

اس درجہ غالب ہوتی ہے کہ بندہ روتے روتے ہلاکت کے قریب ہو جاتا ہے
اللہ تعالےٰ کو یہ عجز و نیاز پسند ہے وہ اس کو پہلے سے بھی زیادہ مقرب بنا لیتے
ہیں پھر یہ شخص آئندہ کو اس گناہ کے وہ دروازے بالکل بند کر دیتا ہے جن کی
وجہ سے شیطان کے دھوکہ میں آیا تھا غرض شیاطین الانس والجن دونوں کو بعض
دفعہ دھوکہ ہو جاتا ہے جیسا کہ اس یہودی کو ہوا جس نے اوس وخزرج میں نفاق
وشقاق ڈالنا چاہا تھا اگر اسے یہ معلوم ہو جاتا کہ میری سعی کا یہ انجام ہوگا تو وہ
کبھی ایسا نہ کرتا کیونکہ اللہ تعالےٰ نے اس کی کوشش کو صرف اسی واقعہ میں ناکام نہیں
کیا بلکہ آئندہ کا بھی انتظام فرما دیا اور جدال وقتال کے دروازے بالکل بند
کر دیئے چنانچہ اس سے پہلے جو آیات ہیں ان میں اول تو اہل کتاب پر ملامت ہے
جنھوں نے یہ کارروائی کی تھی اور یہ ملامت بڑی بلاغت سے کی گئی کہ اس فعل پر
ملامت کرنے سے پہلے ان کو کفر پر ملامت کی گئی جس کا حاصل یہ ہوا کہ چاہیئے تو یہ تھا کہ
تم خود بھی مسلمان ہو جاتے نہ یہ کہ الٹا دوسروں کے گمراہ کرنے کی فکر میں لگ رہے ہو
پھر مسلمانوں کو خطاب اور فہمائش ہے کہ اہل کتاب کو تمہارا اتحاد و اتفاق جو ذریعہ ہے
دین و دنیا کی ترقی کا سخت ناگوار ہے وہ تم کو آپس میں لڑانا چاہتے ہیں اور اگر تم ان کا
کہنا مانو گے تو وہ تم کو ایمان کے بعد کافر بنا دیں گے (اور دشمنوں کے فریب میں آکر اپنا
نقصان کرنا اور ان کا دل خوش کرنا سخت جہالت و حماقت ہے۔ اس سے پہلے ارشاد ہے
وَكَيْفَ تَكْفُرُوْنَ وَاَنْتُمْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ اٰيَاتُ اللّٰهِ وَفِيْكُمْ رَسُوْلُهٗ وَمَنْ يَّعْتَصِمْ
بِاللّٰهِ فَقَدْ هُدِيَ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ؕ اور بھلا تم کیسے کفر کر سکتے ہو حالانکہ
(اسباب مانعہ عن الکفر (کفر سے روکنے والے پورے طور پر جمع ہیں کہ) تم کو اللہ تعالےٰ
کے احکام پڑھ کر سنائے جاتے ہیں اور (پھر) تم میں اللہ کے رسول (صلی اللہ
علیہ وسلم) بھی موجود ہیں (اور یہ دونوں قوی ذرائع ہیں ایمان پر قائم رہنے کے
پس تم کو چاہیئے کہ کتاب اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کے موافق ایمان
پر اور ایمان کی باتوں پر قائم رہو) اور (یاد رکھو کہ) جو شخص اللہ تعالیٰ کو مضبوط

پکڑتا ہے (یعنی اس کی اطاعت کرتا اور اس کے مخالف کی اطاعت نہیں کرتا ہے)
تو ایسا شخص ضرور راہِ راست کی طرف ہدایت کیا جاتا ہے۔ اس آیت میں کفر سے
مراد معنی عام ہیں جو کفر اعتقادی و عملی دونوں کو شامل ہے اور قتال وجدال کفر عملی
ہے کیونکہ فعل قریب کفر ہے اس سے نااتفاقی پیدا ہوتی ہے جو گناہ بھی ہے اور
قوت وترقی کی زائل کرنے والی بھی پھر ان بکھیڑوں میں پڑکر دین حق سے بُعد ہو جاتا ہے
نااتفاقی میں ہر شخص دوسرے کو زک دینے کے لئے ہر ممکن سے ممکن تدبیر کو کام میں لاتا
ہے خواہ جائز ہو یا ناجائز انسانیت سے قریب ہو یا بعید اسی واسطے حدیث میں
فساد ذات البین کو حالقہ فرمایا ہے کہ یہ مونڈنے والی چیز ہے پھر حضور صلی اللہ علیہ
وسلم نے اس کی تفسیر بھی خود ہی فرمائی لَا اَقُوْلُ تَحْلَقُ الشَّعْرَ بَلْ تَحْلَقُ الدِّیْنَ
میں یہ نہیں کہتا کہ یہ بالوں کو مونڈتی ہے بلکہ دین کو مونڈتی ہے اور ظاہر ہے کہ
جب مسلمان کو دین سے بعد ہوگا تو کفر سے قرب ہوگا (اور قاعدۂ عقلیہ ہے۔
اَلْقَرِیْبُ مِنَ الشَّیْءِ یَاْخُذُ حُکْمَہٗ کہ جو جس سے قریب ہو اسی کا حکم لے لیتا ہے اسی
وجہ سے فقہاء نے اَقْرَبُ اِلَی الْقُعُوْدِ (بیٹھنے کی طرف قریب تر) کو قاعد اور اَقْرَبُ
اِلَی الْقِیَامِ (کھڑے ہونے کے قریب) کو قائم اور غالب الغش (کھوٹ غالب) کو
مغشوش اور غالب الفضہ (چاندی غالب) کو فضّہ (چاندی) فرمایا ہے۔ اس
قاعدہ سے عمل قَرِیْبٌ مِنَ الْکُفْرِ (قریب کفر کے) کو کفر کہنا اور اس کے
مرتکب کو عملاً کافر کہنا صحیح ہے ۱۲) صاحبو قرآن محاورات میں نازل ہوا ہے
اور محاورات میں اس کی نظیر موجود ہے کہ جو شخص جس قوم کے افعال کرتا ہے
اس پر اسی قوم کا اطلاق کرتے ہیں جیسے کمینہ حرکت کرنے والے کو کہتے ہیں کہ تو
تو چمار ہے یعنی چماروں کی سی حرکت کرتا ہے اس سے ہر شخص یہی سمجھتا ہے کہ
تنفیر کے لئے یہ عنوان اختیار کیا گیا ہے یہ مطلب نہیں ہوتا کہ وہ شخص اگر شیخ وسید تھا تو شیخ
وسید نہیں رہا بلکہ مراد صرف یہ ہے کہ عملاً چمار ہو گیا گو واقع میں سید ہے اسی طرح
یہاں یہ مراد ہے کہ قتال وجدال کرنے والا عملاً کافر ہے گو واقع میں مومن ہے۔

پس جیسا کہ چمار کی دو قسمیں ہیں ایک حقیقی چمار جس کی ذات بھی چمار ہو ایک عملی چمار جو چماروں جیسے کام کرے اسی طرح کافر کی بھی دو قسمیں ہیں ایک حقیقی کافر جو اعتقاداً کفر کے مرتکب ہیں دوسرے عملی کافر جو کافروں جیسے کام کرتے ہیں اور یہ تقسیم محاورات کے بالکل موافق ہے کوئی دقیق بات نہیں مگر خوارج و معتزلہ کی عقل ماری گئی کہ انھوں نے اس محاورہ کو نہیں سمجھا اور محاورہ کے موافق مستعمل لفظ میں تدقیق کرنے لگے کفر کو حقیقی معنی پر محمول کر کے یہ حکم لگا دیا کہ گناہ کبیرہ کا ارتکاب کفر ہے اور مرتکب کبیرہ سچ مچ کافر یا خارج عن الایمان ہے۔ جب ان لوگوں نے قرآن کے معانی کو بدلنا شروع کیا تو اہل حق کو جواب دینے کی ضرورت ہوئی اور انھوں نے ہیئت ایمان کفار کی تحقیق کی صحابہ کو اس کی ضرورت نہ تھی کیونکہ وہ سب کے سب محاورات کے جاننے والے اور کلام الٰہی کو سب سے زیادہ سمجھنے والے تھے ان میں باہم ایسے اختلافات کم ہوتے تھے اس لئے ان کو ایسے مسائل میں گفتگو کی ضرورت نہ تھی اور جس قدر ضرورت تھی اس کے موافق انھوں نے بھی گفتگو کی مگر اس وقت علم کلام کی تدوین کی ضرورت نہ ہوئی تھی اور ایک علم کلام ہی کیا صحابہ کے زمانہ میں تو فقہ کی بھی تدوین نہ تھی کیونکہ ان میں اتباع کا مذاق غالب تھا تدقیق عمل کا مذاق نہ تھا تو ان کو اس سے بحث نہ تھی کہ فرض کون ہے اور واجب کون۔ بس حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو وضو کرتے ہوئے دیکھا تھا اور اسباغ وضو کے فضائل سنے تھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ کر وضو کرنے لگے آپ کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھا تھا بس اُسی طرح پڑھنے لگے جیسے آپ پڑھتے تھے۔ ان کو اس کھود کرید کی حاجت نہ تھی کہ نماز میں کیا تو فرض ہے اور کیا واجب اور کون مستحب کیونکہ جس کو نسخہ پینا ہے وہ نسخہ کی تحقیق نہیں کیا کرتا کہ اس کا جزو اعظم کیا ہے مزاج کیسا ہے مگر جب کسی کو پورا نسخہ پینا منظور نہ ہو اور وہ تحقیق کے درپے ہو جائے تو طبیب شفیق جزو اعظم وغیرہ کی تحقیق بھی بیان کر دے گا اور اس کو مدون بھی کر دے گا تاکہ کوئی پورا نسخہ نہ استعمال کرے تو بالکل محروم بھی نہ رہے وہ جزو اعظم ہی استعمال کرلے کہ وہ بھی

حصولِ مقصود کے لئے کسی درجہ میں تو کافی ہے گو اثر دیر میں ہوگا اور پورے نسخہ کے برابر نہ ہوگا تو اگر مسلمان حضرات صحابہ ہی کے طرز پر رہتے اور عبادات کو ناقص نہ کرتے تو فقہاء کو تدوین فقہ اور تحقیق فرائض و واجبات و شرائط وارکان کی ضرورت نہ ہوتی اسی طرح اگر سب مسلمان مذاہب اصلیہ پر رہتے اور تدقیق شروع نہ کرتے تو متکلمین کو بھی تَکْفُرُوْن (تم کفر کرتے ہو) کی تحقیق کی ضرورت نہ ہوتی کہ یہاں کفر عملی مراد ہے نہ کفر حقیقی نہ اُن کو اِسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ کی تاویل بیان کرنا پڑتی متکلمین کو بھی اس کی ضرورت جب ہی ہوئی جبکہ اہلِ بدعت نے تلبیس شروع کردی اور یہ یقینی ہے کہ اگر علوم قرآن اپنی سذاجت اصلیہ پر رہتے تو اس سے نفع زیادہ ہوتا اور فضول ابحاث میں عوام کا اور علما کا وقت صرف نہ ہوتا بلکہ تمام علماء ضروری علوم کی تدوین و تحقیق میں مصروف ہوتے مگر اس کو کیا کیا جائے کہ صحابہؓ کے بعد مسلمانوں کی طبائع میں اتباع کا مادہ کم ہوگیا عقول میں سلامتی کم ہوگئی اور تحقیق و تدقیق کے درپے ہونے لگے اہلِ بدعت دھوا نے تلبیس و تحریف شروع کردی تو اب علماء میں تقسیم خدمات ہوگئی کسی نے بلاغت کو لے لیا کسی نے نحو و صرف کو کسی نے علم کلام کو کسی نے حدیث کو کسی نے فقہ کو کسی نے تفسیر کو اور ایک جماعت نے علوم عقلیہ کی خدمت اختیار کی اور اب علوم عقلیہ کی بھی ضرورت ہے کیونکہ آجکل عقول میں سلامتی نہیں رہی وہ بدون علوم عقلیہ کی مدد کے دقیق علوم کو نہیں سمجھ سکتے اگر عقول میں سلامتی ہو تو پھر علوم میزانیہ کی کوئی ضرورت نہیں۔ چنانچہ حضرات صحابہ و مجتہدین کو اس کی ضرورت نہ تھی مگر باوجود اس کے ان کے تمام دلائل قوانین عقلیہ پر منطبق ہیں لیکن اب بدون علوم عقلیہ کے فہم اس لئے مشکل ہوگیا کہ جو اشکالات شریعت پر کئے جاتے ہیں خود ان میں علوم عقلیہ و فلسفیہ کی بہت آمیزش ہے خصوصاً معتزلہ کے اشکالات میں اور گو علوم عقلیہ کے ذریعہ سے معتزلہ کے اشکالات رفع کر دیئے گئے مگر یہ ضرور ہے کہ متاخرین کے کلام میں علوم قرآن بہت کم ہیں اور سلف کے کلام میں

علوم قرآن زیادہ ہیں اور سلف کی باتیں دل کو لگتی ہیں کیونکہ سذاجت کا خاصہ ہے کہ دل کو کشش کرتی ہے سادگی سے جو بات بیان کی جاوے وہ دل میں پیوستہ ہو جاتی ہے متاخرین کے کلام میں یہ رنگ نہیں ان کی باتیں اس قدر دل کو نہیں لگتیں مگر وہ کیا کریں وہ اس رنگ کے اختیار کرنے پر مجبور تھے کیونکہ معترضین نے اسی رنگ سے اعتراضات پیش کئے تھے اور یہ بھی خدا کی رحمت ہے کہ ہم سے پہلے یہ شبہات پیدا ہو چکے اور متقدمین متکلمین نے اُن کے جواب میں قیامت تک کا انتظام کر دیا کہ علم کلام کی بنیاد ڈال کر قیامت تک کے شبہات کا ازالہ کر دیا اگر ہم جیسے کم ہمتوں کے سامنے معتزلہ کے شبہات پیش ہوتے تو ہم سے یہ کام دشوار تھا غرض اس میں تو شک نہیں کہ متکلمین نے جو کچھ تحقیق و تدقیق کی وہ ایک ضروری کام تھا جس پر مخالفین اہل بدعت و ہوی کی تلبیس نے ان کو مجبور کیا (گو اس مجبوری کے بعد بعض ابحاث انھوں نے ایسی بھی چھیڑ دیں جن کے چھیڑنے پر وہ مجبور نہ تھے اور ایسی ابحاث کی شمار بہت قلیل ہے ۱۲) لیکن متکلمین کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ مسلمانوں کو قرآن پر ایسی تحقیق و تدقیق کے ساتھ ایمان لانا چاہئے بلکہ مطلب صرف یہ ہے کہ اگر کوئی مخالف اسلام پر اعتراض کرے اور اس کی فہم میں سلامتی نہ ہو اور سذاجت کے ساتھ وہ قائل نہ ہوسکے تو اس کے مقابلہ میں اس سے کام لیا جائے اور خود اپنے اعتقاد رکھنے کے واسطے سذاجت ہی کا رنگ اختیار کرنا چاہئے خصوصاً عوام کو تو یہی لازم ہے کہ قرآن پر سذاجت کے ساتھ ایمان لائیں کیونکہ تدقیقات سے شبہات دفع نہیں ہوتے بلکہ اس سے تو شبہات اور بڑھتے ہیں جن سے بعض دفعہ نجات مشکل ہو جاتی ہے اور اخیر میں جب کبھی نجات ہوئی ہے سذاجت ہی سے ہوئی ہے کہ اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم سچے ہیں اُن کا حکم سر آنکھوں پر ہے خواہ سمجھ میں آئے یا نہ آئے (میں پھر کہتا ہوں کہ متکلمین کا تدقیقات سے یہ مطلب نہ تھا کہ تم اپنے شبہات ان کے ذریعہ سے زائل کرو بلکہ صرف یہ مقصود تھا کہ اگر مخالف ان تدقیقات کے پیرایہ میں اعتراض کرے تو تم اس کو اُسی کے طرز سے خاموش کر سکو ۱۲ جامع)

اور سادہ تعلیم کے بعد بہ نسبت فلسفیات کے تصوف کی تحصیل سے بھی شبہات سے نجات جلد ہو جاتی ہے مگر اسی شرط ساتھ کہ تصوف بھی سادہ بہیئت اصلیہ پر ہو جس میں علوم فلسفہ کا رنگ نہ ہو یعنی علوم کشفیہ کی تحقیق نہ ہو جو واقع میں تو علوم فلسفیہ نہیں لیکن ان کی تعبیر فلسفہ کے رنگ میں ہوتی ہے اس لئے وہ علوم فلسفہ معلوم ہوتے ہیں گو اصل مفہوم کے اعتبار سے تو فلسفہ علم حکمت کو کہتے ہیں جو تمام علوم کشفیہ کو شامل ہے مگر میں علوم فلسفیہ بمعنے علوم دقیقہ زائدہ سے منع کرتا ہوں کہ محاورہ میں انہیں کو علوم فلسفیہ کہتے ہیں غرض تصوف سے بھی اسی وقت شبہات کا مادہ منقطع ہوگا جبکہ کشفیات سے الگ رہے اور ان کی تحقیق میں نہ پڑے ورنہ شبہات سے نجات دشوار ہے چنانچہ خود اہل کشف کا ارشاد ہے اَنْتُمْ تَخَافُوْنَ الْمَعَاصِیَ وَنَحْنُ نَخَافُ الْکُفْرَ کہ علمائے ظاہر کو تو معاصی ہی میں مبتلا ہونے کا اندیشہ ہے مگر ہم کو کفر کا اندیشہ لگا رہتا ہے کیونکہ علوم کشفیہ کی فہم میں جب غلطی ہوتی ہے تو وہ کفر سے ادھر نہیں رہتی اس لئے ان کے درپے ہونا بہت مضر ہے اس کے ساتھ ہی مشائخ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ علوم کشفیہ کی تحقیق و تدقیق تو نہ کرے لیکن اجمالاً ان کی تصدیق کر دے تاکہ صاحب کشف کے گمراہ سمجھنے کا عقیدہ پیدا نہ ہو کیونکہ یہ عقیدہ سخت مضر ہوگا وہ مقبولان الٰہی ہیں جن کی شان میں یہ ارشاد وارد ہے مَنْ اٰذٰی لِیْ وَلِیًّا فَقَدْ اٰذَنْتُہٗ بِالْحَرْبِ (جو میرے ولی کو ایذا دے اس کو میری طرف سے اعلانِ جنگ ہے) اور تصدیق اجمالی کے معنے یہ ہیں کہ یوں سمجھے کہ یہ قول محتمل حق وصواب ہے ممکن ہے صحیح ہو۔ احتمال وامکان کی قید اس لئے میں نے بڑھا دی تاکہ الہام کے قطعی ہونے کا اعتقاد نہ ہو گو بعض صوفیہ کے کلام میں یہ بھی وارد ہے کہ اہل کشف صحیح تلبیس ابلیس سے محفوظ ہو جاتے ہیں میں بھی بہت دنوں اس کے اندر چکر میں رہا کہ اس قول کا مطلب کیا ہے کیونکہ ہمارا عقیدہ تو ظنیت الہام کا ہے اور اس کو تلبیس ابلیس سے محفوظ اور بالکل صحیح فرماتے ہیں جس سے متبادر یہ ہے کہ ان کے نزدیک الہام قطعی ہے میں عرصہ دراز تک اس اشکال کی

وجہ سے پریشان رہا اور جو بات اس پریشانی کے متعلق مجھے معلوم ہوئی ہے وہ عرض کرتا ہوں اور میں محقق ہونے کا دعوےٰ نہیں کرتا بلکہ محض شفقت کی بناء پر کہتا ہوں کہ میرا عمر بھر کا تجربہ یہ ہے کہ علوم کشفیہ کا مطالعہ مضر ہے ان کا مطالعہ کبھی نہ کرے نہ ان کی تحقیق کے درپے ہو ہاں اجمالاً اہلِ کشف کی بزرگی کا معتقد رہے اور اجمالاً ان کی تصدیق بھی کرے مگر تفصیل کی فکر میں نہ پڑے حضرت مجدد صاحب رحمۃ اللہ علیہ تو بڑے رتبہ کے ہیں وہ تو بے دھڑک فرماتے ہیں کہ شیخ اکبر از مقبولان نظر می آید مگر علوم او نامقبول اند (شیخ اکبر مقبولانِ الٰہی میں سے معلوم ہوتے ہیں مگر ان کے علوم نامقبول ہیں) مگر مشکل ہماری ہے ہم شیخ کی باتوں کو نامقبول کیسے کہیں ہمارا تو یہ رتبہ نہیں سو الحمد للہ کچھ دن ہوئے ہیں کہ اس اشکال کا جواب سمجھ میں آگیا مگر ایک مسئلہ سمجھ میں آجانے کے بھروسہ دوسرے مسائل کا مطالعہ یہ سمجھ کر نہ کرنا چاہیئے کہ ہم کو تو دامن چھڑانا آتا ہے کیونکہ بعض دفعہ ایسا خار لگتا ہے کہ پیچھا چھڑانا مشکل ہو جاتا ہے وہ دامن کو بھی پھاڑ کے رکھ دیتا ہے اور خود نہیں نکلتا دیکھو اگر ایک شخص کو نگاہ نیچی کر لینے کی مشق ہے تو اس کو یہ تو مناسب نہیں کہ اس کے بھروسہ خود قصد کر کے بازار میں ایسی جگہ کو نکلا کرے جہاں بازاری عورتوں کا مجمع رہتا ہے صاحبو! بہتر تو یہی ہے کہ بازار ہی میں نہ جایئے تاکہ کوئی عورت نظر ہی نہ پڑے ورنہ کبھی تو ایسی نظر پڑے گی کہ یہ ساری مشق رکھی رہ جائے گی تم ہزار نگاہ نیچی کرنا چاہو گے وہ پھر اوپر کو آنکھ اٹھا دے گی اور نگاہ نیچی کر بھی لی تو ایک بار کی نظر سے بعض دفعہ دل پر ایسا تیر لگتا ہے کہ عمر بھر دل سے نہیں نکلتا پھر یوں کہو گے ؂

درون سینۂ من زخم بے نشان زدۂ
بحیرتم چہ عجب تیر بے کمان زدۂ

(تو نے میرے سینہ میں بے نشان زخم مارا ہے حیرت ہے کہ کیا عجیب تیر بلا کمان کے مارا ہے)

اس لئے اہل تجربہ کا قول ہے "رہ راست رو اگرچہ دور است" (سیدھے رستہ

پر چلو اگرچہ دور ہو) اس قول پر اہل اقلیدس کو شبہ ہوا ہے کہ خط مستقیم تو بوجہ اقصر الخطوط الواصلہ بین النقطتین (دو نقطوں کے درمیان جو خطوط ہیں ان سب سے چھوٹے خط کو خط مستقیم کہتے ہیں) ہونے کے اقرب الطرق (راستوں میں قریب تر) ہوگا۔ وہ دور کیونکر ہو سکتا ہے یہ اسی خرابی کا نتیجہ ہے کہ محاورات کو تدقیقات پر محمول کرنے لگے۔ محاورہ میں راہ راست کہتے ہیں راہ بے خطر کو مطلب یہ ہے کہ جس راستہ میں خطرہ نہ ہو اس کو اختیار کرو اگرچہ وہ دور ہی کیوں نہ ہو۔ اب کچھ شبہ نہیں پس علوم کشفیہ کا مطالعہ ہرگز نہ کرنا چاہئے کیونکہ وہ خطرہ سے خالی نہیں بلکہ صرف علوم معاملہ کا مطالعہ کرے کہ وہ بے خطر ہیں اور میں نے وہ قول کشف صحیح کے مامون عن التلبیس ہونے کا قصداً نہیں دیکھا تھا بلکہ بلا قصد نظر سے گذر گیا اور آفت آگئی اور کہیں حاشیہ یا شرح میں اس کا حل بھی نہ تھا لیکن خدا کا شکر ہے کہ باوجود کسی شخص کی عدم اعانت کے اشکال حل ہو گیا وہ حل یہ ہے کہ ہم نے مانا کہ صاحب کشف صحیح تلبیس ابلیس سے مامون ہو جاتا ہے لیکن باوجود امن عن التلبیس کے حجت شرعیہ اس کو لازم نہیں کیونکہ ایسی نظائر موجود ہیں جہاں باوجود امن عن التلبیس کے شرعاً ایک شئے حجت نہیں۔ اس کی ایسی مثال ہے جیسے ابصار بالنظر کو اکثر اوقات مامون عن التلبیس ہے جس کی نگاہ درست ہو اس کا ابصار عموماً غلطی نہیں کرتا مگر پھر بھی وہ شرعاً حجت نہیں نہ اس کے مقتضا پر اعتقاد واجب ہے نہ اس کے خلاف کا احتمال گناہ ہے مثلاً ہم کو چاند سورج سے چھوٹا نظر آتا ہے مگر اس پر اعتقاد لازم نہیں ممکن ہے کہ واقع میں بڑا ہو اور ہم کو چھوٹا نظر آتا ہو ہاں وہ مواقع مستثنیٰ ہیں جن میں شریعت نے ابصار کو حجت مانا ہے جیسے رویت ہلال وغیرہ اس نظیر کا ذہن میں آنا تھا کہ بادل سا پھٹا اور اشکال کی ظلمت رفع ہو کر دل میں نور چمکا اور حق تعالیٰ کا بار بار شکر ادا کیا ورنہ دل پر پہاڑ سا رکھا تھا اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ اگر پہاڑ پر یہ ثقل ہوتا تو پھٹ جاتا بس خطرات میں قصداً پڑ کر پھر نکلنا یہ عقلمندی نہیں بلکہ سلامتی اسی میں ہے کہ خطرات کے

پاس ہی نہ جاؤ ؎

ہر گز بگندمی گوں لا تقربوا کہ زہر ست
حال پدر بیاد ز ام الکتاب دارم

(گندمی رنگ کے ہرگز قریب مت جاؤ کہ زہر ہے ام الکتاب حال پدر کی یاد رکھتا ہوں)

وہ تو شیخ اکبر تھے مگر کہیں تم ان کے علوم کشفیہ کو دیکھ کر شیخ اکفر نہ ہو جاؤ جیسے عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ اکبر شاہ کے متعلق کہا کرتے جد ما اکفر بود (ہمارا دادا اکفر تھا) وہاں تو خود اکبر کو اکفر کہہ رہے ہیں یہاں اکبر تو اکبر ہی رہیں گے ہاں ان کے کلام کا دیکھنے والا اکفر ہو جائے گا۔ اکبر کے درباری کچھ ایسے بیایمان واقع ہوئے تھے کہ ہمیشہ اس غریب کو نئے نئے طریقے سے کافر بنانے کی کوشش کرتے تھے چنانچہ ایک مرتبہ سب نے مل کر اس کو نبی بنایا اور ایک شخص ابو بکر بنا اور ایک عمر بنا ملا دو پیازے بھی اس مجلس میں موجود تھے جب ان کی باری آئی اور ان سے پوچھا گیا کہ ملا جی آپ کیا بننا چاہتے ہیں تو بولے میں اس جماعت کا ابو جہل ہوں میں تم سب کی تکذیب کرتا ہوں کہ تمہارا نبی بھی جھوٹا اور اس کے ساتھی بھی جھوٹے کیونکہ نبی کے واسطے اس کی بھی ضرورت ہے کہ کوئی اس کا مکذب بھی تو ہو وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ يُوْحِيْ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا ؕ (اسی طرح ہم نے ہر نبی کے دشمن بہت سے شیاطین پیدا کئے تھے کچھ آدمی اور کچھ جن جن میں سے بعضے دوسرے بعض کو چکنی چپڑی باتوں کا وسوسہ ڈالتے رہتے تھے تاکہ ان کو دھوکہ میں ڈالدیں)

ملا جی کی اس بات پر دربار میں قہقہہ پڑ گیا وہ نبوت درہم برہم ہو گئی۔ اور یہ حکایات افواہی ہیں۔ ابو الفضل میں اکبر نے ایک مکتوب میں ان سب خرافات سے اپنا تبریہ بھی کیا ہے جو اس کی طرف منسوب کی جاتی ہیں۔ پس خلاصہ جواب کا یہ ہوا کہ ہم نے مانا کہ صاحب کشف صحیح کو تلبیس نہیں ہوتی مگر پھر بھی کشف شرعاً حجت

نہیں نہ خود صاحب کشف پر نہ دوسروں پر جیسے میں نے ابھی کہا کہ چاند کو ہم آفتاب سے چھوٹا دیکھتے ہیں مگر شرعاً یہ ابصار حجت نہیں نہ اس پر اعتقاد رکھنا واجب نہ اس کے خلاف کا اعتقاد حرام ۔ بہرحال میں اپنے دوستوں کو مشورہ دیتا ہوں کہ وہ شیخ اکبر کی تصانیف کا ہرگز مطالعہ نہ کریں نہ معلوم کس چکر میں پڑ جائیں ۔ تمہارے لئے شیخ اکبر سے شیخ اصغر ہی اچھا۔ یہ بات میں تجربہ کے بعد کہہ رہا ہوں اور مشہور تعلیم ہے سَلِ الْمُجَرِّبَ وَلَا تَسْئَلِ الْحَکِیْمَ (تجربہ کار سے دریافت کرو حکیم سے مت پوچھو) اور یاد رکھو کہ علوم کشفیہ کو تصوف سے کچھ تعلق نہیں مگر چونکہ بعض صوفیہ اہل کشف تھے اور انھوں نے اپنی کشفیات کو تقریراً و تحریراً ظاہر کیا جس سے ناقص الفہم گمراہ ہونے لگے اس لئے محققین صوفیہ نے ان کی حقیقت ظاہر کر کے اشکالات کو رفع کرنا چاہا اس لئے علوم کشفیہ تصوف سمجھے جانے لگے اگر یہ حضرات اہل کشف اپنے علوم کشفیہ کو ظاہر نہ کرتے تو محققین کو ان سے بحث کرنے کی ضرورت نہ ہوتی بلکہ وہ اصل مقصود ہی کی تحقیق میں رہتے یعنی علوم معاملہ کی تفصیل میں کیونکہ قرب حق کا مدار معاملہ پر ہے نہ کہ علوم کشفیہ پر خوب سمجھ لو۔ اب یہاں سے سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ متکلمین پر جو بعض لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ انھوں نے علوم قرآن کو چھوڑ کر خواہ مخواہ تدقیق سے کام لیا یہ ان کی کوتاہ نظری ہے کیونکہ متکلمین نے ضرورت سے مجبور ہو کر ایسا کیا ہے جبکہ لوگ خود تدقیق کرنے لگے اور شبہات میں پڑ گئے تھے اگر لوگ شبہات میں نہ پڑتے تو ان کو ضرورت نہ تھی پس تم بھی شبہات میں نہ پڑو اور سذاجت اصلیہ پر رہو تو واقعی اس سے بہتر کوئی راستہ نہیں۔

امام ابوالحسن اشعریؒ کی حکایت ایک ثقہ سے سنی ہے کہ ایک عالم ان سے ملنے گئے مگر چونکہ صورت سے ناآشنا تھے اس لئے خود آپ ہی سے پوچھا کہ شیخ ابوالحسن اشعری کون سے ہیں۔ فرمایا تم میرے ساتھ دربار شاہی میں چلو وہاں بتلاؤں گا چنانچہ دونوں دربار شاہی میں پہنچے وہاں ہر قسم کے علماء مجتمع تھے محدثین بھی فقہاء بھی فلاسفہ بھی متکلمین بھی معتزلہ بھی اور اہل سنت بھی امام ابوالحسن اشعریؒ کے پہنچنے کے بعد

ایک شخص نے ذات و صفات کے کسی مسئلہ میں گفتگو شروع کی اس کے بعد دوسرے علماء نے اس کے متعلق اپنی اپنی تحقیقات بیان کیں معتزلہ نے اہلِ سنت کے مسلک پر اعتراضات کئے اہلِ سنت نے ان کو جواب دیئے یہ سب کچھ ہوتا رہا مگر امام ابوالحسن خاموش بیٹھے رہے جب سب علماء اپنی اپنی کہہ چکے تو اخیر میں شیخ نے کھڑے ہو کر معتزلہ و فلاسفہ کو خطاب کرکے ان کی سب باتوں کا جواب دیا اور ان مسائل کی ایسی تحقیق کی کہ جس پر فلاسفہ کو بولنے کا موقع نہ رہا اس سے فارغ ہو کر بیٹھے تو اپنے رفیق سے کہا کہ ابوالحسن میں ہی ہوں یہ بزرگ بہت خوش ہوئے اور کہا واقعی جیسا سنا تھا اس سے بڑھ کر آپ کو پایا پھر ان بزرگ نے اپنی کتاب میں امام کی بہت تعریف لکھی اور اخیر میں یہ لکھا ہے کہ جب امام ابوالحسنؒ سب کو جواب دے چکے تو میں نے عرض کیا کہ حضرت آپ نے اول ہی ان مسائل کی وہ تحقیق کیوں نہ بیان کر دی جو اخیر میں بیان فرمائی ہے تاکہ مخالفین کو اعتراض کا موقع ہی نہ ملتا۔ امام نے جو اس سوال کا جواب دیا وہ آب زر سے لکھنے کے قابل ہے۔ فرمایا کہ ان مسائل میں خود تکلم کرنا بدعت ہے کیونکہ ان میں تکلم کرنا خلاف سنت ہے تو میں نے ابتداءً ان میں تکلم کو جائز نہ سمجھا مگر جب اہل بدعت نے مذہب حق پر اعتراض کیا تو اب جواب کی غرض سے تکلم کی ضرورت ہوئی اس لئے میں ابتداء میں خاموش رہا اور اخیر میں مجبور ہو کر بولا جب کہ حق پر اعتراضات ہونے لگے کہ اب سکوت کی گنجائش نہ رہی اب ایسے محتاط علماء کہاں ہیں اب تو ہر شخص ذرا سے سوال پر اپنی تحقیقات بیان کرنے لگتا ہے چنانچہ آجکل لوگوں کو یہ سبق مل گیا ہے کہ جو ملتا ہے سلطان ابن سعود کے متعلق سوال کرتا ہے کہ ان کے بارے میں آپ کا کیا اعتقاد ہے اب لگے مولوی صاحب اپنی تحقیق بیان کرنے جس میں خوامخواہ فضول وقت ضائع ہوتا ہے۔ صاحبو! صاف یوں ہی کیوں نہ کہہ دو کہ ہم کو کچھ خبر نہیں اور یہ کہہ کر اپنے کام میں لگو اور واقعی ہندوستان کے رہنے والوں کو کیا خبر۔ ہمارے پاس بجز اخباروں کے

تحقیق کا ذریعہ ہی کیا ہے اور اخباروں کی دیانت کا جو حال ہے سب کو معلوم ہے رہا حجاج کے بیان سے استدلال کرنا سو اس کی یہ حقیقت ہے کہ ہر شخص اپنے مذاق کے موافق حالت بیان کرتا ہے بعض لوگ اول اول ابن سعود کی تعریف کرتے ہوئے آئے تھے کیونکہ اس وقت تک ابن سعود کا طرز عمل بظاہر ان کے مذاق کے موافق تھا اور ان کو یہ امید تھی کہ وہ شخصی سلطنت قائم نہ کریں گے بلکہ جمہوری قائم کریں گے پھر دوبارہ جو یہ رنگ دیکھ کر آئے کہ سلطان نے اپنی ملوکیت کا اعلان کر دیا اور شخصی سلطنت قائم کر دی تو وہی تعریف کرنے والے جو سلطان کو امام وقت اور فرشتہ خصلت کہتے تھے اب اس کو شیطان سے بدتر کہنے لگے اس حالت میں کسی کے بیان پر کیا خاک اعتماد کیا جائے بس اسلم یہی ہے کہ سکوت کیا جائے اور کہہ دیا جائے کہ ہم کو تحقیق نہیں مگر اس جواب سے شرماتے ہیں کیونکہ اس میں جہل کا اقرار ہے حالانکہ صاحب علم ہونے کے لئے ہر بات کا جاننا ضروری نہیں تو کسی ایک بات کے نہ جاننے سے آپ کا جاہل ہونا کیونکر لازم آیا۔ بزرجمہر کا قصہ ہے جو نوشیرواں کا وزیر اعظم تھا کہ اس سے ایک بڑھیا نے کسی بات کے متعلق سوال کیا بزرجمہر نے کہا کہ مجھے اس کی تحقیق نہیں۔ بڑھیا نے حیرت سے کہا کہ تم کو وزیر ہو کر اس بات کی خبر نہیں ہے پھر تم اتنی بڑی تنخواہ کس بات کی پاتے ہو۔ بزرجمہر نے کہا کہ اتنی تنخواہ تو میں اپنی معلومات کے عوض میں پاتا ہوں اگر مجہولات کی تنخواہ پاتا تو خزائن ہفت اقلیم بھی کافی نہ ہوتے۔ دوسرے آپ کو معلوم بھی ہے لا ادری (میں نہیں جانتا) کہنا جہل کی دلیل نہیں بلکہ علم کی دلیل ہے چنانچہ ایک بار مولانا محمد اسمٰعیل صاحب شہید رحمۃ اللہ علیہ نے وعظ فرمایا کسی نے کہا سبحان اللہ کیا علوم ہیں۔ مولانا نے فرمایا میں تو کچھ بھی نہیں جانتا اس شخص نے کہا یہ حضرت کی تواضع ہے فرمایا یہ تواضع نہیں بلکہ تکبر کا قول ہے۔ کیونکہ لا اعلم (میں نہیں جانتا) بڑا عالم ہی کہہ سکتا ہے جس پر علم کی وسعت منکشف ہو چکی ہو ورنہ جس پر وسعت علم منکشف نہیں ہوئی وہ ہر بات میں علم کا دعویٰ کرتا ہے۔

تیسرے لا اعلم کہدینا بڑی راحت کی بات ہے اور اعلم (میں جانتا ہوں) کہنا مصیبت کو اپنے سر لینا ہے۔ اس لئے ایک عاقل کی رائے ہے کہ حتی الامکان جواب نفی میں دیا کرو کیونکہ نفی میں جواب دینا اہون ہے اور اثبات میں جواب دینا اشد ہے مثلاً اگر تم سے کسی نے سوال کیا کہ آپ نے کلکتہ دیکھا ہے۔ اس کے جواب میں اگر یہ کہدیا کہ ہاں دیکھا تو بس سوالات شروع ہو جائیں گے کہ بتلاؤ وہاں کیا کیا عجائبات ہیں، چڑیا گھر کتنا بڑا ہے اور قلعہ کیسا ہے وغیرہ وغیرہ اور اگر یہ کہدیا کہ میں نے کلکتہ دیکھا نہیں تو اس پر کوئی سوال نہیں ہو سکتا پس راحت اسی میں ہے کہ جب کوئی فضول سوال کرے تو اس کے جواب میں یا تو اپنے جاہل ہونے کا اقرار کرے یا سائل کو جاہل بنا دے اگر لڑائی کا اندیشہ نہ ہو اور یہ کہدے کہ اس سوال کا جواب سمجھنے کے لئے تمہارا فہم کافی نہیں جیسے علیگڈھ میں میرے پاس ایک صاحب آئے جو کالج میں عربی یا انگریزی کے پروفیسر تھے اور وہاں دونوں زبانوں میں یکتا مشہور تھے۔ انھوں نے ایک حدیث کا متن پڑھا جس کا یہ مفہوم ہے کہ جہاں زنا کی کثرت ہوتی ہے وہاں طاعون پھیلتا ہے اور یہ کہا کہ یہ سمجھ میں نہیں آیا۔ میں نے کہا کہ حدیث کا مدلول سمجھ میں نہیں آیا یا جنایت اور عقوبت میں ارتباط سمجھ میں نہیں آیا کہا ارتباط سمجھ میں نہیں آیا۔ میں نے کہا ارتباط نہ سمجھنے سے ضرر کیا ہوا کہنے لگے کہ ضرر تو کچھ نہیں ہوا لیکن معلوم ہونے میں نفع تھا۔ میں نے کہا وہ نفع کیا تھا کہنے لگے اطمینان ہو جاتا میں نے کہا کہ خود اطمینان کے مطلوب ہونے کی کیا دلیل کہنے لگے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قول وَلٰكِنْ لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِيْ (لیکن اس لئے تاکہ میرا قلب مطمئن ہو جائے) میں نے کہا اور اس کی کیا دلیل کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اطمینان مفید تھا تو آپ کو بھی ہوگا۔ کیونکہ ممکن ہے ایک شئے کسی کو مفید ہو اور کسی کو مفید نہ ہو جیسا کہ ادویہ میں مشاہدہ ہے کہ ایک دوا ایک شخص کو موافق ہوتی ہے دوسرے کو موافق نہیں ہوتی۔ اس پر

ضروری اطلاع:۔ خط و کتابت کرتے وقت یا پتہ بدلتے وقت نمبر خریداری ضرور تحریر فرمادیں۔

وہ خاموش ہو گئے۔ بعد میں میں نے کہا کہ آپ یہ نہ سمجھئے گا کہ مولویوں کو احکام کی حکمتیں معلوم نہیں الحمد للہ ہمارے پاس اسرار و حکم کا خزانہ موجود ہے مگر ؎

مصلحت نیست کہ از پردہ بروں افتد راز
ورنہ در مجلس رنداں خبرے نیست کہ نیست

(مصلحت نہیں ہے کہ راز فاش ہو جائے ورنہ عارفین کی مجلس میں کوئی ایسی خبر نہیں کہ معلوم نہ ہو)

اور گو یہ ظاہر میں تکبر تھا مگر صوفیہ کا ارشاد ہے اَلتَّکَبُّرُ مَعَ الْمُتَکَبِّرِیْنَ عِبَادَۃٌ (متکبرین سے تکبر کرنا عبادت ہے) یہ بات میں نے اس لئے کہہ دی تاکہ وہ نہ سمجھیں کہ علماء کورے ہیں ان کو کچھ معلوم نہیں کیونکہ آجکل تو تعلیم یافتہ جماعت کو اپنی عقل وفہم پر بہت ناز ہے۔ ان کے چلے جانے کے بعد میں نے دوستوں کے سامنے اس حدیث کے متعلق ایک تحقیق بیان کی جو میرے ذہن میں تھی جس سے زنا و طاعون کے درمیان ارتباط ظاہر ہوتا ہے۔ احباب کہنے لگے کہ تم نے یہ تحقیق ان پروفیسر صاحب کے سامنے بیان نہ کردی وہ بہت خوش ہوتے۔ میں نے کہا تم نہیں جانتے یہ لوگ حکم کو بناء احکام قرار دیتے ہیں۔ ان کو حکمت بتلانا اون کے مرض کو بڑھانا ہے ان کے لئے اسی جواب کی ضرورت ہے کہ حکمت کا جاننا کیا ضرور ہے اور آپ لوگ حکمت کو بناء احکام نہیں سمجھتے۔ دوسرے یہ کہ وہ جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قصہ سے اطمینان کے مطلوب ہونے پر استدلال کرتے ہیں تو اول تو یہ استدلال اس لئے صحیح نہیں کہ وہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حق تعالیٰ سے طلب اطمینان کا اظہار کیا تھا مخلوق سے انھوں نے اطمینان نہیں چاہا تھا پھر تم مخلوق سے اطمینان کے طالب کیوں ہو۔ دوسرے وہاں حق تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اطمینان مشاہدہ سے کردیا تھا کہ مردہ کو زندہ کرکے دکھلا دیا جس میں شبہ کی گنجائش نہ تھی اور میں اگر ان پروفیسر صاحب کا اطمینان کرتا تو مقدمات ظنّیہ سے کرتا جو ممکن ہے کسی وقت ٹوٹ جاتے یا کم از کم

ان کے نزدیک مخدوش ہوجاتے تو پھران کا اطمینان بھی رخصت ہوجاتا اور اطمینان زائل ہونے کے بعد وہ حدیث کی بھی تصدیق نہ کرتے کیونکہ ان کے ذہن میں حدیث کی صحت ان ہی مقدمات پر مبنی تھی اس لئے ان کے سامنے یہ تقریر مناسب نہ تھی میں جواب میں سائل کے مذاق کا اتباع نہیں کرتا بلکہ اس کے مرض کا علاج کرتا ہوں تاکہ اس کو اپنی غلطی پر تنبہ ہو۔

میرے پاس ایک صاحب جو ایک اردو کے اسکول میں مدرس تھے آئے کہ مجھے تقدیر کا مسئلہ سمجھادو۔ میں نے کہا کہ آپ کی عوض سمجھے گا کون کہنے لگے میں سمجھوں گا میں نے کہا تم نہیں سمجھ سکتے اور میں ایسے شخص سے خطاب نہیں کرسکتا جس کو میں جانتا ہوں کہ اس مسئلہ کو نہیں سمجھ سکتا۔ تم کسی طالب علم کو لے آؤ میں اس کے سامنے تقریر کردوں گا تم بھی سن لینا اس سے تم کو یہ بھی معلوم ہوجائے گا کہ تم نہیں سمجھ سکتے اور یہ معلوم ہوجائے گا کہ مولویوں کے پاس تمہارے سوالوں کا جواب ہیں۔ میں اوپر عرض کرچکا ہوں کہ یہ صاحب اسکول کے معلم تھے جن کی لیاقت کا یہ حال ہے کہ ایک صاحب نے اعتراض کو اعتراز لکھا تھا کسی نے ٹوکا تو کہا جی ہاں غلطی ہوگئی ظاء سے لکھنا چاہیئے تھا۔ انگریزی میں تو بی۔ اے ایم۔ اے ہوجاتے ہیں اور علوم عربیہ سے اتنی اجنبیت کہ اعتراض کا املا بھی صحیح نہیں میں تو کہا کرتا ہوں کہ انگریزی خواں ترقی معکوس کرتے ہیں مرد سے بی بننے ہیں یعنی عورت جو بی اے کا جزو اول ہے پھر میم بن جاتے ہیں کہ ایم اے اور میمیں قریب قریب ہیں اور اس پر دعویٰ یہ ہے کہ ہم ہر بات کو سمجھتے ہیں اور ہمارے علماء ایسے خوش اخلاق ہیں کہ ان لوگوں کے ہر سوال پر جواب کی تقریر کرنے لگتے ہیں اور احکام شرعیہ کی حکمتیں بیان کرنے لگتے ہیں یہ خوش اخلاقی نہیں بچہ کے ہاتھ میں سانپ دینا ہے تم کو تو سانپ کا پکڑنا جائز ہے کیونکہ تمہارے پاس منتر اور تریاق موجود ہے۔ بچہ کو سانپ دینا اسے ہلاک کرنا ہے اسی طرح علوم غامضہ کی تقریر جاہلوں کے سامنے کرنا ان کو ہلاک کرنا ہے کیونکہ اس سے جو

ان کو شبہات پیدا ہوں گے ان کا علاج ان کے پاس نہیں پس ان کو تو صاف جواب دو کہ قرآن وحدیث میں یہی آیا ہے تم کو ماننا پڑے گا اور جو اس جواب کو نہ مانے اس کو منہ نہ لگاؤ ؎

آنکس کہ بقرآن وخبر زو نہ رہی
آنست جوابش کہ جوابش نہ دہی

(جس شخص سے قرآن وحدیث سے تو نہ چھوٹے اس کا جواب یہی ہے کہ اس کو جواب نہ دو)

اور میں بقسم کہتا ہوں کہ اطمینان اور تسلی اسی سے ہوتی ہے کہ میں اللہ ورسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کو بلادلیل مانتا ہوں اسرار اور حکم کے درپے ہونے سے پوری تسلی نہیں ہوتی۔ امام رازی رحمۃ اللہ علیہ جو بہت بڑے معقولی اور فلسفی ہیں متکلم بھی بڑے درجے کے ہیں۔ اخیر عمر میں اپنی عمر بھر کا تجربہ بیان کرتے ہیں ؎

نِهَايَةُ اَقْدَامِ الْعُقُوْلِ عِقَالُ ۔۔۔ وَغَايَةُ سَعْيِ الْعَالَمِيْنَ ضَلَالُ
وَلَمْ نَسْتَفِدْ مِنْ بَحْثِنَا طُوْلَ عُمْرِنَا ۔۔۔ سِوٰى اَنْ جَمَعْنَا فِيْهِ قِيْلَ يُقَالُ

(دنیا والوں کی کوشش کا خلاصہ ضلال ثابت ہوا بجز بک بک اور قیل وقال کے کچھ حاصل نہ ہوا عمر یوں ہی ضائع کی)

کہ ہم کو عمر بھر کی بحث سے سوائے قیل وقال کے کچھ حاصل نہیں ہوا۔ ان ہی امام رازی کا قصہ سنا گیا ہے کہ یہ شیخ نجم الدین کبریٰ رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت ہونے گئے تھے۔ شیخ نے بیعت کیا اور ذکر وشغل تعلیم کر کے ایک حجرہ میں رہنے کا امر کیا یہ ذکر وشغل میں مشغول ہو گئے تو چند روز کے بعد یہ محسوس ہوا کہ دل میں سے کوئی چیز نکل کر بھاگی جا رہی ہے۔ شیخ سے عرض کیا فرمایا یہ آپ کا منطق وفلسفہ ہے جو قلب سے نکل رہا ہے۔ انھوں نے کہا حضرت میں نے تو اس کو بڑی محنت سے حاصل کیا تھا اس کا قلب سے محو ہونا تو مجھے گوارا نہیں فرمایا

اس کے عوض تم کو حق تعالیٰ دوسرے علوم عطا فرمائیں گے جو حقیقی علوم ہیں اور یہ تو کتابی علم ہے وہ وہبی علم ہوگا ؎

بینی اندر خود علوم انبیاء
بے کتاب و بے معید و اوستا

(بے کتاب و بے مددگار و استاد کے اپنے اندر انبیاء جیسے علوم پاؤ گے)
مگر امام رازی کو گوارا نہ ہوا۔ شیخ نے کہا پھر تمھیں اختیار ہے چنانچہ یہ ذکر و شغل چھوڑ کر درس و تدریس میں مشغول ہو گئے اتفاق سے شیخ کی زندگی ہی میں امام کی وفات کا وقت آ گیا اور نزع کی حالت میں شیطان ان کے پاس آیا اور کہا تم دنیا سے جا رہے ہو توحید بھی سالم لے چلے ہو کہا ہاں الحمد للہ میری توحید سالم ہے شیطان نے کہا ذرا مجھے تو بتلاؤ تمہارے پاس توحید کی کیا دلیل ہے امام رازی نے کتاب التوحید میں توحید کے سو دلائل لکھے تھے وہ بیان کرنا شروع کئے اور شیطان کمبخت نے ایک ایک دلیل کو توڑنا شروع کیا یہاں تک کہ ان کے تمام دلائل کو توڑ دیا اب تو امام رازی کا رنگ فق ہو گیا۔ شیطان نے کہا کہ یہ تو آپ کی توحید کا حال تھا جو رکن اعظم اسلام ہے جس میں آپ جہل مرکب کے اندر مبتلا تھے اس پر دوسرے مسائل کو بھی قیاس کر لو۔ یہ واقعہ شیخ نجم الدین کبریٰ کو منکشف ہو گیا اس وقت شیخ وضو کر رہے تھے۔ امام رازی کی پریشانی دیکھ شیخ گھبرا گئے اور فرمایا کہ اس وقت ایک بہت بڑے عالم کا ایمان خطرہ میں ہے۔ ایک خادم جو حضرت کو وضو کرا رہا تھا بولا کہ حضرت پھر آپ دستگیری فرمایئے۔ شیخ رحمۃ اللہ علیہ نے اسی جگہ سے ایک چلو پانی امام رازی کی طرف پھینکا حالانکہ وہ بہت دور دراز فاصلہ پر تھے مگر شیخ کی کرامت تھی کہ حق تعالیٰ نے وہ چلو بھر پانی امام رازی کے منہ پر پہنچا دیا جس سے ان کے حواس بجا ہوئے پھر شیخ نے کہا کہ شیطان سے یہ کیوں نہیں کہہ دیتے کہ نا معقول میں بلا دلیل خدا کو واحد اور

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سچا رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) مانتا ہوں۔ بطور کرامت ہی کے یہ آواز بھی ان کے کان میں پہنچی۔ جیسے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو جمعہ کا خطبہ پڑھتے ہوئے منکشف ہوا کہ لشکر اسلام دشمن کے نرغہ میں ہے اور دشمن غالب ہوا چاہتا ہے تو آپ نے خطبہ ہی میں جوش سے فرمایا یَاسَارِیَۃُ الْجَبَلَ یَاسَارِیَۃُ الْجَبَلَ کہ اے ساریہ (یہ سردار لشکر کا نام ہے) پہاڑ کی پناہ لو اور حق تعالیٰ نے یہ آواز مدینہ سے لشکر اسلام میں پہنچا دی جو اس وقت شام یا عراق میں تھا۔ اور حضرت ساریہ رضؓ نے حضرت عمرؓ کی آواز سن کر پہاڑی مورچہ پر قبضہ کر لیا جس کے بعد دشمن کی فوج کے حوصلے پست ہو گئے اور لشکر اسلام کو فتح ہوئی ایسا ہی یہاں ہوا اور امام رازیؒ نے شیطان کو بھی جواب دیا کہ ادنا معقول میں بلا دلیل کے خدا کو واحد اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سچا رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) مانتا ہوں۔ یہ جواب دینا تھا کہ شیطان دم دبا کر بھاگا اور حضرت شیخ نے خادم کو بشارت دی کہ الحمد للہ امام رازی شیطان کے جال سے نکل گئے سچ ہے ؎

دستِ پیر از غائباں کوتاہ نیست
دست او جز قبضۂ اللہ نیست

(پیر کا ہاتھ (توجہ) غائبوں سے کوتاہ نہیں ہے اس کا سوائے اللہ کے دوسرے کے قبضہ میں نہیں ہے)

اس میں علم غیب کا دعویٰ نہیں ہے کہ معاذ اللہ پیروں کو مریدوں کا حال ہمیشہ معلوم ہو جاتا ہے بلکہ بات یہ ہے کہ حضرات مقبولانِ الٰہی ہیں تو جو ان سے وابستہ ہوتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو محروم نہیں رکھنا چاہتے جس کے طرق مختلف ہوتے ہیں اور ان میں سے ایک طریق یہ بھی ہے کہ بعض اوقات اللہ تعالیٰ ان مشائخ کو کشف کے ذریعہ سے اطلاع دیدیتے ہیں اور ان کو حکم دیتے ہیں کہ اس شخص کی امداد کرو اور کبھی شیخ کو اطلاع بھی نہیں ہوتی کوئی لطیفہ غیبی شیخ کی صورت

میں آکر مدد کر جاتا ہے بس اصل یہ ہے کہ اگر ابتلاءً اللہ کی طرف سے وارد ہے تو لطفاً انہی کی طرف سے درمان بھی ہے ؎

دردا زیار ست ودرماں نیز ہم
دل فدلئے او شد وجاں نیز ہم

(بیماری دوست کی طرف سے اور علاج بھی۔ اس پر میرا دل فدا ہے اور جان بھی)

بیماری بھی وہی دیتے ہیں نسخہ بھی وہی پلاتے ہیں یہ ہر وقت کا مشاہدہ ہے کہ اس طریق میں جال بھی ہیں اور ان کے کاٹنے کی قینچیاں بھی ہیں اسی کو مولانا نہایت جوش سے فرماتے ہیں ؎

صدہزاراں دام ودانہ است اے خدا ۔۔۔ ما چو مرغان حریص و بے نوا
دمبدم پابستہ دام تو ایم ۔۔۔ گرہمہ شہباز وسیمرغے شویم
می رہانی ہر دمے مارا و باز ۔۔۔ سوے دامے می رویم اے بےنیاز

(اے خدا سینکڑوں جال اور دانہ ہیں ہم پرندوں کی طرح حریص و بے نوا ہیں ہر آپ کے جال کے پابستہ ہیں اگرچہ شہباز اور سیمرغ کیوں نہ ہوں ایک جال سے آپ ہم کو رہائی دیتے اور ہم دوسرے جال میں پھنس جاتے ہیں)

ایک جال سے نکلتے ہیں دوسرے میں پھنستے ہیں پھر حق تعالیٰ نے اس کے کاٹنے کو بھی قینچی تیار کر رکھی ہے بس یہی قصہ ہے کہ ہر وقت کا مرنا اور ہر وقت کا جینا ہے

کشتگان خنجر تسلیم را
ہر زماں از غیب جان دیگر است

(خنجر تسلیم کے کشتوں کو ہر زمانہ میں ایک اور جان عطا ہوتی ہے)

چنانچہ امام رازیؒ کو اللہ تعالیٰ نے ایک بیماری دی کہ شیطان نے ان کو پریشان کر دیا تو اس کی ساتھ دوا بھی نازل کی کہ شیخ کو کشف ہو گیا شیخ نے خادم کو اس حال پر مطلع کیا اس نے امام کی سفارش کی کہ دستگیری فرمایئے شیخ کو جوش ہوا کیونکہ

وہ ماذون من اللہ تھے اور انھوں نے باطناً بھی توجہ کی جس سے امام رازی کے قلب سے وساوس وخطرات رفع ہوگئے اور ظاہری اعانت بھی کی کہ وہ جواب تعلیم کیا جس نے شیطان کے جال کو تار تار کرکے توڑ دیا اسی لئے تو حدیث میں ہے فَقِیْہٌ وَاحِدٌ اَشَدُّ عَلَی الشَّیْطَانِ مِنْ اَلْفِ عَابِدٍ۔ ایک فقیہ ہزار عابدوں سے زیادہ شیطان پر بھاری ہے۔ یہاں فقیہ سے مراد عارف ہے جو مکائد شیطان سے واقف ہو جزئیات فقہ کا حافظ مراد نہیں کیونکہ جزئیات فقہ تو امام رازیؒ کو شیخ نجم الدین کبریٰؒ سے زیادہ یاد تھے مگر دیکھ لیجئے کہ شیطان کے جال کو کس نے توڑا۔ اسی لئے میں کہتا ہوں کہ اسرار اور حکم اور ابحاث سے تسلی حاصل نہیں ہوسکی اور نہ ان سے شیطان بھاگتا ہے۔ تسلی اسی سے ہوتی ہے کہ خدا کا حکم یوں ہی ہے بس ہم بے دلیل کے مانتے ہیں اسرار وحکم کے یا علوم کشفیہ کے درپے نہ ہو یہ خطرات سے خالی نہیں بس طریق تصوف سے اتنا حصہ لے لو کہ اخلاص واحسان حاصل کرلو جس کو نسبت کہتے ہیں بس اس سے زیادہ اور کچھ نہ لو صوفیہ کی تحقیقات اور کشفیات کا مطالعہ یہ سانپ ہیں ان سے دور رہو ؎

نکتہ ہا چوں تیغ پولاد ست تیز ۔۔۔ چوں نداری تو سپر واپس گریز

پیش ایں الماس بے اسپر میا ۔۔۔ کز بریدن تیغ را نبود حیا

(تصوف کی باریکیاں فولادی تلوار سے بھی زیادہ تیز ہیں جب تمہارے پاس ڈھال نہیں ہے واپس آؤ اس تلوار کے سامنے بغیر ڈھال نہ آؤ اس لئے تلوار کو کاٹنے سے حیا نہیں آتی)

اور یہ جو میں نے کہا ہے کہ علل اور ابحاث سے تسلی نہیں ہوتی بلکہ اطمینان اسی سے ہوتا ہے کہ اللہ ورسول صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ حکم ہے اس کی تائید اس قصہ سے تو ہوتی ہی ہے جو ابھی بیان کیا گیا ہے۔ حدیث سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وسوسہ کا علاج یہ بتلایا ہے کہ

وسوسہ کے وقت اٰمَنْتُ بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ (میں اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لایا)
کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دلائل معلوم نہ تھے یقیناً معلوم تھے مگر دلائل میں
غور کرنے کی تعلیم اسی لئے نہیں فرمائی کہ یہ سلسلہ غیر متناہی ہے اس سلسلہ میں
شبہات پر شبہات نکلتے چلے آئیں گے اس لئے وہ بوٹی بتلائی جو ہزار جواہرات
سے بھی انفع ہے مگر افسوس اس کی قدر نہیں کی جاتی کیونکہ بوٹی بہ نسبت جواہر کے
ارزاں اور سہل الحصول ہے اور قاعدہ ہے ؎

ہر کہ او ارزاں خرد ارزاں دہد
گوہرے طفلے بقرص ناں دہد

(جو شخص کسی چیز کو ارزاں لیتا ہے ارزاں دے بھی دیتا ہے چنانچہ بچہ نادان
قیمتی موتی کو روٹی کے ٹکڑے کے عوض دیدیتا ہے)

لوگ لمبے لمبے جوابوں کی قدر کرتے ہیں مختصر اور سہل جواب کی قدر نہیں کرتے
آجکل ہی میں شاملی سے ایک پان فروش کا خط آیا تھا جس میں اسی قسم کا سوال
تھا میں نے اس کا مختصر جواب دیا تو وہ لکھتے ہیں کہ خشک جواب سے تسلی
نہیں ہوتی چونکہ وہ پان فروش ہے اور پان پانی کا نر ہے تو اس نے پانوں کی
طرح جواب کے لئے بھی تری لازمی سمجھی مگر یہ ایسا قیاس ہے جیسا شیخ
سعدیؒ کی باندی نے قیاس کیا تھا کہ ایک شخص شیخ سے ملنے آیا باندی دروازہ
پر نام پوچھنے گئی اور کچھ دیر تک اس سے باتیں کرکے واپس آئی تو شیخ نے پوچھا
کون تھا کہا غبداللہ (غین معجمہ سے) شیخ نے فرمایا غبداللہ کیا بلا ہے کہا اس کی
عین یعنی آنکھ میں نقطہ یعنی پھولا ہے اس لئے میں نے بجائے عبداللہ کے غبداللہ
کہا پوچھا وہ کیا کہتا تھا کہا کچھ نہیں ایک معمولی بات تھی۔ میں نے خود ہی جواب
دیا وہ یہ پوچھتا تھا کہ استنجے میں پاکی کب ہوتی ہے کتنا دھویا جائے میں نے
کہا اتنا دھویا جائے کہ کھال چوں چوں بولنے لگے جیسے برتن کو رگڑتے ہیں
تو وہ چوں چوں کرتا ہے اس نے موضع استنجا کو برتن پر قیاس کیا ایسے ہی

اس پان فروش نے جواب سوال کو پانوں پر قیاس کیا کہ جواب بھی تر ہونا چاہئے حالانکہ یہ قیاس غلط ہے جواب کے لئے تری کی ضرورت نہیں بعض دفعہ خشکی کی بھی ضرورت ہوتی ہے بلکہ بعض دفعہ ضرب یضرب یعنی سختی کی بھی ضرورت ہوتی ہے اور ضرب یضرب میں ایسی برکت ہے کہ اس سے بہت جلد تمام شبہات حل ہوجاتے ہیں ہمارے مولانا محمد یعقوب صاحب رحمہ اللہ تعالٰی کا ارشاد ہے ؎

اَلْوَعْظُ یَنْفَعُ لَوْبِالْعِلْمِ وَالْحِکَمِ وَالسَّیْفُ اَبْلَغُ وُعَّاظٍ عَلَی الْقِمَمِ

نصیحت اگر علم و حکمت کے ساتھ ہو تو نفع پہنچاتی ہے اور تلوار سروں پر پڑنی نصیحت گروں میں سب سے بلیغ نصیحت گر ہے)

اور اگر مرتبہ فرمایا تھا کہ اللہ تعالٰی نے آسمان سے پانچ کتابیں نازل فرمائی ہیں چار تو مشہور ہیں توراۃ و زبور و انجیل و قرآن اور ایک پانچویں کتاب بھی آسمان ہی سے نازل ہوئی ہے چنانچہ ارشاد ہے وَاَنْزَلْنَا الْحَدِیْدَ فِیْہِ بَاْسٌ شَدِیْدٌ (اور ہم نے لوہے کو پیدا کیے جس میں شدید ہیبت ہے) جب چاروں کتابوں سے کسی کی اصلاح نہ ہو تو اس کے لئے پانچویں کتاب کی ضرورت ہے وہ حدید ہے یعنی تعلدار جوتا ایک شخص وساوس میں مبتلا تھے اور میں ان کا علاج کرتا تھا ایک دن وہ کہنے لگے کہ اب تو یہ وسوسہ ہوتا ہے کہ عیسائی ہو جاؤں میں نے اس کے جواب میں زور سے ایک دھول رسید کیا اور کہا نالائق جا دور ہو ابھی عیسائی ہوجا اسلام کو ایسے ناپاکوں کی ضرورت نہیں! اس دھول کی ایسی برکت ہوئی کہ دس برس سے زیادہ زمانہ ہوا آج تک ان کو ایک دو شبہات بھی تو نہ ہوئے۔ اسی طرح ایک ذاکر کی عادت تھی کہ وہ ذکر میں اٹھ اٹھ کر بھاگتے تھے۔ میں نے اس کا یہ علاج کیا کہ اپنے پاس بٹھلا کر ان سے ذکر کرایا اور جب بھاگنے لگے زور سے ہاتھ پکڑ کر بٹھلا دیا اور دو دھپ رسید کئے پھر عمر بھر ان کو یہ جوش نہ آیا۔ خیر یہ طرز عمل تو سب کی ساتھ نہیں ہوسکتا

کیونکہ ہماری حکومت نہیں لیکن یہ تو ہوسکتا ہے کہ جاہلوں کو منہ نہ لگایا جائے اور ان کے لایعنی سوالات کا خشک جواب دیا جائے اس سے بھی ان کا دماغ درست ہوجاتا ہے۔ چنانچہ ایک بار میں سہارنپور گیا تو وہاں ایک صاحب بہشتی زیور بغل میں دباتے ہوئے لائے اور ایک مسئلہ دکھا کر مجھ سے کہنے لگے کہ یہ مسئلہ دیکھ لیجئے۔ میں نے کہا کہ میری تو ساری کتاب بار بار کی دیکھی ہوئی ہے مجھے آپ کیا دکھلاتے ہیں۔ کہنے لگے یہ مسئلہ سمجھ میں نہیں آیا میں نے کہا کہ اس کا مطلب سمجھ میں نہیں آیا یا اس کی دلیل سمجھ میں نہیں آئی۔ اگر مطلب سمجھ میں نہیں آیا تو میں اس سے زیادہ آسان عبارت میں بیان کرنے پر قادر نہیں میرے نزدیک بہشتی زیور نہایت آسان اردو میں ہے۔ کہنے لگے کہ مطلب تو سمجھ لیا دلیل سمجھ میں نہیں آئی میں نے کہا کہ کیا اس مسئلہ کے سوا بہشتی زیور کے تمام مسائل کی دلیلیں آپ نے سمجھ لی ہیں یا اور بھی کچھ ایسے مسائل ہیں جن کی دلیل معلوم نہیں ہوئی اور اگر سب کی دلیلیں معلوم ہوچکی ہیں تو مجھے سوال کی اجازت دیجئے کہ میں کسی مسئلہ کی دلیل آپ سے دریافت کروں کہنے لگے کہ نہیں اور بھی بہت سے مسائل ایسے ہیں جن کی دلیل مجھے معلوم نہیں۔ میں نے کہا پھر اس کو بھی اسی مہر میں داخل کرلیجئے اسی کی دلیل جاننے کی کیا ضرورت ہے۔ بس اب ان کی منطق ختم ہوگئی اور کتاب بغل میں دبا کر رخصت ہوگئے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اس شخص نے تین روز سے حضرات علمائے سہارنپور کو تنگ کر رکھا تھا اور وہ حضرات خوش اخلاقی سے اس کو دلیل سمجھا رہے تھے لیکن میں نے چار منٹ میں اس کو الا جواب کر کے اٹھا دیا۔ ان کے جانے کے بعد ایک صاحب جنٹلمین تشریف لائے اور تہذیب و خیر خواہی کے لہجے میں فرمانے لگے کہ بعض جہلا اس مسئلہ پر طعن کرتے ہیں جس سے ہمارا دل دکھتا ہے کہ ہمارے سامنے ہمارے بزرگوں کو برا بھلا کہا جاوے اس لئے مناسب ہے کہ بہشتی زیور کے اس مسئلہ کے متعلق جو مخالفین کا اعتراض ہے اس کے جواب کے لئے ایک جلسہ منعقد کر کے حق کو

واضح کر دیا جائے میں نے کہا کہ آپ کی خیر خواہی میں شک نہیں مگر یہ بتلایئے دنیا میں ایک جماعت یعنی دہریہ خدا تعالیٰ کو اور ایک جماعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اور ایک جماعت صحابہؓ کو اور ائمہ مجتہدین کو برا بھلا کہتی ہے اور یقیناً اس سے بھی آپ کا دل مجروح ہوتا ہے آپ نے اس کا کیا انتظام کیا ہے۔ ہر کام ترتیب سے اچھا ہوتا ہے آپ پہلے ان جماعتوں کا انتظام کر دیجئے اخیر میں ایسے جماعت کا میں انتظام کر دوں گا جو بہشتی زیور پر طعن کرتے ہیں بس اس کا کچھ جواب نہ تھا میں کہتا ہوں جاہلوں کا انتظام علمی جوابوں سے نہیں ہو سکتا بس ان کے لئے تو یا پانچویں کتاب ہو یا یہ کہ ان کو جواب مت دو بلکہ دھکا دو یا خشک جواب دیدو جیسا میں نے سہارنپور میں دیا تھا۔ ہاں اگر کوئی استفادہ کی غرض سے سوال کرے اور اس میں استفادہ کی قابلیت بھی ہو تو اس کے لئے ہم ہر وقت علمی جواب دینے کو تیار ہیں اور اگر استفادہ مطلوب نہ ہو یا اس میں اس تحقیق کی استعداد نہ ہو تو اس کو علمی جواب ہرگز نہ دو کیونکہ اس سے اس کی اصلاح نہ ہوگی بلکہ اور زیادہ ہلاک ہوگا اور شبہات کا سلسلہ بڑھتا چلا جائے گا دیکھو اگر ایک پودا سا آدمی آئے اور یہ کہے کہ میرے سر پر یہ دشمن کا بورا اٹھوا دو بتلایئے ہم کیونکر دشمن کا بورا اس کو اٹھوا دیں یقیناً اس کا توگوہ نکل جائے گا۔ جیسے ایک شخص کا قصہ ہے کہ وہ رات کو بستر پر پیشاب کر لیا کرتا تھا۔ بیوی نے ملامت کی کمبخت یہ کیا حرکت ہے کہ تو بڑی عمر کا آدمی ہو کر رات کو بستر پر موتتا ہے کہنے لگا کیا بتلاؤں رات کو ہر روز شیطان خواب میں آتا ہے کہ چلو سیر کو چلیں میں ساتھ ہو لیتا ہوں راستہ میں پیشاب کی ضرورت ہوتی ہے، اس وقت میں اپنے نزدیک قدمچہ پر بیٹھ کر پیشاب کرتا ہوں اور وہ بستر پر نکل جاتا ہے۔ بیوی بھی اس کی بیوقوف تھی کہنے لگی کہ جب شیطان جو جنات کا بادشاہ ہے تمہارا ایسا دوست ہے تو اس سے یوں کہنا کہ ہم غریب آدمی ہیں کہیں سے بہت سا روپیہ ہم کو لا دے۔ مرد نے کہا آج کی رات آیا تو

ضرور کہوں گا۔ چنانچہ رات کو خواب میں شیطان آیا اور اس نے بیوی کی فرمائش اس سے ظاہر کی۔ شیطان نے کہا یہ کون بڑی بات ہے دونوں چلیے اور خزانہ میں لیجا کر شیطان نے اس کے اوپر روپیہ لادنا شروع کیا اتنا لادا کہ میاں کا گوہ نکل گیا۔ صبح کو آنکھ کھلی تو خزانہ تو غائب البتہ بستر پر پیشاب کی ساتھ گوہ کا ڈھیر موجود تھا۔ بیوی نے کہا کیا واہیات ہے۔ اس نے سارا قصہ کہا وہ کہنے لگی کہ میں ایسے خزانہ سے باز آئی تم پیشاب ہی کر لیا کرو تو صاحبو! تحمل سے زیادہ کسی پر بوجھ لادنے کا انجام یہی ہے کہ اس کو حاصل تو کچھ نہ ہوگا ہاں ہلاکت میں پڑ جائے گا۔ اس لئے ہمارے حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو مناظرہ سے بہت نفرت تھی۔ فرمایا کرتے تھے کہ جب کوئی تم سے کسی مسئلہ میں الجھے تو تم بحث کبھی نہ کرو بلکہ سب رطب و یابس اس کے سامنے رکھ کر خود الگ ہو جاؤ اور کہہ دو کہ تم اس میں حق و باطل کو خود ہی انتخاب کر لو جیسے ایک شخص نے حجام سے کہا تھا کہ میری ڈاڑھی میں سے سفید سفید بال چن کر الگ کر دو۔ حجام نے استرہ سے ساری ڈاڑھی جدا کر کے اس کے سامنے رکھدی کہ مجھ کو اتنی فرصت نہیں آپ خود سفید و سیاہ کو الگ کر لیجئے۔

مولانا رومیؒ نے مثنوی میں حکایت لکھی ہے کہ ایک شخص بانسری بجا رہا تھا کہ دفعۃً ریح صادر ہوئی تو اس نے بانسری منہ سے ہٹا کر دبر میں لگا دی اور کہا کہ اگر تو مجھ سے اچھا بجانا جانتی ہے تو تو ہی بجالے۔ حکایت تو فحش ہے مگر مولانا نے اس سے نتیجہ بہت عمدہ نکالا ہے فرماتے ہیں کہ جب تم کوئی مضمون بیان کر رہے ہو اور کوئی مدعی نااہل بک بک کرنے لگے تو تم چپ ہو جاؤ اور اُس سے کہدو کہ اچھا بھائی تو ہی بول لے ہم خاموش ہوتے ہیں۔ مولانا نے اس جگہ مدعی کو دبر سے تشبیہ دی ہے واقعی بلیغ تشبیہ ہے کیونکہ مدعی بھی اپنی خرافات عالم کو متعفن کرتا ہے مگر آجکل طلبہ میں یہ مرض ہو گیا ہے کہ وہ

ہر شخص کے جواب دینے کو تیار ہو جاتے ہیں جس کی وجہ یہ ہے کہ ان کو کچھ کام نہیں اس لئے ذرا ذرا سی بات میں بحث کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ ایک دفعہ میں ریل میں سوار تھا اپنے احباب میں تصویر کے مسئلہ پر گفتگو ہو رہی تھی۔ وہاں ایک پادری بھی بیٹھا ہوا تھا وہ اپنی جگہ سے اُٹھ کر ہمارے پاس آیا اور کہا میں بھی پوچھ سکتا ہوں (یہ آجکل محاورہ ہو گیا ہے کہ وقوع سے صیغہ امکان میں سوال کرتے ہیں) میں نے کہا آیئے جناب پوچھئے (میں کفار کو جنابت سے جناب کہا کرتا ہوں کیونکہ وہ غسل جنابت نہیں کرتے) کہنے لگا کہ اسلام میں تصویر کیوں حرام ہے۔ اگر یہ سوال کسی نئے مولوی سے کیا جاتا تو دو گھنٹہ تک اس سے بحث کرتے مگر میں اس روگ کو نہیں پالتا میں نے جواب دیا کہ مسئلہ فروع میں سے ہے اور فروع سے اصول مقدم ہیں۔ آپ کو ابھی تک ہمارے اصول ہی مسلم نہیں اس لئے فروع کے سوال کا آپ کو حق نہیں کہنے لگا یہ تو سچ ہے کہ مجھے اس سوال کا حق نہیں مگر میں نے چاہا تھا کہ سفر میں علمی گفتگو سے مشغلہ ہو جاتا میں نے کہا کہ مذہبی مسائل کو مشغلہ بنانا آپ کو مبارک ہو۔ ہمارا مذہب ایسا نہیں کہ ہم اس کو مشغلہ بنائیں۔ بس اب وہ خاموش تھا اور اپنے اس جواب پر سخت شرمندہ تھا۔ اسی طرح ایک بار ایک ہندو آریہ نے ریل میں مجھ سے پوچھا کہ اگر کوئی مسلمان ایک نیک کام کرے اور وہی کام کافر بھی کرے تو دونوں کا اجر برابر ہوگا یا کم زیادہ۔ میں نے کہا افسوس ہے آپ مجھ سے ایسا سوال کر رہے ہیں جس کا جواب خود آپ کے ذہن میں موجود ہے کہنے لگا یہ کیونکر میں نے کہا اس لئے کہ اُس جواب کے مقدمات سب آپ کے ذہن میں ہیں کہنے لگا یہ کیونکر معلوم ہوا میں نے کہا ابھی آپ اقرار کئے لیتے ہیں۔ سنئے کیا آپ نہیں جانتے کہ ہر مذہب والا اپنے مذہب کو حق اور دوسرے مذاہب کو باطل سمجھتا ہے ایک مقدمہ تو یہ ہے دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ مذہب حق والا مثل مطیع سلطنت کے اور مذہب باطل والا مثل باغی سلطنت کے

اور تیسرا مقدمہ یہ ہے کہ بغاوت ایسا جرم ہے جو انسان کے تمام کمالات کو بیکار اور لاشئے کر دیتا ہے چنانچہ اگر کسی جامع الکمالات باغی کو پھانسی ہونے لگے کوئی عاقل یہ شبہ نہیں کرتا کہ اس کے کمالات کو مانع سزا نہیں سمجھا گیا اور یہ سب مقدمات بدیہی ہیں جو آپ کو پہلے سے معلوم ہیں اب ان سب کو ملا کر دیکھئے آپ کے سوال کا جواب خود نکل آئے گا اور ان مقدمات کو جان کر مجھ سے سوال کرنے کا مطلب بجز اس کے اور کیا ہے کہ میرے منہ سے اپنی نسبت کافر کا لفظ سننا چاہتے ہیں تو وہ آریہ اس تقریر پر فریفتہ ہو کر کہنے لگا کہ واقعی میری نیت یہی تھی کہ آپ مجھے کافر کہیں کیونکہ ایسے منہ سے کافر کا لفظ سننا بھی موجب لذت ہے میں نے کہا یہ آپ کی لیاقت ہے لیکن میری اسلامی تہذیب مجھے اس سے منع کرتی ہے کہ میں بلا ضرورت کسی کا دل دکھاؤں۔ ریل میں سفر کرتے ہوئے اکثر ایسا اتفاق ہوا ہے کہ ہم لوگ آپس میں مسائل شرعیہ کی تحقیق میں گفتگو کرتے تو کفار ان کو غور سے سنتے اور ان پر اثر ہوتا تھا کیونکہ حق میں ایک خاص کشش ہے جو باطل میں کبھی نہیں ہوتی۔ چنانچہ ایک دفعہ ہم لوگ باتیں کر رہے تھے تو چند ہندو آپس میں کہنے لگے کہ ان کی باتوں کی طرف دل کھنچتا ہے دوسرے نے کہا یہ سچے ہونے کی علامت ہے۔ ایک دفعہ ہم باتیں کر رہے تھے جب اسٹیشن آگیا اور اترنے لگے تو ایک ہندو نے حاضرین سے کہا کہ کیا نور برس رہا تھا اب سارا نور یہ اپنی ساتھ لے چلے تو صاحبو! آپ بحث و مباحثہ نہ کریں آپس میں مسلمانوں ہی سے اسلام کی تعلیم پر گفتگو کرتے رہیں اسی کا کفار پر اثر ہوگا بحث کا اثر نہیں ہوتا کیونکہ اس میں مخالف ضد پر آجاتا ہے اور سچے طالب تحقیق آجکل کہاں ہیں۔ یہ سب گفتگو اس پر چلی تھی کہ اس جگہ حق تعالےٰ نے قتال و شقاق کو تکفرون سے تعبیر فرمایا ہے۔ اور میں نے کہا تھا کہ یہ استعمال محاورات کے موافق ہے حقیقت پر محمول نہیں۔ خوارج و معتزلہ کی جہالت ہے کہ انھوں نے محاورات کو تدقیق پر محمول کرنا شروع کر دیا اس لئے متکلمین کو علم کلام

مدون کرنے کی ضرورت ہوئی اس پر یہ تقریر طویل ہوگئی اور یہاں سے یہ بھی سمجھ لینا چاہیئے کہ آجکل جو ہم لوگوں میں یعنی مسلمانوں میں نااتفاقی ہے دیکھ لیا جائے کہ یہ کیسی سخت حالت ہے کہ اللہ تعالےٰ نے اس کو کفر سے تعبیر فرمایا ہے چنانچہ حضرات صحابہ اس کو سن کر چونکے اور اپنی غلطی پر متنبہ ہوئے تو اللہ تعالےٰ نے آئندہ کے لئے ان کو دستور العمل بتلایا کہ خیر جو ہو چکا ہو چکا گذشتہ تو گذشتہ ہوا آئندہ کا بندوبست کرو تاکہ پھر اس معصیت کا خطرہ نہ رہے۔ چنانچہ اول تقویٰ اور اسلام پر مداومت کا امر ہے پھر اعتصام بحبل اللہ کا حکم ہے پھر ارشاد ہے وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ إِذْ كُنْتُمْ أَعْدَاءً فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ فَأَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهِ إِخْوَانًا (اور تم پر جو اللہ کا انعام ہے اس کو یاد کرو جبکہ تم دشمن تھے پس اللہ تعالیٰ تمہارے قلوب میں الفت ڈالدی سو تم خدا کے انعام سے آپس میں بھائی بھائی ہو گئے) جس میں نعمت اتفاق کے یاد کرنے کا حکم ہے کہ اس نعمت کو اور اس کی برکات کو یاد کرو اور موازنہ کرو کہ تمہاری پہلے کیا حالت تھی اور اس کا نتیجہ کیسا وخیم تھا اور اتفاق کے بعد کیا حالت ہوگئی اور اس کا انجام نعیم مقیم ہے۔ شاید بعض لوگوں کو اس وقت یہ خیال ہوا ہو گا کہ میں آج اتفاق و اتحاد کا مضمون بیان کروں گا کیونکہ بظاہر یہاں یہی مضمون مذکور ہے لیکن مجھے دوسری بات بیان کرنا ہے جو اتفاق و اتحاد کی بھی جڑ ہے اور وہ ایسی بات ہے جو راستہ طے کرنے والوں کو پیش آتی ہے اور ان کی ضرورت کی ہے کیونکہ مسلمانوں میں دو قسم کے آدمی ہیں ایک تو وہ جنھوں نے دین کا کام ہی شروع نہیں کیا دوسرے وہ جو کام شروع کر چکے ہیں اور راستہ میں ہیں پہلی جماعت کا علاج تو یہ ہے کہ ان کو کام میں لگادیا جائے اور جو لوگ راستہ طے کر رہے ہیں ان کے لئے ایصال کی ضرورت ہے تو یہ مضمون ایصال کی قبیل

ملہ یہ تفسیر اس لئے کی گئی کہ بعض جاہلوں نے ایک جلسہ میں لفظ ہم کی تفسیر ہندو و مسلمان سے کی ہے اس طرح سے کہ ہ سے مراد ہندو اور میم سے مراد مسلمان ۱۲ جامع

سے ہے ارارۃ طریق کی قبیل سے نہیں اور گو مضمون نیا نہیں لیکن عنوان نیا ہے۔ چنانچہ معلوم ہو جائے گا کہ اس آیت کا مطلب اس عنوان سے بہت کم لوگوں نے سمجھا ہوگا اب میں مقصود کو شروع کرتا ہوں اور ان شاء اللہ تعالیٰ مختصر ہی بیان کروں گا کیونکہ اول تو وہ بات ہی مختصر ہے۔ دوسرے اس وقت کچھ طبیعت بھی مضمحل ہے جن بزرگوں کی وجہ سے یہ بیان ہو رہا ہے اُن کی درخواست تو کل گذشتہ کے متعلق تھی مگر کل طبیعت زیادہ مضمحل تھی کیونکہ کل رات ایک طوطے نے بیوقت ٹرٹر لگائی جس سے نیند اچاٹ ہو گئی پھر دیر تک نیند نہ آئی اور جب کچھ نیند آئی تو اس نے پھر بولنا شروع کیا آخر اُس کو عالم بالا میں پہنچایا (یعنی بالاخانہ پر) تب کچھ نیند آئی مگر بھری نہیں آج بھی طبیعت پر قدرے اضمحلال کا اثر ہے مگر کل جیسا نہیں اس لئے مختصر ہی بیان کروں گا حضرات صحابہؓ نے بھی بعض دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مختصر بات کا سوال کیا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو رد نہیں فرمایا بلکہ درخواست کو قبول کر کے مختصر بات بتلادی چنانچہ ایک صحابی نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم احکام شرعیہ بہت زیادہ ہو گئے ہیں مجھے ایک مختصر بات بتلا دیجئے جس کو میں دستور العمل بنالوں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قُلْ اٰمَنْتُ بِاللّٰہِ ثُمَّ اسْتَقِمْ (ایمان لایا میں اللہ پر اور اس پر استقامت کر)

صحابی کے اس سوال سے یہ مراد نہ تھی کہ فرائض میں اختصار ہو جائے یا ایسی بات بتلادی جائے جس سے سب مسائل مستنبط ہو جائیں کیونکہ اس جواب سے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دیا ہے سب مسائل کیسے مستنبط ہوں گے بھلا سجدہ سہو کا وجوب اس سے کیونکر مستنبط ہوگا اور اگر کھینچ تان کر کے نکالا بھی گیا تو وہ استنباط نہ ہوگا بلکہ چیکاٹ ہوگا۔ جیسے آجکل ایک فرقہ قرآنیہ نکلا ہے جو حدیث کو نہیں مانتا پہلے ایک فرقہ غیر مقلدین نکلا تھا جس نے فقہ کو اڑا دیا تھا اب یہ فرقہ نکلا ہے جس نے حدیث کو بھی اڑا دیا اندیشہ ہے

کوئی کمبخت ایسا نہ نکلے جو قرآن ہی کو اڑا دے (معلوم ہوا ہے کہ پٹیالہ میں ایک مدعی نبوت نکلا ہے وہ قرآن کی بھی نفی کرتا ہے۔ قاتلہ اللہ من لعین مارد ۱۲)

آجکل یہ حالت ہے کہ ایک فتنہ دبنے نہیں پاتا کہ دوسرا کھڑا ہو جاتا ہے۔

ع اِذَا سُدَّ مِنْهَا مَنْخِرٌ جَاشَ مَنْخِرٌ

(ایک فتنہ دباؤ تو دوسرا فتنہ کھڑا ہو جاتا ہے)

سو اس فرقہ کے بانی سے کسی نے پوچھا کہ تم حدیث کی تو نفی کرتے ہو اور سارے مسائل قرآن ہی سے مستنبط کرتے ہو تو بتلاؤ کہ عدد رکعات نماز کی دلیل قرآن میں کہاں ہے تو وہ کہتا ہے کہ اس کا جواب کل دوں گا۔ بھلا یہ حماقت تو دیکھئے کہ استدلال تو کل ہوگا اور عمل پہلے ہی سے شروع کر دیا اگر یہ عمل قرآن پر مبنی تھا تو اس میں سوچ کیوں ہوئی اور قرآن پر مبنی نہ تھا تو کس پر مبنی تھا اگر حدیث وفقہ پر مبنی تھا تو اس نے عمل ثابت کر دیا کہ قرآن کے سوا بھی کوئی چیز حجت ہے۔ غرض اگلے دن آپ تشریف لائے اور دعویٰ کیا کہ میں قرآن سے رکعات صلوٰۃ کا ثبوت دوں گا۔ سنئے حق تعالیٰ فرماتے ہیں اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ جَاعِلِ الْمَلٰٓئِکَۃِ رُسُلًا اُولِیْٓ اَجْنِحَۃٍ مَّثْنٰی وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ کہ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو پیام رساں بنایا ہے جن میں کسی کے دو بازو ہیں کسی کے تین کسی کے چار بس ایسی ہی نمازوں کی رکعات کا عدد مختلف ہے بھلا کوئی پوچھے کہ یہاں تو فرشتوں کی بازوؤں کا ذکر ہے اس کو رکعات صلوٰۃ سے کیا تعلق اور اگر محض عدد کا ذکر ہی استنباط کے لئے کافی ہے تو پھر ایک رکعت کی بھی ہونا چاہیئے کیونکہ قُلْ ھُوَ اللّٰہُ اَحَدٌ میں ایک کا ذکر ہے۔ یہ تو وہی مثل ہوئی کہ کسی طالب علم سے کسی نے کہا تھا کہ دو اور دو کے ہوتے ہیں وہ جواب دیتا ہے کہ چار روٹیاں تو جیسے دو اور دو کی دلالت روٹیوں پر ہے ایسے ہی مَثْنٰی وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ کی دلالت رکعات پر ہو گی اس کو اثبات بالقرآن نہیں کہہ سکتے اثبات تو وہ ہے جو خود مفید مطلوب ہو بدون ضم ضمیمہ کے۔ اگر حدیث

سے پانچ وقت کی نمازیں اور ان کی رکعاتیں کی شمار معلوم نہ ہوتی تو کوئی شخص مَثْنٰی وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ سے رکعات نماز سمجھ سکتا تھا ہرگز نہیں تو اگر اس طرح اٰمَنْتُ بِاللّٰہِ ثُمَّ اسْتَقِمْ (اللہ پر ایمان لا اور اس پر مستقیم رہ) سے سب مسائل مستنبط کئے جائیں تو اس کا تو کچھ علاج نہیں ورنہ خود یہ کلام استنباط مسائل کے لئے ہرگز کافی نہیں اور نہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ مطلب ہے کہ اٰمَنْتُ بِاللّٰہِ ثُمَّ اسْتَقِمْ (ایمان لائے اللہ پر پھر اس پر مستقیم رہو) سارے مسائل کے استنباط کو کافی ہے اب یہ سوال ہوگا کہ پھر صحابی کے سوال اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے جواب کا کیا مطلب ہے تو اس کو حضرات صوفیہ نے سمجھا وہ فرماتے ہیں کہ صحابی نے ایسا دستور العمل پوچھنا چاہا تھا جو تمام اعمال میں کام آوے اور سب کو سمیٹ دے جیسا کہ صوفیہ مریدین کو مراقبۂ رؤیت وغیرہ بتلایا کرتے ہیں جو تمام اخلاق رذیلہ غضب وحرص و کبر وغیرہ میں کام آتا ہے اور تنہا سب کے علاج کو کافی ہو جاتا ہے اگر ہر مرض کا جدا جدا علاج کیا جائے تو بڑی مدت چاہیے۔ اب انھوں نے ایسی بات بتلائی جس کے رسوخ سے ایک دم سارے امراض اور معاصی کی جڑ اکھڑ جائے گی کیونکہ جو شخص ہر وقت اس بات کو پیش نظر رکھے گا کہ حق تعالیٰ مجھ کو دیکھ رہے ہیں وہ نہ تکبر کر سکے گا نہ غصہ بیجا نہ گناہ صغیرہ کر سکے گا نہ کبیرہ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے صحابی نے ایسی ہی بات دریافت کرنا چاہی تھی جس کے جواب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا قُلْ اٰمَنْتُ بِاللّٰہِ ثُمَّ اسْتَقِمْ کہ اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے کا استحضار رکھو اور اس کے بعد ہر عمل میں استقامت کا لحاظ کرو کہ نہ کسل ہو نہ تسویف ہو ظاہر ہے کہ جو شخص ہر وقت اس کا استحضار رکھے گا کہ میں خدا پر ایمان لا چکا ہوں تو وہ تمام احکام کو خوشی سے بجالائے گا اور کسی حکم میں چون وچرا نہ کرے گا یہ تو تسہیل عمل کا طریق تھا اس کے بعد تکمیل عمل کا طریقہ بتلا دیا کہ استقامت کا

لحاظ رکھو یہاں سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بلاغت کا اندازہ ہوتا ہے کہ آپ نے دو جملوں میں تمام طریق کو سمیٹ دیا جس میں تسہیل عمل بھی ہے اور تکمیل بھی ہے تو اس حدیث سے معلوم ہوا کہ مختصر بات کا دریافت کرنا اور بتلانا بھی سنت ہے اسی لئے مجھے طریق میں اس کا بہت خیال رہتا ہے کہ ایسی مختصر بات بتلائی جائے جو سب باتوں کو حاوی ہو چنانچہ ایک دفعہ میں نے اخلاق رذیلہ کا علاج دو لفظوں میں تجویز کیا تھا تامل و تحمل کہ جو کام کرے سوچ کے کرے کہ شرعاً جائز ہے یا نہیں اور جلدی نہ کرے بلکہ تحمل سے کام کیا کرے مجھے اختصار کے ساتھ قافیہ کا بھی خبط ہے اس سے یاد میں سہولت ہوتی ہے اس لئے ایک دوست کا فیصلہ ہے کہ یہ نثر میں شاعر ہے۔ ابھی کچھ دن ہوئے میں نے ایک زمین لی ہے جب اس کے لینے کا ارادہ ہوا تو میں نے اس کے متعلق یہ دعا تجویز کی تھی اَللّٰھُمَّ حَصِّلْ اَللّٰھُمَّ کَمِّلْ اَللّٰھُمَّ عَجِّلْ اَللّٰھُمَّ سَهِّلْ (اے اللہ حاصل کرا دے۔ اے اللہ پورا کرا دے اے اللہ جلدی کرا دے اے اللہ آسان کرا دے) جس میں چاروں جملے مقفی ہیں اسی طرح طریق میں طالبین کے لئے ایک بار یہ دستور العمل تجویز کیا اطلاع و اتباع۔ کہ اپنے احوال و اعمال سے شیخ کو مطلع کرتے رہیں اور اس کی تجویز پر عمل کریں ایک دفعہ یہ تجویز کیا تھا کہ انقیاد و اعتماد۔ اس وقت پہلی مقفی عبارت ذہن سے نکل گئی تھی تو جب ایک قافیہ دار عبارت بھول جاتا ہوں دوسری قافیہ دار عبارت تجویز کر لیتا ہوں ممکن ہے کسی وقت یہ بھی ذہن سے نکل جائے تو تیسری قافیہ دار عبارت تجویز کر لوں گا یہ تو جنم روگ ہے جیسا ایک آزاد مزاج بزرگ نے حفظ قرآن کو جنم روگ بمعنی دائم الرعایۃ فرمایا تھا کیونکہ حفظ قرآن کے لئے بھی ہر وقت فکر کی ضرورت ہے جہاں ذرا غافل ہوا اور ذہن سے نکلا چنانچہ جو لوگ ہمیشہ نہیں پڑھتے ان کو اس سے اجنبیت ہو جاتی ہے جیسے مولوی احمد حسن صاحب کانپوری فرماتے تھے کہ رمضان میں جو میں قرآن تراویح کے اندر پڑھتا ہوں تو یہ نہیں معلوم ہوتا کہ

قرآن پڑھ رہا ہوں یا تورات و انجیل کیونکہ ان کو سال کے اندر کثرت تدریس کے سبب تلاوت کی نوبت کم آتی تھی مگر بعض لوگوں کا حافظہ اچھا ہوتا ہے وہ باوجود عدم مشغولی کے اور بیفکری کے بھی نہیں بھولتے حالی شاعر کا واقعہ میں نے پانی پت میں مولوی عبدالسلام صاحب انصاری مرحوم سے سنا ہے کہ ان کو قرآن حفظ تھا مگر حفظ کے بعد ابتدائے جوانی میں کبھی محراب سنائی ہوگی پھر شاعری اور لیڈری کے قصہ میں پڑ گئے تو برسوں محراب نہیں سنائی نہ تلاوت کا شغل رہا مگر حافظہ ایسا اچھا تھا کہ بڑھاپے میں بھی قرآن خوب یاد تھا چنانچہ ان کے بڑھاپے میں ایک دفعہ پانی پت کے چند لڑکوں نے شبینہ کرنا چاہا اور یہ شوخی سوجھی کہ حالی سے اس شبینہ کی شرکت کی درخواست کرو چنانچہ سب مل کر ان کے پاس گئے کہ حضور آج ہم سب نے شبینہ کا قصد کیا ہے آپ ہماری سرپرستی فرمائیں اور ایک منزل آپ بھی سنائیں ۔ حالی نے کہا کہ بھائی میں نے تو بہت زمانہ سے قرآن نہیں سنایا جو کچھ یاد تھا سب بھول بھال گیا مجھے معاف کرو مگر لڑکوں نے نہ مانا اور اصرار کیا مجبور ہو کر درخواست منظور کی اور کہا کہ اتنا تو بتادو کہ میرے ذمہ کونسی منزل ہوگی چنانچہ سب سے زیادہ مشکل منزل جس میں متشابہات زیادہ ہیں ان کے لئے تجویز کی گئی اور نوجوان حافظ اپنے دل میں خوش ہو رہے تھے کہ آج بڈھے کو خوب رسوائی ہوگی یقیناً خوب غوطے کھادیں گے ۔ مگر جب رات ہوئی اور حالی کے پڑھنے کی باری آئی تو ظالم نے ایسا اچھا سنایا کہ ایک جگہ بھی تو نہ اٹکا اس وقت سب کو معلوم ہوا کہ ان کو قرآن واقعی یاد ہے بھولے نہیں سو ایسے لوگ بہت کم ہیں جن کو باوجود عدم مزاولت کے بھی ایسا یاد رہے ورنہ عام حالت یہی ہے کہ قرآن بدون دائمی مزاولت کے یاد نہیں رہتا ۔ اسی قیاس پر ایک اور تفریع کرتا ہوں کہ اسی طرح اس طریق میں بھی قلت کی نگہداشت عمر بھر کا روگ ہے کسی وقت غفارت کی اجازت نہیں ؎

یک چشم زدن غافل ازاں شاہ نباشی
شاید کہ نگاہے کند آگاہ نباشی

(ایک پلک مارنے کی مقدار بھی محبوب حقیقی سے غافل مت ہو شاید کہ تم پر لطف کی نگاہ کریں اور تم آگاہ نہ ہو)

اور ؎

اندریں رہ می تراش و می خراش — تا دمے آخر دمے فارغ مباش
تا دمِ آخر دمے آخر بود — کہ عنایت باتو صاحب سر بود

(تم کو چاہئے کہ طریق وصول الی اللہ میں ہمیشہ اُدھیڑ بن میں لگے رہو اور آخری وقت تک ایک لحظہ بھی فارغ مت ہو کیونکہ آخری وقت تک کوئی گھڑی ایسی تو ضرور ہوگی جس میں عنایت ربانی تمہاری ہمراز اور رفیق بن جائے گی)

اور ایک اور لطف صنع ہے کہ اگر کسی وقت سالک غافل ہونا بھی چاہے تو حضرت حق غافل نہیں ہونے دیتے ایک سپاہی ایسا مسلط کر دیا ہے جو کان پکڑ کر کھڑا کر دیتا ہے بیفکر نہیں ہونے دیتا۔ اور اس سپاہی کا حلیہ میں بیان نہیں کر سکتا کہیں سننے والے بے چین نہ ہو جائیں جو لوگ آرام میں ہیں ان کو کیوں بے چین کیا تو وہ سپاہی آکر کہتا ہے کہ ایک دن پچاس ہزار سال کی برابر آنے والا ہے اس سے غافل ہو کر کہاں جا رہا ہے بس جہاں غفلت ہوئی اور یہ دن پیشِ نظر ہو جاتا ہے اس لئے سالک غافل نہیں رہ سکتا کبھی تجلی جلالی منکشف ہوتی ہے وہ دل کو تھرا دیتی ہے لوگ سمجھتے ہیں کہ اہل اللہ بڑی چین میں ہیں ان کو کچھ فکر نہیں بیشک دنیا کی تو ان کو فکر نہیں مگر دنیا کی فکر نہ ہونے کا منشا بے فکری نہیں بلکہ ایسی عظیم الشان فکر ہے جس نے عصائے موسیٰ کی طرح سب فکروں کو نگل لیا ہے واللہ جو فکر ان کو ہے اگر آپ کو ہو جائے تو رات کا سونا بھول جائیں ؎

اے ترا خارے بپا نشکستہ کے دانی کہ چیست
حال شیرانے کہ شمشیر بلا برسر خورند

(تمہارے پاؤں میں کانٹا بھی نہیں لگا ہے تم ان لوگوں کی حالت کو کیا سمجھ سکتے ہو جن کے سروں پر بلا اور مصیبت کی تلواریں چل رہی ہیں)

سعدی علیہ الرحمۃ نے اس کو بہت وضاحت کے ساتھ بیان فرمایا ہے ؎

خوشا وقت شوریدگانِ غمش | اگر ریش بینند وگر مرہمش
گدایانِ از بادشاہی نفور | بامیدش اندر گدائی صبور
دمادم شراب الم درکشند | وگر تلخ بینند دم درکشند

(اس کے غم کے پریشان لوگوں کا کیا اچھا وقت ہے اگر زخم دیکھتے ہیں اور اگر اس پر مرہم رکھتے ہیں۔ ایسے فقیر بادشاہی سے نفرت کرنے والے اس کی امید پر فقیری میں قناعت کرنے والے ہر دم رنج کی شراب پیتے ہیں اور جب اس میں رنج کی کڑواہٹ دیکھتے ہیں خاموش رہتے ہیں)

غرض سالک کے لئے نئے نئے سبق ہمیشہ تازہ ہوتے رہتے ہیں جو کسی وقت اس کو غفلت نہیں ہونے دیتے اور وہ سب تقویٰ ہی کی افراد ہیں جس کا یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ حَقَّ تُقٰتِہٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ۝

(اے ایمان والو اللہ سے ڈرو ڈرنے کا حق سوائے اسلام کے اور کسی حالت پر جان مت دو)

میں امر ہے اس وقت اسی مضمون کو دوسرے عنوان سے بیان کرنا چاہتا ہوں کیونکہ تقویٰ کا عنوان بہت وسیع ہے اور ضرورت اس کی ہے کہ مختصر بات بتلائی جائے جس سے تمام اعمال سہل ہو جائیں اور تمام مقامات طریق حل ہو جائیں میں یہ یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ اس مضمون کے بعد آپ کو پریشانی ہی نہیں ہوگی بلکہ یہ کہتا ہوں کہ اگر پریشانی ہوگی تو لذیذ ہوگی کہ آپ اس پریشانی کے بدلہ ہفت اقلیم کا لینا بھی منظور نہ کریں گے باقی پریشانی کے رفع ہونے سے تو امید ہی قطع کر دیجئے کیونکہ آپ تو پریشانی ہی کے لئے پیدا ہوئے ہیں یہ تو جنت ہی میں

پہنچکر ختم ہو گی۔ خدا تعالیٰ وہاں سرخرو کر کے ہم کو پہنچا دیں (آمین ثم آمین)
اور بعض کوتاہ نظر عاشقوں نے تو جنت میں بھی پریشانی کو ختم نہیں مانا۔ چنانچہ ایک عاشق کا قول ہے اِنَّ فِی الجنان لجنۃ لیس فیھا حورٌ وَّ لا قصورٌ وَّلا لٰکِنْ فِیْھَا اَرِنِیْ اَرِنِیْ (جنتوں میں ایک جنت ایسی ہے جس میں نہ حوریں نہ محلات اور ارنی ارنی مجھ کو اپنا دیدار دکھا مجھ کو اپنا دیدار دکھا)
قولؔ واقع میں صحیح نہیں اور کشف حجت نہیں مگر اس صاحب کشف نے جو دلیل بیان کی ہے اس دلیل سے مجھے بھی بہت دنوں شبہ رہا وہ یہ کہ حسن و جمال حق حقیقۃً بے نہایت ہے اور عاشق کا عشق و طلب بمعنے لا تقف عند حدٍّ بے نہایت پھر چین کیونکر ہو وہاں تو یہ حال ہے ؎

نہ حسنش غایتے دارد نہ سعدی را سخن پایاں
بمیرد تشنہ مستسقی و دریا ہمچناں باقی

(نہ اس کے حسن کی انتہا ہے نہ سعدی کے کلام کی کوئی انتہا ہے جیسے جلندھر والا پیاسا مرجاتا ہے اور دریا باقی رہ جاتا ہے۔ اسی طرح محبوب کا بیان باقی رہ گیا)
اور یہ کیفیت ہے ؎

داماں نگہ تنگ و گل حسن تو بسیار
گلچیں بہار تو ز داماں گلہ دارد

(دامان نگاہ تنگ ہے اور تیرے حسن کے پھول بیحد ہیں گل چین تنگیٔ دامن کا گلہ رکھتا ہے)

؎ قلت ویحتمل ان یکون الکشف صحیحا ولکنہ ای صاحب الکشف اخطأ فی قولہ از اھل ھذہ الجنۃ لا راحۃ لھم وانھم فی کربۃ واضطراب بل لیکن از یکون لھم فی ارنی ارنی راحۃ لیس بغیرھم فی الحور والقصور ولا یکون منشأ قولھم ارنی کربھم واضطرابھم ولا قلقھم بل منشاء و الدلال علی اللہ وطلب رویتہ اظھارًا للمحبۃ واھذا فانھم لا رب لھم فی غیرہ جل وعلا واللہ اعلم ۱۲ جامع

اور ایک عاشق کہتا ہے ؎

قلم بشکن سیاہی ریز کاغذ سوز دم درکش
حسن ایں قصہ عشق ست در دفتر نمی گنجد

(قلم توڑ روشنائی بکھیر کاغذ جلا خاموش رہ جس پر عشق کا قصہ ہے جو دفتر میں نہیں سما سکتا)

اور ایک شاعر کہتا ہے ؎

نگردد قطع ہرگز جادہ عشق از دویدنہا
کہ می بالد بخود ایں راہ چوں تاک از بریدنہا

(عشق کا راستہ دوڑنے سے ہرگز قطع نہیں ہوتا جس طرح انگور کو جتنا زیادہ قطع کرو اور بڑھتا ہے یہی حال اس راستہ کا ہے)

اور مولانا فرماتے ہیں ؎

اے برادر بے نہایت درگہیست
ہرچہ بروے می رسی بروے مایست

(اے برادر بے نہایت درگاہ ہے جس درجہ پر پہونچو اس پر مت ٹھیرو بلکہ آگے کو ترقی کرو۔)

اور گو عاشق کا عشق بالفعل متناہی ہے مگر چونکہ اس کا منشا حسن وجمال حق ہے اور وہ بے غایت ہے تو اس کا عشق بھی لا تقف عند حد ضرور ہوگا پھر چین کیونکر آئے عاشقان مجازی کو تو وصال محبوب سے اس لئے چین آجاتا ہے کہ ان کے محبوب کا حسن متناہی ہے وصال کے بعد جی بھر کر اس سے متمتع ہوگئے اور سکون ہوگیا اور جس کے محبوب کا حسن بے غایت ہو اس سے تو جتنا متمتع ہوگا اور نیا درجہ حسن کا ظاہر ہوگا جیسے ایک شاعر کہتا ہے ؎

یَزِیْدُكَ وَجْهُهٗ حُسْنًا ۔۔۔ اِذَا مَا زِدْتَّهٗ نَظَرًا

(جتنی زیادہ تیرے چہرہ پر نظر ڈالتا اتنا تیرے چہرے حسن زیادہ معلوم ہوتا ہے)

یہ ہے ان کی دلیل اس دلیل سے میں بہت روز تک چکر میں رہا اسی واسطے کہتا ہوں کہ بس نماز روزہ میں لگے رہو اور ان کشفیات و اسرار کے پیچھے نہ پڑو یہ بلائے بے درماں ہے پھر بحمداللہ اس کا جواب سمجھ میں آگیا وہ یہ کہ یہاں تو شوق لاتقف عندحد اس لئے ہے کہ ہمارے اندر وصال حق کی جتنی استعداد پیدا کی گئی ہے یہاں کے مشاہدہ سے اس استعداد کا تقاضا پورا نہیں ہوتا یہاں ہم کو حق تعالٰے کا ناتمام وصال حاصل ہوتا ہے کہ بعض افراد میں استعداد اس سے زیادہ ہیں وہ تقاضا کرتے ہیں کہ ہمارا حق بھی ادا ہو اور جنت میں تمام افراد استعداد کا تقاضا پورا کر دیا جائے گا پھر چین ہو جائے گا اور اس سے حسن حق کا محدود ہونا لازم نہیں آتا بلکہ استعداد طالب کا متناہی ہونا لازم آیا مگر اس عاشق نے استعداد طالب کو بھی غیر متناہی بمعنی لاتقف عندحد سمجھ لیا اس لئے اشکال پیش آیا اور منشا اس دھوکہ کا یہ ہوا کہ دنیا میں عاشق کا شوق لاتقف عندحد ہی ہے اس سے وہ یہ سمجھا کہ عشق فی نفسہ لاتقف عندحد ہے حالانکہ ایسا نہیں بلکہ فی نفسہ محدود و متناہی ہے اور دنیا میں اس لئے لاتقف عندحد ہے کہ یہاں اس کی استعداد کے تمام افراد کا تقاضا پورا نہیں کیا گیا اور جنت میں ہر فرد استعداد کا تقاضا پورا ہو جائیگا جس سے سکون کامل ہو جائے گا اور یہ میں کسی طبعی قاعدہ پر مبنی کر کے نہیں کہتا بلکہ نص کی بناء پر کہتا ہوں حق تعالٰے فرماتے ہیں وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْٓ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ اِنَّ رَبَّنَا لَغَفُوْرٌ شَكُوْرُ الَّذِیْٓ اَحَلَّنَا دَارَ الْمُقَامَةِ مِنْ فَضْلِهٖ لَا یَمَسُّنَا فِیْهَا نَصَبٌ وَّلَا یَمَسُّنَا فِیْهَا لُغُوْبٌ (اور کہیں گے کہ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے جس نے ہم سے غم دور کیا بیشک ہمارا پروردگار بڑا بخشنے والا بڑا قدردان ہے جس نے ہم کو اپنے فضل سے ہمیشہ رہنے کے مقام میں لا اتارا جہاں ہم کو کوئی کلفت نہیں اور نہ کوئی ہم کو خستگی پہونچے گی)

اگر جنت میں بھی پریشانی رہی تو پھر عشق کو لے کر کیا کریں گے اس صاحب کشف کی نظر سے یہ مقدمہ نکل گیا کہ دنیا میں عشق اس لئے لاتقف عند حد ہے کہ یہاں استعداد عاشق کے جملہ افراد کا تقاضا پورا نہیں کیا گیا۔ اللہ تعالیٰ نے ہم جیسے ناکاروں کو اس مقدمہ پر اطلاع کر دی اور یہ بھی ان بزرگوں کی برکت ہے جیسے کبھی کمزور باپ کے قوی لڑکا پیدا ہوتا ہے لیکن وہ قوی ہو کر بھی ہے بیٹا ہی اور وہ کمزور اس کا باپ ہے بہر حال جنت میں تو چین ہوگا مگر دنیا میں چین نہیں بعض لوگ یہاں طالب راحت ہیں یہ ان کی غلطی ہے بھلا عشق اور چین ؎

عاشقی چیست بگو بندۂ جاناں بودن ‎ ‎ ‎ ‎ دل بدست دگرے دادن و حیراں بودن

سوئے زلفش نظرے کردن و رویش دیدن ‎ ‎ ‎ ‎ گاہ کافر شدن وگاہ مسلماں بودن

(عاشقی کیا ہے محبوب کا بندہ بن جانا دل دوسرے (محبوب) کے قبضہ میں دیدینا اور حیران رہنا محبوب کی زلف کی طرف نظر کرنا اور اس کے چہرہ انور کو دیکھنا کبھی فانی ہونا اور کبھی باقی ہونا ہے)

کافر شدن سے پریشان نہ ہونا یہ ان صوفیوں کی اصطلاح ہے ان کے یہاں فانی کو کافر اور صاحب بقا کو مسلمان کہتے ہیں اور ایسی وحشت ناک اصطلاحیں انھوں نے گالیاں کھانے کو مقرر کی ہیں مگر اعتراض کا کسی کو حق نہیں کیونکہ قرآن میں بھی تو ہے فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ (سو جو شخص شیطان سے بد اعتقاد ہو

اور ابراہیم علیہ السلام کا مقولہ ہے کہ انھوں نے اپنی قوم سے کہا تھا كَفَرْنَا بِكُمْ (ہم تمہارے منکر ہیں)۔ بس اتنا فرق ہے کہ قرآن میں صلہ بھی مذکور ہے اس لئے وحشت نہیں ہوتی اور صوفیہ کو صلہ رحمی نہیں آتی ان کی بات سے لوگ متوحش ہوتے ہیں مگر حقیقت واضح ہو جانے کے بعد الفاظ سے متوحش نہ ہونا چاہئے اسی اصطلاح کے موافق حضرت خسرو فرماتے ہیں ؎

کافر عشقم مسلمانی مرا درکار نیست
ہر رگ من تار گشتہ حاجت زنار نیست

(میں عشق میں فانی ہوں بقا مجھے درکار نہیں ہے میری رگ تار ہوگئی ہے اتار کی ضرورت نہیں)

مگر تم ان اشعار کو نقل کے طور پر بھی نہ پڑھنا کیونکہ وہ تو مغلوب تھے اس لئے معذور تھے اور تم ان کو پڑھ کر مسلوب ہی ہوجاؤ گے اور اگر کوئی نجدی آگیا تو مصلوب (بالصاد) بھی ہوجاؤ گے اور جو عاشق ہوگا وہ تو خود ہی بک بک لگائے گا۔ وہ میرا اور تمہارا کسی کا کہنا نہ مانے گا لیکن وہ نقل کے طور پر نہ پڑھے گا بلکہ مغلوب ہوکر پڑھے گا سو وہ بھی امیر خسرو کی طرح معذور ہے۔ غرض تم آرام کے طالب نہ بنو جیسا بعض سالکین دفع خطرات کے طالب ہیں کہ ایسی حالت ہوجائے کہ وساوس و خطرات پاس ہی نہ آئیں یہ بھی راحت کے طالب ہیں میں اس وقت آپ کو ایسی چیز بتلانا چاہتا ہوں جو پریشانی کو لذیذ کردے کیونکہ میں کہہ چکا کہ پریشانی تو جنت سے ورے ختم نہیں ہوسکتی ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ پریشانی کو لذیذ کردیا جائے اور یہ بھی ایک طرح پریشانی کا خاتمہ ہی ہے تو میں ایسی بات بیان کرنا چاہتا ہوں جو تمام اعمالوں میں کام آئے اور غفلت سے روکتی رہے اور پریشانی کے وقت ہمت بندھائے اور وہ نئی بات نہیں بلکہ وہ وہی ہے جس کا نام قرآن میں کہیں تقویٰ ہے کہیں کہیں اعتصام بحبل اللہ ہے اور اسی کا نام ذکر نعمت بھی ہے ؎

عِبَارَاتُنَا شَتّٰی وَحُسْنُكَ وَاحِدٌ
وَكُلٌّ اِلٰی ذَاكَ الْجَمَالِ يُشِيْرُ

(عنوانات مختلف ہیں معنون ایک ہی جمال محبوب ہے ہر ایک عنوان اسی جمال کی طرف اشارہ کرتا ہے)

یہ سب عنوانات ایک ہی معنوں کے ہیں جاننے والا ہر لباس میں اس کو پہچان لیتا ہے ؎

بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش
من انداز قدت را می شناسم
(خواہ کسی رنگ کا لباس پہن لو قد کے انداز ے میں پہچان لیتا ہوں)

صاحبو! اس وقت میں جس چیز کا پتہ دینا چاہتا ہوں وہ اسلام ہے جو ظاہر ہے کہ ان سب عنوانات میں موجود ہے مگر میں اس وقت اسلام کو دوسرے عنوان سے بیان کروں گا کہ اس عنوان سے بہت کم لوگوں نے اس کو دیکھا ہے اسی لئے اسلام کے لفظ سے ادھر ذہن نہیں جاتا اور وجہ اس کی یہ ہے کہ اسلام کا لفظ زبانوں پر اس درجہ شائع ہو گیا ہے کہ اب اس سے اس کا مصداق تو متبادر ہوتا ہے مگر مفہوم کی طرف کسی کو التفات نہیں ہوتا اگر لوگ اسلام کے لغوی معنی پر بھی نظر کر لیا کرتے تو اس حقیقت سے قریب ہو جاتے جس کو میں اس وقت بیان کروں گا۔ تو سنئے اسلام معنے لغت میں سپرد کرنے کے ہیں جس کو تسلیم بھی کہتے ہیں میں اسی کو اس وقت بیان کرنا چاہتا ہوں جس کو صوفیہ نے تفویض سے تعبیر کیا ہے یہی اسلام کی حقیقت ہے مگر اب لفظ اسلام سے اس کی طرف ذہن ہی نہیں جاتا قرآن میں کہیں اسلام کا ذکر مجملاً ہے کہیں مفصل ہے اور مفصل بمعنے تفویض ہی ہے۔ چنانچہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں بَلٰى مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ الآیہ (ہاں جو شخص بھی اپنا رخ اللہ تعالیٰ کی طرف جھکا دے اور وہ مخلص بھی ہو) دوسری جگہ ہے وَمَنْ اَحْسَنُ دِيْنًا مِّمَّنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ وَّاتَّبَعَ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا (اور ایسے شخص سے زیادہ اچھا کس کا دین ہو گا جو کہ اپنا رخ اللہ تعالیٰ کی طرف جھکا دے اور وہ شخص مخلص بھی ہو اور ملت ابراہیم کا اتباع کرے جس میں کمی کا نام نہیں) اور ایک جگہ ہے وَمَنْ يُّسْلِمْ وَجْهَهٗۤ اِلَى اللّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى (اور جو شخص اپنا رخ اللہ کی طرف جھکا دے اور وہ مخلص

بھی ہو تو اس نے بڑا مضبوط حلقہ تھام لیا) یہاں اسلام وجہ کی ساتھ اتباع ملت ابراہیم کا بھی ذکر ہے اور اس کو دوسری جگہ اس طرح بیان فرمایا ہے۔
وَمن یرغب عن ملۃ ابراھیم اِلَّا مَنْ سَفِہَ نَفْسَہٗ وَلَقَدِ اصْطَفَیْنٰہُ فِی الدُّنْیَا وَاِنَّہٗ فِی الْاٰخِرَۃِ لَمِنَ الصّٰلِحِیْنَ ۝ اِذْ قَالَ لَہٗ رَبُّہٗٓ اَسْلِمْ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ (اور ملت ابراہیمی سے وہی روگردانی کریگا جو اپنی ذات سے احمق ہو اور ہم نے ان کو دنیا میں منتخب کیا اور وہ آخرت میں بڑے لوگوں میں شمار کئے جاتے ہیں جبکہ ان کے پروردگار نے ان سے فرمایا کہ تم اطاعت اختیار کرو انھوں نے عرض کیا کہ میں نے اطاعت اختیار کی رب العلین کی) جس سے معلوم ہوا کہ ملۃ ابراہیم بھی اسلام وجہ رب العلین ہے کہ اپنے کو خدا کے سپرد کردے جس کو ایک مقام پر حضرت ابراہیمؑ نے اِنِّیْ وَجَّھْتُ وَجْھِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا (میں یکسو ہو کر اپنا رخ اس کی طرف کرتا ہوں جس نے آسمانوں کو اور زمین کو پیدا کیا اور میں شرک کرنے والوں میں سے نہیں ہوں) سے بیان فرمایا ہے۔ تو معلوم ہوا کہ قرآن میں اسلام کی تفسیر اسلام وجہ ہے جس کے پورے معنے نماز روزہ کے نہیں ہیں بلکہ اسلام وجہ بمعنے تفویض ہے یعنی اپنی ذات کو خدا کے سپرد کر دینا اور اپنے کو ہر تصرف الٰہی کے لئے آمادہ کر دینا کہ وہ جو چاہیں کریں جو چاہیں حکم دیں سب منظور ہے نماز روزہ بھی اس تفویض کا ایک فرد ہے لیکن عین نہیں اگر قرآن میں اسلام کا استعمال اطلاق ہی کے ساتھ ہوتا اور اس کے ساتھ وجہ اللہ یا وجہ الی اللہ مذکور نہ ہوتا تو یہ بھی احتمال تھا کہ اسلام بمعنی اطاعت ہے مگر ان قیود کے ساتھ اطاعت کے معنے نہیں بنتے بلکہ تفویض ہی کے معنے مستقیم ہوتے ہیں اور قاعدہ ہے کہ آیات میں بعض بعض کی مفسر ہوتی ہیں تو اب جہاں اسلام بلا قید مذکور ہے وہاں بھی مقید ہی مراد ہے جیسے احادیث میں علم کے فضائل بلا قید مذکور ہیں حالانکہ علم مصدر ہے جس کے لئے قید کی ضرورت ہے خواہ بصورت

مفعول ہو یا مضاف الیہ اس لئے لفظ کے اطلاق سے یہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یہ فضائل مطلق علم کے ہیں بلکہ یقینی بات ہے کہ علم سے علم دین مراد ہے ایسے ہی نصوص میں اسلام سے اسلام وجہ مراد ہے یعنی تفویض یہی وہ چیز ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے کمالات و فضائل ہیں۔ جا بجا حق تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے۔ پس ان آیات میں اصل مقصود لَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ (بجز اسلام کے اور کسی حالت میں جان مت دو) ہے اور اِتَّقُوا اللّٰہَ (اللہ سے ڈرو) وَ اذْکُرُوْا نِعْمَۃَ اللّٰہِ (اللہ کے انعام کو یاد کرو) وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰہِ (اللہ تعالیٰ کے سلسلہ کو مضبوط پکڑو) یہ سب اسی کے لقب ہیں۔ اسی لیے میں نے اس بیان کا نام "الدوام علی الاسلام والاعتصام بالانعام" تجویز کیا ہے جس میں اصل مقصود کے ساتھ اس کے دوسرے عنوانات پر بھی دلالت ہے جیسے مولانا محمد اسحاق صاحب بردوانی کا سجع میں نے کہا تھا ثاقب از لطف محمد اسحاق جس کا ترجمہ تو یہ ہے کہ اسحاق علیہ السلام محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لطف سے روشن ہوئے ہیں مگر اس میں لطیفہ یہ بھی ہے کہ اس مصرع میں مولوی محمد اسحٰق صاحب اور ان کے والد کا اور دادا کا نام بھی آگیا ہے کیونکہ ان کے والد کا نام لطف اللہ یا لطف الہدیٰ تھا اور دادا کا محمد ثاقب ایسے ہی اس وعظ کے نام میں اسلام بھی ہے اور اعتصام بھی ہے اور نعمت پر بھی دلالت ہے جس سے وہ تمام عنوانات جمع ہو گئے جو اس آیت میں اختیار کئے گئے ہیں بہر حال اس جگہ اول تو اِتَّقُوا اللّٰہَ حَقَّ تُقَاتِہٖ (تو اللہ سے ڈرو جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے) فرمایا گیا ہے جس میں تفویض کی کسی قدر تفصیل ہے پھر وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ (اور تم اسلام کے سوا کسی حالت میں جان مت دو) میں مجملاً تفویض کا ذکر ہے اس کے بعد پھر تفصیل ہے وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰہِ وَاذْکُرُوْا نِعْمَۃَ اللّٰہِ عَلَیْکُمْ (اللہ کے سلسلہ کو مضبوط پکڑو اور اللہ کے نام کو یاد کرو) میں کیونکہ مقصود کی علامت یہی ہے کہ اس کا ذکر شروع میں بھی

ہو۔ درمیان میں بھی ہو تو یہاں اول ترکیب ہے پھر جمع ہے۔ پھر تحلیل ہے جس کا لطف اہل علم کو خاص طور سے حاصل ہوگا۔ اب میں مقصود کو عرض کرتا ہوں۔

حق تعالیٰ فرماتے ہیں یَاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقَاتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ۝ اے ایمان والو اللہ تعالیٰ سے ڈرو جیسا اس سے ڈرنے کا حق ہے اور تم بجز اسلام کے کسی حالت پر جان نہ دینا یہاں ایک اشکال ہوتا ہے کہ اِتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقَاتِهٖ (اللہ تعالیٰ سے ڈرو جیسے اس سے ڈرنے کا حق ہے) تو مشکل ہے خدا کی شان کے لائق تقویٰ کس سے ہو سکتا ہے تو آیت میں تکلیف مالایطاق ہے اس کا جواب یہ ہے کہ حَقَّ تُقَاتِهٖ سے مراد غایۃ مَا تَقْدِرُوْنَ عَلَیْهِ (جس قدر تم اس پر قادر ہو) ہے کہ جتنا تم کر سکتے ہو اتنا تقویٰ کرو۔ چنانچہ دوسری جگہ ارشاد ہے اور یہ بھی حق تعالیٰ کی رحمت ہے کہ دوسری جگہ اس مضمون کو دوسرے سہل عنوان سے بیان فرمایا کیونکہ ہم سے اپنی اطاعت کے موافق بھی تو نہیں ہوتا تو فرماتے ہیں فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ (اللہ تعالیٰ سے ڈرو جتنی تم استطاعت رکھتے ہو) جس میں بجائے قدرت کے استطاعت کا لفظ وارد ہے اور استطاعت کہتے ہیں قدرۃ یسرہ کو نہ قدرت ممکنہ کو۔ بعض صحابہ نے دوسری آیت کو پہلے کے لئے ناسخ فرمایا ہے اس سے بعض طلبہ خوش ہوئے ہوں گے کہ اتقوا اللہ حق تقاتہ منسوخ ہوگیا چلو چھٹی ہوئی۔ ارے منسوخ تو وہ ہو جس میں نسخ کی قابلیت بھی ہو بھلا ایمان بھی کہیں منسوخ ہوا ہے اور اِتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقَاتِهٖ (اللہ سے ڈرو جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے) یہ اسی شان کا امر ہے جیسے اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ (اللہ پر ایمان لاؤ) میں ہے کیونکہ حق تعالیٰ کی عظمت کا مقتضیٰ یہی ہے کہ تقویٰ حق تقاتہ کیا جائے اور مقتضائے عظمت بدل نہیں سکتا بلکہ بات یہ ہے کہ صحابہ کے عرف میں لفظ نسخ بیان تبدیل ہی کے

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

ساتھ خاص نہیں بلکہ وہ بیان تفسیر کو بھی نسخ کہتے ہیں پس قواعد شرعیہ کے اِتَّقُوا اللّٰہَ حَقَّ تُقَاتِہٖ کا مطلب ہی یہ تھا کہ اپنی استطاعت کے موافق تقوٰی اختیار کرو یہ تو طالب علمانہ اشکال کا جواب تھا مگر افسوس یہ ہے کہ طلبہ تو صرف تفسیر میں پڑ گئے اشکالات اور شبہات حل کرنے کے درپے ہوگئے اصل مقصود پر نظر ہی نہیں کہ یہاں امر کس چیز کا ہے اور ہم کو کیا کرنا چاہئے۔

صاحبو! ضرورت اس کی ہے کہ تمام مضامین کو سمیٹ کر مقصود کا پتہ لگایا جائے۔ جیسے ایک کابلی طالب علم نے جس نے ابتداہی سے شرح جامی شروع کی اور جب لوگوں نے کہا کہ یہ طریقہ ٹھیک نہیں پہلے میزان ومنشعب اور ہدایۃ النحو وکافیہ پڑھو پھر شرح جامی پڑھنا کہا کہ شرح جامی ان سب کتابوں کی ماں ہے اور وہ سب اس کے بچے ہیں اور ہم نے اپنی والدہ کو دیکھا تھا کہ جب وہ مرغی کے بچوں کو کھڈلے میں بند کرنا چاہتیں تو بچے بہت پریشان کرتے کوئی ادھر بھاگتا کوئی اُدھر آخر وہ مرغی کو پکڑ لیتیں تو سب بچے ساتھ ساتھ ہو لیتے۔ اسی طرح ہم نے شرح جامی کو پکڑ لیا ہے یہ آجائیگی تو سب کتابیں آجائیں گی۔ تو مضامین منتشرہ کے سمیٹنے کا بھی یہی طریقہ ہے کہ اصل مقصود کا پتہ لگاؤ تو غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان آیات میں اصل مقصود ایک ہی ہے باقی سب اس کے عنوانات ہیں اب اگر تقوٰی کو اصل مقصود کہا جائے تو یہ بھی صحیح ہے کیونکہ مقصود کا یہ بھی ایک عنوان ہے مگر اس کا مصداق یہ تو بہت وسیع ہے جس کی تفصیل پر ہم کو قدرت نہیں اور ضرورت سمیٹنے کی ہے جس کے لئے مختصر حقیقت چاہیئے سو وہ حقیقت اسلام ہے یعنی یہاں حق تعالیٰ کا مقصود یہ ہے کہ اسلام یعنی تفویض پر مداومت رکھو کسی وقت اس کو ہاتھ سے نہ دو یہ ہے وہ چیز جس کو میں نے کہا تھا کہ وہ پریشانی کو بھی لذیذ کر دیتی ہے مگر وہ لذت مٹھائی اور حلوے جیسی نہیں بلکہ مرچوں بھرے کباب جیسی جس کی لذت وہی جانتے ہیں جو مرچ کھانے

کے عادی ہیں چنانچہ عاشقین کو بھی ہر طرح کی مشقت و مصائب و آلام پیش آتے ہیں مگر ان کو اس میں بھی لذت آتی ہے اور وہ یوں کہتے ہیں ؎

ناخوش تو خوش بود بر جان من　　دل فدائے یار دل رنجان من

(محبوب کی جانب سے جو امر پیش آئے گو وہ اپنی طبیعت کے خلاف اور ناخوش ہی کیوں نہ ہو مگر وہ میری جان پر خوش اور پسندیدہ ہے میں اپنے یار پر جو میری جان کو رنج دینے والا ہے اپنے دل کو قربان کرتا ہوں)

پس یہ مت سمجھنا کہ تفویض کے بعد پریشانیاں یا پریشان کن واقعات پیش نہ آئیں گے ہاں یہ ضرور ہے کہ پہلے وہ ناگوار تھے اب خوشگوار ہو جائیں گے جیسے مرچ کھانے والے کو مرچوں بھرا کباب خوشگوار ولذیذ ہوتا ہے کہ روتا بھی جاتا ہے اور کھاتا بھی جاتا ہے یہاں ایک اشکال طالب علمی اور ہے اس کو بھی حل کر دوں۔ وہ یہ کہ اصولی قاعدہ ہے کہ امر و نہی کا تعلق امور اختیاریہ سے ہوتا ہے اور یہاں موت پر نہی وارد ہے جو غیر اختیاری ہے جواب یہ ہے کہ یہ کلام محاورہ کے موافق ہے محاورہ میں بھی کہا جاتا ہے کہ بے وفا بن کر جان مت دینا اور مطلب یہ ہوتا ہے کہ عمر بھر وفادار رہنا اور اسی پر جان نکل جائے پس یہاں بھی گو ظاہر میں موت پر نہی وارد ہے مگر موت سے منع کرنا مراد نہیں بلکہ بے وفائی سے منع کرنا مقصود ہے اسی طرح آیت میں دوام اسلام کا امر مقصود ہے جس کو محاورہ کے موافق اس عنوان سے بیان کیا گیا ہے تقدیر یہ ہے دَاوِمُوْا عَلَی الْاِسْلَامِ حَتّٰی لَا تَمُوْتُوْا اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ (دوام کرو اسلام پر اور تم اسلام کے سوا اور کسی حالت میں جان نہ دینا)

اب یہاں سے ایک خام صوفی کی غلطی ظاہر ہو گئی جس نے اس آیت

سے موت نفس کو ثابت کیا ہے جو صوفیہ کی اصطلاح ہے اور استدلال
میں یہی کہا ہے کہ یہاں موت پر نہی وارد ہے جس سے معلوم ہوا کہ یہاں
وہ موت مراد نہیں جو غیر اختیاری ہے بلکہ اختیاری موت مراد ہے تو اس
سے مُوْتُوْا قَبْلَ اَنْ تَمُوْتُوْا (مرجاؤ تم مرنے سے پہلے) کا مسئلہ ثابت
ہوا تو سمجھ لو کہ یہ استدلال صحیح نہیں کیونکہ یہاں موت پر نہی وارد ہی
نہیں جیسا ابھی بیان کیا گیا بلکہ وہ مسئلہ ایک حدیث سے ثابت
ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صحابی سے فرمایا تھا یَا عَبْدَ اللّٰہِ
اِذَا اَصْبَحْتَ فَلَا تُحَدِّثْ نَفْسَکَ بِالْمَسَاءِ وَاِذَا اَمْسَیْتَ فَلَا
تُحَدِّثْ نَفْسَکَ بِالصَّبَاحِ عُدَّ نَفْسَکَ مِنْ اَصْحَابِ الْقُبُوْرِ۔
بہر حال یہاں مراد دَاوِمُوْا عَلَی الْاِسْلَامِ (اسلام پر مداومت کرو)
ہے مگر اس کو لَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ (اسلام کے علاوہ
اور کسی حالت میں جان مت دو) کے عنوان سے اس لئے ظاہر کیا گیا
کہ دَاوِمُوْا عَلَی الْاِسْلَامِ (اسلام پر مداومت کرو) کو سن کر عشاق
پر مصیبت آجاتی کہ حکم تو دوام علی التفویض کا ہے اور ہم سے اس میں کوتاہی
ہوتی ہے تو اس عنوان میں ان کی تسلی کردی گئی کہ اگر موت کے وقت
بھی تفویض کامل ہوجائے تو کافی ہے عوام تو اس کو سن کر بے فکر
ہوگئے ہوں گے کہ بس مرتے ہوئے تفویض کلی حاصل کرلیں گے
ارے اس کے ساتھ یہ مقدمہ بھی تو ملاؤ کہ مرتے وقت تفویض کلی عادۃً
اسی کو حاصل ہوتی ہے جو زندگی بھر اسی میں مشغول رہا ہو ورنہ موت کا
وقت تو سخت نازک ہے وہ تحصیل نسبت و طے مقامات و تکمیل
تفویض کا وقت تھوڑا ہی ہے کہ اسی وقت کام شروع کرو اور اسی
وقت حاصل بھی کرلو اور یوں خلاف عادت حق تعالیٰ جو چاہیں کردیں
جیسے عیسیٰ علیہ السلام و آدم علیہ السلام و حوا علیہا السلام کو بدون

ماں باپ کے بنا دیا، ورنہ عادت یہی ہے کہ بدون مرد و عورت کے مباشرت کے بچہ پیدا نہیں ہوتا اسی طرح عادۃ مرتے ہوئے انہی کے مقامات حاصل ہوتے ہیں جو زندگی بھر انہی کی فکر میں لگے رہے تھے۔

پس عوام کی بے فکری بے معنی ہے اور یہ شیطان نے ان کا راہ مار رکھا ہے کہ عمر بھر یہی پٹی پڑھاتا رہتا ہے کہ ابھی زندگی بہت ہے ذرا دنیا کے لطف اٹھالو پھر خدا تعالیٰ کی طرف توجہ کریں گے غرض تفویض وہ چیز ہے کہ ہر کام میں اس کی ضرورت ہے خواہ دنیا کا ہو یا دین کا۔ اہلِ باطن تو اس سے ابتدا ہی میں کام لیتے ہیں اور اہلِ دنیا بعد میں اس سے کام لیتے ہیں۔ مثلاً کسی پر مقدمہ قائم ہو جائے اگر وہ صاحب باطن ہے تو اسی وقت سے معاملہ خدا کے سپرد کر دے گا اور جو نتیجہ ہو اس پر اول ہی سے راضی ہوگا اس کا یہ مطلب نہیں کہ تدبیر کو چھوڑ دے گا کیونکہ تدبیر تفویض کے منافی نہیں یہ بھی اسی کا حکم ہے جس کا حق وہ تفویض ہے پس یہ تدبیر بھی کرے گا مگر اپنی طرف سے کوئی نتیجہ تجویز نہ کرے گا بلکہ اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دے گا کہ جو ان کی رضا ہے میں اس پر راضی ہوں۔

دنیا دار بھی اخیر میں یہی کرتا ہے مگر وہ اول اول اپنی تدبیر پر نظر کرتا ہے اور اپنی طرف سے نتیجہ کی ایک شق متعین کر لیتا ہے کہ نتیجہ یوں ہونا چاہیئے۔ پھر جب ہار جاتا ہے تو کہتا ہے کہ تقدیر میں یوں ہی تھا میں خدا کی مرضی پر راضی ہوں اسی طرح ایک فرع اس کی مثلاً مدرسہ ہے جس کے چلانے کے لئے تدبیر کی بیشک ضرورت ہے مگر صاحب تفویض تو ابتدا ہی سے تفویض کرتا ہے اور تدبیر جو کچھ کرتا ہے محض سنت و اطاعت سمجھ کر کرتا ہے اس کی نیت یہ نہیں ہوتی کہ تدبیر ضرور

کامیاب ہی ہو بلکہ وہ کامیابی اور ناکامی کو حق تعالٰی کے سپرد کر کے کوشش کرتا ہے۔ اگر کامیابی ہو گئی تو اور ناکامی ہوئی تو وہ ہر حال میں خوش ہے اور جو شخص اس ارادہ سے تدبیر کرتا ہے کہ مجھے کامیابی ہی ہو اور جس طرح میں چاہتا ہوں مدرسہ اسی طرح چلے اس کی پریشانیوں کی کوئی حد نہیں رہتی کیونکہ جہاں کوئی بات ناگوار طبع پیش آئے گی اس کو اپنی ناکامی کا رنج ہو گا تو بتلاؤ کہ تفویض سے زیادہ راحت کا آلہ دنیا میں کیا ہے حضرت تلاش کرتے کرتے تھک جائیے گا اس سے بڑھ کر راحت کا آلہ کوئی نہ ملے گا مگر راحت کی نیت سے تفویض کرنا دین نہیں بلکہ دنیا ہے حقیقی تفویض وہ ہے جس میں یہ بھی قصد نہ ہو کہ اس سے چین ملے گا بلکہ محض رضاء حق کا قصد ہو ورنہ وہ مثال ہو گی۔

جیسے ایک دیہاتی نے مولوی صاحب کی ترغیب سے نماز شروع کی مولوی صاحب کا جو پھر وہاں گذر ہوا نماز کی نسبت پوچھا کہنے لگا کہ نماز سے بڑا پھایدہ (فائدہ) ہے جب ہی مونڈھا پڑوں (یعنی سجدہ کروں) جبھی بادی (ریح) خوب نکر طے (نکلے) آپ کو ریح کا مرض تھا اور سجدہ میں گوز اڑایا کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ فائدہ کس درجہ کا ہے۔ یوں ہی تفویض بقصد راحت سے بھی گو راحت حاصل ہو گی مگر یہ نفع قابل اعتبار نہیں۔ تفویض معتبر وہی ہے جس سے صرف اللہ تعالٰی کی رضا مقصود ہو اور کچھ مقصود نہ ہو۔ چنانچہ شیخ ابن عطاء اللہ اسکندری رحمۃ اللہ علیہ نے کسی کی حکایت لکھی ہے۔

کہ میں ایک بزرگ سے ملنے گیا تو وہ یہ دعا کر رہے تھے کہ اے اللہ میں لذت تفویض سے پناہ مانگتا ہوں واقعی تفویض میں بڑی لذت ہے مگر اہل اللہ اس سے پناہ مانگتے ہیں کہ مبادا ہم لذت کی وجہ سے تفویض کر رہے ہوں لیکن یہ ان بزرگ کا حال تھا تم

یہ بھی دعا نہ کرو کیونکہ لوگ بدون لذت کے تفویض نہیں کر سکتے بس تم نہ لذت کا قصد کرو نہ اس کی نفی کی دعا کرو بلکہ یہ مذاق رکھو ع

ہرچہ از دوست می رسد نیکوست
(جو کچھ محبوب کی جانب سے پہونچے وہ بہتر ہے)

اب اگر لذت عطا ہو جائے تو یہ نعمت حق ہے اس سے گھبراتے کیوں ہو اس سے پناہ نہ مانگو نہ اس کے دفع کی دعا کرو اور لذت حاصل نہ ہو جب بھی راضی رہو اصحاب مقام یوں فرماتے ہیں کہ اگر وہ چپت ماریں چپت کھا لو اور پیار کریں تو پیار کرالو اور اس کی لذت حاصل ہو تو اس کو نعمت سمجھو شاید کسی کو اس مقام پر حضرت ابراہیم ادہم رحمۃ اللہ علیہ کی ایک حکایت سے شبہ ہو کہ ایک دفعہ ان کی نماز تہجد ناغہ ہو گئی اس کا ان کو رنج ہوا اور اگلی رات جاگنے کا زیادہ اہتمام کیا تو اس رات ایسی نیند آئی کہ صبح کی نماز بھی قضا ہو گئی اب تو وہ سخت پریشان ہوئے الہام ہوا کہ اے ابراہیم تم نے اپنی تدبیر کو دیکھ لیا اب تفویض کرو۔

(نحن اذا انمنا وقم اذا اقمنا) (جب ہم سلائیں سو رہو جب اٹھائیں اٹھ جاؤ ۱۲)

حضرت ابراہیم فرماتے ہیں فَفَوَّضتُ فَاسْتَرَحْتُ کہ میں نے تفویض کر دی اور راحت میں ہو گیا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے راحت کے لئے تفویض اختیار کی تھی جواب یہ ہے کہ اس سے یہ معلوم نہیں ہوتا بلکہ اس میں تو صرف ترتب راحت کا ذکر ہے قصد استراحت پر کوئی لفظ دال نہیں مگر اس حکایت سے جاہل لوگ خوش ہوئے ہوں گے کہ بڑا مزہ آیا۔ اب سے

ہم بھی نماز روزہ کے لئے اہتمام و تدبیر نہ کیا کریں گے بلکہ تفویض کردیں گے اس کا جواب یہ ہے کہ بہت اچھا پھر اللہ تعالیٰ تم کو سزا دیں گے اس وقت بھی تفویض کرنا۔

جیسے مثنوی میں ایک جبری کی حکایت مولانا نے لکھی ہے کہ وہ اختیار کا قائل نہ تھا۔ ایک دن وہ کسی شخص کے باغ میں جاکر انگور توڑ توڑ کے کھانے لگا مالک باغ نے جو دیکھا تو اس نے دھمکایا کہ یہ کیا کر رہا ہے، میرے انگور کیوں کھاتا ہے۔ کہا چپ رہو۔ زمین بھی خدا کی، درخت بھی خدا کا، انگور بھی خدا کے میں بھی خدا کا۔ تو منع کرنے والا کون ہے۔ وہ باغ والا بھی ذہین تھا اس نے اپنے نوکر کو آواز دی کہ ایک کھٹکا اور ایک رسا لاوہ لے آیا تو اس نے اس جبری کو رسے سے باندھ کر خوب مارا وہ چلانے لگا کہ اللہ کے واسطے چھوڑ دے کہا چپ رہ میں بھی خدا کا تو بھی خدا کا رسا بھی خدا کا کھٹکا بھی خدا کا پھر کیوں چلاتا ہے وہ کہنے لگا

گفت توبہ کردم از جبرای عیار
اختیار است اختیار است اختیار

(اس نے کہا کہ میں جبر سے توبہ کی اور اختیار کا قائل ہوا)

یاد رکھو تفویض کے معنی ترک تدبیر نہیں بلکہ تفیض کے معنے صرف یہ ہیں کہ خدا کے سوا کسی پر نظر نہ رکھے تدبیر کرے اور تدبیر کے نتیجہ کو خدا کے سپرد کرے۔ اور حضرت ابراہیم نے تدبیر فرض سے زیادہ تدبیر کی تھی اس لئے ان کو تنبیہ کی گئی کیونکہ خواص کو تدبیر فرض سے زیادہ کی اجازت نہیں ہوتی اور ہم کو تدبیر فرض سے زیادہ کی بھی اجازت ہے کیونکہ ہم گنوار ہیں اور گنواروں کے لئے وہ قواعد نہیں ہوتے جو خواص کے لئے

ہیں۔ جیسے ایک حکیم کا قصہ ہے کہ اس نے ایک گنوار کو دیکھا کہ چنے کی چار پانچ روٹیاں کھا کر اوپر سے چھاچھ کا بنٹا پی رہا ہے حکیم نے کہا کہ چھاچھ کو کھانے کے درمیان میں پینا چاہیئے اخیر میں پینا مضر ہے۔ گنوار نے اپنے بیٹے کو آواز دی کہ ارے فُلانے ایک چار ٹکڑ (یعنی روٹی) اور لیا اسے چھاکو بیچ میں کر لوں۔ یو (یہ) حکیم کہہ رہا ہے۔ چنانچہ وہ چار پچنگ اور کھا گیا۔ حکیم صاحب نے یہ منظر دیکھ کر کہا چودھری جی تمہارے واسطے کوئی قاعدہ قانون نہیں تم چاہے بیچ میں پیو یا اخیر میں۔ اسی طرح ہمارے واسطے یہ قاعدہ نہیں کہ تدبیر فرض سے زیادہ تدبیر نہ کریں بلکہ ہم تو جب فرض سے زیادہ کریں گے جب فرض تک پہونچیں گے۔

غرض اس میں شک نہیں کہ تفویض سے دنیا کے کاموں میں بھی راحت ہے اور دین کے کاموں میں بھی۔ دنیا میں مقدمہ اور مدرسہ کی مثال تو گذر چکی۔ ایک اور مثال لو۔

مثلاً تم اپنے لڑکے کا رشتہ کر رہے ہو اور کامیابی نہیں ہوتی اس سے رنج ہوگا کیونکہ تفویض نہیں تھی تم نے اپنی طرف سے ایک شق تجویز کر لی تھی کہ یوں ہونا چاہیئے اور اگر ابتدا ہی سے تجویز نہ کرتے بلکہ تفویض کرتے تو ہرگز ناکامی سے رنج نہ ہوتا یا کوئی عزیز مریض تھا تم اس کے لئے تعویز لے گئے اور نفع نہ ہوا تو اس وقت بھی رنج ہوگا کیونکہ تفویض نہ تھی بلکہ اس اعتقاد سے تعویذ لیا گیا تھا کہ بس اس کے باندھتے ہی آرام ہوجائے گا۔ اگر تفویض ہوتی تو اول ہی سے ہر شق پر راضی ہوتے اور وہ تعویذ تفویض ہوجاتا۔

آجکل مدرسہ دیوبند میں ایک شور برپا ہے سخت شورش

ہو رہی ہے (کہ وہ لوگ جن کو مولوی حبیب الرحمن صاحبؒ نے باپ بنکر پالا پرورش کیا پڑھایا لکھایا اور تدابیر سے ان کو بڑا بنایا آج وہ انہی کے مقابلہ میں بڑائی جتلا رہے ہیں اور ان کے ہاتھ سے مدرسہ کا اہتمام لینا چاہ رہے ہیں اور مولوی حبیب الرحمن صاحب ایسے بے نفس ہیں کہ مدرسہ کے اہتمام سے استعفاء دینے کو آمادہ ہو گئے کہ جب میری خدمت لوگوں کو پسند نہیں تو میں ہی الگ ہو جاؤں لیکن اراکین مدرسہ نے ان کو اس خیال سے روک رکھا ہے ۱۲ جامع) اور اس شورش کے رفع کرنے میں مہتمم مدرسہ اور اراکین سب کوشاں ہیں مگر میں نے مہتمم صاحب کو لکھدیا ہے کہ تم اسیوقت سے ہر نتیجہ کے لئے آمادہ ہو جاؤ یہ تجویز ذہن میں نہ کرو کہ مدرسہ رہے یا تمہارے ہاتھ میں رہے بلکہ اگر مدرسہ ٹوٹ جائے یا بند ہو جائے تو تم ابھی سے اس پر راضی ہو جاؤ اور خدا پر نظر کر کے قوت کے ساتھ اپنے اصول پر قائم رہو۔ اور یہ قوت بدون تفویض کے پیدا نہیں ہو سکتی اس کا یہ مطلب نہیں کہ تدبیر نہ کرو کیونکہ تفویض ترک تدبیر کا نام نہیں چنانچہ میں کہہ چکا ہوں کہ تدبیر بھی اسی کا حکم ہے جس کے لئے تم تفویض کر رہے ہو دلیلہ الصریح وَاَعِدُّوا لَهُم مَّا اسْتَطَعْتُم مِّن قُوَّةٍ وَمِن رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُونَ بِهِ عَدُوَّ اللَّهِ وَعَدُوَّكُمْ (اس کی صریح دلیل یہ ہے واعدوا لہم الخ یعنی اور ان کافروں کے لئے جس قدر تم سے ہو سکے ہتھیار سے اور پلے ہوئے گھوڑوں سے سامان درست رکھو کہ اس کے ذریعہ سے تم رعب جمائے رکھو ان پر جو اللہ کے دشمن ہیں اور تمہارے دشمن ہیں)

بس تفویض یہ ہے کہ تدبیر کرو مگر اس پر نظر نہ کرو اور اپنی تجویز سے کوئی شق نتیجہ کی متعین نہ کرو کہ یوں ہونا چاہیئے۔

میرے اس لکھنے کا یہ اثر ہوا کہ مہتمم صاحب بڑے مضبوط ہو گئے اور لکھتے ہیں کہ تیری وجہ سے ہمیں بہت قوت ہو گئی۔

میرے ایک اور دوست ہیں ان کے ذمہ قرض بہت ہو گیا ہے بنئے نالش کرنا چاہتے ہیں اس سے وہ بیچارے بڑے پریشان ہو رہے تھے مجھے بھی اپنی پریشانی لکھی۔ میں نے لکھا کہ پریشان کیوں ہوتے ہو آخر وہ نالش کر دیں گے تو کیا ہو جائے گا بہت سے بہت تم کو قید کرا دیں گے تو تم قید خانہ میں چلے جانا

یا زمین و مکان نیلام ہو جائے گا تم زمین و مکان نیلام کرا دینا جس خدا نے اب تک روزی دی ہے وہ پھر بھی روزی دے گا تم اپنی طرف سے اسی وقت ہر نتیجہ کے لئے تیار رہو جاؤ اور اس کے بعد مقدمہ میں تدبیر اس کی کرو کہ قرض کی قسطیں ہو جائیں یہ خط پڑھ کر ان کو ایسا سکون و اطمینان ہوا کہ اب لکھتے ہیں کہ یوں جی چاہتا ہے کہ سب قرضخواہوں سے کہہ دوں کہ سب مل کر نالش کر دو جو ہونا ہوگا ہو جائیگا میں نے لکھا کہ ایسا بھی نہ کرنا کہ یہ بھی خلاف تفویض ہے اپنی طرف سے تم نہ بلا تجویز کرو نہ راحت بلکہ جو وہ تجویز کر دیں اس پر راضی رہو۔ حضرت یہ نسخہ اکسیر میں نے ایسا بتلا دیا جس سے نہ اہل دنیا کو استغنا ہے نہ اہل دین کو نہ علماء کو استغناء ہے نہ عرفاء کو بلکہ تمام عالم اس کا محتاج ہے اور اس کی زیادہ قدر ان سالکین کو ہوگی جو کسی بلائے باطنی میں پھنسے ہوئے ہوں کیونکہ بعض حالات سالکین کو ایسے پیش آتے ہیں کہ اگر پہاڑ پر رکھے جائیں تو پہاڑ پھٹ جائیں ؂

آسماں بار امانت نتوانست کشید قرعہ فال بہ نام من دیوانہ زدند

(آسماں بار امانت نہ اٹھا سکا قرعہ فال مجھ دیوانہ کے نام آیا)

یہ روح انسانی ہی کی طاقت ہے کہ وہ ایسے ثقیل و شدید امور کا تحمل کرتی ہے اسی کو حق تعالیٰ فرماتے ہیں انا عرضنا الامانۃ علی السمٰوٰت والارض والجبال فابین ان یحملنھا اور ایک آیت میں جو یہ فرمایا گیا ہے لخلق السموات والارض اکبر من خلق الناس تو یہ باعتبار مادۂ انسانی کے ہے سو اس میں کیا شک ہے کہ مادۂ انسان مادہ سموات سے اضعف ہے لیکن روح انسانی اَشَدُّ مِنَ الْجِبَال (پہاڑوں سے زیادہ سخت) ہے روح انسان کی قوت سمٰوٰت و ارض سب سے زیادہ ہے جس کا تجربہ سالکین کو ہوتا ہے جن پر یہ احوال شدائد گذرتے رہتے ہیں اور اس وقت تفویض کے سوا کوئی آلہ راحت کا نہیں بس سالکین تفویض کر کے دیکھیں ان شاء اللہ سب شدائد کا تحمل آسان ہو جائے گا اور نہ بھی آسان ہو تو تفویض کے سوا چارہ ہی کیا ہے۔ اسی کو حضرت حافظ فرماتے ہیں ؂

باغباں گر چند روزے صحبت گل بایدش　　　بر جفائے خار ہجراں صبر بلبل بایدش
(باغبان کو اگر چند روز گل کی صحبت چاہیئے تو خار ہجران کی زیادتی پر بلبل کا سا صبر درکار ہے)

اگر کبھی وصال کے بعد فراق ہو جائے تو صبر سے کام لو تفویض کرو۔ اگر تجلی جمال کے بعد تجلی قہر و جلال ہو تو اس وقت بھی تفویض سے ہی کام لو۔ حدیث میں آتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار فرمایا کہ مجھے چین کیونکر ہو، اسرافیل صور منہ میں لئے ہے اور کان جھکائے حکم کا منتظر ہے کہ ذرا حکم ہو تو عالم کو درہم برہم کر دوں۔ صحابہ اس کو سن کر لرز گئے گھبرا گئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قُولُوا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيلُ (ہم کو اللہ کافی ہے اور وہی اچھا کارساز ہے) یعنی گھبراؤ نہیں بلکہ حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيلُ کہو یعنی تفویض کرو اور خدا پر نظر رکھو۔ ارے جب سارے راستے ان کے ہی قبضے میں ہیں اور تم کہیں سے نکل کر بھاگ نہیں سکتے تو اب بجز تفویض کے چارہ ہی کیا ہے مولانا فرماتے ہیں ؎

اے حریفاں راہ ہا را بست یار　　　آہوئے لنگیم و او شیر شکار
(اے حریفو یار نے تمام راستے بند کر دئے ہیں ہم لنگڑے ہرن کی طرح اور شکار کے ہرن کی طرح ہے)

واللہ سارے راستے بند ہیں تم کہیں ان کے قبضہ سے باہر نہیں جا سکتے بس ہماری ایسی مثال ہے جیسے لنگڑا ہرن شیر کے پنجہ میں ہو اب بتلاؤ لنگڑا ہرن شیر کے پنجہ سے چھوٹنے کی کوشش کرے تو یہ اس کی حماقت ہے یا نہیں بس اس کی خیر اسی میں ہے کہ اپنے کو شیر کے سامنے ڈال دے اور اس کے ہر تصرف پر راضی ہو جائے خواہ کھالے خواہ چھوڑ دے ؎

غیر تسلیم و رضا کو چارۂ　　　در کف شیر نر خونخوارۂ
(سوائے تسلیم و رضائے کوئی چارہ نہیں تم مثل خونخوار شیر نر کی مٹھی میں ہو)

ہائے اللہ ہائے اللہ اے اللہ اے اللہ (صَاحَ الشَّیْخُ وَبَکٰی وَوَلْوَلَ وَاضْطَرَبَ اِضْطِرَابًا شَدِیْدًا لَمْ نُشَاهِدْ بِهٖ قَطُّ۔ شیخ چلائے اور روئے اور سخت مضطرب ہوا سے پہلے کبھی ایسا مشاہدہ نہیں ہوا) دیر تک خاموش رہنے کے بعد فرمایا کہ (جامع) واللہ بجز تسلیم و رضا کے کچھ چارہ نہیں ؎

غیر تسلیم و رضا کو چارۂ در کفِ شیرِ نرِ خونخوارۂ

آہوئے لنگ کو یہی چاہئے کہ اپنے کو شیر کے آگے ڈالدے اور اپنا ضعف و عجز ظاہر کرے اب یہ ہوگا کہ شیر اس پر رحم کرکے خود اس کی پرورش کرے گا اور جنگل سے شکار لاکر اس کے آگے ڈالیگا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو یہی علاج بتلایا ہے قُوْلُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ (کہو ہم کو اللہ کافی ہے اور وہی اچھا کارساز ہے) جس پر وعدہ ہے ومن يتوكل على الله فهو حسبه ان الله بالغ امره قد جعل الله لكل شئ قدرا اس شعر کے بعد حافظ فرماتے ہیں ؎

اے دل اندر بند زلفش از پریشانی منال
مرغ زیرک چوں بدام افتد تحمل بایدش

یعنی تمہاری مثال ایسی ہے جیسے مرغ جال میں پھنسا ہوا اس کو تحمل ہی چاہئے کہ صبر و سکون کے ساتھ پابزنجیر ہو جاوے ورنہ جتنا پھڑپھڑائے گا اور زیادہ پھنسے گا (تڑپوگے جتنا جال کے اندر، جال گھسے گا کھال کے اندر) اس کے بعد فرماتے ہیں ؎

رند عالم سوز را با مصلحت بینی چہ کار
کار ملک ست آنکہ تدبیر و تحمل بایدش

(اندر عالم سوز یعنی عاشق کو مصلحت بینی سے کیا تعلق اس کو تو محبوب حقیقی کا کام سمجھ کر تحمل و تدبیر چاہئے)

یعنی تدبیر کے درپے ہونا اور اسی فکر میں رہنا غلام کا کام نہیں یہ کام بادشاہوں کا ہے اور تم بادشاہ نہیں ہو بلکہ غلام ہو بادشاہ صرف ایک ہے اور سب اس کے غلام ہیں۔ پس ان تدابیر پر نظر کرنا چھوڑ دو خدا پر نظر رکھو آگے علم و عمل پر بھروسہ

کرنے کو منع فرماتے ہیں ؎

تکیہ بر تقویٰ و دانش در طریقت کافریست
راہرو گر صد ہنر دارد توکل بایدش

(طریقت میں عقل و تقویٰ پر بھروسہ کرنا کفر ہے سالک اگر سو ہنر جانتا ہو پھر اس کو توکل یعنی اپنے کو اہل اللہ کے سپرد کرنا چاہیئے)

یہاں بڑے بڑے متقی اور عارف سالک کو توکل ہی لازم ہے اسی سے کام چلے گا ورنہ جہاں اسنے اپنی عقل یا تقویٰ پر اعتماد کیا اور تباہ ہوا حضرت یہی ہے تفویض اور یہی حقیقت ہے اسلام کی اور اسی کا حکم ہے اس آیت میں لَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ (سوائے اسلام کے اور کسی حالت میں مت جان دو) مگر ہم نے اسلام کا صرف لفظ یاد کرلیا ہے اس کی حقیقت پر کبھی نظر نہیں کی جن کو طریق احوال پیش آتے ہیں وہ خوب جانتے ہیں کہ جہاں تدبیر کے پیچھے پڑے اور اس پر نظر کی وہیں پریشانی اٹھائی اور جب تفویض کی فوراً ہلکے پھلکے ہوگئے اور ایسا معلوم ہوا کہ گویا کوئی یوں کہہ رہا ہے ؎

من غم تو می خورم تو غم مخور
بر تو من مشفق ترم از صد پدید

(میں تیرا غمخوار ہوں تو غم مت کر میں تجھ پر سیکڑوں باپوں سے زیادہ شفیق ہوں)

پس ہمیشہ کے لئے یہی دستور العمل بنالو کہ شریعت نے جس تدبیر کی اجازت دی ہے خواہ دین کے متعلق ہو یا دنیا کے وہ کر کے آگے نتیجہ کو خدا تعالےٰ کے سپرد کردو بس اسی سے نجات ہوگی اب میں تمام دنیا سے کہتا ہوں کہ کوئی اس سے بہتر نسخہ تو لائے ذرا ہم بھی دیکھیں ان شاء اللہ قیامت آجائے گی اور اس سے بہتر نسخہ کوئی نہ لاسکیگا اسی کو حق تعالیٰ اس جگہ بیان فرماتے ہیں وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ (سوائے اسلام اور کسی حالت میں جان مت دو) اس کے بعد فرماتے ہیں وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا کہ اللہ کی رسی کو (یعنی قرآن و احکام قرآن کو جس میں حدیث و فقہ بھی سب شامل ہیں کیونکہ سب اسی ایک متن کی شروح ہیں) مضبوط پکڑلو اور آپس میں افتراق نہ کرو کیونکہ اس سے

دین کو بھی سخت ضرر پہونچتا ہے جس کی بنا پر حدیث میں فسادِ ذات البین کو حالقہ فرمایا گیا ہے کما تقدم۔ وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللهِ عَلَيْكُمْ إِذْ كُنْتُمْ أَعْدَاءً فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ فَأَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهِ إِخْوَانًا اور اللہ کی اس نعمت کو اپنے اوپر یاد کرو کہ تم پہلے باہم دشمن تھے پھر اللہ تعالیٰ نے تمہارے قلوب میں الفت ڈالدی جس سے تم بھائی بھائی ہوگئے (یہ تو دنیوی نعمت ہے) وَكُنْتُمْ عَلَىٰ شَفَا حُفْرَةٍ مِنَ النَّارِ فَأَنْقَذَكُمْ مِنْهَا اور تم جہنم کے گڑھے کے کنارہ پر کھڑے تھے کہ جہنم میں جانے کے لئے صرف مرنے کی دیر تھی کہ اللہ تعالیٰ نے تم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے اس سے بچا لیا یہ دینی نعمت ہے) ان نعمتوں کو یاد کرکے ان کا شکر ادا کرو اور شکر وہی ہے کہ حبل اللہ کو مضبوط پکڑلو یہ تو ترجمہ تھا اور مقصود ظاہر ہے کہ حبل اللہ اسلام ہے اور اسلام کی حقیقت تفویض ہے جو تمام حالات کو شامل ہے خواہ حالات آفاقیہ ہوں خواہ نفسیہ ہوں پھر انفسیہ میں خواہ احوال حسیہ ہوں جیسے مرض وصحت و قوت وضعف خواہ باطنیہ ہوں جیسے قبض وبسط ہیبت وانس ومحبت وشوق و امثالہا سب کو اپنے سر آنکھوں پر رکھے پس مقصود یہ ہوا کہ ہر حال میں تفویض پر مداومت رکھو چونکہ مجھے اس مضمون سے خود بہت نفع ہوا ہے اس لئے میں نے دوستوں کو بھی اس سے مطلع کرنا چاہا۔

بس اب میں ختم کرتا ہوں دعا کیجئے اللہ تعالیٰ ہم کو یہ دولت عظمیٰ نصیب فرمائیں اور فہم سلیم عطا فرمائیں۔ آمین وصلی اللہ علی سیدنا خیر خلقہ محمد وعلی الہ واصحابہ وازواجہ وذریتہ اجمعین واخر دعوٰنا ان الحمد للہ رب العلمین۔

تمت

قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی وَأْتُوا الْبُيُوتَ مِنْ أَبْوَابِهَا

چوں آیت مزبورہ بمعنا ہا دال ست

برضرورت حدود و رہبر مقصود

وعظ

آداب التبلیغ

مشتمل بر حدود و مقصود تبلیغ بود۔ افادۃً للمبلغین

منجملہ ارشادات

حکیم الامۃ مجدد الملۃ حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی

رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

ناشر:۔ محمد عبد المنان غفرلہ

مکتبہ تھانوی —— دفتر الابقاء

مسافرخانہ بندر روڈ / ایم۔ اے جناح روڈ کراچی ۱

وعظ مسمیٰ بہ

آداب التبلیغ

این	کہاں ہوا	مدرسہ دارالعلوم دیوبند ضلع سہارنپور
متی	کب ہوا	۱۰ ذالحجہ سنہ ۱۳۴۱ھ بروز جمعرات
کم	کتنی دیر ہوا	دو گھنٹہ ۴۵ منٹ
کیف	کیونکر ہوا	کرسی پر بیٹھ کر
لم	کیوں ہوا	جناب مولانا حبیب الرحمن صاحب نائب مہتمم مدرسہ مذکور کی درخواست پر
ماذا	کیا مضمون تھا	آداب تبلیغ اور شکایت کم توجہی کی
من ای نتان	کس طبقے کیلئے زیادہ مفید تھا	زیادہ تر علماء اور طلباء کے لئے
من ضبط	کس نے ضبط کیا	مولوی اطہر علی سلہٹی
المستمعون	سامعین کی تعداد	تقریباً ایک ہزار
الاشتات	متفرقات	.

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دعا وخطبہ کے بعد - امابعد فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم. بسم اللہ الرحمن الرحیم - ادع الی سبیل ربک بالحکمۃ والموعظۃ الحسنۃ وجادلھم بالتی ھی احسن ان ربک ھو اعلم بمن ضل عن سبیلہ وھو اعلم بالمھتدین ٥ جس مضمون کو اس وقت میں عرض کرنا چاہتا ہوں وہ کوئی نیا مضمون نہیں مگر ایک اعتبار سے نیا بھی ہے یعنی اصل وحقیقت کے اعتبار سے تو جدید نہیں ہاں عارض کے اعتبار سے جدید ہے یعنی واقع میں تو یہ پرانا ہے مگر اس کا جو مقتضا تھا اس میں آجکل کمی ہے۔ اُس کمی کو دور کرلے اور اس کے حقوق کما ینبغی پر آگاہ کرنے کے لئے یعنی جس درجہ اس کا اہتمام ہونا چاہیئے تھا اور آجکل وہ نہیں ہے اس اعتبار خاص سے جدید بھی کہا جاسکتا ہے

چنانچہ اس کے تعیین سے معلوم ہو جائے گا کہ اس میں آجکل کس قدر کمی ہے اور حقیقت میں اس میں کیسا اہتمام ہونا چاہیئے تھا اور ہر چند کہ بیان میں کوئی نیا مضمون ہونا ضروری نہیں بلکہ ایک اعتبار سے جدید ہونا مضر بھی ہے کیونکہ جدید وہ ہوگا جو بدعت ہو اور دین سے خارج اور زائد ہوا اور جو پہلے سے دین کا جزو ہو وہ تو قدیم ہی ہوگا لہذا انتظار مضمون جدید کا علی الاطلاق تو غلطی ہے۔ مگر عام لوگوں کا طبعًا یہ تقاضا ہوتا ہے کہ وعظ میں کوئی نیا مضمون ہونا چاہیئے کیونکہ اس میں جی لگتا ہے اس مصلحت کا لحاظ فی الجملہ کر کے جی چاہا کرتا ہے کہ بیان میں گو نہ جدت ہو تو اچھا ہے خواہ جدید اس اعتبار سے ہو کہ اب تک سامعین کو بالکل معلوم ہی نہیں ہوا یا توجہ کے درجہ میں جدید ہو یعنی معلوم تو ہے مگر ادھر توجہ نہیں رہی اس لئے بیان میں اس جدت خاص کے اعتبار سے اس کی رعایت کی جاتی ہے کہ کوئی نیا مضمون ہو ورنہ جدید ہونے کی ضرورت نہیں حتیٰ کہ اگر کسی قسم کی جدت بھی نہ ہو خواہ بالذات یا بالعرض بیان پھر بھی مفید ہوتا ہے اگر یہ شبہ ہو کہ جب کسی قسم کی بھی جدت نہیں تو اس بیان سے کیا فائدہ یہ تو تحصیل حاصل ہے سو یہ کہنا غلط ہے کیونکہ اگر اور کچھ فائدہ نہ ہو تو مکرر کرنے سے تاکید ہی ہو جائے گی اور تاکید کا مفید و مؤثر ہونا علم بلاغت میں ثابت ہے تو یقینًا تکرار سے ایک نیا نفع ہوگا یعنی تاکید کا اثر جو کہ قبل از بیان نہیں تھا تو یہ کیا تھوڑا فائدہ ہے تو تحصیل حاصل کہاں ہوئی بلکہ یہ تو تحصیل غیر حاصل ہے مگر تاہم عمومًا طبعی اقتضا یہ ہے کہ ایسی بات بیان ہو جو پہلے سے بالکل ذہن میں نہ تھی خواہ حصول کے اعتبار سے کہ وہ چیز ذہن میں حاصل ہی نہ تھی یا ذہول کے اعتبار سے کہ حاصل تو تھی مگر اس سے ذہول ہو گیا تھا اس کی طرف توجہ نہ تھی تو اس طبعی اقتضاء کو دیکھ کر بعض دفعہ جی چاہا کرتا ہے کہ اگر اس کی رعایت کی جائے کہ مضمون میں گو نہ جدت ہو تو کوئی مضائقہ نہیں چنانچہ اس وقت بھی اس کا لحاظ کیا گیا ہے۔ اسی لئے میں نے کہا تھا کہ یہ مضمون خاص اعتبار سے نیا ہے اب اس کو متعین کرتا ہوں اہل علم

کو تو آیت کی تلاوت ہی سے اس مضمون کی تعیین ہو گئی ہو گی کیونکہ مجمع اہل علم کا ہے لیکن ممکن ہے کہ بعض لوگ جو اہل علم نہیں نہ سمجھے ہوں اون کا ترجمہ کرنے سے معلوم ہو جائے گا اس لئے ترجمہ کرتا ہوں تاکہ ان کے نزدیک بھی متعین جائے۔ حق تعالے فرماتے ہیں ادع الی سبیل ربک بالحکمۃ والموعظۃ الحسنۃ وجادلھم بالتی ھی احسن ان ربک ھو اعلم بمن ضل عن سبیلہ وھو اعلم بالمھتدین۔ یعنی اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم آپ لوگوں کو سبیل رب کی طرف حکمت اور موعظہ حسنہ کے ساتھ بلائے اور (اگر مجادلہ کی ضرورت ہو تو) ان سے مجادلہ (بھی) کیجیے (مگر) احسن طریقہ سے (ہو) ترجمہ سے معلوم ہو گیا ہو گا کہ کیا مضمون بیان کرنا ہے وہ مضمون خدا کے سبیل کی طرف بلانے کا ہے خدا کا سبیل کیا ہے سبیل رب وہ ہے جس سے ان تک رسائی ہو جائے اور ظاہر ہے کہ قرآن و حدیث سے ثابت ہے کہ وہ سبیل صرف اسلام ہے اگر انسان اسلام کے احکام بجا لاتا ہے تو اس کو ان تک رسائی ہو سکتی ہے اور یہی سبیل رب ہے اسی کی طرف لوگوں کو بلانے کا حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو امر ہوا ہے اور اسلام کے اندر احکام دو قسم کے ہیں ایک اصولی ایک فروعی لفظ سبیل دونوں کو عام ہے مطلب یہ ہوا کہ لوگوں کو اصول کی بھی دعوت کیجیے اور فروع کی بھی تو خلاصہ یہ نکلا کہ اصول اور فروع پر بتلا کر ان کو اسلام کی طرف بلائے باقی دعوت کا ایک طریقہ ہے وہ اس کے متعلقات سے ہے یعنی اس کے آداب اور لوازم جن کا ذکر اپنے موقعہ پر آجائیگا مگر تعین مضمون کے واسطے اتنا ہی کافی ہو گیا کہ وہ مضمون اسلام کی طرف بلاتا ہے اور اسلام ہی دین حق ہے وہی سبیل رب ہے وہی صراط مستقیم ہے یہ اس کے القاب ہیں اور ظاہر ہے کہ گو یہاں ادع کا خطاب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے مگر حکم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ خاص نہیں بلکہ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) اور اتباع رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) سب اس کے مخاطب ہیں۔ ہاں حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کو خطاب اولاً ہے اور دوسروں کو ثانیاً۔ اب دیکھنا چاہیئے کہ اس باب میں ہماری کیا حالت ہے اور ہم کو اس

حکم کی طرف توجہ ہے یا نہیں تو غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہم کو ادھر بالکل توجہ نہیں اعتقاداً تو اس کو مامور بہ سمجھتے ہیں بلکہ اگر اس میں بھی غور کر کے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ جس درجہ کا یہ مامور بہ ہے اس درجہ سے بہت کم سمجھا جاتا ہے، اس کو درجہ وجوب میں سمجھنے والے تو بہت ہی کم ہوں گے کوئی مستحب سمجھتا ہے اور کوئی مستحسن اور غضب یہ کہ مستحسن سمجھنے میں بھی قید لگاتے ہیں کہ مستحسن بھی جب ہے کہ کسی مصلحت سیاسیہ وغیرہ کے خلاف نہ ہو ورنہ وہ بھی ندارد اول تو یہی غضب تھا کہ بعض نے واجب کو مستحب کہا پھر یہ دوسرا غضب ہے کہ اس میں یہ قید لگا دی کہ مصلحت کے خلاف نہ ہو وہ کیوں محض اپنے اغراض کے سبب کیونکہ دینی کاموں میں بھی لوگ اول اغراض کی طرف دیکھتے ہیں کہ یہ اس کے بھی موافق ہیں یا نہیں اگر ہوا فبہا ورنہ کھینچ تان کر اس کو اغراض کے تابع بناتے ہیں اور اغراض کو متبوع یعنی پہلے اغراض تجویز کر لئے۔ پھر دیکھتے ہیں کہ یہ مسئلہ ان اغراض کے موافق ہے یا مخالف پھر وہ غرض جہاں وہ فوت ہونے لگی کہدیا کہ یہ اس وقت یہ کام مصلحت کے خلاف ہے، لہذا مستحب بھی نہیں رہا اب اس کو اصلاً مامور بہ بھی نہیں سمجھتے بلکہ عجب نہیں کہ ایک دن کسی مصلحت کی وجہ سے مامور بہ کو منہی عنہ بتلانے لگیں افسوس مسلمانوں سے یہ نہیں ہوتا کہ اغراض کو احکام کے تابع بنائیں کہ اصل تو یہی ہے وہ سر انجام پا جائے پھر اغراض خواہ حاصل ہوں یا نہ ہوں مگر افسوس یہ نہیں کرتے بلکہ بعض نے تو اغراض نفسانی کو پورا کرنے کے لئے دعوت الی الاسلام کا نام فتنہ اور فساد رکھا ہے، اور یہی وجہ ہے بے توجہی کی کہ اس میں اپنی اغراض کی وجہ سے بے حد تساہل کرتے ہیں حتیٰ کہ اگر اپنی آنکھ سے بھی دیکھیں کہ کسی نے نماز میں تعدیل ارکان نہیں کی اور ایسے بہت نکلیں گے تو ہماری یہ ہمت نہیں ہوتی کہ اس سے اتنا کہدیں کہ صل فانك لم تصل اور اس کی وجہ صرف اتباع ہوئی ہے

لہ اشارہ ہے پرستاران تحریکات جدیدہ کے معاملات کی طرف ۱۲

اس لئے باوجود علم کے محض رکیک تاویلیں گھڑ لیتے ہیں مگر خدا کے ساتھ یہ حیلہ تزویر
چل نہیں سکتا بل الانسان علیٰ نفسه بصیرة ولو القٰی معاذیرہ ٥ اگر انصاف
سے دیکھو تو معلوم ہوگا کہ اصل میں دنیا کو قبلہ و کعبہ بنا رکھا ہے، امر بالمعروف
نہ کرنے کی وجہ فقط اتنی ہے کہ اس سے دنیوی اغراض فوت ہوتے ہیں دوستی نہیں
رہے گی میل ملاپ نہیں رہے گا ہنسی خوشی جاتی رہے گی اگر ہم نے کسی کو ٹوکا
تو وہ ناخوش ہو جائے گا۔ پھر ناخوش ہو کے آزار کے درپے ہو جاوے گا۔ پھر
آزار سے ہم کو تکلیف ہوگی اور یہ آزار و تکلیف بھی سب وہمی محض ایسے مواقع
کے متعلق و زرا علماء سے تو دریافت کر لو کہ صاحب امر بالمعروف میں اگر ایسی ایسی
باتیں پیش آدیں تو ایسی حالت میں ہم معذور ہیں یا نہیں اُن سے پوچھو تو کہ کون
کون سی چیزیں سقط وجوب امر ہیں میں یہ نہیں کہتا کہ اس کا کوئی طریقہ ہی نہیں
اس کے لئے کوئی شرط و ضابطہ ہی نہیں ہے اور ضرور ہے مگر شرائط و ضوابط
و آداب و اعذار علماء سے دریافت کرو خود مفتی بن کر کیوں فتویٰ لگا لیا کہ ہم
تو معذور ہیں اور سچی بات تو یہ ہے کہ شرائط و آداب کا طالب حقیقی بھی
وہی ہوگا جس نے پکا ارادہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا کر لیا ہو، اس کو
البتہ حق ہے شرائط و ضوابط پوچھنے کا وہ اگر آداب و اعذار معلوم کرے تو
اس کو سب کچھ بتلایا جاوے گا باقی حالت موجودہ میں جبکہ اس کی طرف
توجہ اور التفات ہی نہیں اس حالت میں آپ کو اعذار و شرائط پوچھنے اور
سمجھنے کا بھی کچھ حق نہیں جو شخص کام کا ارادہ ہی نہ کرے، اس کو نہ شرائط
ضوابط بتلائے جائیں گے اور نہ اس کو آداب و اعذار پوچھنے کا کوئی حق ہے
وجہ یہ ہے کہ وہ تو شرائط و اعذار اس لئے تلاش کرے گا تاکہ امر بالمعروف
کرنا نہ پڑے بلکہ کسی طرح اس سے مخلصی اور رہائی مل جاوے جب اعذار معلوم
ہو جائیں گے تو کوئی نہ کوئی بات تراش لیگا کہ مجھ میں یہ یہ عذر موجود ہیں یہ شرطیں
مجھ میں نہیں پائی جاتی ہم کیسے امر بالمعروف کریں اس لئے علماء کو چاہیے کہ

قبل از شروع عمل کسی کو اعذار و شرائط بتلایا ہی نہ کریں جیسے کوئی شخص نماز کا ارادہ ہی نہ رکھتا ہو اور علماء سے پوچھتا ہے کہ نماز کے شرائط کیا ہیں، اس کے اعذار و موانع کیا کیا ہیں ایسے شخص کو شرائط و اعذار نہ بتانا چاہیئے ورنہ وہ تو مسقط صلوٰۃ کو ہر حالت میں تلاش کرے گا ہر وقت اسی دھن میں رہے گا کہ کوئی بات ایسی ہو جس سے نماز پڑھنے سے چھٹی مل جاوے البتہ جس کا ارادہ ہو پڑھنے کا وہ پوچھے تو اس کو بیشک بتلایا جاوے لیکن اگر یہ معلوم ہو جاوے کہ محض مخلصی کا متلاشی ہے تو مفتی کو چاہیئے ایسے شخص کو ہرگز جواب نہ دے بلکہ میرے نزدیک ایسوں کو عذار و موانع کی اطلاع کرنا جائز بھی نہ ہوگا یاد رکھو ہر سائل کو یکساں جواب دینا مناسب نہیں کیونکہ ہر شخص کا حال برابر نہیں۔

مجھے حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ایک جواب بہت پسند آیا ایک دن درس میں یہ حدیث آئی کہ من صلی رکعتین مقبلا علیھما بقلبہ الخ کہ جو شخص ایسی دو رکعت نماز پڑھے جن کی طرف دل سے متوجہ ہو کر حدیث نفس اور وسوسہ خطرہ عمداً بالکل نہ لاوے تو اس کے تمام گناہ معاف ہو جاویں گے ایک طالب علم نے کہا حضرت اس طرح نماز پڑھنا ممکن بھی ہے نماز میں تو خیالات بہت ہی آتے ہیں۔ فرمایا تجھ کو شرم نہ آئی یہ سوال کرتے ہوئے، ارے کبھی اس کا قصد بھی کیا تھا جو محال نظر آیا ہو بس پہلے ہی پوچھنے بیٹھ گئے میاں کبھی ارادہ بھی تو کیا ہوتا۔ خدا کے بندے پہلے کرتے پھر پوچھتے کہ ہم نے کیا تھا مگر نہ ہوا تو واقعی یہ جواب نہایت حکیمانہ و بزرگانہ ہے واقعی جواب محض منطقیانہ نہ ہونا چاہیئے بلکہ حکیمانہ جواب بھی دینا چاہیئے اس سے اثر ہوتا ہے چنانچہ مولانا کے ارشاد سے نفع یہ ہوا کہ سائل کو تنبہ ہوا اپنی غلطی پر اسے ندامت و خجلت ہوئی اس لئے میں کہتا ہوں کہ شرائط علماء سے پوچھنا جائز بھی ہے اور ان کو بتلانے سے بھی انکار نہیں مگر یہ دیکھنا چاہیئے کہ مستفتی کون ہے آیا وہ شخص ہے جو ارادہ رکھتا ہے امر بالمعروف کا جس کو اس کا اہتمام ہے عزم ہے جس کو واقعی یہ حالات

واعذار پیش آویں گے اس کو بیشک ہر حالت کے آداب و اعذار معلوم کرنا چاہیئے کیونکہ اس کو یہ امور پیش آدیں گے یا مستفتی وہ ہے جس کا نہ کبھی ارادہ ہوا امر بالمعروف کا اور نہ آئندہ ہوگا بلکہ ظالم کا یہ قصد ہے کہ عمر بھر کبھی کسی کو کچھ نہ کہوں گا کیونکہ دوسرے کی دل شکنی کروں محض اپنے بچاؤ کے واسطے شرائط معلوم کرتا ہے تاکہ ان کو آڑ بنا وے اس لئے صرف مسقطات کی فہرست جاننا چاہتا ہے تاکہ ہر حالت میں جی کو سمجھا لے ایک تاویل کھے اور ہر حال کے لئے ایک من گھڑت عذر تراش لے، صاحبو امر بالمعروف بھی ایک فرض ہے جیسے اور فرائض ہیں اور کوئی ایسی حالت نہیں جس میں فرائض ساقط ہوسکیں بجز جنون واکراہ وغلبۂ عقل اور خاص خاص اعذار کے باقی کسی حال میں فرائض ساقط نہیں ہوتے اور مغلوب العقل بھی وہی معتبر ہے جس کو شریعت مغلوب العقل تسلیم کرلے، تمہاری من گھڑت تفسیر کا اعتبار نہیں حیرت کی بات ہے کہ ایک قصبہ میں ایک شخص نے اپنی عورت کو طلاق مغلظ دی تھی عدت بھی گذر چکی تھی اس کے بعد ایک مفتی آئے انھوں نے اس کو سمجھایا اور کہا کہ طلاق واقع ہونے کے لئے عقل شرط ہے اور تم تو اس وقت مغلوب العقل تھے بس اس تاویل سے حرام عورت حلال کرلی، اور ان کے نزدیک حلال بھی ہوگئی تو اس طرح جس کا جی چاہے دعوے کردے مغلوب العقل ہونے کا پھر تو سارا جہان مغلوب العقل ہوجائے گا مثلاً امر بالمعروف کرنے میں اصل تو تعلقات شگفتہ نہ رہنے کا خوف تھا مگر تاویل کرلی کہ میں بغض فی اللہ کے سبب ہوش باختہ ہوگیا تھا اس لئے امر بالمعروف نہ کرسکا یا طمع تھی کسی چیز کے ملنے کی مگر وہاں بھی وہی تاویل گھڑلی۔ صاحبو اس سے کچھ نہیں ہوتا ان تاویلات کا جو تمہاری تراشی ہوئی ہیں کچھ اعتبار نہیں تمہارے فتوے سے امر بالمعروف ساقط نہیں ہوسکتا، یہ نہیں کہ جو تمہارا دل چاہے وہی ہوجاوے تمہاری رائے معتبر نہیں بلکہ ضرورت اس کی ہے کہ ؎

بنمائے بصاحب نظرے گوہر خود را
عیسیٰ نتواں گشت بتصدیق خرے چند

کسی صاحب کمال سے پوچھنا چاہیئے اگر وہ کہدے کہ تم معذور ہو تو ٹھیک ہے ورنہ تمہارے خیالات کا یا جہلاء کے کہنے کا کچھ اعتبار نہیں کسی صاحب بصیرت کی شہادت ہونی چاہیئے ورنہ اس طرح تو ہر شخص کوئی نہ کوئی عذر تراش لے گا غرض پہلے ہر شخص قلب کو ٹٹول کر دیکھ لے کہ امر بالمعروف کا قصد ہے یا کہ قصد نہیں محض اس سے رہائی اور مخلصی ہی چاہتا ہے اگر قصد ہو تو وہ بیشک اس کے آداب و اعذار و شرائط سیکھے علماء سے پوچھ کر یا کتاب سے دیکھ کر اس لئے کہ امر بالمعروف کا حکم علی الاطلاق نہیں ہے کہ جس طرح ہوا اندھا دھند دعوت و تبلیغ کردو کہ نہ شرائط کی پروا نہ آداب کی رعایت بلکہ اس کے لئے ضوابط اور طرق مقرر ہیں کیونکہ امر بالمعروف فرضیت میں نماز سے تو بڑھ کر نہیں بلکہ برابر بھی نہیں اور اسی لئے قرآن میں اقامت صلوٰۃ کے بعد امر بالمعروف کا حکم ہے اقم الصلوٰۃ وامر بالمعروف وانہ عن المنکر مگر پھر بھی نماز کے لئے کچھ آداب و اعذار و ضوابط ہیں یہ نہیں کہ جو نماز پڑھنا چاہے اس کے لئے کوئی ضابطہ ہی نہیں نہ وضو کی ضرورت نہ ستر عورت کی نہ قرارت کی نہ پاکی کا خیال نہ استقبال قبلہ کی ضرورت یہ نہیں بلکہ اگر نماز پڑھنا ہے تو اول قرارت سیکھو، ناپاک ہو تو نہاؤ قبلہ کی طرف متوجہ ہو کر کھڑے ہو۔ یہ فرائض ہیں نماز کے کہ بغیر ان کے نماز ہوتی نہیں تو جیسے نماز فرض ہے اور پھر بھی اس کے لئے شرائط وارکان وغیرہ ہیں ایسے ہی امر بالمعروف کے لئے بھی کچھ قواعد و آداب ہیں۔ علماء سے ان آداب وضوابط کو پوچھنا چاہیئے علمائے محققین اس کو بتلادیں گے کہ اس کے لئے کیا شرط ہے اور کیا ضابطہ ہے۔ چنانچہ امر بالمعروف کی ایک قسم اصول کی تبلیغ کرنا ہے اس کے الگ آداب ہیں، ایک فروع کی تبلیغ کرنا ہے اس کے الگ آداب ہیں علماء سب پہلوؤں کو جانتے ہیں ان کا علم تم سے زیادہ محیط

پس اس کا طریق ان سے سیکھو، یہ تھوڑا ہی ہے کہ بس جیسے ہو کر لو نہ کوئی ضابطہ نہ قاعدہ جو ملا اس کو امر بالمعروف اندھا دھند کر دیا گویا ایک لٹھ سا مار دیا، مثلاً کوئی کافر ملا اس سے کہا ابے تو مسلمان ہو جا اس نے جواب میں کہہ لا بے تو کافر ہو جا بس اب کیا تھا لٹھ چل پڑا، صاحبو یہ کوئی معمولی کام نہیں بہت نازک کام ہے اس کے واسطے بڑی بڑی کتابیں لکھی گئیں ان میں اس کے آداب مذکور ہیں یہ بھی ایک مستقل فن ہے اس کو سیکھ کر پھر عمل شروع کرو محقق علماء سے کام کرنے کا طریقہ سیکھو اپنی رائے سے کچھ نہ کرو، اپنی رائے کا شریعت میں کچھ اعتبار نہیں بلکہ اہل علم کو بھی چاہئیے کہ جو کام کریں اپنے سے زیادہ عالم سے پوچھ کر کریں بلکہ ترقی کر کے کہتا ہوں کہ بڑوں کو بھی چاہئیے کہ چھوٹوں سے مشورہ کر لیا کریں (مشورہ کا لفظ میں نے ادب کے لئے استعمال کیا ہے) اگرچہ بڑوں کو اکثر چھوٹوں سے پوچھنے کی ضرورت نہیں ہوتی مگر کبھی چھوٹے کو کوئی بات ایسی معلوم ہوتی ہے جو بڑے کو نہیں ہوتی گو غالب ایسا نہیں ہوتا اکثر تو بڑوں ہی کو زیادہ معلوم ہوتا ہے مگر پھر بھی مشورہ کر لینا چاہیئے اگرچہ ان کا علم زیادہ نہیں لیکن ممکن ہے کہ اون کو کوئی خاص مصلحت معلوم ہو کوئی واقعہ معلوم ہو بلکہ بکثرت واقع ہے کہ واقعات چھوٹے کو زیادہ معلوم ہوتے ہیں بڑوں کو معلوم نہیں ہوتے اور واقعات کی لاعلمی سے ان کے کمال میں کوئی نقصان نہیں آتا۔

دیکھئے ہدہد جیسا کوئی آدمی چھوٹا نہیں اور سلیمان علیہ السلام جیسا کوئی بڑا آدمی نہیں مگر پھر ہدہد حضرت سلیمانؑ سے کہتا ہے احطت بما لم تحط بہ وجئتك من سبا بنبا یقین ہ کہ میں سبا سے ایک خبر لایا ہوں جس کو آپ نہیں جانتے ہیں اس پر سلیمان علیہ السلام نے نکیر نہیں کیا اور نہ اللہ تعالےٰ نے بلکہ اللہ تعالےٰ نے تو اہتمام کے ساتھ اس قصہ کو بیان فرمایا ہے تو معلوم ہوا کہ بڑوں کو کسی واقعہ سے لاعلمی ہونا یہ نقصان

فی الکمال نہیں کیونکہ واقعات امور غیر مقصود ہوتے ہیں ہاں امور مقصودہ یعنی احکام کا علم بڑوں کو زیادہ ہوتا ہے اور اس میں ایک بات اور ہے وہ یہ کہ چاہے چھوٹے کے پاس کچھ علم نہ ہو مگر مشورہ سے کم از کم اتنا فائدہ ہوگا کہ اس سے مزید اطمینان ہو جاوے گا۔

صاحبو! جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم مشورہ لینے کے مامور ہیں وشاورھم فی الامر تو ہم کو تو ضرور مشورہ لینا چاہیے یہ سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے اور ہمارے اکابر کا بھی یہی طرز تھا وجہ یہ کہ مشورہ کرنے سے خواہ وہ چھوٹوں ہی سے ہو بعض دفعہ کوئی کام کی بات نکل آتی ہے اور جب بڑے کو چھوٹے سے مشورہ کرنے کا حکم ہے تو چھوٹے کو تو بطریق اولیٰ بڑوں سے پوچھنا چاہیے پھر جس طرح اپنے اکابر اپنے مقتدا حکم دیں اس طرح کرے یہ طریقہ کام کرنے کا امر بالمعروف کے یہ معنی نہیں کہ بس جو کافر ملے ہاتھ پکڑ کے اسے مسلمان بنانا شروع کر دے بعض دفعہ یہ طرز مضر ہوتا ہے اس لئے اس کا ڈھنگ اور طرز سیکھنا چاہیے اس لئے اللہ تعالیٰ نے یہ قید لگائی ہے ادع الی سبیل ربک بالحکمۃ یعنی حکمت سے بلائیے معلوم ہوا کہ اس میں حکمت کی ضرورت ہے ورنہ مطلق فرماتے بالحکمۃ نہ فرماتے۔

بہرحال اس کے شرائط ضرور ہیں مگر وہ اسی کے لئے ہیں جو کام کرنے کا قصد کرے۔ اب تو دیکھا جاتا ہے کہ لوگ قصد ہی نہیں کرتے اور عوام تو عوام خواص کو بھی ادھر توجہ نہیں اور خواص میں بھی دو قسم کے لوگ ہیں ایک وہ جو مشائخ نہیں ان کی تو کیا شکایت کیونکہ عوام اُن کے زیادہ معتقد نہیں ہوتے ان میں جو مشائخ ہیں اور مقتدائے وقت مانے جاتے ہیں جن کے بہت لوگ معتقد ہیں سب سے زیادہ کوتاہی انہیں میں ہے وہ بس اسی کو کافی سمجھتے ہیں کہ ہاتھ میں تسبیح لیکر بیٹھ جائیں جنت میں پہنچ جاویں گے ان کو کسی کی اصلاح کی کچھ پرواہ نہیں بلکہ اس کو تو شان مشیخت سے اس قدر بعید سمجھتے ہیں کہ اگر کوئی شیخ اس کام کو

شروع کرے تو اس کو مشیخت کے دفتر سے خارج کر کے محض علماء کے دفتر میں داخل سمجھتے ہیں چنانچہ میں ایک دفعہ الٰہ آباد گیا تھا والد صاحب کی بیمار پرسی کے لئے وہاں ایک درویش تھے، والد صاحب ان کے پاس مجھے لے لئے جب درویش نے مجھے دیکھا تو مجھ سے کہا کہ اس آیت کا مطلب بتلاؤ لکل امۃ جعلنا منسکاً ھم ناسکوہ فلا ینازعنك فی الامر میں نے ترجمہ کر دیا تو کہنے لگے دیکھو حق تعالیٰ منع کرتا ہے منازعت سے پھر ہم کسی کو روک ٹوک کیوں کریں موسیٰ بدین خود عیسٰی بدین جو جس کے جی میں آوے کرے ہمیں کسی سے تعرض کرنے کی ضرورت کیا پڑی یہ تفسیر کی انھوں نے اس وقت میرے ذہن میں کوئی تفسیر حاضر نہیں تھی میں نے لفظوں ہی سے ان کو جواب دیا میں نے کہا حق تعالےٰ نے لا ینازعنك فرمایا ہے کہ وہ آپ سے منازعت نہ کریں لا تنازعھم نہیں فرمایا کہ آپ بھی ان کو روک ٹوک نہ کریں بلکہ آپ کے لئے تو خود اس کے متصل ہی امر فرماتے ہیں وادع الی ربك انك لعلی ھدی مستقیم یعنی دو قسم کے لوگ تھے ایک وہ جو باطل پر تھے حق سے ہٹے ہوئے تھے اور ایک وہ جو صراط مستقیم پر تھے تو حق تعالےٰ فرماتے ہیں کہ اہل باطل کو اہل حق سے منازعت کرنے کی اجازت نہیں۔ پس حاصل آیۃ کا یہ ہے کہ آپ صراط مستقیم پر ہیں آپ کو تو حق ہے منازعت صوری یعنی دعوت کا مگر ان کو حق نہیں کہ آپ سے منازعت کریں میں نے کہا کہ اس جگہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تو عدم منازعت کا حکم نہیں بلکہ ان کو حکم ہے کہ آپ سے منازعت نہ کریں۔ پس شاہ صاحب کا ذرا سا منہ نکل آیا اور ان سے کچھ جواب نہ بن پڑا والد صاحب بھی میرے جواب سے بہت خوش ہوئے۔ پھر اس کی لطیف لطیف تفسیریں بھی نظر سے گذریں لیکن یہ تفسیر کسی نے نہیں لکھی، مگر یہ مطلب کسی نص کا معارض بھی نہیں اور بعض نے جو اس آیت کی تفسیر میں لا ینازعنك کا مطلب لا تنازعھم لکھدیا ہے کہ آپ ان سے منازعت نہ کریں یقیناً شاہ صاحب کی اس تفسیر پر نظر نہ

تھی ورنہ وہ ضرور اس کو پلٹش کرتے۔ مگر میں اس وقت یہ جواب دیتا کہ منازعت اور کو ہے دعوت اور ہے اگر منازعت حقیقیہ سے ممانعت ہے دعوت سے تو ممانعت نہیں پس تم منازعت نہ کرو محض دعوت ہی کردیا کرو مگر غضب تو یہ ہے کہ آجکل تو درویش کے یہ معنی سمجھتے ہیں کہ بس کچھ نہ کرے اور کسی کو کچھ نہ کہے بلکہ سب کی ساتھ صلح وکل ہوکر رہے وہ تو درویشی ہے ورنہ نہیں اور اس کے لئے ایک شعر گھڑا ہے اور اس کو حضرت حافظ شیرازی علیہ الرحمۃ کی طرف منسوب کیا ہے اس لئے کہ اس کے اول میں حافظا آگیا ہے اس کے ساتھ دوسرا مقدمہ یہ ملا لیا جائے کہ جس شعر میں حافظ آجائے بس وہ حافظ شیرازی ہی کا ہے مگر یہ محض مہمل دلیل ہے کیا کوئی دوسرا شخص اپنا تخلص حافظ نہیں کرسکتا یا اپنا شعر رائج کرنے کو جعلی طور پر حافظ کا لفظ اپنے شعر میں نہیں بڑھا سکتا۔ پس ہم دعوے سے کہتے ہیں کہ یہ شعر اول تو حافظ کا ہے نہیں اور اگر ہوتا بھی تو چونکہ ہم کو ان سے حسن ظن ہے ہم اس کی تاویل کرتے ہاں جو خشک دماغ ہے وہ تو تاویل نہیں کرے گا بلکہ حافظ پر طعن کرنے لگے گا مگر ہم ایسے بے ادب نہیں پس یہی قاعدہ غلط ہے کہ جس شعر میں لفظ حافظ ہو اس کو حافظ شیرازی کی طرف منسوب کردیا جاوے اسی طرح جو کلام مثنوی کے وزن پر ہو تو اس کو مولانا روم کی طرف منسوب کردیتے ہیں اب سنئے کہ انھوں نے کونسا شعر گھڑا ہے اور اس کو حافظ کی طرف منسوب کیا حالانکہ وہ حافظ کا کسی طرح نہیں ہوسکتا وہ شعر یہ ہے ؎

حافظا گر وصل خواہی صلح کن با خاص وعام

با مسلماں اللہ اللہ با برہمن رام رام

(اے حافظ اگر قرب چاہتے ہو تو تم ہر خاص وعام سے صلح کرو۔ دوستوں سے لطف ومہربانی دشمنوں سے ظاہری مدارات کرلو کہ فراغ دل سے دینی کام میں لگو)

بھلا جس کو ذرا بھی حافظ کی بلاغت وفصاحت کا ذوق ہے وہ تسلیم کرسکتا ہے کہ یہ ان کا

کلام ہے ہرگز نہیں۔ دوسرے حافظ شیرازی رام رام جانتے بھی نہ تھے انھوں نے تو عمر بھر کبھی سنا بھی نہ ہوگا اور بڑی بات یہ ہے کہ حافظ کا دیوان موجود ہے اس میں دیکھ لو اور تماشہ یہ کیا کہ باوجودیکہ دیوان کے اندر تحریفیں بہت ہوئی ہیں مگر یہ شعر تحریف کے بعد بھی اس میں موجود نہیں۔ پس یہ شعر دیوانِ حافظ کا تو ہے نہیں ہاں کسی دیوانہ حافظ کا ہوگا۔ ایک اور شعر بھی ہے جس سے آجکل کے صوفی اپنے مسلک صلح کل پر استدلال کرتے ہیں اور وہ واقعی حافظ کا ہے ؎

مباش درپئے آزار وہرچہ خواہی کن
کہ درشریعت ماغیر ازیں گناہے نیست

کسی کو ایذا رسانی نہ کرو اور جو چاہے وہ کرو کہ ہمارے آئین میں اس کے سوا کوئی گناہ نہیں لیکن ہر گناہ میں ایذا رہے خواہ لازمی یا متعدی پس ہر گناہ سے بچنا بھی ضروری اس شعر سے ثابت ہوا)

اس کو بھی صوفیوں نے اپنا مستدل ٹھہرایا ہے کہ بس کسی کو آزار دینا نہ چاہیئے دل دکھانا اچھا نہیں پھر کیوں کسی کو امر بالمعروف کیا میں کہتا ہوں کیا ایک متکبر کا دل دکھانا بھی منع ہے اگر اس شعر میں ہر آزار کی ممانعت ہے تو پھر ہرچہ خواہی کن کی بھی عام اجازت ہونی چاہیئے پھر کیا ہے بس زنا کی بھی اجازت ہونی چاہیئے چوری کی بھی اور غصب لوٹ مار اور ڈاکہ کی بھی بس جو چاہو کرو سب کی اجازت ہے اگر کہو کہ چوری سے تو آزار ہوتا ہے لہٰذا وہ آزار کی ممانعت میں داخل ہے میں کہتا ہوں زنا میں تو آزار نہیں شاید کہو کہ شوہر اور خاندان کو آزار ہے تو اگر کسی کو کوئی ایسی عورت مل جاوے کہ نہ اس کے خاوند ہے نہ باپ ہے نہ بھائی کوئی نہیں ہے اور وہ خوشی سے یہ فعل کراتی ہے تو یہاں کسی کو آزار نہیں ہے نہ اس کو نہ اور کسی کو تو کیا اس کی اجازت ہے اگر نہیں اور یقیناً نہیں تو پھر اس میں تخصیص کرو گے اور تخصیص کسی دلیل سے کرو گے یا بے دلیل جیسے بھی ہو اگر تم ہرچہ

خواہی کن میں تخصیص کرتے ہو تو ہم یہاں (یعنی آزار میں) بھی تخصیص کریں گے یعنی مطلب یہ ہے کہ کسی کو آزار بقصد آزار نہ دو اور درحقیقت درپے آزار ہونا یہی ہے اور جو شخص آزار بغرض اصلاح دے جیسے طبیب اور ڈاکٹر آپریشن کرتا ہے یا باپ استاد بچہ کو تادیباً مارتا ہے اس کو ہرگز درپے آزار شدن نہیں کہہ سکتے پھر امر بالمعروف کرنے والے سے اگر کسی کو آزار پہونچے بھی تو اس کو درپے آزار کہنا صحیح نہیں لہٰذا وہ اس شعر کا مصداق ہی نہیں پس امر بالمعروف سے رُکنے کے واسطے اس شعر کو آڑ بنانا محض باطل ہے دوسرے یہ کہ مباش درپے آزار میں اگر آزار ایسا ہی عام ہے تو پھر اس میں مخاطب ہی کی کیا خصوصیت ہے کہ صرف مخاطب ہی کو آزار نہ پہونچایا جاوے غائب کو آزار پہنچ جاوے سبحان اللہ بلکہ اس کو بھی عام کہو کہ صاحب آزار کوئی ہو آزار میں تعمیم کر کے صاحب آزار میں کیوں تخصیص کی جاتی ہے بلکہ جیسے آزار میں تعمیم کرتے ہو صاحب آزار میں بھی تعمیم کرو۔ اگر صاحب آزار میں بھی تعمیم کروگے تو پھر کوئی بھی معصیت ایسی نہ ہوگی جس سے کسی نہ کسی کو تکلیف نہ ہو ایسا کوئی امر نہ نکلے گا جو کسی نہ کسی کے لئے سبب آزار نہ ہو شاید آپ سوچتے ہوں گے کہ ہمارے گناہوں سے کس کو آزار پہونچتا ہے تو آپ ایک حکایت سے اس کا اندازہ کرلیجئے مرزا بیدل شاعر کی حکایت ہے کہ ان کے اشعار تصوف کا رنگ لئے ہوتے تھے کسی ایرانی نے ان کے اشعار کو دیکھ کر پسند کیا اور ان کو بزرگ سمجھ کر ان کے پاس آیا جب ان کے پاس پہونچا تو یہ حجام سے ڈاڑھی منڈا رہے تھے اس کو یہ دیکھ کر غصہ آگیا اور جھلا کر اس نے پوچھا آغا ریش میتراشی شاعر نے جواب دیا آرے ریش میتراشم ولے دِل کسے نمی خراشم وہ بیچارہ مخلص تھا اس نے آزادانہ جواب دیا آرے دل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میخراشی۔ مخلص تو درپے مصلحت کے نہیں ہوتا اس کی بڑی مصلحت تو یہ ہے کہ

مصلحت دید من آنست کہ یاراں ہمہ کار
بگذارند و خم طرۂ یارے گیرند

(عشق کی مصلحت کا تقاضہ یہ ہے کہ یار لوگ سب کام چھوڑ کر محبوب کے قرب کو لازم کر لیں)

شاعر نے تصوف مزعوم کے اعتبار سے اور اس عرفی تصوف کے طور پر جواب دیا تھا کہ دل کسے نمی خراشم ایرانی نے جواب دیا کہ ظالم تو تو سب سے بڑے دل کو چھیل رہا ہے اور دعوٰی کرتا ہے کہ دل کسے نمیخراشم بلے دل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میخراشی تم یہ ڈاڑھی پر استرہ نہیں پھرا رہے ہو بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دل پر چھری چلا رہے ہو۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں جب اعمال پیش ہوتے ہیں اور آپ کو معلوم ہوتا ہے کہ میری امت کا ایک شخص یہ حرکت کرتا ہے کیا اس سے آپ کا دل نہیں دکھتا اور کیا آپ کا دل دکھانا چھوٹی بات نہیں ہے آپ کا قلب تو سید القلوب ہے جب تم سید القلوب کو تکلیف دیتے ہو پھر یہ دعوٰی کیسے کرتے ہو کہ ہم کسی کا دل نہیں دکھاتے ہیں، ارے تم درپئے آزار تو ہو گئے یہ سنکر مرزا کی آنکھ کھلی اور چیخ مار کر بے ہوش ہو گیا ہوش میں آیا تو توبہ کی اور بزبان حال یا قال یہ کہتا تھا ؎

جزاک اللہ کہ چشمم باز کردی
مرا با جان جاں ہمراز کردی

(آپ کو اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے کہ آپ نے میری آنکھیں کھول دیں اور مجھ کو محبوب سے ہمراز کر دیا)

یعنی میں تو اندھا تھا میری کبھی ادھر نظر ہی نہیں گئی کہ مجھ سے اتنے بڑے قلب کو ایذاء ہو رہی ہے یہاں تک میرے ذہن کی رسائی ہی نہیں ہوئی تو نے میری آنکھیں کھول دیں خدا تجھ کو اس کی جزا دے۔ اب اس حکایت سے سمجھ لیجئے کہ جب آپ سے کوئی امر غیر مشروع سرزد ہو گا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس سے آزار ہو گا یا نہیں اس لئے ترک احکام شرعیہ کے لئے اس کو آڑ بنانا اور یہ کہنا کہ مباش درپئے آزار و ہرچہ خواہی کن بالکل واہیات ہے۔ پھر بڑی

بات یہ ہے کہ سنار کی کھٹ کھٹ لوہار کی ایک ہم تمہیں ہر ہر بات کا کہاں تک جواب دیں تم نے ایک بات نکالی ہم نے اس کا جواب دیا دوسری نکالی اس کا دیا آخر یہ سلسلہ کہاں تک رہے گا۔ سیدھا جواب یہ ہے کہ نصوص کے مقابلہ میں سب اشعار ہیچ ہیں۔ بس ہم تو یہ جانتے ہیں کہ یہ خدا رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کا حکم ہے۔ اس کے سامنے کہاں کی مصلحت کہاں کی حکمت۔ نصوص کے اندر امر بالمعروف کا حکم موجود ہے اور نہ کرنے پر نکیر ہے ہم تو یہ جانتے ہیں بس اس کو کرو البتہ شرائط و احکام کے ساتھ کرو اندھا دھند لسٹم پسٹم مت کرو۔ فقہاء نے اس کی ایک مستقل بحث لکھدی ہے اس کے قوانین و ضوابط کو مدون کر دیا ہے اس کو سیکھو علماء سے پوچھو وہ تم کو راستہ بتا دیں گے اور اس قسم کے اشعار سے نصوص کا مقابلہ نہ کرو اور جو کوئی جاہل نصوص کا مقابلہ ان اشعار سے کرے اس کو ڈانٹ دینا چاہیئے حدیث میں ہے کہ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک جنین کی دیت میں غرہ عبد یا امۃ کا حکم دیا تھا۔ مدعا علیہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے یہ کہا کیف اغرم من لا شرب ولا اکل ولا نطق ولا استھل ومثل ذلک یطل یعنی ایسے بچہ کی کیا دیت جس نے نہ کھایا نہ پیا اور نہ بولا نہ چلایا اور ایسا معاملہ تو یوں ہی نظر کر دیا جاتا ہے آپ نے فرمایا اسجع کسجع الکھان کیا واہیات ہے کاہنوں جیسی مسجع مقفی عبارت سے شریعت کا مقابلہ کرتے ہو۔ غرض حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو ڈانٹ دیا تو بعض جگہ اس کی بھی ضرورت ہے کہیں حاکمانہ جواب مناسب ہوتا ہے اور کہیں حکیمانہ سب کو ایک لکڑی سے نہیں ہانکا جاتا عوام اسی سے بگڑ گئے علماء کے حکیمانہ جواب ہی سے ان کا حوصلہ بڑھ گیا حتیٰ کہ اب ہر بات کی علل و اسرار پوچھنے کی جرات ہو گئی۔

ایک شخص نے حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا تھا کہ اس کی کیا وجہ ہے کہ حائض سے نماز تو ساقط ہو گئی اور روزہ

کی قضا لازم۔ جواب دیا کہ وجہ یہ ہے کہ اگر ایسا نہ کرو گے تو اتنے جوتے سر پر پڑیں گے سر پر بال بھی نہ رہیں گے اس جواب کی یہ وجہ نہ تھی کہ مولانا کو حکمت معلوم نہ تھی بلکہ اس کے لئے یہی جواب مناسب تھا کیونکہ مابہ الفرق سمجھنے کی لیاقت اس میں نہیں تھی۔ چنانچہ اسی سوال کو دوسرے ایک فہیم نے دوسری مجلس میں پوچھا تو آپ نے اس کو مفصلاً بیان کر دیا۔ تو ہر مخاطب کا مذاق جُدا ہے ہر ایک کی حالت جُدی ہے اس کے رتبے کے موافق جواب دینا چاہیئے۔

میرے پاس ایک سب انسپکٹر کا خط آیا کہ کافر سے سود لینا کیوں حرام ہے وہ اس کی علت دریافت کرنا چاہتے تھے میں نے جواب میں لکھا کہ کافر عورت سے زنا کرنا کیوں حرام ہے۔ پھر انھوں نے لکھا کہ علماء کو ایسا خشک نہ ہونا چاہیئے۔ میں نے دل میں جواب دیا کہ جہلاء کو اتنا تر نہ ہونا چاہیئے کہ ڈوب ہی جاویں اس کے بعد ایک جگہ وہ مجھ سے ملے اور اپنا پتہ بتلایا کہ میں وہی ہوں جس کا ایسا ایسا خط گیا تھا اور تم نے یہ جواب دیا تھا جب سارا قصہ بیان کیا تو میں نے پہچان لیا اور کہا ماشاء اللہ آپ سے تو بڑا پُرانا یارانہ ہے پھر مجھ سے انھوں نے کہا کہ آپ نے یہ خشک جواب کیوں دیا تھا میں نے کہا انصاف سے بتلایئے آپ سب انسپکٹر ہیں مگر پھر بھی کیا آپ کے تعلقات و معاملات سب کے ساتھ یکساں ہیں یا کسی سے خصوصیت ہے اور کسی سے نہیں ہے کیا آپ سب کے ساتھ یکساں برتاؤ کرتے ہیں یا مخصوصین کے ساتھ خصوصیت کے برتاؤ سے پیش آتے ہیں اور غیر مخصوصین کے ساتھ ضابطہ کے برتاؤ سے کہا سب سے یکساں برتاؤ کیسے ہوسکتا ہے فرق ضرور ہے۔ میں نے کہا ہمارے یہاں بھی ایسا ہی ہے جن سے خصوصیت ہے ان سے خصوصیت کا برتاؤ ہے اور جن سے نہیں ہے ان سے ضابطہ کا مگر اب سے ایسا برتاؤ آپ کے ساتھ نہیں کیا جاوے گا کیونکہ

اب تعارف ہو گیا ہے پھر میں نے یہ خیال کیا کہ ذرا ان کو بھی تو باندھنا چاہیئے ایسا نہ ہو کہ آئندہ آپ دل کھول کر ہر بات کے حکم اور علل پوچھنے لگیں تو میں نے کہا اس ملاقات کا جیسا مجھ پر اثر ہوا ہے کہ میں آئندہ ایسا برتاؤ نہیں کروں گا ایسا ہی اس کا آپ پر بھی یہ اثر ہوگا کہ آپ بھی آئندہ ایسی اینڈی بینڈی باتیں نہ پوچھیں گے ایسا ہی ایک اور شخص کا خط میرے پاس آیا کہ فلاں حکم میں کیا حکمت ہے میں نے لکھا کہ سوال عن الحکمت میں کیا حکمت ہے خدا کے حکم کی حکمت تو ممکن ہے کہ بندہ کو معلوم نہ ہو مگر سوال تو تمہارا فعل ہے تم کو اپنے فعل کی حکمت ضروری ہی معلوم ہے مہربانی کر کے ذرا بتلاؤ تو سہی میں نے یہ خیال کیا تھا کہ اگر وہ سوال عن الحکمۃ کی کچھ حکمت بتلا دیں گے تو میں اس کو باطل کر دوں گا، غرض کبھی اس قسم کے بھی جواب دینا چاہئیں، علماء نے عوام کا حوصلہ بڑھا دیا ہے نرم جواب دے دے کر ایک اور شخص نے ایک سوال کیا تھا میں نے کہا اس کا جواب تمہاری سمجھ میں نہیں آویگا تو کہتے ہیں کہ سمجھ میں آئے یا نہ آئے آپ کہیئے میں نے کہا میرا دماغ مفت کا نہیں مگر وہ بڑا ہی ہٹی تھا کسی طرح سے ٹلا ہی نہیں جب بہت ہی تنگ کیا تو میں نے کہا کہ ایک طالب علم کو بلا لو میں اس کے سامنے تقریر کر دوں گا اس میں دو فائدہ ہیں ایک تو یہ کہ ہم طلبہ کے متعلق جو آپ لوگوں کا خیال ہے کہ یہ لوگ ایسے سوالوں کا جواب نہیں دے سکتے اس کا غلط ہونا معلوم ہو جاوے گا۔ گو ہم کسی مصلحت سے جواب نہ دیں اور میں نے یہ شعر پڑھا ؎

مصلحت نیست کہ از پردہ برون افتد راز

ورنہ در مجلس رنداں خبرے نیست کہ نیست

(مصلحت نہیں ہے کہ پردہ سے راز فاش ہو جائے ورنہ عاشقانِ حق کو معارف وحقائق راہ کی پوری خبر ہے)

یعنی یہ سب کچھ جانتے ہیں مگر نا اہل ناجنس پر ظاہر نہیں کرتے ہیں۔ دوسرا فائدہ یہ ہے

کہ تم دیکھ لو گے کہ تم اس تقریر کو نہیں سمجھ سکتے اور جب نہیں سمجھ سکتے تو تم سے خطاب کرنا موت ہے، میری زبان ہی نہیں چلے گی کیونکہ ؎

فہم سخن تا نکند مستمع ۔ قوت طبع از متکلم مجو

(بات سمجھنے کی سعی اگر سننے والا نہ کرے تو متکلم سے جوش تکلم کی تمنا عبث ہے)

اگر جہلاء کو اس طرح حاکمانہ جواب دیا جاوے تو ان کی جرأت نہ بڑھے گی۔ میں ایک دفعہ سہارنپور گیا تو ایک شخص نے وہاں بہشتی زیور کا ایک باریک مسئلہ حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سے پوچھا تھا۔ مولانا نے اپنے حسن اخلاق سے اس کو سمجھا دیا تھا مگر وہی مرغی کی ایک ٹانگ ان کی سمجھ میں کہاں آنا تھا کیونکہ سمجھنا مطلوب ہی نہ تھا۔ جب میں گیا تو وہ سمجھے کہ یہ تو مؤلف ہی آگیا ان سے پوچھنا چاہیئے۔ چنانچہ میرے پاس بھی آئے پہلے آن کے تو زور سے کہا السلام علیکم سلام ہی سے خشونت اور اکھڑپن ٹپکتا تھا پھر کہنے لگے کہ یہ عبارت ہے بہشتی زیور کی ذرا اس کو دیکھ لیجئے میں نے کہا کہ میں نے تو سب دیکھ ہی کے لکھا ہے آپ کہئے کیا کہنا ہے۔ کہا یہ سمجھ میں نہیں آیا میں نے کہا مطلب نہیں سمجھے یا علت نہیں سمجھے مطلب تو ظاہر ہے اردو میں سہل کر کے لکھا گیا ہے کہا جی علت نہیں سمجھا کہ اس کی علت کیا ہے۔ میں نے کہا آپ کو کچھ اور بھی مسائل یاد ہیں، کہا جی ہاں بہت میں نے کہا کیا اُن سب کی علت کو آپ نے معلوم کر لیا ہے۔ یا بہت سے ایسے بھی ہیں جن کی علت اور حکمت معلوم نہیں۔ اگر سب کی علت معلوم ہو چکی تو مجھے اجازت دیجئے کہ دو چار کی میں بھی علت دریافت کروں کہا ہاں غیر معلوم العلت بھی بہت سے ہیں میں نے کہا پھر اسے بھی اُسی فہرست میں داخل کر لیجئے۔ اس جواب سے وہ ناراض تو بہت ہوئے مگر بولے کچھ نہیں بس کتاب بغل میں دبا جلدی سے اُٹھ گئے۔

مولانا نے فرمایا کہ تم نے تو بڑی جلدی ساکت کر دیا میں نے کہا حضرت میں آپ کی طرح خلیق نہیں کہ ایک کوڑ مغز کے ساتھ چار گھنٹے مغز ماروں۔ اخیر میں

برا خفش کی طرح وہ کہے میں نہیں سمجھا اور پھر میں تقریر کروں قصہ برا خفش کا طالب علموں میں یہ مشہور ہے کہ وہ اپنے بکرے سے سبق کا تکرار کیا کرتے تقریر ختم کرنے کے بعد اس سے پوچھتے کہ سمجھا اور اس کو یہ تعلیم کر رکھا تھا کہ وہ نفی کے طور پر سر ہلا دیتا یہ پھر تقریر شروع کرتے ایسے ہی مکرر سہ کرر تقریر کرتے تو مجھ سے اخفش نہیں بنا جاتا اس کے بعد ادر ایک جنٹلمین صاحب آئے وہ بھی اسی علت میں مبتلا تھے مہذب عنوان سے کہنے لگے کہ حضرت جب لوگ علماء کی شان میں گستاخی کرتے ہیں تو ہم کو برا معلوم ہوتا ہے بہت رنج ہو جاتا ہے، چنانچہ اس مسئلہ میں جہلا اعتراض کرتے ہیں جو ناگوار ہوتا ہے اس لئے اگر آپ اجازت دیں تو میں ایک چھوٹا سا جلسہ جمع کر دوں آپ اس میں اُن چند مسائل کی تقریر کر دیں۔ میں نے کہا میں آپ کی محبت کا نہایت ممنون ہوں مگر عقلی قاعدہ ہے کہ الاہم فالاہم جو کام سب سے اہم ہو پہلے اس کے اہتمام کرنا چاہیے یہ آپ کو مسلم ہے یا نہیں کہا ضرور مسلم ہے کیونکہ یہ مقدمہ تو عقل کے موافق تھا اس کو بغیر تسلیم کئے تو چارہ ہی نہ تھا ان لوگوں کو عقلیات سارے مسلم ہیں بس نقلیات ہی میں کلام ہے۔ میں نے کہا جو لوگ علماء کو بُرا بھلا کہتے ہیں واقعی وہ گستاخی کرتے ہیں سو ایک تو یہ طبقہ ہے جو علماء کی شان میں گستاخی کرتا ہے مگر اس سے بڑھ کے ایک طبقہ وہ ہے جو ائمہ مجتہدین کی شان میں گستاخی کرتا ہے وہ ان سے بدتر ہے اور ایک وہ طبقہ ہے جو صحابہ پر طعن کرتا ہے وہ ان سے بھی گستاخ تر ہے۔ ان سے بڑھ کر ایک وہ فرقہ ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کرتا ہے اور سب سے بدتر وہ گروہ ہے جو اللہ تعالیٰ کو شب وشتم کرتا ہے تو ترتیب سے کام کرنا چاہیئے۔ آپ اول ان لوگوں کی اصلاح کا انتظام کر دیجئے جو اللہ کی شان میں گستاخی کرتے ہیں، پھر ان کی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں بے ادبی کرتے ہیں۔ پھر ان کی جو صحابہ کو نہیں چھوڑتے پھر ان کی جو ائمہ کو بُرا بھلا کہتے ہیں جب ان سب کا انتظام ہو جاوے گا آخر میں یہ جماعت علماء کی شان میں گستاخی کرنے والی رہے گی اس کا انتظام میں کر دوں گا۔

اب وہ چپ کیا جواب دیں جب دیکھا کہ اس طرح کام نہ چلا تو گفتگو کا طرز بدلا اور کہا یہ تو سمجھ میں آگیا کہ اس وقت ان کی اصلاح کی ضرورت تو نہیں لیکن اگر کر دی جاوے تو ضرر ہی کیا ہے میں نے کہا کچھ ضرر نہیں کہنے لگے پھر ایسا کر دیجیے میں نے کہا یہ مشورہ ہے یا حکم ہے اگر حکم ہے تو آپ کو حکومت کا کوئی حق نہیں میں آپ کا کوئی محکوم نہیں نوکر نہیں آپ کا شاگرد نہیں، مرید نہیں اور اگر مشورہ ہے تو مشورہ میں مخاطب کے ماننے کا انتظار نہیں ہوتا آپ اپنے فرض منصبی سے فارغ ہو چکے آگے ہمارا کام ہے ہماری جو سمجھ میں آوے گا کریں گے آپ کی کچہری کا وقت آگیا ہے تشریف لیجائیے غرض یہ بھی چلے گئے۔ تمام دن یہی قصہ رہا مگر میں نے کسی کو ایک منٹ میں ختم کیا کسی کو دو منٹ میں اور پہلے ایک ہی آدمی نے کئی دن سے اکابر کو تنگ کر رکھا تھا غرض یہ کہ ہر سائل کیسا تھ نہ تو مطلقاً خشکی برتے اور نہ ہر جگہ خلیق بنے اصلاح اسی طرح ہوتی ہے۔ اسی واسطے میں کہتا ہوں کہ اول تو حقیقت ظاہر کرو اور اگر نہ سمجھے تو آخر میں کہدو کہ بس جاؤ یہ خدا کا حکم ہے خدا کے حکم کے مقابلہ میں ہم تمہاری واہیات خرافات کو نہیں مانتے ہیں اسی کے مناسب ایک اور حکایت ہے کہ۔

مولانا محمد یعقوب صاحب ایک بار ایک دعوت کے جلسہ میں رڑکی تشریف رکھتے تھے اس جلسہ میں ایک عالی صوفی صاحب سماع جوازِ سماع کے دلائل بیان کر رہے تھے مولانا کی وضع سادی تھی اس لئے وضع سے کسی نے یہ نہیں پہچانا کہ یہ کوئی عالم یا بزرگ ہیں۔ اس صوفی نے دلیل جواز سمع میں مولانا رومی کا یہ شعر پیش کیا ؎

بشنو از نے چوں حکایت میکند
وز جدا ئیہا شکایت میکند

(جس طرح بانسری اپنے مرکز سے جدائی کا غم رو رہی ہے اور اپنی جدائی کی شکایت کر رہی ہے تم بھی اپنے مرکز آخرت کو یاد کرو (بانسری سننا حرام ہے) صرف نصیحت کیلئے یہ مثال ہے۔

اور کہا کہ اس میں لشنوا امر ہے اور امر وجوب کے لئے ہے اس کا حقیقی جواب تو یہ تھا کہ بیشک امر سے وجوب ثابت ہوتا ہے مگر کس کے امر سے مولانا کے امر سے یا اللہ تعالیٰ کے امر سے مگر یہ جہلا لوگ تو اس کو کچھ نہ سمجھتے بس ان کو تو اڑتی ہوئی ایک بات ہاتھ لگ گئی کہ امر وجوب کے لئے ہے وہ جہلا ران باتوں کو کیا جانیں کہ امر کے اقسام کتنے ہیں۔ اس لئے مولانا محمد یعقوب صاحب نے فرمایا کہ مولانا رومی کا قول تو جب حجت ہو کہ پہلے خود ان کا حجت ہونا ثابت کیا جاوے سو سب سے پہلے تو تم ان کا مسلمان ہونا ثابت کرو۔ پس اس جواب سے ان پر تو مٹی پڑ گئی اور سارے دلائل گاؤ خورد ہو گئے غرض ہر جگہ جواب کا مختلف طریقہ ہے کہیں نرمی کا جواب اچھا ہے کہیں سختی کا اور کہیں جوتہ کا جواب بہتر ہوتا ہے۔ مولانا ہی کا شعر ہے ؎

الوعظ ینفع لو باالعلم والحکم

والسیف ابلغ وعاظ علی القمم

(وعظ نفع دیتا ہے علم اور حکمت سے اور تلوار نہایت زبردست وعظ ہے سرکشوں کو)

اور فرمایا کرتے کہ اللہ تعالیٰ نے جہاں چار کتابیں نازل فرمائی ہیں وہاں ایک پانچویں کتاب حدید بھی اتاری ہے۔ چنانچہ ارسل مرسل وانزل کتب کے بعد ارشاد ہے وانزلنا الحدید فیہ باس شدید فرمایا کہ اس میں حدید سے مراد تعلدار جوتا ہے کہ اس سے دماغ روشن ہو جاتا ہے۔ حضرت عمرؓ کا مقولہ ہے یزع السنان اکثر مما ینزع القران یعنی بعض قرآن کی نصیحت اتنا نہیں روکتی جتنا ایک نیزہ کی نوک روک دیتی ہے خلاصہ یہ ہے کہ اول دلائل بیان کرو اگر ان دلائل کو نہ مانے تو صاف جواب دو کہ یہ خدا کا حکم ہے احکام الٰہی کے سامنے کوئی چیز حجت نہیں اس لئے یہ اشعار بھی کچھ حجت نہیں ہیں غرض امر بالمعروف یقیناً واجب ہے اور دیکھا جاتا ہے کہ اس طرف توجہ بالکل نہیں اور یہ ایک بڑی کوتاہی ہے اسی کوتاہی کو رفع کرنے کے لئے یہ مضمون اختیار کیا گیا ہے تاکہ معلوم ہو جاوے کہ نماز اور روزہ کی طرح یہ بھی فرض ہے البتہ مختلف اوقات میں اس کے طرق مختلف ہیں مثلاً اس وقت آپ لوگوں کا پڑھنا

بھی تبلیغ ہے اگر نیت اچھی ہے کیونکہ انما الاعمال بالنیات اگر آپ کی نیت میں یہ ہو کہ پڑھنے سے فارغ ہو کر امر بالمعروف کروں گا تو یہ پڑھنا بھی شعبہ تبلیغ ہی کا ہے اگر یہ نیت نہ ہو تو پھر تبلیغ نہیں دیکھو اگر کوئی شخص نماز کی نیت نہ کرے تو نماز نہیں ہوتی ایسا ہی روزہ ہے اگر نیت نہ کرے اور دن بھر فاقہ کرے تو روزہ نہیں ہوتا غضب کی بات ہے کہ ہم رات دن پڑھتے پڑھاتے ہیں مگر اعمال وطاعات کی نیت نہ کرنے کی وجہ سے ثواب سے محروم ہیں، غرض اچھی نیت سے اس وقت یہی کتابیں پڑھنا بیشک اصل تبلیغ ہے اور میں نے اس وقت کی قید اس لئے لگائی کہ پہلے زمانہ میں صحابہ وتابعین کو تدریس متعارف کی کوئی حاجت نہیں تھی ان کا تو بغیر اس کے کام چلتا تھا کیونکہ حافظے اور اذہان کافی تھے اور تدین بھی تھا اور اس وقت اس کی ضرورت اس لئے ہے کہ اگر کتابیں مدون نہ ہوں اور آجکل لوگوں کا نہ حافظ ویسا ہے نہ ویسا تدین ہے نہ ان کے قول پر ان جیسا وثوق ہے پھر زبانی کوئی مضمون حدیث وفقہ کا بیان کیا جاتا تو سامعین کو ہرگز تسلی نہ ہوتی اور خیال ہوتا کہ نہیں معلوم یہ کچھ کہتے ہیں ٹھیک بھی ہے یا یوں ہی الٹ پلٹ ہانک رہے ہیں اگر کتابیں مدون نہ ہوتیں تو بڑا خلط مبحث ہوتا دین میں بڑا فساد پھیلتا خدا کا بڑا احسان ہے کہ اپنی عنایت ورحمت سے اس نے کتابیں مدون کرا دیں۔ مدرسے قائم کرا دیئے اس کے سامان مہیا دئے منجملہ ان سامانوں کے ایک یہ ہے کہ مدرسہ کے لئے چندہ بھی کیا جاوے مگر شرط یہ ہے کہ طیب خاطر سے ہو اور جب ان چیزوں کی ضرورت ثابت ہو گی کہ بغیر ان کے کام نہیں چلتا چنانچہ اگر کتابیں نہ ہوں تو سلف کی باتیں ہم تک پہنچنے کی کوئی صورت نہیں اور بغیر مدارس قائم کئے تعلیم کتب ممکن نہیں لہذا یہ بدعت نہیں ہے بلکہ سنت ہے کیونکہ اس درس تدریس سے بھی مقصود تبلیغ ہی ہے خواہ بلاواسطہ یا بالواسطہ چنانچہ بلاواسطہ تو تبلیغ مخاطب اول کو ہے یعنی طلبہ کو اور بالواسطہ مخاطب ثانی کو یعنی عوام کو سو یہ درس وتدریس تبلیغ کا اتنا بڑا فرد ہے مگر ہم نیت تبلیغ نہ کرنے سے

اس کے ثواب سے محروم ہیں انما الاعمال بالنیات سے معلوم ہوتا ہے نیت نہ کرنے سے اعمال کا ثواب نہیں ملتا گو عمل متحقق ہو جاوے اور بعض اعمال تو بلا نیت متحقق ہی نہیں ہوتے کیونکہ اعمال دو قسم کے ہیں بعض اعمال تو ایسے ہیں کہ ان کا تحقق بھی بلا نیت نہیں ہوتا اور بعض ایسے ہیں کہ ان کا تحقق تو ہو جاتا ہے مگر ثواب نہیں ہوتا جیسے پڑھنا پڑھانا کہ اس کا تحقق بلا نیت بھی ہو جاتا ہے مگر ثواب نہیں ملتا بخلاف نماز روزہ کے کہ ان کا تحقق ہی بلا نیت نہیں ہوتا۔ چاہے یوں جہل سے کوئی کہہ لے کہ ہمارے یہاں تحقق نماز بدون نیت کے بھی ہو جاتا ہے جیسے کسی نے مولانا محمد یعقوب صاحب سے دو میاں بی بی کے نکاح کے متعلق مسئلہ پوچھا کہ ان کا یہ رشتہ ہے ان میں نکاح ہو جاوے گا یا نہیں مولانا نے فرمایا نہیں ہو سکتا، تو وہ کیا کہتا ہے کہ ہم نے تو کیا تھا ہو گیا تھا اور جیسے ایک گنوار بے وضو نماز پڑھا کرتا تھا کسی واعظ سے سنا کہ بلا وضو نماز نہیں ہوتی تو وہ کہتا ہے کہ بارہا کر دیم وشد اسی طرح اس گنوار نے سمجھا کہ بس ایجاب و قبول ہو گیا تو نکاح ہو گیا حالانکہ رفع موانع شرائط تحقق سے ہے مگر بعض اعمال بغیر نیت کے بھی ہو جاتے ہیں مگر اجر نہیں ہوتا جیسے تعلیم و تعلم سو ہم لوگوں کا کتنا بڑا حرمان ہے کہ چوبیس گھنٹے ہم اس میں مشغول مگر نیت نہ ہونے سے ثواب سے محروم رہا یہ شبہ کہ اگر نیت بھی دین کی اور تبلیغ کی ہوتی تب بھی ثواب نہ ملتا کیونکہ اسکی ساتھ تنخواہ کی بھی تو نیت ہے اور یہ دنیا ہے تو نیت تبلیغ کے بعد بھی ثواب کہاں ہوتا۔ کیونکہ خالص تبلیغ ہی کی تو نیت نہیں بلکہ مدرسین کو تو تنخواہ بھی مطلوب ہے۔ جواب یہ ہے کہ اس میں تفصیل ہے ایک تو وہ تنخواہ لینے والا ہے جس کو مقصود اصلی صرف نوکری اور تنخواہ ہے اور ایک وہ جو تنخواہ نفقہ کے طور پر لیتا ہے جیسے قاضی بیت المال سے تنخواہ لیتا ہے اور اصل مقصود اس کا خدمتِ دین ہے ان دونوں میں فرق ہے اور وہ فرق یہ ہے کہ جس کو مقصود بالذات دنیا تھی اس کو ثواب نہیں ملے گا اور جس کو مقصود بالذات دین ہے

مگر رو پیہ گذر اوقات کے لئے لیتا ہے اس کو ثواب ملے گا اگر یہ شبہ ہو کہ جب دین کے ساتھ دنیا کا بھی خیال ہے تو مجموعہ تو دنیا ہی ہوا کیونکہ مرکب دین و دنیا سے دنیا ہے کیونکہ نتیجہ تالع اخس کا ہوتا ہے جواب یہ ہے کہ جس کو تنخواہ مدنظر نہیں صرف گذر اوقات کے لئے لیتا ہے اس کا مقصود تنخواہ کو کہا ہی نہ جاوے گا خواہ بلا شرط ہو یا بالشرط ورنہ قاضی مفتی بلکہ خلفا راشدین کسی کو بھی ثواب نہ ملتا اب اس کی علامت کیا ہے کہ اس شخص کو مقصود صرف دین ہے اور تنخواہ صرف رفع حاجت کے لئے سو اس کی علامت کیا ہے کہ اس شخص کو مقصود صرف دین ہے اور تنخواہ صرف رفع حاجت کے لئے سو اس کی علامت یہ ہے کہ جس کو تنخواہ ملتی ہے اس کی دو حالتیں ہیں ایک حالت تو یہ ہے کہ جتنی تنخواہ اس کو ملتی ہے وہ اس کے نان ونفقہ کو کافی نہیں اس حالت میں تو دوسری کوئی بڑی نوکری تلاش کرنا اس کے لئے یہ علامت قصد دنیا کی نہیں لیکن اگر وہ رفع حوائج کے لئے کافی ہے معاش میں کوئی تنگی نہیں ہے اور پھر بھی اس کو بڑی ملازمت کی تلاش ہے کہ اگر دوسری جگہ تنخواہ زیادہ ملے تو فوراً چلا جاوے اور اس وقت محض ترقی ہی کی وجہ سے جاتا ہے یہ تو علامت اس کی ہے کہ اس کو دین مقصود نہیں دنیا مقصود ہے۔ اور دوسری حالت یہ ہے کہ کفایت کی صورت میں دوسری جگہ کی تلاش نہ ہو اور ملے بھی تو نہ جاوے یہ علامت ہے کہ دین مقصود ہے۔ ہاں یہ بھی دیکھا جاویگا کہ اس شخص سے دونوں جگہ دین کا نفع برابر ہے یا دوسری جگہ زیادہ ہے اگر اس سے دوسری جگہ کو ترجیح ہے تو اور بات ہے بشرطیکہ قصد دین کا ہو ورنہ اگر دوسری جگہ کو نفع دینی زیادہ ہو مگر مقصود اس کا یہ نہیں بلکہ مقصود تو ہے ترقی دنیا اور نفع دینی کو آڑ بناتا ہے تو اس شخص کی نسبت کہا جاوے گا کہ یہ ملازمت محض دنیا کے لئے کرتا ہے دین کے لئے نہیں کرتا۔ دین کے لئے ملازمت وہ ہے جس میں عزم دین کا ہو اس کو ہر شخص دل میں ٹٹول کر دیکھ لے حق تعالیٰ کے ساتھ معاملہ ہے محض منطقی نیت سے کام نہیں چلتا۔

جیسے ایک دفعہ کانپور میں میں مسافرانہ طور سے گیا ہوا تھا اور دوسری جگہ جانے کو تیار ٹکٹ لینے کے لئے آگے آدمی کو بھیجدیا اور خود عشا پڑھ کر جانے کو تھا عشا کی امامت کے لئے مجھ سے کہا گیا میں نے کہا کہ اگر کوئی مقیم پڑھا دے تو بہتر ہے۔ شاید بعض مقتدی امامت مسافر کے مسائل سے ناواقف ہوں۔ تو ایک صاحب فرماتے ہیں کہ تم اقامت کی نیت کر کے پوری نماز پڑھا دو تو ظاہر ہے کہ وہ نیت لفظی یا خیالی نیت ہوتی حقیقی نیت نہ ہوتی غرض محض تصور سے کچھ نہیں ہوتا کیونکہ تصور نیت نیت نہیں جیسا تصور کفر کفر نہیں بلکہ عزم کفر کفر ہے اسی طرح تصور ریا، ریا نہیں بلکہ عزم ریا ریا ہے۔ بہرحال مقصود کو دیکھنا چاہیئے اور ہر شخص اپنے وجدان کو دیکھے کہ اس وقت جہاں تنخواہ پر کام کر رہا ہے اگر دوسری جگہ اس سے زیادہ ملے تو چلا جاوے گا یا نہیں اگر زیادہ ملنے پر بھی نہ جاوے تو معلوم ہوگا کہ یہ شخص حسبۃ اللہ کام کرتا ہے ورنہ اجیر ہے یہ اور بات ہے کہ اجرت لینے میں گناہ نہ ہو۔ کیونکہ امام شافعی جواز کے قائل ہیں اور ہمارے علماء نے اس پر فتوی دیدیا ہے مگر گفتگو اجر و ثواب میں ہے یہ میری رائے ہے اگر غلطی ہو تو مجھ کو اطلاع کر دی جاوے۔

خلاصہ یہ ہے کہ جو شخص نفقہ قاضی کے طور پر تنخواہ لیتا ہے اس کو اجر ملیگا ورنہ نہیں۔ اب صرف ایک شبہ اور رہ گیا وہ یہ کہ جب یہ نفقہ قاضی کی مثل ہے تو پھر تنخواہ کی تعیین کریں جواب یہ ہے کہ تعیین تنخواہ محض رفع نزع کے لئے ہے کیونکہ اصل معیار توقع حاجت ہے اور حاجت کبھی کم ہوتی ہے کبھی زیادہ اور در اصل اس میں معتبر قول صاحبِ حاجت کا ہے شاید کسی کو اس پر شبہ ہوتا کہ ممکن ہے کہ حاجت پانچ روپیہ کی ہو اور اس نے بتلا دیئے دس روپے۔ پھر نزاع ہوتا اس لئے مصلحت یہ ہے کہ تعیین ہو جاوے۔ اس کی ایسی مثال ہے جیسے نفقہ زوجہ کو اس میں بھی اصل عدم تعیین ہے کیونکہ وہ اجرت نہیں بلکہ حق واجب ہے اور اصل معیار اس کا حاجت ہے۔ چنانچہ قبل فرض

قاضی بھی اس کا ادا کرنا واجب ہے لیکن بعض دفعہ مصلحت عدم نزاع کے لئے قاضی نفقہ کی مقدار معین کر دیتا ہے اور ظاہر ہے فرض قاضی کے بعد بھی وہ نفقہ ہی ہوتا ہے اجرت نہیں ہو جاتی پس اگر تعیین منافی ثواب ہوتی تو چاہیئے کہ نفقہ زوجہ بعد فرض کے نفقہ نہ رہے بلکہ اجرت ہو جائے اور اس کا کوئی قائل نہیں یہ اجمالی جواب ہے واللہ اعلم بتفاصیلہ اگر اس میں کوئی غلطی ہو تو اصلاح کر دی جائے غرض تنخواہ لینے کے بعد بھی بعض صورتوں میں اجر ملتا ہے تو پھر نیت تبلیغ کی کیوں نہ کی جائے۔ پس مدرسین وطلبہ تبلیغ کا ثواب سن کر پڑھنا پڑھانا نہ چھوڑیں بلکہ وہ اس میں نیت تبلیغ کر لیں اور اگر تبلیغ کی قسمیں کر دی جائیں کہ ایک تبلیغ اصول وعقائد کی ہے کفار کو۔ دوسری قسم تبلیغ فروع ہے مسلمانوں کو تیسری قسم ایک جماعت کو تبلیغ کے قابل بنانا پھر تو درس وتدریس کا تبلیغ میں داخل ہونا بالکل ظاہر ہے اور جب تبلیغ کی مختلف قسمیں ہیں تو اب یہ ضرور نہیں کہ ہر شخص ساری قسمیں ادا کرے بلکہ اس کے لئے تقسیم خدمات ضروری ہے۔ پس ان سب کاموں کو خاص خاص جماعت کے سپرد کیا جائے یعنی قابلیت اور مناسبت کو دیکھ کر تقسیم خدمات کی جائے کیونکہ ہر ایک آدمی ہر ایک کام کے قابل نہیں ہوتا خود قرآن سے بھی تقسیم خدمات کا ضروری ہونا معلوم ہوتا ہے چنانچہ فرماتے ہیں وما کان المومنون لینفروا کافۃ فلولا نفر من کل فرقۃ منھم طائفۃ اس میں حق تعالے نے سب کو دفعۃً جہاد میں جانے پر عتاب فرمایا ہے بلکہ یہ فرمایا ہے کہ ایک جماعت جہاد میں جاتی اور ایک علم حاصل کرتی اس سے اس آیت میں بحث نہیں کی کہ اس تقسیم کے لئے مرجح کیا ہے کس کو تحصیل علم کرنا چاہیئے اور کس کو جہاد میں جانا چاہیئے مگر اتنی بات ثابت ہو گئی کہ دونوں میں مشترک خدمات کو تقسیم کیا گیا اسی طرح جب تبلیغ کے اقسام ہیں تو کسی کو کوئی خدمت کرنا چاہیئے کسی کو کچھ کرنا چاہیئے۔ سب ایک ہی کام نہ کریں کہ اس سے دین کی بنیادیں کمزور ہو جائیں گی۔ باقی یہ پھر کہوں گا کہ جو کچھ کر د

اپنے بڑے سے پوچھ کر کر دوہ متعین کر دیں گے کہ کس کو کیا کرنا چاہیئے وہ جس کو پڑھنے کا حکم کریں وہ پڑھیں جن کو تبلیغ متعارف کے واسطے مقرر کریں وہ مبلغ بنے پھر تبلیغ کے اندر جس کو جو خدمت سپرد کریں وہ اسی کو انجام دے مثلاً کسی کو مالی خدمت بتادیں گے کسی کو جانی کسی کو تالیف و تصنیف کی پس یہ مت سمجھو کہ یہ تبلیغ نہیں ہے یہ بھی تبلیغ ہی ہے کیونکہ مقدمات تبلیغ ملحق بالتبلیغ ہیں پس مال دہندہ بھی مبلغ ہے اور احکام سنانے والا بھی مبلغ ہے اور مضامین لکھنے والا بھی مبلغ ہے اس کی ایسی مثال ہے کہ کسی سے پوچھو کہ تمہارے کھانے میں کیا صرف ہوتا ہے تو وہ پانچ روپے بتلا دے گا مثلاً پھر اس کی تفصیل میں کوئلہ اور اوپلے کو بھی شمار کرے گا مثلاً دو روپیہ کا اناج ہے اور ایک روپیہ کی دال اور چار آنے کے اوپلے اب اگر کوئی کہے کہ میاں ہم تو تم سے کھانے کا حساب پوچھ رہے ہیں تم اوپلے کو اس میں کیسے شمار کرتے ہو تو کہا جاوے گا کہ یہ شخص یعنی معترض احمق ہے کیونکہ یہ بھی کھانے کے متعلقات میں سے ہے کھانا بغیر لکڑی یا اوپلے کوئلے کے کیسے پک سکتا ہے یہ تو عرف کے موافق کلام ہے اور قواعد شرعیہ سے بھی ثابت ہے کہ مقدمات شے بھی اسی حکم میں ہوتے ہیں جو اصل کا حکم ہے چنانچہ ارشاد ہے تعاونوا علی البر و التقوٰی معلوم ہوا کہ معاونت بر بھی بر ہے کیونکہ اس میں تعاون یا مور بہ کے اور مامور بہ کا بر ہونا لازم ہے۔

بہر حال تبلیغ کے متعلق متعدد خدمات ہیں پس ایک جماعت ایسی ہو جو اشاعت اسلام کرے اور ایک جماعت ایسی ہو کہ مال سے ان امداد کرے وغیرہ وغیرہ میں نے اس کو مکرر اس لئے بیان کیا کہ ہم لوگوں میں کام کے وقت غلو ہو جاتا ہے کہ بس جدھر رخ کرتے ہیں سب ایک ہی طرف ٹوٹ پڑتے ہیں اس لئے تبلیغ کی ضرورت بیان کرتے ہوئے مجھے اندیشہ ہے کہ کبھی ایسا نہ ہو کہ مدرسین وطلبہ پڑھنا پڑھانا چھوڑ دیں، بلکہ اس کو اپنے بزرگوں سے پوچھو کہ ہم کو کیا کرنا چاہیئے آیا سبق چھوڑ کر چلے جاویں یا پڑھتے رہیں یا ایک وہاں سے چلا آوے

دوسرا جاوے غرض اپنی رائے سے کچھ نہ کرو ورنہ بجائے اصلاح کے فساد ہوگا میں نے اس کو قصداً عرض کیا ہے، کیونکہ میں یہ رنگ دیکھ رہا ہوں کہ آجکل وہ طلبہ بھی جو علم سے فارغ نہیں ہوئے تبلیغ میں مشغول ہونا چاہتے ہیں حالانکہ میرے نزدیک ان کے لئے تکمیل علم اول ضروری ہے کیونکہ اگر یہ پڑھنا پڑھانا نہ ہو تو تصنیف و تبلیغ وغیرہ بھی سب بیکار ہے کیونکہ ناقص کی تبلیغ وغیرہ کچھ قابل اعتبار نہیں بلکہ اس طرح تو چند روز میں علم بالکل معدوم ہی ہوجاویگا تو تعلیم و تعلم بھی ایک فرد ہے۔

تبلیغ کی اب دوسری بات کہتا ہوں کہ تبلیغ کی اس فرد کی طرف کچھ تو توجہ ہے مگر اس کی جو دوسری فرد ہے یعنی امر بالمعروف و نہی عن المنکر اس کی طرف تو بالکل ہی توجہ نہیں حالانکہ یہ بھی ایک فرد اعظم ہے تبلیغ کی اور اس میں بھی ایک تفصیل ہے وہ یہ کہ اس کی بھی دو قسمیں ہیں ایک خطاب خاص ایک خطابِ عام، امر بالمعروف خاص تو سب کے ذمہ ہے یہ کسی فرد بشر سے ساقط نہیں ہوتا اور امر بالمعروف عام یعنی وعظ کہنا یہ سب کے ذمہ فرض نہیں بلکہ صرف یہ علماء پر واجب ہے اور امر بالمعروف خاص کا مدار قدرت پر ہے یعنی جس کو جس کسی پر جتنی قدرت ہے اس کے ذمہ واجب ہے کہ اس کو امر بالمعروف کرے مثلاً ماں باپ کے ذمہ واجب ہے کہ اپنی اولاد کو نماز روزہ کی نصیحت کریں خاوند پر فرض ہے کہ اپنی بی بی کو احکام شرعیہ پر مجبور کرے۔ آقا کے لئے لازم ہے کہ اپنے نوکر چاکر اور حیوان کے ماتحت ہیں ان کو امر بالمعروف کرے حدیث میں ہے مروا صبیانکم بالصلوٰۃ اذا بلغوا سبعا واضربوھم اذا بلغوا عشرا غرض ہر شخص پر واجب ہے کہ اپنے ماتحتوں کو حکم کرے امور خیر کا اور خلاف شرع باتوں سے روکے اس میں عالم ہونے کی ضرورت نہیں ہاں جہاں علم درکار ہے مثلاً کوئی مختلف فیہ مسئلہ ہے یا ایسا کوئی مسئلہ ہے جس کے بہت شقوق ہیں اور وہ ان شقوق کا احاطہ نہیں کرسکا یا احاطہ تو کرلیا مگر درجہ معلوم نہیں کہ متفق علیہ مسئلہ ہے یا مختلف فیہ مسئلہ مختلف فیہ

میں گنجائش ہوتی ہے تو ایسا مسئلہ بتلانا ہر شخص کے لئے جائز نہیں بلکہ جس کی نظر کافی نہ ہو اس کو ایسا مسئلہ بیان کرنا بھی جائز نہیں یہ علماء کے بتلانے کا ہے پس تبلیغ خاص کے لئے تو مسئلہ کی حقیقت کا پورے طور سے منکشف ہونا اور قدرت ہونا شرط ہے اور تبلیغ عام یعنی وعظ کہنا یہ علماء کا کام ہے خواہ درسیات پڑھ کر عالم ہوا ہو یا کسی عالم سے مسائل سن کر عالم ہو گیا ہو اس کو بھی تبلیغ عام کی اجازت ہے بشرطیکہ کسی بڑے نے اس کو اس کام کے لئے معین کیا ہو چنانچہ صحابہ نے کہاں پڑھا تھا وہ بھی تو سن سنکر تبلیغ کرتے تھے مگر ہر شخص خود نہ سمجھے کہ میں اس کے قابل ہوں جب تک کوئی کامل نہ کہدے کہ تم قابل ہو بقول ایک حکیم کے ؎

بنمائے بصاحب نظرے گوہر خودرا — عیسیٰ نتواں گشت بتصدیق خرے چند

(اپنے موتی کو کسی صاحب نظر کو دکھاؤ چند گدھوں کی تصدیق سے کوئی عیسیٰ نہیں ہو جاتا۔ یعنی اے اہل علم کسی اللہ والے کی جوتیاں سیدھی کرو وہ تمہاری اصلاح کر دیں گے ورنہ اپنے کو نہ جانے تکبر سے کیا سمجھنے لگو گے)

جیسے آجکل بعض لوگ اردو کتابیں دیکھ کر وعظ کہنے لگے اور مسائل میں ایسی غلطیاں کرتے ہیں کہ کچھ انتہا نہیں ترجمہ تک غلط کرتے ہیں۔ ایک عالم حکایت فرماتے تھے کہ کسی مقام میں ایک واعظ آئے وعظ میں انا اعطینٰك الکوثر کا ترجمہ کیا کہ "اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) دیا ہم نے تم کو مثل کوثر کے" ان راوی عالم نے کہا کہ بھائی مثل کا ہے کے معنی ہیں تو فرماتے ہیں کہ یہ کاف کے معنی ہیں یہ کاف تشبیہ کا کہلاتا ہے انھوں نے کہا کہ حضرت یہ کاف تشبیہ کا نہیں ہے یہ کاف خطاب کا ہے تو کہتے ہیں کیا دلیل ہے کہ یہ تشبیہ کا نہیں خطاب کا ہے اب وہ چکرائے کہ اس جاہل کو کیسے سمجھائیں۔ سوچ کر کہا کہ وہ گول گول لکھا جاتا ہے جب الف سے ملا ہوا ہو اور یہ ایسا نہیں کہا ہاں مجھ کو معلوم نہ تھا۔ پھر بھی غنیمت ہے کہ اس نے اتنا بھی مان لیا ورنہ کہتا کہ اس کی کیا دلیل ہے کہ وہ گول گول

ہوتا ہے اگر کہتے کہ استاد نے بتلایا ہے وہ کہتا کیا دلیل ہے کہ استاد نے بتلایا اور پھر استاد ہی کو نہ مانتے تو کوئی کیا کر لیتا مگر پھر بھی اس میں دین کی اہلیت تھی کہ اس نے اپنی غلطی کو مان لیا۔ ورنہ اب تو یہ حالت ہے کہ جو بات منہ سے نکل جاتی ہے خواہ بالکل ہی غلط ہو مگر غلطی کا اقرار کبھی نہیں کریں گے۔ تو آجکل ایسے ایسے جاہل بھی وعظ کہنے کھڑے ہو جاتے ہیں خود یہاں دیوبند ہی کی میرے سامنے کی حکایت ہے کہ ایک جاہل اندھا واعظ آیا اس زمانہ میں مولانا رفیع الدین صاحب بھی تشریف رکھتے تھے ان ہی کی مسجد کا قصہ ہے بعد مغرب وعظ شروع کیا وعظ میں یہ آیت پڑھی یا ایھا الذین امنوا اذا نودی للصلوٰۃ من یوم الجمعۃ فاسعوا الی ذکر اللہ وذروا البیع ذلکم خیر لکم ان کنتم تعلمون۔ آیت کے اول جز کا ترجمہ تو قریب قریب ٹھیک بیان کر گئے آگے دوسرے جز میں تماشا کیا ذلکم خیر لکم ان کنتم تعلمون کا آپ نے یہ ترجمہ کیا کہ یہ بہتر ہے تمہارے لئے کہ دوکان کو تالا لگا دو آپ نے تعلمون کی گت بنائی اس کو تالا موند سمجھا مگر قرآن میں تو مون ہے موند نا کہاں مگر شاید وہ کہتا کہ یہ مون مرخم ہے موند کا حالانکہ موندنا اس معنی میں مستعمل بھی نہیں ہوتا بلکہ کیواڑ بند کرنے کو موندنا کہتے ہیں نہ کہ تالا لگانے کو۔ مولانا کو غصہ آیا پوچھا کہ یہ ترجمہ تو نے کہاں سیکھا تو سیکری میں ایک شخص بہت ظریف تھے، ان کا نام مولوی صادق علی تھا کہا کہ مجھ کو مولوی صادق علی نے یہ ترجمہ بتلایا ہے۔ مولانا نے فرمایا اسے اس نے تجھے پٹوانے کو ایسا ترجمہ بتلایا ہے۔ تو اگر ایسے لوگوں کو وعظ گوئی کی گنجائش دی جائے تو بڑا مفسدہ پھیلے گا۔ مگر ہاں بعض ان پڑھ بھی صاحب کمال اور دیندار فہیم ہوتے ہیں ان کا حافظہ بھی اچھا ہوتا ہے اور باوجود اس کے اگر کوئی بات ان سے پوچھی جاوے اور ان کو معلوم نہ ہو تو صاف کہہ دیتے ہیں کہ ہمیں معلوم نہیں۔ ان کو وعظ کہنا کسی عالم کی اجازت کے بعد جائز ہے۔ اب تو یہ مصیبت ہے کہ جو لوگ نام کے مولوی بھی ہیں اور بدون تحقیق مسئلہ بتلانے کی وعید بھی جانتے ہیں ان کو بھی یہ کہتے ہوئے عار آتی ہے کہ ہمیں معلوم نہیں بس ان سے جو بات بھی

پوچھی جائے فوراً بتلانے کو تیار اور گڑبڑ کر کے جواب دیدیتے ہیں، ان میں بھی دو قسم کے لوگ ہیں ایک بالکل بد دین اور ایک کچھ دین دار ہیں۔ جو بد دین ہیں وہ تو غلط سلط بتلاتے ہیں اور جو ذرا دیندار ہیں وہ گول گول جواب دیتے ہیں کہ مخاطب کو جواب کا کچھ پتہ ہی نہ چلے اور یہ بھی معلوم نہ ہو کہ ان کو مسئلہ معلوم نہیں وہ اس طرح اپنی جہالت کو چھپاتے ہیں۔

حضرت مولانا گنگوہی فرماتے تھے کہ گنگوہ میں ایک جاہل مفتی تھے مولانا نے امتحاناً ان سے پوچھا کہ حاملہ سے نکاح کرنا کب ہے۔ مولانا نے مسئلہ بھی چھانٹ کر وہ پوچھا جو بہت ہی شقوق رکھتا ہے مگر وہ شخص تھا متدین یہ جواب دیا کہ بیوہ سے نکاح کرنا ایسا ہے جیسے گھیرا دیدینا، پوچھا مطلب کیا ہے کہا تم خود سمجھ لو غرض وہ بڑا ہوشیار تھا جواب ایسا دیا کہ مخاطب کو کچھ پتہ ہی نہ چلے نہ حلت کا پتہ لگے نہ حرمت کا اور نہ عقیدہ بگاڑا مگر سائل کو اس جواب سے کیا حاصل ہوا بجز اس کے کہ متحیر رہے مگر خیر پہلے کچھ تو اہلیت تھی، اب تو من گھڑت سے بھی باک نہیں کوئی کچھ ہی پوچھے جواب تراش کر کہہ ڈالا خواہ غلط ہی ہو تو ایسوں کو تو وعظ کہنا حرام محض ہے۔ البتہ اگر کوئی جاہل اچھا حافظہ والا ہو اور اس کے اندر تدین بھی ہو اور کوئی عالم اس کو اجازت دے تو اس کو وعظ کہنا جائز ہے۔ مگر شرط یہ ہے کہ وہ عالم پہلے اس کے متعدد تقریریں بھی سن لیں پھر اجازت دیں مولانا عبدالعزیز صاحب کے زمانہ میں ایک امی شخص وعظ کہتا تھا مگر اس کا حافظہ ایسا اچھا تھا کہ وہ شاہ صاحب کے وعظ کو ازبریاد کر لیتا تھا تو ایسے شخص کو اجازت ہے جبکہ ہر پہلو سے یقین ہو جاوے کہ قوی الحافظہ ہے متدین ہے اور اس کے دین کی بھی جانچ کر لی ہو جیسے ڈاکخانہ کے افسر اپنے ہاتھ سے ڈاک کے خانہ میں اپنے نام کے خط چھوڑ چھوڑ کر ڈاکیہ کی جانچ کے لئے دیکھتے ہیں کہ پہنچتا ہے یا نہیں اسی طرح مختلف جلسوں میں اس شخص سے مسائل پوچھواؤ پھر دیکھو جو باتیں اس کو معلوم نہیں ہیں ان کا کیا جواب دیتا ہے اگر کہہ دے کہ معلوم

نہیں تو سمجھ لو کہ اس میں تدین ہے اسی طرح اگر کسی طالب علم کو وعظ کے لئے متعین کیا جائے تو جائز ہے مگر اس کے حدود مقرر کر دو کہ اس حد تک کام کرو آگے کو نہ بڑھو آخر دنیا کے بھی تو ہر کام کی ایک ایک حد ہے کہ اس حد سے تجاوز جائز نہیں رکھا جاتا غرض اس طریق سے سب کو تبلیغ میں مشغول ہونا چاہیئے جس سے جتنا ہو سکے اسی لئے اللہ تعالیٰ نے کسی کی تخصیص نہیں فرمائی بلکہ ادع الی سبیل ربك میں عام حکم دیدیا ہے اور یہاں جو بظاہر خطاب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے تو مقصود خاص حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کو خطاب کرنا نہیں بلکہ عام ہے چنانچہ ایک جگہ ارشاد ہے قل ھٰذہ سبیلی ادعوا الی اللہ علی بصیرۃ انا ومن اتبعنی کہ میں اور میرے متبعین اللہ کی طرف بصیرت کے ساتھ دعوت کرتے ہیں اس تفسیر پر انا ضمیر ادعو کی تاکید ہے اور من اتبعنی اس پر معطوف اور گو علی بصیرۃ انا ومن اتبعنی کی ایک تفسیر یہ بھی کی گئی ہے کہ میں بھی بصیرت پر ہوں اور میرے متبعین بھی اس صورت میں یہ مستقل جملہ ہوگا یعنی علی بصیرۃ خبر مقدم اور انا مع اپنے معطوف کے مبتدا موخر اور ادعو کا معمول نہ ہوگا مگر چونکہ دوسری نصوص میں وعید عدم دعوت کی عام ہے چنانچہ ترمذی میں ایک حدیث ہے کہ جو لوگ امر بالمعروف نہیں کرتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کو عقاب عام کرے گا اور آپ نے استشہاد کے لئے یہ آیت پڑھی واتقوا فتنۃ لا تصیبن الذین ظلموا منکم خاصۃ تو اس کے انضمام سے معلوم ہوا کہ امت کا ہر فرد بھی وجوب دعوت کی حکم میں داخل ہے۔ نیز حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ پہلی امتیں امر بالمعروف کے ترک سے ہلاک ہوئی ہیں اور امم سابقہ کے حالات نقل کر کے اگر نکیر نہ کیا جائے تو وہ بھی حجت ہے اور اس لئے کہ حق تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے صید کے قصہ میں فرمایا ہے واذ قالت امۃ منھم لم تعظون قوما اللہ مھلکھم او معذبھم عذابا شدیدا یعنی بعض صلحاء نے دوسروں سے کہا تھا کہ ان نافرمانوں کو نصیحت کیوں کرتے ہو تو انھوں نے جواب دیا قالوا

معذرة الی ربکم کہ خدا کے یہاں عذر تمام کرلے کے لئے تاکہ معذور سمجھے جائیں کہ ہم نے تو ان سے ترک معصیت کے لئے کہا تھا مگر انھوں نے نہیں مانا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نصیحت میں تخصیص کسی کی نہیں بلکہ امتی کے ذمہ بھی امر بالمعروف ضروری ہے اور حکم سب کو عام ہے ہاں اس میں وہ تفصیل کہ کس کے ذمہ کیا حکم ہے یعنی تبلیغ خاص ہے یا عام سو اس کو میں نے اوپر بیان کر دیا ہے کہ تبلیغ عام علماء کا منصب ہے تبلیغ خاص تو ہر جگہ اور ہر شخص پر ہے، بہر حال حکم عام ہے باقی خطاب کا خاص ہونا خصوصیت مقام سے ہوتا ہے بلکہ اکثر جگہ قرآن میں خطاب خاص ہی ہے لیکن جب آپ کسی حکم کے مامور ہیں تو اور سب تو بطریق اولیٰ مامور ہوں گے جبکہ کوئی دلیل تخصیص کی نہ ہو چنانچہ قاعدہ ہے کہ سلاطین کا خطاب اول بڑوں کو ہوا کرتا ہے اور چھوٹے ان کے تابع ہوا کرتے ہیں جب مقربین کو کسی بات کا حکم ہے تو غیر مقربین پر تو فرض متحتم ہوگا پس حق تعالے فرماتے ہیں

ادع الی سبیل ربك بالحکمة والموعظة الحسنة وجادلهم بالتی هی احسن

اس میں سبیل رب کی طرف بلانے کا حکم ہے اب رہا یہ کہ طریقہ کیا ہے دعوت کا سو اس کے متعلق حق تعالے نے تین چیزیں بتلائی ہیں۔ دعوت[۱] بالحکمۃ، دعوت[۲] بالموعظۃ الحسنہ اور ایک مجادلہ[۳] یعنی ایک قسم تو دعوت کی یہ ہے کہ حکمت کے ساتھ کی جائے دوسری قسم یہ ہے موعظۂ حسنہ کے ساتھ دعوت کی جائے اور ایک یہ کہ مجادلہ حسنہ کیا جائے اس کی توجیہ مختلف ہوسکتی ہے جو بات میری سمجھ میں آتی ہے وہ عرض کرتا ہوں جب کسی کو سبیل رب کی طرف ہوگی تو اس میں ایک تو دعویٰ خاص داعی کا مطلوب ہوگا اور ایک اس کی نقیض ہوگی جو کہ مذہب مخالف کا ہے پھر گفتگو میں دو چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے ایک اپنے دعویٰ کا اثبات اور دوسرے کے دعوے کا ابطال تو حکمت یہ ہے کہ اپنے دعوے پر علمی دلائل قائم کئے جاویں۔ اور مجادلہ یہ ہے کہ مخالف کے مدعیٰ کو باطل کیا جاوے اصل مقصود تو یہ دونوں ہیں باقی تیسری ایک چیز اور ہے وہ

موعظہ حسنہ ہے چونکہ اللہ تعالیٰ کو عباد کے ساتھ شفقت بہت زیادہ ہے اس لئے موعظہ حسنہ بھی ایک طریق بتلا دیا اس کی حقیقت یہ ہے کہ ناصح دو قسم کے ہوتے ہیں ایک تو ضابطہ کے ساتھ نصیحت کرنے والا وہ تو اپنے ضابطہ کی خانہ پڑی کر دیتا ہے دوسرا وہ ناصح جس کو سامعین پر شفقت بھی ہے مثلاً ایک تو منادی کا حکم سنانا ہے اور ایک باپ کا نصیحت کرنا دونوں میں بڑا فرق ہے منادی کا کام تو ضابطہ کا ہے صرف حکم کا پہونچا اس کا فرض منصبی ہے اب تم مانو یا نہ مانو اس سے اس کو کوئی بحث نہیں اور باپ محض سنانے پر قناعت نہیں کرتا بلکہ اس کی شفقت اس بات کو مقتضی ہوتی ہے کہ کسی صورت سے اس کو منوالوں اس لئے وہ ایسی صورت اختیار کرتا ہے کہ بیٹا مان ہی لے تو دیکھئے دونوں میں کتنا بڑا فرق ہے اور ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ جیسا کوئی شفیق نہیں پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم جیسا کوئی خیر خواہ نہیں تو محض شفقت ہی کے مقتضات اللہ تعالیٰ نے اولاً حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اور ثانیاً آپ کی امت کو فرمایا ہے کہ دعوت میں صرف حکمت یعنی دلائل ہی پر اکتفا نہ کرو بلکہ ساتھ ساتھ موعظہ حسنہ بھی کرتے رہو جس کی حقیقت تقابل سے معلوم ہوتی ہے کہ حکمت سے جب علمی دلائل مراد ہیں تو موعظہ حسنہ سے دلائل کے علاوہ کچھ اور مراد ہوگا سو وہ ایسے مضامین موثرہ ہیں جس سے مخاطب میں نرمی پیدا ہو دل پگھل جاوے اور ان مضامین مرقعہ کا مصداق ترغیب و ترہیب ہے کہ درجات جنت کی ترغیب اور درکات جہنم سے ترہیب کرنا وغیرہ ذلک غرض اصل مقصود تو احکام کا سنانا ہے خواہ اصل ہوں یا فروع باقی ایک درجہ مخاطب کے متاثر کرنے کے لئے ترغیب و ترہیب کا بھی ہے گو وہ بھی ایک حیثیت سے احکام ہی میں سے ہے مثلاً جنت اور دوزخ کا مضمون عقیدہ کے درجہ میں تو احکام ہی میں داخل ہے اور اصول میں سے مگر دوسری حیثیت سے ترغیب و ترہیب ہے یعنی جہاں احکام کا سنانا اور دوزخ و جنت کا

معتقد بنانا مقصود نہ ہو صرف ترقیق قلب مقصود ہو وہاں ترغیب و ترہیب ہے مثلاً کسی کو کہا کہ اگر نماز پڑھو گے تو ایسی جنت ملے گی جس کی یہ شان ہے یہ حالات ہیں اس کے اندر ایسی ایسی آسائشیں ہیں اور اگر نہیں پڑھو گے تو دوزخ میں جاؤ گے جس کے یہ واقعات ہیں تو یہ مضمون ترغیب و ترہیب کی حیثیت سے محض مرقق ہے قلب کا اس سے مخاطب کے قلب میں صلاحیت قبول احکام کی پیدا ہو گی پھر عمل کرنے کی توفیق ہو گی کیونکہ عمل اول اول تکلف سے ہوتا ہے کیونکہ طبیعت کے خلاف کام ہے اس کے واسطے کوئی امر آمادہ کرنے والا اور ابھارنے والا ہونا چاہیئے طبیعت کے خلاف دنیا کا کوئی کام بھی بلا طمع یا بغیر خوف کے نہیں ہوتا پھر عادت ہو جاتی ہے تو ترغیب و ترہیب کی چنداں ضرورت نہیں رہتی اس لئے ترغیب کی بھی ضرورت ہوئی اور ترہیب کی بھی شفیق کی تعلیم ایسی ہی ہوئی ہے مثلاً باپ اگر بیٹے کو کسی مضر چیز سے روکتا ہے تو گو اتنا کہدینا کہ یہ چیز مت کھانا حاکمانہ حق ادا کرنے کے لئے کافی ہے آگے اس کو اختیار ہے چاہے احتراز کرے یا بھاڑ میں پڑے مگر باپ اتنی بات پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ شفقت کی وجہ سے کہتا ہے کہ بیٹا یہ چیز مضر ہے دست آور ہے اسے مت کھانا یہ پیٹ میں درد پیدا کر دے گی، اس کے کھانے سے پھنسیاں نکل آئے گی تو اتنا لگنا لپٹنا شفیق ہونے کی حیثیت سے ہے ورنہ اس کو خوف دلانے کی کیا ضرورت پڑی تھی اسی طرح کبھی طمع دلانے سے کام لیتا ہے کہ اگر یہ دوا پی لو گے تو تم کو یہ دوں گا وہ دوں گا خود میرا ایک واقعہ ہے بچپن میں ایک دفعہ بیمار ہوا تو حکیم صاحب نے مسہل تجویز کیا مگر میں پیتا نہ تھا تو والد صاحب نے کہا اگر دوا پی لو گے تم کو ایک روپیہ دوں گا بس روپیہ کے لالچ میں پی گیا تو اس واسطے ضرورت ہے ترغیب و ترہیب کی کیونکہ ایسے آدمی بہت کم نکلیں گے جو بلا ترغیب ترہیب کے امتثال امر کر لیں گو بعض ایسے بھی ہوتے ہیں جو بلا ترغیب ترہیب کے بھی کر لیتے ہیں جیسے ایک صحابی کے متعلق حضور صلی اللہ

علیہ وسلم نے فرمایا ہے لولم یخف اللہ لم یعصہ کہ اگر اس کے دل میں خوف خدا بھی نہ ہوتا تب بھی خدا کی نافرمانی نہ کرتا تو بعض کو تو فطری طور پر خدا سے تعلق ہوتا ہے مگر اکثر تو خوف ہی سے کچھ رکتے ہیں پھر وہ درجہ بھی نصیب ہو جاتا ہے لیکن اول ہی سے ایسے کم ہوتے ہیں مثلاً بچہ پہلے پہلے مار دھاڑ سے پڑھتا ہے اور پھر تو اگر سبق کے لئے اپنے پاس سے بھی کچھ خرچ کرنا پڑے جب بھی نہ چھوڑے تو اس لئے ترغیب ترہیب کی ضرورت ہے یہ موعظہ حسنہ ہے۔ سبحان اللہ حق تعالیٰ کی کتنی بڑی شفقت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اور امت کو یہ ترکیب بتلائی کہ آپ اس طریقہ سے کام کیجئے کس قدر رحمت ہے کہ دشوار عمل کو کس طرح آسان کر دیا، اس کے بعد ارشاد ہے جادلھم یعنی ان سے مجادلہ کیجئے اس میں دو احتمال تھے ایک مجادلہ حسنہ کا ایک سیئہ کا اس لئے احسن کی قید لگا دی اور مجادلہ سیئہ سے ممانعت کر دی۔ رہا یہ کہ مجادلہ میں تو احسن کی قید لگائی اور حکمت کے ساتھ حسنہ کی قید کیوں نہیں لگائی اس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں غیر حسنہ کا احتمال ہی نہیں کیونکہ اپنے دعوے کی دلیل بیان کرنے میں کسی کو ناگواری نہیں ہوتی اور دوسرے کے دعوے کو رد کرنے میں اسے کبھی انقباض ہوتا ہے اس لئے وہاں قید نہیں لگائی اور یہاں قید لگائی کہ رد اگر ہو احسن طریقہ سے ہو جس سے کسی کو رنج اور کلفت نہ ہو۔ سبحان اللہ کس قدر شفقت ہے عباد پر کہ مخالف کی اتنی رعایت کہ اس کا رد اگر ہو ایسے طریقہ سے ہو کہ اس پر حقیقت تو منکشف ہو جائے مگر برا بھلا کسی کو نہ کہا جائے اور میں نے جو رد میں یہ قید لگائی کہ حقیقت ظاہر ہو جائے یہ اس لئے ہے کہ بعض دفعہ جواب ایسا گول مول ہوتا ہے کہ خصم پر حقیقت بھی ظاہر نہیں ہوتی اور یہ حسن مجادلہ کے خلاف ہے اس لئے چاہیئے کہ کہے تو صاف صاف مگر احسن طریقہ سے۔ چنانچہ فاصدع بما تومر کا یہی مطلب ہے کہ کھول کے صاف صاف بیان کرو ورنہ جہل سے نجات نہیں ہوتی جو شخص گول مول بات کرتا ہے اس سے ہر شخص راضی تو رہتا ہے مگر اس کا اثر برا ہوتا ہے

کہ مخاطب جہل مرکب میں مبتلا رہتا ہے اس لئے ضروری ہے کہ بات صاف صاف ہو مگر الفاظ سخت نہ ہوں قل لعبادی یقولوا التی ھی احسن کا یہی مطلب ہے کہ سخت الفاظ سے بچو اب ایک باریک ادب تبلیغ کا اور رہ گیا وہ یہ کہ تبلیغ کر کے ظہور نتیجہ وحصول ثمرہ کی فکر میں نہ پڑنا چاہیئے بعض دفعہ اس سے بہت بُرا اثر ہوتا ہے اور یہ بالخصوص مبلغ شفیق کو پیش آتا ہے جاد لھم تک تو یہ معلوم ہوا کہ تبلیغ شفقت کے ساتھ ہو مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ تبلیغ کے بعد بھی شفقت کی وجہ سے اس کی فکر میں لگے رہو اس میں ایک غائلہ ہے جس کو لوگ کمال سمجھتے ہیں اور ہے واقع میں نقص اس سے تبلیغ کے اندر نقصان ہوجاتا ہے وہ یہ کہ جب شفقت زیادہ ہوتی ہے تو نتیجہ عاجلہ پر نظر ہوتی ہے مگر اوس نتیجہ کو اول سوچ لیتے ہیں کہ اس کا یہ اثر ہوگا حالانکہ اصل نتیجہ رضائے حق ہے اور وہ تبلیغ بطریق مذکورہ پر فوراً مرتب ہوجاتا ہے اور ثمرہ عاجلہ بھی اگر ہوتا ہے اسی کی برکت سے مرتب ہوتا ہے مگر ہم لوگوں کے اندر عجلت زیادہ ہے ہم چاہتے ہیں کہ جلدی اثر ظاہر ہوجائے گو اس میں نیت دین ہی کی ہو مثلاً کسی کو نماز سکھاتے ہیں تو اس کا ثمرہ عاجلہ یہ چاہتے ہیں کہ ہم اپنی آنکھ سے اس کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھ لیں اسی طرح تبلیغ اسلام میں یہ چاہتے ہیں کہ ہماری تحریک کے ساتھ ہی بہت سے مسلمان نظر آنے لگیں اور اس میں بعض وقت یہ مصلحت بھی نیت میں ہوتی ہے کہ اس سے اہل حق کا مجمع زیادہ ہوگا اور حق بڑھے تو حق کو قوت ہوگی اور جب اہل حق کو قوت ہوگی اہل باطل مغلوب ہوں گے تو وہ مضرت بھی پہونچا سکیں گے یہ مصلحت پیش نظر ہو تو یہ دین ہے مگر اس میں غلو نہ چاہیئے۔ اور اگر ثمرہ دنیا ہے مثلاً یہ کہ ہمارا نام ہوگا کہ یہ خوب کام کرتا ہے تو وہ تو ہے ہی برا اگرچہ بصورت نماز ہی ہو غرض بعض وقت ثمرہ دینی ہوتا ہے اور کبھی دنیاوی مگر یہ سب ثمرات عاجلہ ہیں جن پر بعض مبلغین کی نظر ہوتی ہے پھر اگر ان ثمرات کا ترتب نہیں ہوتا تو حزن و ملال ہوتا ہے اور بعض وقت یاس تک نوبت آجاتی ہے اور مخاطب پر غیظ پیدا ہوتا ہے

اور حاضر یا غائب برا بھلا کہتے ہیں کہ جانا لائق بچے اس قدر سمجھایا اتنی کوشش کی مگر تو نے سمجھا ہی نہیں میری اوقات کو ضائع کیا اتنی محنت ہی رائیگاں گئی اور اگر اس پر قدرت ہوتی ہے تو کبھی اس کو سزا بھی سزا بھی دیدیتے ہیں اور وہ بھی اعتدال سے زیادہ اور بعض وقت دل تنگ ہو کر بیٹھ جاتے ہیں کہ جا بھاڑ میں پڑ کام چھوڑ بیٹھتے ہیں یہ اثر ہوا ثمرات پر نظر ہونے سے بظاہر تو جب مبلغ کو محزون اور غمگین دیکھا جاتا ہے۔ اس کا بڑا ہی کمال سمجھا جاتا ہے اور اعلیٰ درجہ کا مبلغ شمار کیا جاتا ہے کہ اس سے زیادہ اور کیا کمال ہوگا کہ ہمہ تن اس طرف متوجہ ہے اور دوسروں سے بھی کہہ رہے ہیں کہ بھائی اس کے لئے دعا کرو کہ اس کی اصلاح ہو جائے مثلاً اپنا بیٹا نماز نہیں پڑھتا تو اس کو سمجھاتے میں کڑھتے ہیں دل سے دعا کرتے ہیں اوروں سے بھی دعا کراتے ہیں کسی سے کہتے ہیں اجی ایک تعویذ ہی کر دو یہ سب افعال گو محمود ہیں مگر جب غلو ہو جاتا ہے تو اس کا اثر برا ہوتا ہے کہ اس کا انجام یاس اور یاس کا انجام تعطل ہوتا ہے تو جس کو آپ نے تبلیغ کا فرد کامل سمجھا تھا اب وہ مفضی الی التعطل و ترک التبلیغ ہو گیا اور تبلیغ سے ہاتھ دھو بیٹھے سو یاد رکھو جو درجہ شفقت کا ایسا ہوگا وہ کامل نہیں بلکہ ناقص ہے حاصل اس ادب کا یہ ہوا کہ ثمرات کے مرتب نہ ہونے سے محزون نہ ہو ایک طبعی حزن ہوتا ہے اس کا تو مضائقہ نہیں بلکہ اس میں ثواب ہوگا اور یہ ایک یہ کہ اس میں غلو اور مبالغہ ہو جائے کہ ثمرہ مرتب نہ ہونے سے ہمت ہی توڑ دے اور روتے روتے آنکھیں پھوڑ دے یہ برا ہے نصوص کے تتبع سے معلوم ہوتا ہے کہ اتنے حزن و ملال کی اجازت بھی نہیں حق تعالیٰ جابجا فرماتے ہیں لا تحزن علیھم ولا تك فی ضیق مما یمکرون ۔ لست علیھم بمصیطر اور لعلك باخع نفسك ان لا یکونوا مومنین اور ما انت علیھم بوکیل اور فان استطعت ان تبتغی نفقا فی الارض او سلما فی السماء فتاتیھم بآیۃ یہ سب آیات مبالغہ فی الحزن سے منع کرتی ہیں یعنی اتنا حزن جس سے اپنی صحت ہی برباد ہو جائے یا کام سے

تعطل ہو جاوے اس کی اجازت نہیں کوشش کی ممانعت نہیں اس کا تو حکم ہے مگر عدم ظہور نتائج پر اس درجہ کا حزن مضر ہے اللہ تعالیٰ اس آیت میں جادلہم کے بعد اس ضرر کا تدارک کیا عجیب فرماتے ہیں ان ربك ھو اعلم بمن ضل عن سبیلہ وھو اعلم بالمھتدین یعنی تبلیغ کرکے نتیجہ کی فکر میں نہ پڑو۔ یہ خدا کے قبضہ میں ہے تمہارے اختیار سے باہر ہے یہ بھی ایک وجہ ربط ہے ما قبل کو ما بعد سے اور ممکن ہے اور کوئی وجہ ربط اس سے بھی عمدہ کسی کی سمجھ میں آجاوے تو گویا اس مقام میں اللہ تعالیٰ نے دونوں درجوں سے تعرض کیا ہے یعنی ایک تو تفریط فی التبلیغ سے اس کے تدرک کے لئے فرمایا ادع الی سبیل ربك الآیۃ اور ایک افراط فی التبلیغ سے اس کی ممانعت اس جزو میں مذکور ہے ان ربك ھو اعلم بمن ضل عن سبیلہ وھو اعلم بالمھتدین غرض تبلیغ کے اندر کبھی افراط ہو جاتا ہے کبھی تفریط یہ دونوں مضر ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں شفقت کی کمی کا تو احتمال ہی نہ تھا تو یہ مجموعی انتظام ہم لوگوں کے واسطے فرمایا گیا ہے کہ تبلیغ میں نہ افراط کرنا نہ تفریط چنانچہ اول میں تفریط کا انسداد ہے اور آخر میں افراط کا حاصل یہ ہے کہ ایک درجہ تبلیغ کا یہ بھی ہے کہ آخر میں ناکامیابی سے اتنا غم سوار ہوتا ہے کہ یاس کی نوبت آجاتی ہے اس کے بعد تعطل ہو جاتا ہے اس کے متعلق فرماتے ہیں کہ آپ اس سے کیا بحث ثمرہ ہو یا نہ ہو آپ اپنا کام کئے جایئے ثمرات کا مرتب کرنا ہمارا کام ہے، ہم جانتے ہیں کون ہدایت پر ہے اور کون ضلالت میں ہے ایک اور جگہ لطیف عنوان سے اس کو بیان فرمایا ہے ولو شاء ربك لامن من فی الارض کلھم جمیعا افانت تکرہ الناس حتی یکونوا مومنین وما کان لنفس ان تومن الا باذن اللہ جن کے اندر شفقت ہے وہ سمجھ سکتے ہیں کہ مخاطب کے عدم تاثیر سے کس قدر تکلیف ہوتی ہے سو نفس حزن کی ممانعت نہیں وہ تو طبعی اور غیر اختیاری ہے اس میں انسان مجبور ہے بلکہ ممانعت اس کی

جو حد ضیق تک پہونچے اس لئے فرماتے ہیں ان ربک ھو اعلم بمن ضل عن سبیلہ وھو اعلم بالمھتدین آپ کو اس سے کیا کہ کوئی مسلمان ہوا یا نہیں ہوا اس کو اللہ جانتا ہے آپ اس کی فکر نہ کیجئے اس کے خدا کے سپرد کر دیجئے اور جہاں اتنی شفقت نہ ہو اور اس لئے تیز لہجہ اور سختی سے تبلیغ کرنے لگیں اس کی بھی ممانعت فرمادی وقل لعبادی یقول التی ھی احسن غرض ایک ہی مقام کی آیتیں افراط تفریط دونوں کی ممانعت کے لئے کافی ہوگئیں امید ہے کہ اب بقدر ضرورت بیان کافی ہوگیا ہے۔ ایک مضمون اور رہ گیا اس کیلئے ایک مقدمہ کی ضرورت ہے وہ یہ کہ مقدمہ مقصود کا مقصود ہوا کرتا ہے۔ چنانچہ فقہی مسئلہ ہے مقدمۃ الواجب تو اس وقت جن چیزوں کا تبلیغ کے لئے موقوف علیہ ہوتا ثابت ہوجاوے خواہ لولاہ لامتنع کے درجہ میں یا مصحح لدخول الفاء کے درجہ میں مثلاً وہ امور جن کو اہل بصیرت بتلاویں کہ تبلیغ کے لئے ان کی بھی ضرورت ہے تو ان کا اتباع کرکے ان مقدمات کو بھی جمع کریں بشرطیکہ شرعی حدود سے باہر نہ ہو چنانچہ اولاً خط کے ذریعہ سے معلوم ہوا تھا اور اب یہاں آکر دیکھ کر معلوم ہوا کہ یہاں مدرسہ میں سنسکرت کی تعلیم دی جارہی ہے تو ہر چند کہ سنسکرت کا سیکھنا وجوب کے درجہ میں نہیں مگر تبلیغ میں بیحد مفید ہے اس سے معاندین اسلام کے مذہب پر کماحقہ اطلاع ہوگی اور انھیں کی کتب سے ان کا جواب دیا جاوے گا تو بڑا کارگر ہوگا خصم ہی کے مسلمات سے جواب دینا بڑا فائدہ مند ہوتا ہے اس سے وہ ساکت اور دنگ ہوجاتا ہے۔ چنانچہ بہت جگہ دیکھا گیا کہ الزامی جواب جس قدر مفید ہوتا ہے تحقیق معاند کے لئے اتنا شفا بخش نہیں ہوتا تو معلوم ہوا کہ یہ بھی ایک درجہ ہے تبلیغ کا اس سے ہم بالکل ہی چپ ہوجاتا ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس سے مجمع کے اوپر اثر زیادہ پڑتا ہے عوام اس کو نہیں دیکھتے کہ کس کی تقریر کیسی ہے ان کے نزدیک تو جس نے ساکت کردیا بس وہی جیتا

وہ تو مسکت ہونے کے وصف کو دیکھتے ہیں دلیل کی حقیقت کو نہیں دیکھتے ہیں تو بربنائے مقدمۃ الواجب واجب یہ بھی ہو سکتا ہے اور اگر واجب نہیں تو آپ کے نزدیک استحباب ہی کے درجہ میں سہی مگر مفید تو ہے اور یہ عذر کرنا کہ سبق کا حرج ہوتا ہے اجی سبق کے وقت میں اس کا شغل نہ کیجئے بلکہ فضول گوئی میں جو وقت صرف ہوتا ہے اس میں اس کام کو کیجئے اور ایک مقدمہ تبلیغ کا اور ہے یعنی تقریر کی مشق وہ بھی کیجئے بحمد اللہ آپ کے اساتذہ اہل بصیرت ہیں اور سامان بھی مدرسہ میں موجود ہے اس کو غنیمت سمجھئے اور ایسے موقع کو ہاتھ سے نہ دیجئے ایسا سامان کہیں نہیں ملے گا۔

ایک حکایت یاد آئی ہے مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی کہ کسی نے ان کی کمال کی تعریف کی تھی تو آپ نے تواضعاً فرمایا کہ میاں ہماری مثال تو ایسی ہے جیسے رڈ کی گودام کا کاریگر کہ جب تک گودام میں ہے کاریگر ہے جہاں باہر نکلا کچھ نہیں کیونکہ اس گودام میں مشین کے ذریعہ سے سب کام ہوتے ہیں ایک چیز ایک کل میں لگا دی تو ایک نے اُسے کاٹا دوسری کل نے ہتوڑا مارا تیسری نے بنا بنایا ایک جگہ رکھ دیا ایسے ہی ہمارا کمال ہے کہ جب تک مدرسہ کے اندر ہیں سب کچھ ہیں اور جہاں باہر نکلے کچھ بھی نہیں۔ خیر مولانا کی شان تو ایسی کیوں ہوتی مگر ہماری حالت تو واقعی یہی ہے کہ مدرسہ ہی ہمارے کمالات کا موقع ہے صاحبو ایسا سامان آپ کو اور کہیں میسر نہیں آوے گا اور نہ وقت بھی نہیں ملیگا اس وقت کو غنیمت سمجھو میں یہ نہیں کہتا کہ مقدمات ہی کے اندر سارے اوقات کو ضائع کردو بلکہ ہر چیز کو اپنے درجہ میں رکھ کر حاصل کرو اصل مقصود تو دین ہے مگر اس کے حاصل کرنے کے طرق ہیں قرآن کا صحیح کرنا بھی دین ہے، حدیث تفسیر پڑھنا بھی دین ہے، اسی طرح فقہ بھی دین ہے سب پر نظر رکھنا چاہیئے مگر ترتیب سے کرنا چاہیئے۔ اور ساتھ ہی یہ بھی دیکھنا چاہیئے کہ کس کو کتنی مقدار میں حاصل کرنا چاہیئے اور یہ اساتذہ کی رائے پر ہے وہ جس کی استعداد جیسی دیکھیں گے

اس کی صلاحیت کو سمجھ کر خود رائے دیں گے پھر وہ جو رائے دیں ویسے ہی کرو۔

میرے پاس بعض طلبہ کے خطوط آتے ہیں کہ ہم کو منطق نہیں آتی میں لکھ دیتا ہوں اذالم تستطع شیئاً فدع جس کو حمد اللہ نہ آوے وہ الحمد للہ پڑھ لے اور جس کے لئے منطق دین میں مفید سمجھی جاوے اس کے لئے وہ بھی دین ہے۔ حضرت مولٰنا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے فلسفہ منطق کی کتابیں درس سے خارج کر دی تھیں تو ایک طالب علم نے مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے کہا لیجئے حضرت معقول پڑھنا بھی مولانا نے حرام کر دیا اس نے اعتراض کے طور پر کہا تھا مولانا نے فرمایا کہ بھائی مولانا نے حرام نہیں کیا تمہاری طبیعتوں نے حرام کیا ہے تمہارے فہم میں کجی آگئی ہے اس لئے ممانعت کی جاتی ہے۔ اور ہم تو جیسے بخاری میں ثواب سمجھتے ہیں ویسا ہی امور عامہ میں اتنا بڑا دعوے اطمینان کا یہ مولانا ہی جیسے کامل کا کام ہے غرض ہر شخص کا الگ حال ہے جس کو اساتذہ وکاملین سمجھتے ہیں اس لئے سب کے ساتھ ایک برتاؤ نہیں کرتے۔

میرے پاس ایک خط آیا کہ مجھ کو عربی نہیں آتی میں نے لکھا چھوڑ دو اردو میں مسائل پڑھو۔ پنجابی، کابلی، بنگلہ جو زبان آوے اسی میں پڑھ لو کوئی عربی پڑھنا فرض تھوڑا ہی ہے۔ خلاصہ یہ کہ کس کو کیا کرنا چاہیے اور کتنی مقدار کرنا چاہیے یہ اساتذہ کی رائے پر ہے کیونکہ ہر ایک کی حالت جدا ہے، استعداد جدا ہے۔ سب کو ایک لکڑی نہیں ہانکا جاتا غرض اپنی رائے سے افراط تفریط مت کرو۔ ہمارے اندر بڑی خرابی یہ ہے کہ یا تو کسی کام پر بالکل توجہ ہی نہیں اور یا متوجہ ہوئے تو سب کے سب ایک ہی طرف ٹوٹ پڑے چھوٹے بڑے سب اس میں منہمک ہوگئے

اور سب کاموں کو چھوڑ بیٹھے۔ اسی کو مولانا فرماتے ہیں ؎

چوں گرسنہ میشوی سگ میشوی ۞ چونکہ خوردی تند و بدرگ میشوی

اور کسی اردو کے شاعر نے کہا ؎

اگر غفلت سے باز آیا جفا کی
تلافی کی بھی ظالم نے تو کیا کی

وہی مثال ہے ہماری کہ کنوئیں سے نکلے کھائی میں گرے غرض ہمارے کاموں میں گڑ بڑ بہت ہے اعتدال اور استقامت بالکل نہیں وجہ یہ ہے کہ اب خود رائی پھیل گئی ہے یہ بڑا مرض ہے اس لئے میں نے کہا ہے کہ جو کچھ کرے بڑے سے پوچھ کر کرے بلکہ اکابر بھی چھوٹوں کو مناسب ہے کہ مشورہ میں شامل کرلیا کریں اور یہ سنت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اور اس خود رائی کو صوفیہ تو سخت ہی مضر فرماتے ہیں۔ عارف شیرازی کہتے ہیں ؎

فکر خود و رائے خود در عالم رندی نیست
کفر ست دریں مذہب خود بینی و خود رائی

(اپنی رائے اور اپنی فکر محبت کے راستے میں نہیں ہونی چاہیئے
مذہب عشق میں خود بینی اور خود رائی کفر ہے یعنی سخت قبیح ہے)

وہ تو اس کو کفر فرماتے ہیں لیکن اس سے وحشت نہ ہونا چاہیئے کیونکہ کفر کے بھی مراتب ہیں یہ کفر دون کفر ہے اور سبب کلی اس خود رائی کا یہ ہے کہ ہم لوگوں میں اصلاح اخلاق کی کمی ہے۔ چھوٹے بڑے کی تمیز نہیں ورنہ بزرگوں نے تو چھوٹے سے چھوٹا کام بھی بغیر مشورہ نہیں کیا اور سبب جزی یہ ہے کہ ہم لوگ ہوش سے کام نہیں لیتے ہیں نرے جوش سے کام لیتے ہیں بس جوش میں مشورہ کا بھی تو ہوش نہیں رہتا اور جوش بھی فی نفسہ بری چیز نہیں جوش ہو مگر ہوش کے تابع ہو۔ جب آپ ہوش سے کام لیں گے تو اس کو بھی سمجھیں گے کہ آپ

لوگ مقتدا بننے والے ہیں اس لئے آپ کے اندر سب شعبے دین کے ہونا چاہئیں اگر کسی بات کی کمی ہو تو نقصان ہے حسین وہ ہے جس کے آنکھ، کان، ناک سب ہی اچھی ہو سب چیزیں موزوں ہوں اگر سب چیزیں تو اچھی ہوں مگر آنکھوں سے اندھا ہو وہ حسین نہیں یا ناک کٹا ہوا ہو تو وہ بھی حسین نہیں اسی طرح دیندار وہ ہے جو دین کے تمام شعبوں کا جامع ہو، عالم وہ ہے جو تمام شعب علوم کا جامع ہو ان ہی شعبوں میں سے امر بالمعروف کے وہ آداب بھی ہیں جو بتلائے گئے ہیں ان سب کو جمع کرنا چاہیئے۔ بحمداللہ ضرورت کے موافق بیان ہو گیا ہے اسی بیان کا تتمہ ایک یہ بھی ہے کہ اہل اضلال ہیں اس وقت دو قسم کے لوگ ہیں ایک وہ جو ارتداد کی صورت میں مرتد بنا رہے ہیں اور ایک وہ جو اسلام کی شکل میں خود پہلے سے مرتد ہیں اور وہ دوسروں کو اپنی طرف بلاتے ہیں یہ فرقہ زیادہ مضر ہے یعنی اس وقت ایک فرقہ تو آریہ کا ہے وہ تو علانیہ کفر کی دعوت کرتے ہیں اور ایک وہ ہیں جو اسلام کے پردہ میں کفر کو پھیلا رہے ہیں وہ مرزائیوں کا گروہ ہے ان پر کفر و ارتداد کا فتویٰ ہو چکا ہے۔ مبلغین کو دونوں کی مدافعت کرنی چاہیئے جیسے آریہ ہیں ایسے ہی یہ ناریہ بھی ہیں دونوں کافر ہیں یہ میں نے اس لئے عرض کیا کہ پہلے شعبان میں کانپور میں میرا ایک وعظ ہوا تھا۔ اس کا نام دعوۃ الی اللہ ہے وہ چھپ بھی گیا ہے میں نے اس میں بیان کیا تھا کہ اب صرف آریہ کا مقابلہ کرنا چاہیئے اور آپس میں جو فرقے ہیں جیسے رضائی یا مرزائی ان سے لڑنا نہ چاہیئے یعنی جب وہ لوگ یعنی نو مسلم یا جاہل مسلمان ہمارے گھر کے اندر لڑائی دیکھیں گے تو متحیر رہ جائیں گے کہ یہ سب ہی مسلمان ہیں اور ایک دوسرے کو اہل باطل سمجھتے ہیں پھر ہم کدھر جائیں اس کا نتیجہ اچھا نہیں ہوگا اب مجھے تنبہ ہوا کہ یہ خیال میرا صحیح نہیں ہے پہلے مجھے واقعات معلوم نہ تھے میں یہ سمجھتا تھا کہ وہ لوگ بھی صرف

توحید و رسالت ہی کی اشاعت کرتے ہیں یعنی رسالت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کی۔ اب معلوم ہوا کہ وہ رسالت مرزائیہ کی اشاعت کرتے ہیں اور اس کی ساتھ یہ سنا تھا کہ وہ اُن سے الجھتے ہیں تو اس وقت یہ رائے دی تھی کہ آپس میں نہ لڑو اس سے جاہل مسلمان یا مرتدین پریشان ہوں گے اسلام سے رُک جاویں گے اسلام سے متوحش ہوں گے پہلے ان کو کسی کے ہی ذریعہ سے مسلمان ہونے دو جب وہ مسلمان ہو جاویں گے پھر بتلا دینا کہ یہ مذہب باطل ہے اور یہ حق ہے اور اسی دعوۃ الی اللہ میں یہ بھی کہا تھا کہ یہ جب تک ہے کہ وہ مرزائی وغیرہ اپنے مذہب سے تعرض نہ کریں نہ اپنے عقائد کی اشاعت کریں اور اگر وہ اس سے تعرض کریں تو تم بھی دریغ نہ کرو اب ایک دوست نے لکھا ہے کہ تمہارے وعظ میں جو یہ مضمون ہے اس سے لو لازم آتا ہے کہ ہم اور کفار ایک جگہ ہو کر اسلام کی اشاعت کریں اور اس خط سے یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ لوگ اپنے عقائد کی اشاعت سے تعرض بھی کرنے لگے ہیں تو میں نے جواب لکھا کہ اس میں اس حالت میں عدم سکوت کی طرف خود اشارہ ہے اور یہ اجازت دی کہ اب شائع کر دو کہ اگر وہ اپنے مذہب سے تعرض کریں تو ہم بھی اُن سے ضرور تعرض کریں گے۔ پھر ایک دوست نے مجھ کو یہ لکھا کہ اگر وہ تعرض نہ بھی کریں جب بھی ہم کو تعرض کرنا چاہئے کیونکہ حقیقت میں گو وہ مسلمان نہیں مگر ہمارے سکوت سے عام مسلمانوں کو تو یہ خیال ہوگا کہ یہ مسلمان ہیں تو پھر تو چندے وہ انھیں کو اپنے مقتدا اور پیر خیال کریں گے۔ پھر اس سے لوگوں کو ہٹانا مشکل ہوگا اس وقت میری آنکھیں کھل گئیں کہ بیشک میرا خیال غلط تھا۔ پھر میں نے اپنے دوستوں سے مشورہ کیا کہ ہمارے مبلغین کو کیا کرنا چاہئے

ان سے تعرض کرنے میں تو ضرر یہ تھا کہ کہیں دعوت ہی نہ رک جائے اور بجائے مرتدین کو مسلمان بنانے کے کہیں مرزائیوں ہی کے مناظرہ میں سارا وقت صرف نہ ہو جائے اور تعرض نہ کرنے میں یہ خیال ہوا کہ اگر لوگوں کو ایسی حالت میں چھوڑ دیا جائے کہ وہ جس کے ہاتھ پر چاہیں اسلام لے آئیں چاہے ہمارے ہاتھ پر یا مرزائیوں کے تو بعد اسلام لانے کے بعض نومسلموں پر ان کا اثر ہو جاوے گا پھر ہٹانا مشکل ہوگا اس لئے مشورہ کیا گیا غرض اس مصلحت کا بھی خیال تھا کہ اگر اب نہ رد کا جائے تو انجام میں اثر اچھا نہ ہوگا اور اس مفسدہ کا بھی خیال تھا کہ اس سے وہ نومسلم پریشان ہوں گے کہ ہم کدھر جائیں تو مشورہ پر بعض نے کہا کہ مقصود تو دعوت ہے تو مرزائیوں سے تعرض کرنا بھی دعوت ہے اس کو کیوں ترک کریں مسلمان بنانا تو ہمارے ذمہ فرض نہیں ہمارا کام دعوت ہے خواہ اس تعرض کے بعد کوئی مسلمان ہو یا نہ ہو اس کی پروا نہ کرنا چاہیئے اور اب یہاں آن کر بھی معلوم ہوا کہ راجح یہی ہے کہ ان کا رد ضرور کیا جائے اور نتیجہ پر نظر نہ کی جاوے اور اسی کو تو فرماتے ہیں ان ربك هو اعلم بمن ضل عن سبيله وهو اعلم بالمهتدين اور وما كان لنفس ان تؤمن الا باذن الله۔

چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا بعض دفعہ جی چاہتا تھا کہ وہی معجزہ ظاہر ہو جائے جو کفار چاہتے ہیں تو اس کا کیا عجیب و غریب جواب ملا۔ ان كان كبر عليك اعراضهم فان استطعت ان تبتغي نفقا في الارض او سلما في السماء فتاتيهم باية ولو شاء الله لجمعهم على الهدى فلا تكونن من الجاهلين پوری آیت کا مطلب تو ظاہر ہے صرف ولا تكونن من الجاهلين کے متعلق کچھ عرض کرتا ہوں بظاہر ترجمہ دیکھنے والوں کو خیال ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو

حق تعالیٰ نے ایسا سخت لفظ فرمایا یہ شبہ اصل میں غلط محاورہ سے ہوا ہے ہمارے محاورہ میں جاہل بہت سخت لفظ ہے اور اسی کا اگر ترجمہ کیا جائے تو آسان لفظ ہو جاتا ہے۔ جاہل کا ترجمہ نادان ہے یہ کتنا پیارا لفظ ہے اس سے توہین لازم نہیں آتی بلکہ شفقت کے موقع پر یہی بولا کرتے ہیں، چنانچہ ہمارے محاورہ میں بھی کہتے ہیں دیکھو میاں نادان کیسی باتیں نہ کرو دیکھو بچوں کی سی باتیں نہ کرو تو دیکھئے ظاہر میں تو جاہل کا لفظ کتنا سخت ہے مگر ترجمہ کے بعد اس کی حقیقت بالکل آسان ہے یہ اشکالات غلط محاورہ سے ہوتے ہیں۔

چنانچہ وطن میں ایک شخص نے میرے سامنے ایک اشکال پیش کیا اس طرح سے کہ پہلے مجھ سے پوچھا ووجدک ضالا فھدیٰ کا ترجمہ کردو پھر اشکال کروں گا میں سمجھ گیا کہ کیا اشکال ان کو پیش آیا ہے منشا اشکال کا یہ تھا کہ قرآن مجید کے بعض تراجم میں ضال کے معنی گمراہ کے لکھے ہوئے ہیں بس شبہ یہ تھا کہ اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو گمراہ کہا گیا ہے میں نے کہا کہ آیت کا ترجمہ یہ ہے کہ پایا آپ کو ناواقف پس واقف بنا دیا۔ اب وہ میرا منہ تکنے لگے میں نے کہا میاں بتلاؤ کیا اشکال تھا کہنے لگے اب تو کچھ بھی نہیں اس جگہ راز یہ ہے کہ ضلالۃ کا استعمال دو معنی میں ہوتا ہے ایک مذموم ہے چنانچہ ولا الضالین میں جو ضال کہا گیا ہے وہاں تو مذموم میں مستعمل ہے یعنی جو بعد وضوح حق بھی اتباع حق نہ کرے۔ اور ایک غیر مذموم ہے یہ کہ اب تک وضوح حق نہیں ہوا اس کے معنی ناواقفی کے ہیں جو نقص نہیں کیونکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایک زمانہ ایسا بھی گذرا ہے جس میں آپ پر حقائق واضح نہیں ہوئے تھے چنانچہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں ماکنت تدری ما الکتاب ولا الایمان یعنی نزول وحی سے پہلے آپ ان علوم کو کچھ بھی نہیں جانتے تھے ووجدک ضالا فھدیٰ میں یہی درجہ مراد ہے کہ پہلے آپ پر وضوح حقائق

نہیں ہوا تھا اب ہم نے وحی نازل کر کے حقائق کو واضح کر دیا اور ولا الضالین میں وہ درجہ مراد ہے کہ وضوح حق ہو چکا تھا مگر بعد وضوع حق بھی کجی اختیار کی تو جس طرح ضلالت کے دو معنی ہیں اسی طرح لفظ گمراہ بھی فارسی میں دونوں معنوں کو شامل ہے اسی لحاظ سے بعض مترجمول نے ضال کا ترجمہ گمراہ کیا ہے مگر اب ہمارے محاورہ میں گمراہ کا لفظ زیادہ تر معنی ثانی میں مستعمل ہوتا ہے۔ اس لئے اب ضرورت ہے ترجمہ بدلنے کی کہ ایسے الفاظ سے ترجمہ نہ کیا جاوے جس سے عوام دھوکہ میں پڑیں۔ اسی طرح لاتکونن من الجاھلین کے معنی یہ ہیں کہ آپ نادانوں کی سی باتیں نہ کیجئے اس سے کچھ بھی ابہام نہیں ہوتا بلکہ پیار کا لفظ ہے۔ دیکھو اگر تم کسی کو کہو او مرغی کے بچے تو وہ بھڑک اٹھتا ہے غضبناک ہوتا ہے گویا آگ لگا دی۔ اور اگر کہو او چوزے تو ہنس دیتا ہے اور یہ لفظ کس قدر پیارا معلوم ہوتا ہے بلکہ اس کو گمان ہوتا ہے کہ کہیں یہ مجھ پر عاشق نہ ہو گیا ہو تو دیکھئے لغت کے بدلنے سے اثر بدل جاتا ہے۔ اس لئے اس کی ضرورت ہے کہ ترجمہ ایسا کیا جائے جس سے سامعین کو وحشت نہ ہو میں یہ کہہ رہا تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا جی چاہتا تھا کہ کفار کو وہی معجزہ دکھلایا جاوے جس کو وہ چاہتے ہیں۔ اس کا جواب اللہ تعالیٰ نے یہ دیا کہ فان استطعت ان تبتغی نفقا فی الارض الآیۃ حاصل آیت کا یہ ہے کہ ہم تو ایسا معجزہ نہیں دکھلاتے اگر آپ کا جی چاہتا ہے تو زمین میں سرنگ لگا کر یا آسمان میں سیڑھی لگا کر لے آئیے، ہم بھی دیکھیں آپ کہاں سے لائیں گے کس قدر خشک اور مایوس کن جواب ہے تو اس آیت سے معلوم ہوا کہ کام کرنے والے کو ثمرہ عاجلہ پر نظر نہ ہونی چاہیئے اور اس کے عدم ترتب سے محزون نہ ہونا چاہیئے اور ایک تو طبعی حزن ہوتا ہے اس میں تو آدمی معذور ہے بلکہ ماجور ہے اور ایک مبالغہ فی الحزن ہے۔ یعنی

(باقی آئندہ ان شاء اللہ تعالیٰ)

سورج سورچ کر مجروح ہونا اس کی اجازت نہیں ان دونوں کے جمع کا طریق بیان کرتا ہوں وہ یہ کہ کسی میں نیت فقط رضائے خدا کی ہو یہ نیت ہی نہ ہو کہ وہ مسلمان ہی ہو جائے ہاں دعا کرتے رہے کہ یا اللہ اس کو مسلمان بنا دیجئے اور اس کے دل کے اندر اپنا خوف پیدا کر دیجئے دعا تو یہ کرے اور عمل وہ کرے کہ اپنے کام میں رضائے حق کو مدنظر رکھے اپنا کام صرف تبلیغ کو سمجھے خواہ ثمرہ مرتب ہو یا نہ ہو وہ خدا کے اختیار میں ہے اور اگر کسی کے ذہن میں اور کوئی صورت جمع کی ہو تو مطلع فرمائیں (اہل مجلس کی طرف سے جواب آیا کہ یہی بالکل صحیح ہے) ذوق گواہی دیتا ہے کہ یہ طرز کافی شافی ہے اس سے تکلیف بھی نہیں ہو گی حزن وملال بھی نہ ہو گا اور چونکہ دعا میں عرض معروض ثمرہ ہی کے متعلق ہو گی تو اس میں یہ نیت بھی ایک درجہ میں ہو جاوے گی کہ ثمرہ مرتب ہو بس اتنی نیت کافی ہے ثمرہ مرتب ہونے کے لئے اس سے زیادہ مناسب نہیں اور نیت بھی ایسے طریق سے ہے کہ حق تعالیٰ سے عرض حاجت کی ہے امید ہے کہ وہ پوری ہو گی قلوب ان کے ہاتھ میں ہیں انشاء اللہ تعالیٰ وہ قلوب کو پھیر دیں گے اور اگر اس دعا کے بعد بھی کامیابی نہ ہو یا اسے نہ ہو تم اس کی پرواہ مت کرو نیز دعا میں بھی یہ قصد نہ کرو کہ یہ ثمرہ ضرور مرتب ہو ہی جاوے گی اگر کوئی کہے کہ یہ تو احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خیال کرنا کہ مقصود پورا ہو ہی جاوے یہ دعا میں محمود ہے حدیث ان اللہ یحب الملحین فی الدعاء سے معلوم ہوتا ہے کہ دعا کے اندر یہ قصد ہونا چاہیے نیز ادعوا اللہ وانتم موقنون بالاجابۃ اور تم اسے منع کرتے ہو تو یہ بات یہ ہے کہ حدیث کا مطلب یہ ہے کہ دعا میں عزم تو یہی ہو کہ یہ مقصود پورا ہو جائے مگر اس کی ساتھ دوسری شق پر بھی رضا رہے یعنی دعا تو اسی نیت سے کرے کہ مراد پوری ہو ہی جائے لیکن یہ بھی دل میں رکھے کہ اگر نہ ہو تو اس پر بھی راضی اور خوش رہوں گا۔ مثلاً تندرستی کے لئے دعا کرتا ہے کہ یا اللہ ہمیں تندرست کر دے تو یہ نیت نہ کرے کہ اگر آپ کا جی چاہے تو کر دیجئے اور مرضی نہ ہو تو نہ کیجیے اس لئے کہ دعا کے اندر ان شئت کہنے کی ممانعت ہے

ضروری اطلاع:- یہ الابقاء جولائی اور اگست کا ڈبل ۴۶ صفحے ارسال ہیں

(اگست ۱۹۵۲ء)

حدیث میں ہے کہ ان شئت مت کہو کیونکہ ان کو مجبور کرنے والا کون ہے وہ خود ہی جو مناسب ہوگا کریں گے جو تمہارے لئے بہتر ہوگا وہی تجویز کریں گے تم اپنی طرف سے یہی غرض کرو کہ میری مراد پوری ہو جاوے، البتہ یہ شرط ضرور ہے کہ جس چیز کی دعا کرتا ہے وہ شریعت کے موافق ہو اور اس موافق سمجھنے میں اگر اجتہادی غلطی ہو جاوے تو عفو ہے مثلاً جس چیز کی دعا کرتا ہے یہ اس کو قواعد شرع کے موافق سمجھتا تھا اور واقع میں شریعت کے مخالف تھی تو اس پر دار و گیر نہ ہوگی غرض مراد تو شریعت کے موافق ہونا چاہیئے خواہ واقع میں یا اس کے اجتہاد میں مگر دعا تردد کے ساتھ نہ کرے جزم کے ساتھ کرے لیکن اس کے ساتھ ہی یہ سمجھے کہ اگر قبول نہ ہو تو بھی میں راضی رہونگا اور میرے لئے وہی بہتر ہوگا اور اسی میں خیریت ہوگی تو اس قضیہ معلقہ ذہنیہ سے اس غیر معلقہ ملفوظ کی تعدیل ہو جائے گی جب حقیقت دعا کی سمجھ میں آئے گی تو اب شبہ رفع ہوگیا اور جزم بالدعا و عدم قصد ثمرہ میں تعارض نہیں رہا خلاصہ یہ ہے کہ اصل مقصود سعی سے رضائے حق ہے نہ کہ ثمرہ اور اس کے ساتھ ہی ثمرہ کے لئے دعا کی بھی اجازت ہے مگر مبالغہ کے ساتھ اس کے پیچھے مت پڑو کہ ہو ہی جائے اور نہ ہو رنج کرتے بیٹھ جاؤ۔

چنانچہ فانت لہ تصدی اور لست علیھم بمصیطر میں اسی کی تعلیم ہے کہ آپ تبلیغ کرنے کے زیادہ پیچھے نہ پڑے وہ قبول کریں یا نہ کریں اس سے بحث نہ ہونا چاہیئے آپ اس کے درپے نہ ہوں آپ کا کام رضائے حق حاصل کرنا ہے نہ کہ ثمرات کہ وہ نہ اختیاری ہیں نہ موعود اسی لئے ہم کو کسی کے مسلمان بنانے کا حکم نہیں کیونکہ وہ دوسرے کے اختیار میں ہے اور ظاہر ہے قادر بقدرت الغیر کیسے قادر ہو سکتا ہے اختیار تو دوسروں کا اور اس سے کام لیں آپ یہ کیسے ہو سکتا ہے اس لئے ایسے امور کے متصدی ہونے سے بہت تکلیف ہوتی ہے بالخصوص سالکین کو ان کی تو ثمرات عاجلہ پر نظر کرنے سے گویا موت آجاتی ہے کیونکہ اہل علم کو ثمرۂ علم مرتب نہ ہونے سے بدحالی کا شبہ نہیں ہوتا اور سالکین کو ثمرۂ عمل حاصل نہ ہونے سے بدحالی کا شبہ ہو جاتا ہے وہ چاہتے ہیں کہ ہم کو ذوق شوق ہو گریہ طاری ہو میلان الی المعاصی نہ ہو معصیت کا وسوسہ بھی نہ ہو ہر وقت

محویت رہے مگر انسان اس کا مکلف کب ہے وہ تو صرف اس کا مکلف ہے اور اتنا ہی اس کے اختیار میں ہے کہ معاصی کا مرتکب نہ ہو جوارح اور قلب کو گناہ سے پاک رکھے نہ ہاتھ سے گناہ کرے نہ پیر سے اور نہ زبان اور دل کو معاصی میں مبتلا کرے خلاصہ یہ کہ تقاضائے معصیت پر عمل نہ کرے اگر تقاضے پر عمل نہ ہو تو پھر خواہ کتنا ہی میلان ہو واللہ ذرہ برابر بھی نقص نہیں بلکہ ماجور ہے کیونکہ اس وقت مشقت زیادہ ہوتی ہے نفس سے جہاد کرنا پڑتا ہے بار بار تقاضا ہوتا ہے اور وہ اس کو روکتا ہے اور جو شخص یوں چاہتا ہے کہ میلان ہی نہ ہو اور دل تو یہ اختیار میں نہیں اس کا قصد بے معنی پھر اگر ایسا کیا تو حقیقت میں وہ طالب حق نہیں طالب راحت ہے پس اس میں کید نفس ہے کہ مشقت سے بھاگنا چاہتا ہے مجاہدہ سے اکتاتا ہے پس میلان الی المعاصی کوئی نقصان کی بات نہیں یہ تھوڑا بہت سب کو ہوتا ہے حتیٰ کہ کاملین کو بھی ہوتا ہے ہاں کسی کا نفس ایسا مطمئنہ ہو جائے کہ گناہ کا خطرہ ہی نہ گذرے یہ اور بات ہے مگر یہ نادر ہے غرض خطرات کا آنا کوئی مضر چیز نہیں پس اس غم میں نہ پڑنا چاہئے گو غم میں پڑجانا بھی فی نفسہ مضر دین نہیں لیکن اس سے کلفت تو ہوتی ہے اور اس کلفت کا انجام یہ ہوتا ہے کہ بعض دفعہ کوئی بیماری لگ جاتی ہے پھر دین کے کاموں میں خلل پڑنے لگتا ہے۔ چنانچہ حضرت مولانا گنگوہی کی خدمت میں ایک شخص حاضر تھے جو مجاہدہ بہت کرتے تھے کھانا بہت کم کھاتے تھے اور اس سے ضعیف ہو گئے تھے تو مولانا نے فرمایا کہ حدیث میں ہے المومن القوی خیر من الضعیف وفی کل خیر یعنی اگر مومن تندرست طاقتور ہے تو کسی کی کچھ خدمت کر دے گا کسی کے لئے پانی لا دے گا اور اگر ضعف آگیا تو بجائے خادم ہونے کے مخدوم بن جائے گا دوسروں کا محتاج ہوگا کہ بھائی مجھے پانی پلا دو یہ لا دو وہ لا دو حتیٰ کہ بعض دفعہ نماز روزہ ادا کرنا بھی مشکل ہو جاوے گا ہاں ضعف اضطراری الگ بات ہے یہاں تو اختیاری کا ذکر ہے مگر انھوں نے نہ مانا اس کے بعد ان کے معدہ نے خشکی پیدا ہوئی اس سے کچھ الوان اور روشنیاں نظر آنے لگیں جن کو انھوں نے مولانا کی خدمت میں ظاہر کیا مولانا نے فرمایا کہ یہ مقدمہ جنون کا ہے علاج کرو مگر وہ اس کو بزرگی سمجھے ہوئے تھے علاج نہ کیا آخر مجنون ہو گئے ایک شخص نے مجھ سے بیان کیا کہ وہ برہنہ ایک درخت کے نیچے بیٹھے رہتے تھے وظائف

اور مجاہدہ تو الگ رہا فرائض بھی چھوٹ گئے۔ اس سے کیا نفع ہوا غرض امور غیر اختیاریہ کے درپے ہونے سے بہت کلفت ہوتی ہے اور اس کلفت سے بیمار ہو جاتا ہے بعض وقت مرجاتا ہے بعض لوگ خودکشی کر لیتے ہیں چنانچہ مولانا محمد یعقوب صاحب کی خدمت میں ایک طالب علم نے ایک حکایت بیان کی تھی کہ رامپور میں ایک شخص تھے ان کو ایسا ہی قبض طاری ہوا ساری کیفیات جاتی رہیں وہ سمجھے میں مردود ہو گیا اور کوئی دستگیر ہادی ملا نہیں آخر خودکشی کر لی۔ باقی یہ کہ اس سے مواخذہ ہو گا یا نہیں اس میں کلام کرنے کی ضرورت نہیں یہ مقدمہ ہمارے پاس نہیں آوے گا خدا جانتا ہے کہ وہ مغلوب الحال تھے یا نہیں مگر نقصان تو ہوا اور اس میں ایک باریک بات اور ہے وہ یہ کہ جو شخص یہ چاہتا ہے کہ ہماری حالت ایسی ہو ایسی ہو یہ شخص اپنے لئے خود تجویز کرتا ہے جو کہ خلاف عبدیت اور بے ادبی اور گستاخی ہے تمھیں کیا حق ہے تجویز کرنے کا تمھاری تو یہ حالت ہونا چاہیئے ؎

چونکہ بربیخت بربندد بستہ باش　　　چوں کشاید چابک و برجستہ باش

(جب وہ باندھ دیں بندھے رہو اور جب کھولدیں تو کھل جاؤ اور خوشی سے کودنے لگو)

چنانچہ ایک حکایت ہے حاجی صاحب کی اس سے آپ کو اس کی حقیقت معلوم ہو گی کہ ایک طالب آپ کے پاس آیا اور مرض کی شکایت کی کہ اتنے دنوں بیمار رہا اس مدت میں حرم شریف میں نماز پڑھنا بھی نصیب نہ ہوئی دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ صحت و قوت بخشے اس وقت حضرت نے اس کے لئے دعا کی کہ جب وہ چلا گیا تو فرمایا یہ شخص عارف نہیں ہے اگر عارف ہوتا تو نماز حرم کی غیر حاضری سے مغموم نہ ہوتا کیونکہ مقصود اصلی تو قرب ہے جس طرح بھی حاصل ہو اس کے طرق مختلف ہیں ایک طریق یہ بھی ہے کہ حرم میں آن کر نماز پڑھنے سے قرب حاصل ہو ایک طریق یہ بھی ہے کہ بیمار ہو جائے اور اس پر صبر کرے شکوہ شکایت نہ کرے اور اس سے قرب ہو تو مقصود جس طریق سے بھی حاصل ہو جائے اس پر راضی رہنا چاہیئے حصول مقصود کے بعد کسی طریق کے فوت پر حسرت کرنا مقصود کی بیقدری ہے اور اس کی ایک مثال بیان فرمائی کہ دیکھو لوگ جو حج کرنے آتے ہیں تو مقصود کیا ہے ظاہر ہے کہ مقصود حضوری بیت اللہ ہے کوئی خاص راستہ مقصود نہیں کہ مثلاً بمبئی ہی ہو کر آوے اب

ایک شخص تو بمبئی ہو کر آیا اس کو بہت سے حالات راستہ کے معلوم ہوئے اور ایک کراچی ہو کر آیا جس کو وہ خاص حالات معلوم نہ ہوئے اب کوئی بیوقوف ہی ایسا ہوگا جو جج کو چھوڑ کر کراچی سے بمبئی آوے تاکہ یہ حالات معلوم ہوں صوفیہ نے لکھا ہے طرق الوصول الی اللہ بعدد انفاس الخلائق کسی کے لئے کوئی طریق ہے کسی کے لئے کوئی طریق ہے کوئی طریق مقصود نہیں مقصود رضا ہے جب رضا حاصل ہے تو اب تمنا کرنا کہ یہ ہو وہ ہو یہ تجویز ہے جو ادب طریق کے خلاف ہے۔ صوفیہ تو اپنے ارادہ کو ایسا مٹاتے ہیں کہ یہاں تک کہتے ہیں ؎

ارید وصالہ ویرید ہجری   فاترک ما ارید لما یرید

(میں تو ان کا وصال چاہتا ہوں وہ ہم سے دوری چاہتے ہیں پس میں اپنا ارادہ ترک کرتا ہوں تاکہ محبوب کا ارادہ پورا ہو)

اور حافظ شیرازی نے اسی کا ترجمہ فارسی میں کیا ہے فرماتے ہیں کہ ؎

میل من سوئے وصال و میل او سوئے فراق   ترک کام خود گرفتم تا برآید کام دوست

(میری خواہش وصل کی ہے اور محبوب کی خواہش فراق کی ہے میں اپنے مقصد سے باز آگیا تاکہ میرے محبوب کا مقصد حاصل ہوجاوے)

پس عبدیت یہ ہے کہ اپنی خواہش کو فنا کردے جو ان کا ارادہ ہے اسی پر راضی رہے بعض عارفین نے فرمایا ہے ارید ان لا ارید واختار ان لا اختار اسپر ابن عطا اسکندری نے ایک اشکال وارد کرکے خود جواب دیا ہے اشکال یہ ہے کہ عدم ارادہ کا ارادہ یہ بھی تو ایک ارادہ ہوا پھر ارادہ کا فنا، کہاں ہوا کسی معقول کا اشکال معلوم ہوتا ہے پھر خود جواب دیا ہے کہ مطلوب مطلق ارادہ کا فنا کرنا نہیں بلکہ صرف اس ارادہ کا جو کہ رضا کے خلاف ہو اور عدم ارادہ کا ارادہ رضا کے خلاف نہیں کیونکہ خداوند کریم بھی چاہتے ہیں کہ بندہ کسی ایسی بات کا ارادہ نہ کرے جو رضا کے خلاف ہو پس عدم ارادہ کا ارادہ فنا، ارادہ کے منافی نہ ہوا۔

خلاصہ یہ کہ اعمال اختیاریہ میں کمی نہ کرے اور ثمرات غیر اختیاریہ میں تفویض کرے اس قدر ان کے درپے نہ ہو کہ فقدان پر غم کرنے لگے البتہ جو ان میں محمود ہیں ان کے لئے دعا کا مضائقہ نہیں پھر حاصل ہوں تب اور نہ حاصل

ہوں تب دونوں حال میں راضی رہو اور اختیاری اعمال میں لگے رہو کیونکہ غم تو جب ہوتا ہے جب ان ثمرات کا وعدہ ہوتا۔ یہ وعدہ کہاں ہے کہ ذوق شوق بھی عطا کروں گا ہاں حدیث میں اس کی دعا آئی ہے تو ذوق شوق کے واسطے دعا کرو اس سے کام میں سہولت ضرور ہوتی ہے اس لئے اہل طریق نے کہا ہے کہ یہ احوال مقصود نہیں ہیں ہاں محمود ہیں جب محمود ہیں تو دعا کرو اور جب مقصود نہیں اس کے فقدان سے پریشان نہ ہو نہ ان کا انتظار کرو جیسے مقولہ مشہور ہے الحائک اذا صلی یومین انتظر الوحی ایسے امور غیر اختیاریہ دغیر موعودہ کے متعلق حضرت حاجی صاحب سے کوئی شکایت کرتا کہ حضرت ذکر سے نفع نہیں ہوتا تو حضرت فرماتے کہ یہ کیا تھوڑا نفع ہے کہ خدا نے تم کو اپنا نام لینے کی توفیق دی اور اکثر یہ شعر پڑھتے ؎

یابم اورا یا نیابم جستجوئے میکنم   حاصل آید یا نیاید آرزوئے میکنم
(اس محبوب کو پاجاؤں یا نہ پاؤں ہم تو ان کی تلاش میں لگے رہیں گے وہ حاصل ہوں یا نہ حاصل ہوں ہم ان کی آرزو سے دستبردار نہ ہوں گے)

یہاں ایک علمی اشکال ہے وہ یہ کہ یافت حق تو نصاً مطلوب ہے اور اسی کے پانے کے لئے تو رات دن مستانہ وار پھرتے ہیں پھر نہ یافت پر رضا جواب یہ ہے کہ قائل کی اصلاح نہ جاننے سے یہ اشکال وارد ہوا ہر فن کی اصلاح جدا ہے عشاق کی الگ اصلاح ہے علماء کی جدا اصلاح ہے تو ہر متکلم کی اول اصلاح جاننا چاہیئے۔ یہاں یافت حق سے مراد یافت حقیقی نہیں یافت مرغوب ہے جو اس نے اپنے ذہن میں تراش رکھا ہے کہ اگر یہ بات حاصل ہو جو میرے ذہن میں ہے تب تو یافت متحقق ہو ورنہ نہیں ہوا تو اس کو فرماتے ہے کہ یہ خواہ حاصل ہو یا نہ ہو اس کو چھوڑو اپنا کام کئے جاؤ اسی کو عارف شیرازی دوسرے صاف عنوان سے فرماتے ہیں ؎

فراق و وصل چہ باشد رضائے دوست طلب   کہ حیف باشد ازو غیر او تمنائے
(فراق اور وصل کوئی چیز نہیں اصل چیز دوست کو راضی کرنا ہے بس یہی طلب کرو رضائے دوست کے علاوہ کچھ اور تمنا کرنا افسوس کی بات ہے)

فراق اور وصل دونوں کی نفی کرکے رضا کو مطلوب فرماتے اس سے صاف معلوم ہوا کہ وصل

حقیقی مراد نہیں وہ تو عین رضا ہے نہ کہ مقابل رضا کا اسیطرح فراق حقیقی مراد نہیں وہ تو منافی رضا کا ہے نہ کہ ممکن الاجتماع رضا کی ساتھ بلکہ وصال و فراق مزعوم یعنی تم جس کو فراق یا وصل سمجھے ہوئے ہو اس کا کچھ اعتبار نہیں تم اپنی نظر رضا پر رکھو۔ باقی حقیقی وصال اور رضا میں تو تلازم کا علاقہ ہے یعنی رضا مستلزم ہے وصال کو یا یوں کہو کہ وصال مستلزم ہے رضا کو وصال میسر ہو تب بھی مطلوب حاصل رضا میسر ہو جب بھی مدعا حاصل اسی کو کہتے ہیں کہ ؎

بخت اگر مدد کند دامنش آورم بکف ۔۔۔ گر بکشد زہے طرب در بکشم زہے شرف

(اگر قسمت نے موافقت کی تو محبوب کے دامن کو ہاتھ میں پکڑلوں گا پھر اگر اس نے کھینچ لیا کیا ہی لطف ہوگا اور اگر ہم نے کھینچ لیا تو میری خوش قسمتی ہوگی)

یعنی خواہ یہ لازم ہو اس کو یا وہ لازم ہو اس کو دونوں طرح مطلب حاصل ہے۔ یہ ممکن نہیں کہ وصال بلا رضا ہو جائے جب یہ ہے تو پھر اس کے کوئی معنی ہی نہیں کہ رضا تو طلب کرو اور وصال کے طالب مت بنو تو اس سے صاف معلوم ہوا کہ وصال دو قسم پر ہے ایک وصال مزعوم اور ایک واقعی نفی وصال مزعوم کی ہے اور طلب وصال واقعی کی اب میں اس کے مصداق کی تعیین کرتا ہوں اس لئے کہ اس غلطی میں سالکین بکثرت مبتلا ہیں وہ وصال مزعوم بسط ہے اور فراق مزعوم قبض ہے جب قبض ہوتا ہے تو سالک کو بڑی تنگی ہوتی ہے اور اس کو یہ متوہم ہوتا ہے کہ میں مردود ہو گیا اور یہ کم و بیش سب کو پیش آتا ہے الا ماشاء اللہ تو فراق سے یہ قبض مراد ہے اور وصل سے اس کا مقابل بسط اور یہاں قبض و بسط اصطلاحی مراد ہے نہ کہ لغوی یعنی واردات و احوال کا فیضان و فقدان پس عارف شیرازی اس کے متعلق تسلی فرماتے ہیں کہ قبض و بسط کیا چیز ہے جس کو تم فراق و وصل سمجھ رہے ہو اور اس کے پیچھے پڑے ہو۔ تمہارا کام تحصیل رضائے حق ہے اسی کے طالب بنو اور یہی معنی ہیں یا ہم اور ایا نیا ہم کے ورنہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ جستجو میکنم کے بعد نیا ہم کا احتمال رہے حالانکہ حدیث میں ہے من تقرب الی شبراً تقربت الیہ ذراعاً الحدیث خلاصہ یہ کہ صوفیہ کے نزدیک تسلیم و رضا روح سلوک ہے اور جتنے عقبات اس طریق میں پیش آتے ہیں

ان میں بڑا حصہ کا حل یہی رضا ہے اور اسی کا تتمہ یہ ہے کہ غیر اختیاری امور کے پیچھے نہ پڑے یہ دونوں باتیں اگر سمجھ میں آجائیں تو پھر کبھی پریشانی نہ ہوگی اور میں نے صوفیہ کا یہ قول کہ ثمرات کا مرتکب ہونا مقصود نہیں مقصود رضا ہے اپنے مضمون کی تائید میں پیش کر دیا ورنہ یہ مضمون خود قرآن کی آیات میں موجود ہے کہ تبلیغ میں ثمرہ مقصود نہیں اصل مقصود رضا ہے جس کا طریق عمل وسعی ہے۔ اب دعا کیجئے کہ حق تعالیٰ ہم کو کجی سے بچاوے اور فہم سلیم و توفیق عمل عطا فرماوے آمین۔ وصلے اللہ تعالیٰ وسلم علی خیر خلقہ سیدنا و مولانا محمد و علی آلہ واصحابہ اجمعین واٰخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

مختصر کیفیت سفر رقم زدہ صاحب وعظ جس میں یہ وعظ ہوا معنون بہ حکمت حقہ

منقول از رسالہ النور ماہ ذی الحجہ ۱۳۴۱ھ

جس کو منتظم اشاعۃ وعظ نے لطف ناظرین وعظ کے لئے وعظ کے ساتھ ملحق کر دیا وھو ہذا

حکمت حقہ

یعنی

بگذر از ظن خطا اے بدگمان ان بعض الظن اثم را بخوان

کا ایک اہم مصداق

حضرات علماء مدرسۂ دیوبند بارک اللہ تعالیٰ مد فیوضہم کے متعلق مختلف روایات اس احقر کے بارہ میں سننے میں آتی تھیں چونکہ بعض واقعات اس کے معارض بھی ظاہر ہوتے تھے چنانچہ اسی زمانہ میں جناب مہتمم صاحب کا اپنی صاحبزادی کی شادی میں یاد فرمانا اور احقر کے عذر کے بعد جناب نائب مہتمم صاحب کا محض ملاقات کیلئے یاد فرمانا جس میں وہ حضرات فضیلت سبقت وارد حدیث خیرھما الذی یبدء بالسلام پر فائز اور اس کے حائز ہے گو مجھ کو ان ارشادات کی تعمیل کی توفیق نہیں ہوئی اس لئے بمقتضائے آیت و لا تقف ما لیس لک بہ علم و قولہ تعالیٰ فی الحجرات فتبینوا ان آیات پر دثوق نہ کر کے وسوسہ طبیعت کے ازالہ کے لئے یہ طریقہ اختیار کیا گیا کہ رسالہ موذی مرید حضرات کی خدمت میں بغرض تحصیل رائے متعلق موذی مذکور و احقر عدیم الشعور بھیجا گیا جس پر وہ جواب آیا جو النور بابت رمضان و شوال ۱۳۴۱ھ میں صفحہ الف و ب پر شائع ہوا ہے اس کے بعد پھر تیسری با

حاضری کی تحریک فرمائی اس پر احقر نے مجملاً روایت بعض حضرات کے تکدر کی اپنے عذر حاضری میں نقل کر دی، اس کے جواب میں جو خط آیا اس کے بعض جملے یہ ہیں۔

(۱) یہاں بحمد اللہ کسی کو انقباض و تکدر نہیں۔ (۲) اگر فی الواقع ایسا ہو بھی تب بھی مجھے جناب سے یہی توقع رکھنی چاہیئے کہ اس عقدہ کو حل فرما کر جماعت کو انتشار و تشتت سے بچالیں اگر غیر مناسب نہ ہو تو طیب و طاہر حاضر ہو جائیں اور جناب کے ساتھ ہی یہاں واپس آئیں اور اگر سردست میری معروضات کے قبول کا وقت نہیں آیا تو پھر میں حاضر ہوں گا۔ اس پر میں نے ان روایات کی کچھ مختصر تفصیل ان کی تحقیق کی جس کے جواب کے بعض جملے یہ ہیں۔ یہ تو ظاہر ہے کہ باہم اکابر و اصاغر و اوساط میں اختلاف رائے رہا اور رہے اور یہ بھی ظاہر ہے کہ ان اختلافات کی وجہ سے باہم اعتراضات بھی ہوئے مجھے خود بھی جناب سے بعض رایوں میں اختلاف تھا لیکن الحمد للہ تنقیص و توہین کو سننا بھی گوارا نہیں کیا۔ اختلاف آرار مسائل کی صورت میں اعتراض کرنا شرعاً مذموم نہیں سمجھا گیا سب سے اول مشاجرات صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کو دیکھا جائے کہ جلیل القدر صحابہ یہاں تک کہ عشرہ مبشرہ بلکہ خلفاء راشدین میں بوجہ اختلاف اعتراض کئے گئے ہیں بلکہ بعض اوقات سخت الفاظ استعمال کئے گئے ہیں یہاں تک کہ قتال کی نوبت پہنچ گئی لیکن یہ اسی حد تک تھا جہاں تک اختلاف رائے کا تعلق تھا اور جب نفس ذات پر نظر جاتی تھی تو وہی اصل ارتباط معلوم ہوتا تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت عائشہ صدیقہ و حضرت طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہم کے واقعات موجود ہیں، حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے ایک فروعی مسئلہ میں حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ کی نسبت سخت الفاظ استعمال فرمائے

اس کے بعد ائمہ مجتہدین اور ان کے اتباع کے اختلافات موجود ہیں۔ امام شافعی رضی اللہ عنہ حضرت امام اعظم پر اور ان کے متبعین پر سخت الفاظ میں اعتراض کرتے ہیں لیکن جب نفس ذات امام اعظم اور ان کے فضل وکمال پر نظر جاتی ہے تو غایت درجہ کا ادب کرتے ہیں یہاں تک کہ نماز صبح میں قنوت بھی ترک کر دیتے ہیں اسی طرح امام شافعی اپنے استاد امام مالک پر سختی سے اعتراض کرتے ہیں، یہ بھی بطور قاعدہ کلیہ کے ہے کہ اختلاف اگرچہ اصولی نہ ہوں فروعی ہوں حقیقی نہ ہوں لفظی ہوں مگر ابتدا میں بوجہ جوش و ہیجان ایک دوسرے کے خلاف جوشیلے الفاظ استعمال کر لیتے ہیں اور بسا اوقات یہ جزوی اختلاف فساد کی طرف منجر ہو جاتے ہیں لیکن انجام کار سکون پیدا ہو جاتا ہے اشاعرہ وماترید یہ اصولاً متفق ہیں صرف چند مسائل میں اختلاف کی وجہ سے کیسے کیسے خلاف ہوئے طعن وتشنیع کے دروازے کھلے، نوبت بہ مخاصمت وتضلیل پہونچی مگر انجام جب صلح ہوئی تو معلوم ہوا کہ اکثر اختلافات لفظی تھے اور جو بعض اختلاف حقیقی بھی تھے تو ان سے تضلیل و تفسیق ہوئی بجنسہ یہی حالت ہم لوگوں کی جناب کے ساتھ تھی اختلاف ضرور تھا' اعتراض بھی کرتے تھے لیکن جناب کی ذات سے وہی تعلق تھا۔ کسی نے حالت ناراضی میں کوئی لفظ بھی کہا تو وہ اس حالت کا اقتضاء تھا اس سے زیادہ کچھ نہ تھا اور ہم میں سے اکثروں نے بالکل احتیاط کا طریقہ رکھا اور اکثروں کا طریقہ یہ رہا کہ نفس مسئلہ میں اختلاف کے ساتھ جناب کی طرف سے مدافعت کرتے رہے۔ مثال کے طور پر مولوی حسین احمد صاحب کو خیال فرما لیا جاوے کہ رسالہ بھی لکھا لیکن جناب کی ذات سے ان کا تعلق ویسا ہی رہا معترضین کو بگڑ کر جواب دیتے رہے۔ یہ میں نے جو کچھ عرض کیا اس سے میری غرض یہ ہے کہ ایسے شدید ہیجان جوش

اور اختلاف رائے کے وقت اگر کسی سے کوئی امر خلاف شان سرزد ہوا تو ایسی حالت میں کہ اصولاً سب متفق ہیں اختلاف ہے تو صرف مصالح دینی کی بنا پر جس کے نزدیک جو جانب راجح معلوم ہوئی اس پر عمل کیا تو میرے نزدیک اس میں زیادہ کنج و کاؤ نہ کی جائے بلکہ اصول کو مد نظر رکھ کر عارضی اختلافات کو رفع کر دیا جائے۔ خلاصہ عرض یہ ہے کہ بہت سی روایات اور واقعات اصلی حالت میں نہیں پہنچے اس میں شک نہیں کہ اختلاف پیدا ہوا اور اس کی وجہ سے شکوہ شکایت اور اعتراضات کی نوبت پہونچی، لیکن بایں ہمہ یہ اعتراضات مخالفانہ یا معاندانہ نہ تھے بلکہ جیسا کہ اہلِ حق کی دو جماعتوں میں اکثر ہوا ہے تھے اکثر اختلافات کا مبنی عزیمت و رخصت پر تھا ایسی حالت میں باوجود اختلاف کے دینی تعلقات برابر قائم رہے اور ہیں جن اکابر یا بالخصوص اصاغر کی طرف جناب کو خیال ہے ان کی طرف بہت سی باتیں غلط طور پر منسوب ہو جائیں، صورت حال ایسی تھی کہ جو کچھ روایت ہوا چسپاں ہو گیا اور اس میں کسی ایک جانب کی خصوصیت نہیں ہے یہ میں دعوے سے کہتا ہوں کہ تعلقات کبھی بھی منقطع نہیں ہوئے مجھے امید ہے کہ جناب ان روایات پر توجہ نہ فرمادیں گے اور میری نیاز مندانہ عرض قبول فرماکر یہاں تشریف لانے کا قصد فرمائیں فقط والسلام

احقر حبیب الرحمٰن عفی عنہ از دیوبند ۲۱ ذی الحجہ ۱۳۴۱ھ

اس پر احقر نے عرض کیا کہ قبول ارشادات پر کلام کو ختم کرتا ہوں اور دو سوال محض ناز سے اور کرتا ہوں۔ ۱ اگر دوسرے فریق کی طرف سے بعینہٖ یہی معاملہ حضرات دیوبندی رحمۃ اللہ کی ساتھ ہوا ہو کیا اس عذر سے وہ بھی منتفع ہو سکتا ہے۔ ۲ اگر یہ تحریکات حد تمنا تک کامیاب ہو جائیں کیا اسی لطف و کرم کی ابتدا اس احقر کے ساتھ پھر بھی ہوتی۔ اس کا جواب آیا۔

۱ فریقین نے اختلاف رائے کی وجہ سے اعتراض کئے توہین و تنقیص نہیں کی اور نہ

ان کا مقصود یہ تھا تو دونوں اس حیثیت میں مساوی ہیں اگر معذور ہیں تو دونوں اگر نہیں ہیں تو دونوں کوئی وجہ فرق نہیں۔ ؎ اگر تمام تمنائیں پوری ہو جاتی تو سچ عرض کرتا ہوں کہ اس سے زیادہ الحاح کے ساتھ ابتدار کرتا الٰی آخرہ۔

(حبیب الرحمٰن ۱۶ ذی الحجہ ۱۳۴۱ھ شنبہ)

اس کے بعد میں نے عذر کی کوئی گنجائش نہیں دیکھی اور چہار شنبہ ہی کے روز دیوبند حاضر ہوگیا اور پنجشنبہ کو تمام دن لقاء احباب سے جانبین میں عید کا لطف حاصل رہا اور اس لطف کی تکمیل شب جمعہ کے ایک وعظ پر ہوئی جس کی احقر کو فرمائش کی گئی اس سرور کے واقعات اور ان کے زمان و قوع کا اس شعر نے گویا نقشہ کھینچ دیا ہے ؎

عید و عید و عید صرن مجتمعہ ؛ وجہ الحبیب (اشارۃ الی اسم حضرت الداعی) وشہر العید (ذی الحجہ) والجمعۃ (لیلۃ الوعظ) اس صلح کی مسرت کے ساتھ ایک دوسری صلح کی مسرت نورٌ علیٰ نور ہو گئی یعنی زمان مکاتبت میں ایک عزیز کے خط میں یہ خبر نظر سے گذری آج ترکوں کا معاہدہ اپنے مخالفین سے مکمل ہو چکا اور دستخط ہو گئے۔ آہ ان دو صلح کی مسرت کے ساتھ ایک تیسری چھوٹی سی صلح کی مسرت کا اور اضافہ ہوا یعنی قصبہ ہذا میں مسلمانوں کی ایک جماعت میں کچھ اور آویزش تھی خط اخیر کی آمد ہی کے روز باہمی فیصلہ پر فریقین کی رضامندی گوش زد ہوئی جس سے ایک نور طبعی نے نورین کو انوار بنا دیا۔ اس اجتماع کا شکر ایک شعر میں ظاہر کر کے ختم کرتا ہوں ؎

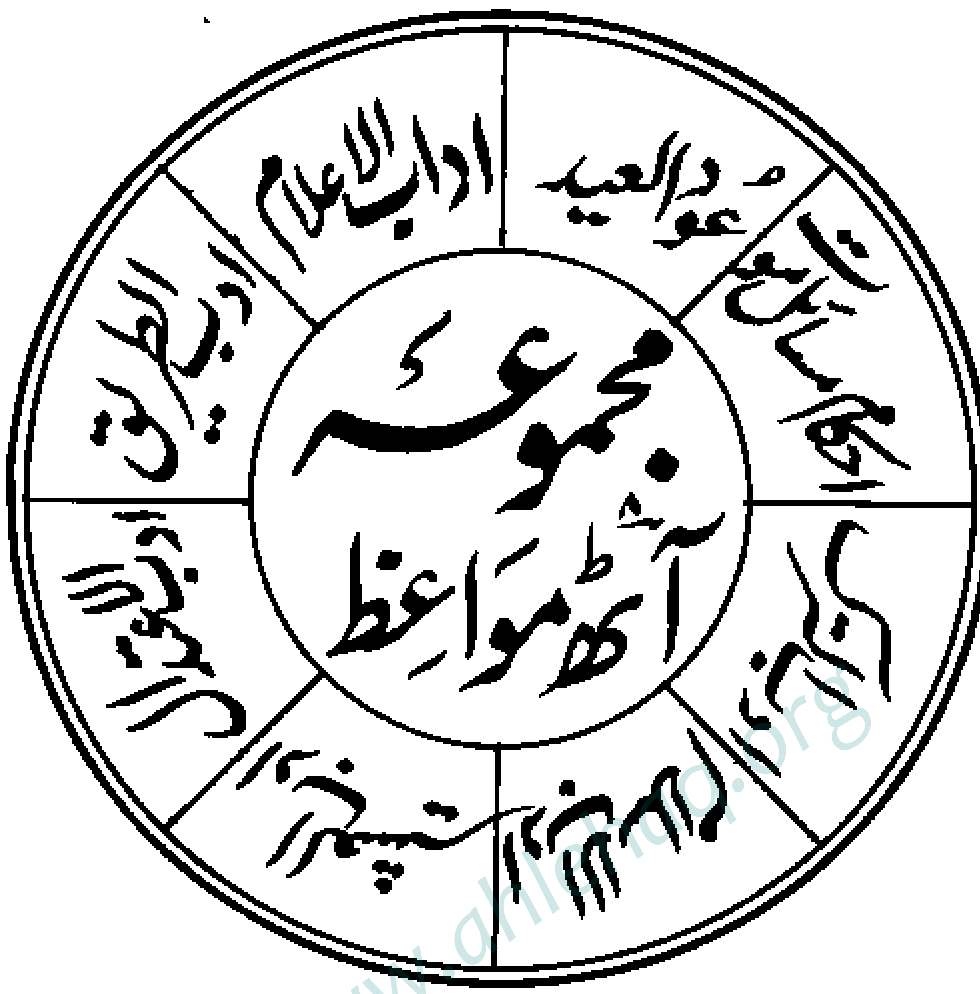
سرورٌ فی سرورٍ فی سرورٍ ؛ و نورٌ فوق نورٍ فوق نورٍ

للتاسع عشر من ذی الحجہ یوم الجمعۃ ۱۳۴۱ھ

کتبہ اشرف علی

قال النبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم بلغوا عنی ولو آیۃ
(رواہ البخاری)

مواعظ



مجملہ ارشادات :

حکیم الامۃ مجدد الملۃ حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی
رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

ناشر : محمد عبد المنان غفرلہ

مکتبہ تھانوی — دفتر الابقاء
مسافر خانہ بندر روڈ کراچی
ایم - اے جناح روڈ
۱۳

ادب الاعلام

ملقب بالکنز النامی

بمناسبت بڑھل گنج

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تقریر حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ درکمپ نرہر پور ضلع گورکھپور مورخہ ۱۲ صفر ۱۳۳۵ھ روز دوشنبہ شروع سات بجکر ۳۲ منٹ صبح وختم پونے نو بجے در راہ بڑھل گنج مطابق ۱۸ دسمبر ۱۹۱۶ء کل وقت ایک گھنٹہ ۱۳ منٹ ماہ صفر ۱۳۳۵ھ میں حضرت والا کا سفر بغرض تبدیل آب و ہوا اور ملاقات اپنے بھائی صاحب منشی اکبر علی صاحب منیجر ریاست مجھولی ضلع گورکھپور کے ہوا چونکہ منشی اکبر علی صاحب دورہ پر تھے اور مقام نرھر پور میں قیام تھا اس واسطے حضرت والا وہیں تشریف لے گئے۔ وہاں سے ایک قصبہ بڑھل گنج قریب میل ڈیڑھ میل کے فاصلہ پر ہے۔ وہاں کے لوگوں کے اشتیاق ظاہر کرنے کی وجہ سے یہ تجویز ہوئی کہ صبح کو بوقت ہوا خوری اسی طرف تشریف لے چلیں چنانچہ منیجر صاحب نے ہاتھی بھجوا دیا اور حضرت والا مع چار خدام کے بڑھل گنج کو روانہ ہوئے۔ ہاتھی پر گھنٹہ بھی تھا راستہ میں اسی پر گفتگو شروع ہوئی اور اس تقریر کو ایسا ابتداد ہوا کہ بڑھل گنج پہونچ کر مسجد میں بھی دیر تک منقطع نہ ہوئی اور ڈیڑھ گھنٹہ تک سلسلہ جاری رہا۔ چونکہ مضمون نہایت معنی خیز تھا اس واسطے دل چاہا کہ یہ تقریر علیحدہ دیگر مواعظ کی طرح ضبط ہو جائے۔ اور احقر نے حضرت سے عرض کیا کہ اس کا نام

بھی علیحدہ تجویز فرما دیا جاوے۔ چنانچہ حضرت نے مجموعہ مضامین پر خیال فرما کر ادب الاعلام تجویز فرما دیا جس کی مناسبت مطالعہ تحریر ہذا سے بخوبی واضح ہو جائے گی اور بمناسبت بڑھل گنج لقیب اس کا کنز نامی تجویز فرمایا۔

فرمایا اس میں علماء کا اختلاف ہے کہ یہ گھنٹہ جائز ہے یا ناجائز ترجیح اس کو دی ہے کہ جائز ہے۔ احقر نے عرض کیا حدیث میں تو اس کی ممانعت آئی ہے۔ فرمایا اس میں اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ کسی نے اس کو معلل بعلت سمجھا اور کسی نے غیر معلل مجوزین نے علت اس کی تفاخر قرار دی ہے جہاں یہ علت نہ ہو وہاں حکم منع بھی نہ رہے گا چنانچہ فقہاء نے لکھا ہے کہ راستہ والوں کو خبر کرنے کے لئے یا جانور کو نشاط میں لانے کے لئے درست ہے ہاں جہاں کوئی فائدہ نہ ہو اور صرف تفاخر رہ جاوے تو درست نہیں جیسے امراء اکثر صرف نمود اور ارفع شان کے لئے لگاتے ہیں معلوم ایسا ہوتا ہے کہ اس کی ایجاد تو غرض صحیح کے لئے تھی پھر اس میں نمود اور تفاخر شامل ہو گیا اور اب تک بھی غرض صحیح اس میں موجود ہے۔ چنانچہ میں نے ایک گاڑی بان سے پوچھا کہ تم لوگ گھنٹہ اور ٹالیں کیوں لگاتے ہو کہا تجربہ ہے کہ اس سے بیل چلتے زیادہ ہیں اور ہاتھی کے گھنٹہ سے راستہ والوں کی اطلاع کے علاوہ یہ بھی فائدہ کہ آبادی میں کو جاوے تو وہ عورتیں پردہ کر لیں جن کے مکانوں کی دیواریں پست ہیں۔ محدثین نے اس کی علت صرف یہ سمجھی ہے کہ جرس سے اس واسطے منع فرمایا گیا تھا کہ دشمن کو خبر نہ ہو جائے۔ یہ علت سوائے جہاد کے اور کہیں نہیں پائی جاتی اس واسطے سوائے مجاہدین کے قافلہ کے اور کہیں ان کے نزدیک منع نہ ہوگا اور فقہاء نے علت تفاخر کو سمجھا لہذا جس جگہ بھی یہ علت ہو منع ہوگا تو فتوی محدثین کا اس بارہ میں اوسع ہے فقہاء سے

محدثین کا مطمح نظر روایت ہوتی ہے اور فقہا درایت سے کام لیتے ہیں جیسے غنا محدثین کے نزدیک بلا مزامیر جائز ہے کیونکہ حدیث میں لفظ معازف کا آیا ہے اور فقہاء کے نزدیک بلا مزامیر بھی جائز نہیں کیونکہ وہ علت کو سمجھتے ہیں اور وہ خوف فتنہ ہے وہ جیسے مزامیر میں ہے غنائے صرف میں بھی موجود ہے محدثین موقع نص سے تجاوز نہیں کرتے اور فقہاء اصل منشاء حکم کو معلوم کر کے دیگر مواقع تک حکم کو متعدی کرتے ہیں (پھر ایک مضمون کے سلسلہ میں محققین کا ذکر ہوا اس پر فرمایا) محقق کی نظر بہت وسیع ہوتی ہے وہ حقیقت کا جویاں ہوتا ہے لایعنی باتوں میں پڑنا نہیں چاہتا صحابہ کی شان بھی یہی تھی ان کے آپس کے اختلافات دیکھ کر شبہ ہو سکتا ہے کہ ان کے کیسے اخلاق تھے۔ چنانچہ بعض جاہل ان حضرات پر اعتراض کرتے ہی ہیں لیکن تعجب کی بات یہ ہے کہ جہاں موقعہ اتحاد کا ہوتا تھا وہاں ایسے ایک جان دو قالب ہوتے تھے کہ کہیں دنیا میں اس کی نظیر ملنی مشکل ہے یہ دونوں باتیں کیسے جمع کہ اخلاق ایسے خراب ہوں کہ ایسی ایسی منازعتیں ان میں ہوں اور دوسرے وقت وہی حضرات ایسے ایک دل ہو جائیں گویا منازعت کا ان میں مادہ ہی نہیں ضرور ہے کہ وہ منازعت فساد اخلاق پر مبنی نہ تھی بلکہ تحقیق پر مبنی تھا دو محقق جو انتہا درجہ کے محقق ہوں بہت کم ایک بات پر متفق ہو سکتے ہیں یہ بات ظاہراً بعید ہی معلوم ہوتی ہو گی لیکن بالکل صحیح ہے اور یہ کچھ دین ہی پر موقوف نہیں دنیا کی باتوں میں بھی دیکھ لیجئے کسی فن کو اٹھا کر دیکھئے دو محقق کی رائے کبھی موافق نہ ہو گی طبی مسائل میں جالینوس کی تحقیق اور ہے اور شیخ کی اور ہے اور بقراط کی اور ہے یہ اختلاف کیوں ہے ظاہر ہے کہ یہ سب ائمہ فن تھے اور ان کو طب کی ترقی کی کوشش تھی طب کے ساتھ ان کو عداوت نہ تھی پھر ان کے اختلاف کے کیا معنے انصاف کی نظر سے دیکھا جائے تو یہ اختلاف اسی اصول پر مبنی ہے کہ دو محقق کی رائے متفق نہیں ہوتی محققین کی شان ہمیشہ یہی ہوتی ہے کہ حقیقت کو سمجھنا چاہتا ہے اور حقیقت کے بہت سے پہلو ہوتے ہیں اور احاطہ سب پہلوؤں کا یہ خدا کا کام ہے تو ایک ایک پہلو پر

نظر جاتی ہے اس لئے ایک دوسرے سے اتفاق نہیں کرتا وسیع النظر اتنا ہوتا ہے کہ دوسرے محقق کی نسبت کوئی برالفظ بھی کہنا پسند نہیں کرتا ائمہ ومجتہدین کا اختلاف بھی اسی قسم کا ہے کہ آپس میں اتنا اختلاف ہے کہ ایک صاحب ایک چیز کو فرض کہتے ہیں اور دوسرے اسی کو حرام کہتے ہیں یہ کتنا بڑا اختلاف ہے مگر ساتھ ہی اس کے یہ حالت بھی انھیں کی ہے کہ امام شافعی کا ادب امام ابو حنیفہ کے ساتھ مشہور ہے دیکھئے اتنا اختلاف اور اتنا اتحاد اس اختلاف کی وجہ سوائے غایت درجہ کے محقق ہونے کے کچھ نہیں ہے اور محقق ہمیشہ وسیع النظر ہوتا ہے۔ اور ایک شان محقق کی یہ ہوتی ہے کہ فضول مباحثہ سے بچتا ہے اور غیر محقق اور غبی سے گفتگو نہیں کرتا بلکہ اگر غبی سے گفتگو ہو تو ذرا میں خاموش ہو جاتا ہے جس کو عوام ہار جانا سمجھتے ہیں اس کی وجہ یہ نہیں ہوتی کہ اس کے پاس دلیل نہیں ہے اور یہ کہ وہ واقع میں ہار گیا بلکہ وجہ یہ ہوتی ہے کہ نا حقیقت شناس کو سمجھانا وہ مشکل سمجھتا ہے اور ہار مان جانے کو سہل سمجھتا ہے اس کی مثال یہ ہے کہ ایک سوانکھا شخص آفتاب کو دیکھ رہا ہے اور ایک مادر زاد اندھا آفتاب کا انکار کر رہا ہے اگر وہ اندھا اس سوانکھے سے الجھے کہ آفتاب کے ہونے کا کوئی ثبوت لاؤ تو وہ کیا ثبوت دے سکتا ہے اس کو یہ کہنا سہل ہے کہ میں ہارا اور تو جیتا آفتاب کا وجود نہ سہی تو اپنے خیال میں خوش رہے میں اپنے خیال میں خوش ہوں۔ اب بتلایئے کہ یہ سوانکھا شخص ہارا ہوا ہے یا جیتا ہوا آجکل بعضے لوگ کہتے ہیں کہ ہم حق کے متلاشی ہیں اور یہ لوگ ائمہ کے ساتھ اختلاف مسائل میں بے ادبی کرتے ہیں اور اس اختلاف کی بنا احادیث کی مخالفت بتلاتے ہیں اگر ان کے ات کو دیکھئے تو صاف ظاہر ہو جاوے کہ تحقیق کا تو پتہ بھی نہیں نہ تحقیق کی لائق علم اور نہ تحقیق کا ارادہ صرف اس مخالفت کی بنا ہوائے نفسانی پر ہے کس درجہ سب وشتم صالحین کے بارہ میں کرتے ہیں۔

آئمہ کا اختلاف تو بلا شبہ اختلاف امتی رحمۃ میں داخل تھا اور ان لوگوں کا اختلاف ویتبع غیر سبیل المؤمنین کی جنس سے ہے۔ بس آج کل خیریت ہے تو سلف کے اتباع ہی میں ہے اور رائے کو دخل دینے میں مفاسد ہی مفاسد ہیں۔ تجربہ ہے کہ اتباع سے نکل کر آدمی بڑی دور پہنچتا ہے حتیٰ کہ بعض اوقات اسلام سے نکل جاتا ہے۔ دیکھئے رائے پر عمل کرنے سے بڑے بڑوں سے ایسی غلطی ہوتی ہے کہ امام رازی نے حدیث۔ لم یکذب ابراھیم الاثلث کذبات سے انکار کر دیا اس وجہ سے کہ کذب انبیاء علیہم السلام سے محال ہے اور جمہور نے ایسا نہیں کیا بلکہ اس کذب میں تاویلیں کی ہیں امام رازی نے تو اپنے نزدیک بڑا کام کیا کہ تاویل کی ضرورت ہی نہیں رکھی لیکن کس قدر فاحشہ غلطی کی کیونکہ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اگر ایک ایسی حدیث کو جو سند صحیح سے ثابت ہے ایسی اشکالوں کی وجہ سے رد کر دیا جاوے تو اس کا باب مفتوح ہوتا ہے کہ ہر شخص کو مجاز ہوگا کہ جس حدیث میں اپنے نزدیک کوئی اشکال پائے اس کو رد کر دے اس سے تمام دین کی اساس ہی منہدم ہوتی ہے ایسے امام سے یہ غلطی کس وجہ سے ہوئی صرف اتباع رائے سے۔

میرا ایک خواب ہے جو موافقت قواعد صحیحہ کی وجہ سے میرے نزدیک خوب ہے اور اس سے اچھا تو تو اس مبحث کا شاید ہی ملے میرے دل میں کھٹک پیدا ہوئی اور یہ زمانہ طالب علمی دیوبند کا ذکر ہے کہ غیر مقلد اپنے ہر مدعا پر حدیث پیش کرتے ہیں جو ہمارے امام کے خلاف ہوتی ہے۔ شاید ان ہی کا طریق حق ہو۔ خواب دیکھا کہ میں دہلی میں ایک محدث میاں صاحب کے مکان پر ہوں۔ دیکھا کہ وہاں چھاچھ تقسیم ہو رہی ہے۔ مجھے چھاچھ کا شوق ہے۔ انھوں نے مجھ کو بھی دی مگر میں نے

نہیں لی۔ بس آنکھ کھل گئی معاً تعبیر ذہن میں آئی کہ علم کی صورت رویا میں لبن ہے جیسا کہ حدیث میں موجود ہے اور چھاچھ کی صورت تو دودھ کی ہے۔ مگر حقیقت بالکل مغائر ہے معنیٰ اور مغز اس میں نہیں پس یہ سمجھ میں آیا کہ ان کا طریقہ صورت دین تو ہے مگر اس میں معنی دین بالکل ندارد ہے۔ یہ لوگ امام صاحب پر خلاف حدیث کا اعتراض کرتے ہیں۔ امام صاحب نے بھی حدیث کے خلاف کوئی بات نہیں کہی مگر معنی اور مغز کو لے کر اور یہ لوگ صرف صورت سے شبہ کرتے ہیں تو یہ معارضہ معارضۂ حدیث نہ ہوا بلکہ معارضۂ معنی و صورت حدیث ہوا اور ایسا ممکن ہے جیساکہ میں چند نظیر دل میں دکھاتا ہوں۔ مثلاً حضرت علی رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے باوجود امر حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے اس غلام پر حد جاری نہ کی اس سے کوئی ظاہر بین کہہ سکتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے حدیث کی مخالفت کی جیساکہ یہ لوگ ہر بات میں امام صاحب کو طعنہ دیتے ہیں کہ حدیث کی مخالفت کرتے ہیں لیکن معنی فہیم آدمی سمجھ سکتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے گو ظاہر حدیث کی مخالفت کی لیکن حقیقت میں مخالفت نہیں کی اور ان کو یہی کرنا چاہیئے تھا۔ چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بعد میں اسی کو تصویب فرمائی حضرت علی رضی اللہ تعالےٰ عنہ کو یہ مسئلہ معلوم تھا کہ از روئے کتاب و سنت غیر زانی پر حد نہیں ہوسکتی جبکہ وہ غلام مقطوع الذکر تھا تو اس سے زنا ممکن ہی نہیں تھا پھر حد کیسی انصاف سے کہیئے کہ تعمیل حدیث یہ ہے یا وہ ہوتی۔

اسی طرح امام صاحب کے اقوال ہیں کہ وہ مغز حدیث پر مبنی ہیں اور ان لوگوں کے اقوال صرف صورت حدیث پر مغز کا نام بھی نہیں اور

وہ بھی دو چار مسئلوں میں میں نے قنوج میں ایک مرتبہ وعظ کہا اور کچھ رسوم مروجہ کے متعلق گفتگو کی منصف غیر مقلدوں نے کہا کہ آج معلوم ہوا کہ متبع سنت ہم بھی نہیں صرف دو چار سنن پر عمل کر رکھا ہے۔

اسی طرح ایک غیر مقلد گندھی نے کہا کہ ہم لوگوں میں احتیاط بالکل نہیں ہے۔ ہمارا عمل بالحدیث صرف آمین بالجہر اور رفع یدین میں ہے اس کے سوا کسی عمل کی طرف ہمارا ذہن ہی نہیں جاتا چنانچہ میں عطر میں تیل ملا کر بیچتا ہوں اور واقعی متقی جس کو کہتے ہیں وہ ان میں ایک بھی نہیں الا ماشاء اللہ یہ کیسی گہری بات ہے اس میں سوچنے کی بات یہ ہے کہ کیوں ان میں متقی نہیں ہوتے جبکہ ہر بات میں عمل بالحدیث کا دعوے ہے وجہ یہ بھی ہے کہ کسی ایک کے پابند نہیں ہیں ذرا کوئی بات پیش آئی سوچ کر کسی ایک روایت پر عمل کرلیا اور روایتوں میں سے انتخاب کرنے کے لئے اپنی رائے کو کافی سمجھا پس اس کو صورۃً تو چاہے کوئی اتباع حدیث کہہ لے مگر جب اس کا منشاء رائے پر ہے تو واقع میں اتباع رائے ہی تو ہوا۔ اتباع ہونے سے بچنا جب ہی ہوتا ہے جب ایک سے بندھ جائے ورنہ نرے دعوے ہی دعوے ہیں مقلدین میں بہت سے لوگوں کی حالت اچھی نکلے گی بخلاف غیر مقلدین کے کہ کوئی شاذو نادر متقی نکل آئے تو نکل آئے ورنہ بہت سے حیلہ جو اور نفس پرور ہیں۔ ابو حنیفہؒ سے بندھتا ہے نفس ورنہ چھچھوندر کی طرح یہ ہانڈی جا سونگھی وہ ہانڈی جا سونگھی۔ یوں کوئی محتاط بھی نکل آئے لیکن حکم اکثر پر ہوتا ہے۔ اچھے اچھوں کے حالات ٹٹول کر دیکھ لئے ہیں۔ اتفاقاً ایک میں بھی نہ پایا الا ماشاء اللہ اس کا اقرار خود ان کے گروہ کو بھی ہے ہاں اگر کوئی احتیاط کرے اور مختلف اقوال میں سے احوط پر عمل کرے تو اس کو اتباع نفس و ہوٰی نہ کہیں گے اور اس میں فی نفسہ کوئی حرج بھی نہیں لیکن اول تو ایسا کرتا

کون ہے اور یہ بہت مشکل ہے کوئی کر کے دیکھے تو معلوم ہو کہ کس قدر دشواریاں پیش آئیں گی اور ایسے محتاط کو بھی اجازت اس واسطے نہ دیں گے کہ دوسروں پر اثر برا پڑتا ہے۔ اس کی احتیاط کی تقلید تو کوئی نہ کرے گا ہاں اس کی عدم تقلید کی تقلید کرلیں گے اور پھر وہی اتباع ہوی باقی رہ جائیگا۔ ہاں اگر یہ شخص گمنام جگہ ہوا در اطمینان ہو کہ دوسروں پر اثر نہ پڑیگا تو اس کا معاملہ اللہ پر ہے اگر اس کی نیت سچی ہے اور خوف خدا سے احوط کو اختیار کرتا ہے تو کچھ حرج نہیں۔ لیکن ایسی نظیر شاید ایک بھی ملنا مشکل ہے یہ صرف توسیع عقلی ہے۔ مفتی صاحب نے پوچھا کہ اگر عامی شخص کو کسی مسئلہ میں ثابت ہو جائے کہ مجتہد کا قول حدیث کے خلاف ہے تو اس وقت میں حدیث پر عمل کیوں جائز نہ ہوگا ورنہ حدیث پر قول مجتہد کی ترجیح لازم آتی ہے فرمایا یہ صرف فرضی صورت ہے عامی کو یہ کہنے کا منصب ہی کہاں ہے کہ مجتہد کا قول حدیث کے معارض ہے اس کو حدیث کا علم مجتہد کے برابر کب ہے نیز وہ تعارض اور تطبیق کو مجتہد کی برابر کیسے جان سکتا ہے تو اول تو یہ صورت فرضی ہے کہ قول مجتہد حدیث کے معارض ہو پھر میں تنزل کر کے کہتا ہوں کہ اگر اس عامی شخص کا قلب گواہی دیتا ہو کہ اس مسئلہ میں مجتہد کے پاس کوئی دلیل نہیں ہے تو اس صورت میں بھی ترک تقلید جائز نہیں اس کی نظیر یہ ہے کہ طبیب سے نسخہ لکھواتے ہیں تو اس نسخہ کو غلط کہنے کی کیا صورت ہو سکتی ہے عامی تو عامی کوئی دوسرا طبیب بھی اس نسخہ کو غلط نہیں کہہ سکتا دوسرا نسخہ دوسرا طبیب تجویز کر دے لیکن اس نسخہ کو غلط کہنے کا مجاز نہیں اس وقت تک کہ اس نسخہ کو بالکل صریح غلط نہ ثابت کر سکے دوسری تجویز کے بہت سے وجوہ ہو سکتے ہیں حتیٰ کہ یہ بھی ایک وجہ ہوتی ہے کہ ایک

دہلی کا تعلیم یافتہ ہے دوسرا لکھنؤ کا، لکھنؤ کا طرزِ مطب اور ہے اور دہلی کا اور۔ اور اوزان ادویہ تک میں فرق ہے تو ایک دہلی کے تعلیم یافتہ کو لکھنؤ کے نسخہ کو صرف اس وجہ سے غلط کہدینا کہ اس کے اوزان میں فرق ہے کیسے درست ہوسکتا ہے علیٰ ہذا مجتہدین کے اختلاف کے وجوہ بھی بہت ہیں۔ بعض وقت رائے کا اختلاف موضع کے اختلاف سے بھی ہوجاتا ہے۔ چنانچہ امام شافعی صاحب کا فقہ جدید اور ہے قدیم کے منضبط کرنے کے بعد انھوں نے مصر کا سفر کیا تو بہت سے اقوال میں تغیر کرنا پڑا جیسا فقہ کے جاننے والوں سے پوشیدہ نہیں، اس کی یہ وجہ نہیں کہ سفر کرنے سے دلیلیں بدل گئیں بلکہ وجہ یہ ہے کہ سفر سے لوگوں کے حالات کا تجربہ مزید حاصل ہوا۔ جس سے بہت سے مواقع جرح کے معلوم ہوئے جو پہلے معلوم نہ تھے۔ پہلے حکم اور تھا اور جرح معلوم ہونے کے بعد ظاہر ہے کہ وہ حکم بدلنا ضرور ہوا اسی طرح بہت سی رایوں میں اختلاف ہوا غرض وجوہ اختلاف کا احصار مشکل ہے لوگوں نے اس کے واسطے قواعد منضبط ضرور کئے ہیں (جن کو اصول فقہ کہتے ہیں) لیکن وہ قواعد خود محیط نہیں، اس کی مثال علم نحو کی ہے جس میں کلام کی ترکیب کے قواعد منضبط کئے گئے ہیں اور یہ علم بہت مفید ہے لیکن تاہم اس کے انضباط کا مقصود یہ نہیں کہ اہلِ زبان اس کے پابند ہوں اور اس لئے اس کا احاطہ پورا کیا گیا ہو۔ بلکہ محض غیر اہلِ زبان کے واسطے اہلِ زبان کا کلام سمجھنے اور ان کے ساتھ مکالمت کرنے کا آلہ ہے۔ پس اگر اہلِ زبان سے کوئی کلام ایسا ثابت ہوجائے جس میں قواعد نحو جاری نہ ہوسکیں تو یہ کہنا صحیح نہ ہوگا کہ اہلِ زبان نے غلطی کی بلکہ یہ کہا جاوے گا کہ علم نحو میں اتنا نقصان تھا کہ یہ قاعدہ ضبط سے رہ گیا۔

اسی طرح مجتہد کو اصول فقہ سے الزام دینا صحیح نہیں ہو سکتا بلکہ ایسے موقع پر جہاں مجتہد کا قول اصول پر منطبق نہ ہوتا ہو یہ کہنا چاہیئے کہ علم اصول ناقص رہا اس تقریر کے بعد یہ کہنا ذرا مشکل ہے کہ مجتہد کے پاس اُس کے قول کی کوئی دلیل نہیں اس واسطے یہ کہا جاتا ہے کہ اگر قلب ذرا بھی گواہی دے کہ مجتہد کے پاس اپنے قول کی دلیل ہوگی تو ترک تقلید جائز نہ ہوگا۔ اگرچہ درجۂ امکان عقلی میں یہ بھی ہے کہ مجتہد کے پاس دلیل نہ ہو یا اس نے غلطی کی ہو جیسے کہ درجۂ امکان میں یہ بھی ہے کہ طبیب کیسا ہی بڑا ماہر کیوں نہ ہو غلطی کر سکتا ہے، لیکن اگر ایسی فرضی صورتوں سے مجتہد کا اتباع چھوڑ دیا جائے تو کارخانہ دین درہم برہم ہو جائے جیسا کہ اسی کی نظیر یعنی امر معالجہ میں یہ فرضی صورت جاری کرنے سے کہ طبیب معصوم نہیں ہے غلطی کر سکتا ہے اور اس کا اتباع چھوڑ دینے سے امر معالجہ درہم برہم ہوتا ہے وہاں تو امر معالجہ کا نظام قائم رکھنے کے لئے یہ بات عام طور سے مان لی گئی ہے کہ طبیب زہر بھی کھلائے تو چون و چرا نہ کرنا چاہیئے، حالانکہ یہ عقل کے خلاف ہے جب ایک چیز کو زہر کہا تو زہر کے معنے قاتل نفس ہے۔ پھر اس کے کھانے کے جواز کے کیا معنی مگر اس جملہ کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ زہر جو طبیب کھلاتا ہے اس کو نہ اس واسطے کھا لینا چاہیئے کہ وہ زہر ہے بلکہ اس واسطے کہ گو وہ صورۃً زہر ہے مگر حقیقت میں زہر نہیں طبیب پر اطمینان ہے کہ وہ قاتل نفس شے نہ کھلائیگا اسی طرح جب ایک شخص کو مجتہد مانا گیا تو (لفظ تو برا ہے) مگر یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ تو اس کے زعم میں خلاف دلیل بات بھی بتلائے تو کر لی جائے جیسا کہ کہا گیا ہے کہ طبیب زہر بھی کھلائے تو کھا لینا چاہیئے جو تاویل وہاں تھی وہی یہاں بھی ہے کہ طبیب زہر نہیں کھلائے گا ایسا ہی مجتہد خلاف دلیل بات نہ بتلائے گا۔ پھر یہ کہنا بڑا مشکل ہے کہ مجتہد کے پاس اپنے قول کی دلیل نہ ہوگی۔ اسی وجہ سے میں نے یہ کہا اگر قلب ذرا بھی گواہی دے کہ

مجتہد کے پاس کوئی نہ کوئی دلیل ضرور ہوگی تو ترک تقلید جائز نہیں البتہ کوئی متبحر عالم اگر کسی مسئلہ کو خلاف دلیل سمجھے تو اس کا سمجھنا معتبر ہوگا۔ اس پر مفتی صاحب نے پوچھا کہ مجتہد کس کو کہتے ہیں جبکہ ایک شخص کو مسئلہ کا علم دلیل سے ہے تو اس مسئلہ کا یہ بھی مجتہد ہے پھر یہ کیسے کہا جائے گا کہ ایک مجتہد کو دوسرے مجتہد کی تقلید لازم جواب دیا کہ لغۃً تو ہر شخص کچھ نہ کچھ مجتہد ہے اس بناء پر تو تقلید سے آزاد کہنے کا انجام یہ ہی ہے کہ تقلید بالکل نہ رہے حالانکہ یہ بلا نکیر جاری ہے اس کی ایک مثال ہے کہ مال دار ہمارے عرف میں کس کو کہتے ہیں کہا جاتا ہے کہ فلاں شخص مال دار ہے میں پوچھتا ہوں ایسا کون شخص ہے جو مالدار نہیں لغۃً تو مال دار وہ شخص بھی ہے جس کے پاس ایک پیسہ چھوٹی کوڑی بھی ہو تو جو احکام مالداروں کے ساتھ متعلق ہیں دنیا کے ہوں یا دین کے ہر ہر شخص پر جاری ہونے چاہئیں زکوٰۃ کا مطالبہ بھی ہونا چاہیئے اور خراج اور محصول بھی بادشاہ کو ہر شخص سے لینا چاہیئے فما ہوا جوابکم فہو جوابنا اسی طرح لغۃً مجتہد ہر شخص سہی لیکن وہ مجتہد جس پر احکام اجتہاد جاری ہو سکیں اس کے واسطے کچھ شرائط ہیں جن کا حاصل ایک ذوق خاص شریعت کے ساتھ حاصل ہو جاتا ہے جس سے وہ معلل اور غیر معلل کو جانچ سکے اور وجوہ دلالت یا وجوہ ترجیح کو سمجھ سکے اور یہ اجتہاد ختم ہو گیا پس ایک مسئلہ کی دلیل جان لینے سے اس مسئلہ کا وہ محقق تو نہیں ہو گیا پھر محقق کے اتباع کو وہ کیسے چھوڑیگا جیسے کہ محدث درجہ عبور میں ہر شخص ہو سکتا ہے لیکن کمال اس کا بعض افراد پر ختم ہو گیا اب کوئی محدث موجود نہیں۔ ذالك فضل الله يوتيه من يشاء آجکل جو لوگ اجتہاد کے مدعی ہیں ان سے ایسی فاحش غلطیاں ہوتی ہیں کہ ہر شخص کا قلب ان کے غلطی ہونے کو تسلیم کر لیتا ہے جیسے کہ آجکل کوئی کچھ سندیں بنا کر محدث بننا چاہے تو اس کی محدثیت تسلیم نہیں کی جاتی آجکل تو سلامت اسی میں ہے کہ اجتہاد کی اجازت نہ دیجائے۔

نظم دین جو کچھ ہو گیا اس سے اس میں بڑا خلل پڑتا ہے میں تو کہتا ہوں کہ آجکل وہ زمانہ ہے کہ اگر کسی کام کو درجہ اولویت پر کرتے ہیں عوام کے فساد کا احتمال ہو تو اس وقت خلاف اولی کہلانے والا مثاب ہوگا۔ نظیر اس کی قصہ حطیم ہے جو حدیث میں موجود ہے یہ میری تقریر ایسی ہے جس سے تقلید کی حقیقت ظاہر ہو جاتی ہے اور سچ تو یہ ہے کہ ائمہ مجتہدین ہی نے دین کی حقیقت کو سمجھا ہے بس جو لوگ تارک تقلید ہیں وہ کہنے کو تو ائمہ کے خلاف ہیں مگر درحقیقت دین کے خلاف ہیں اس کی بنا صرف خود رائے پر ہے اور اتباع ہوی اور اعجاب سب جانتے ہیں مہلک چیز یں ہیں جس کا جی چاہے تجربہ کر کے دیکھ لے کہ تارکین تقلید میں اکثر یہ دونوں مرض رگ و پے میں گھسے ہوئے ہوتے ہیں ہمارا علم کچھ بھی نہیں ہم سے بڑوں نے اور ان لوگوں نے جن کا علم مسلم ہے کیوں تقلید کو اختیار کیا معلوم کہ ہماری رائے غلط اور متہم ہے تقلید شخصی چھوڑ کر گنجائشیں نکالی جاویں تو نتیجہ اس کا بہت ہی جلد آزادی نفس پیدا ہو جاتا ہے ان میں سے بعض کے نزدیک اجتہاد ہی کوئی چیز نہیں بدون نص کے ان کے نزدیک کوئی حکم ہی ثابت نہیں حالانکہ احادیث میں اس کے ثبوت بہت ملتے ہیں دیکھئے حضرت عمر فاروقؓ کا ذوق اجتہادی ہے تو جس پر ایسا اطمینان ہوا کہ حضرت ابوہریرہؓ کو بشارت سے روک دیا اور یہ روکنا عند اللہ مقبول رہا حالانکہ حضرت عمرؓ کی رائے کو قول رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور نص پر کسی طرح ترجیح نہیں ہو سکتی مگر ان کے ذوق اجتہادی ہی نے بتا دیا تھا کہ یہ بشارت نظم دین میں مخل ہو گی اور یاد جود ابوہریرہؓ کے دلیل پیش کرنے کے اس شد و مد سے تردید کی کہ ان کو دھکا دے کر گرا بھی دیا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے یہ سارا قصہ پیش ہوا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے حضرت عمرؓ مجرم کیوں نہ ہوئے اس قصہ سے اجتہاد کا یہ بھی ثبوت ملتا ہے۔ یہ کوئی کچا محل نہیں ہے دین کا اہل اجتہاد نے من گھڑت باتوں پر بنا نہیں رکھی ہے ان کے یہاں تو خود رائی کا تو کام ہی نہیں جیسے کہ مجتہدین دوسروں کو پابند بناتے ہیں خود بھی پابند ہیں کوئی بات بلا قرآن و

حدیث کے نہیں کہتے تو ان کی تقلید تقلید قرآن و حدیث ہوئی نام اس کا چاہے کچھ رکھ لو جیسا صرف و نحو پڑھنے والا اولاً تو مقلد ہے اخفش اور سیبویہ کا لیکن اخفش و سیبویہ خود موجد زبان نہیں بلکہ مقلد ہیں اہل زبان کے واسطے صرف و نحو پڑھنے والا در حقیقت مقلد ہوا اہل زبان کا یہ کیسی غلطی ہے کہ مقلد فقہا کو تو تارک قرآن و حدیث کہا جاوے اور مقلد اخفش و سیبویہ کو تارک زبان نہ کہا جاوے یہ مضامین یاد رکھنے کے ہیں ہر وقت ذہن میں نہیں آتے۔ ابن تیمیہ کی ایک کتاب ہے دفع الملام عن الائمہ الا علام اس میں انھوں نے ثابت کیا ہے کہ وجود دلالت کے اس قدر کثیر ہیں کہ کسی مجتہد پر یہ الزام صحیح نہیں ہو سکتا کہ اس نے حدیث کا انکار کیا یہ کتاب دیکھنے کے قابل ہے۔ ابن تیمیہ اور ابن القیم استاد شاگرد ہیں دونوں بڑے عالم ہیں بعض افاضل کا ان کے بارہ میں قول ہے کہ علمہما اکثر من عقلہما یہ دونوں حنبلی مشہور ہیں مگر ہیں نہیں حنبلی ان کی تحریروں سے معلوم ہوتا ہے خود مجتہد ہونے کے مدعی ہیں ایسا محقق کسی بات میں ائمہ مجتہدین کا خلاف کرے تو مضائقہ بھی نہیں اور یہ تھوڑا ہے کہ بولنے تک کی تمیز نہیں اور ائمہ کے منہ آنے لگے ایک شخص کہتا تھا کہ بلا قرأت فاتحہ نماز کیسے ہو سکتی ہے حدیث میں تو ہے کھداج کھداج (خداج خداج) ایسے بیہودوں سے تو کلام بھی کرنے کو دل نہیں چاہتا۔ ایک صاحب کنیدہ میں ملے اور پوچھا کہ ترک فاتحہ پر کیا دلیل ہے مجھے معلوم ہوا کہ یہ بھی ایسی ہی لیاقت رکھتے ہیں جیسے کھداج والا تھا مجھے سخت گراں گذرا کہ ان کے ساتھ کیا مغز ماروں میں نے کہا پہلے یہ بتایئے کہ یہ مسئلہ اصول میں سے ہے یا فروع میں سے کہا فروع میں سے ہے میں نے کہا آپ کے سوال سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو دین کی تحقیق کی طرف خاص توجہ ہے جب کہ ایک فرعی مسئلہ کی طرف اس قدر توجہ ہے تو اصول کی طرف اور زیادہ ہوگی اصول کی تو آپ شاید پوری تحقیق کر چکے ہوں گے اور اب فروع کی طرف متوجہ ہوئے ہیں پس اصل الاصول توحید ہے اس کو آپ ضرور دلیل سے تحقیق کر چکے ہوں گے اگر ایسا ہے تو میں چند شبہات توحید پر پیش کرتا ہوں ذرا ان کا حل تو کر دیجئے اور اگر ایسا نہیں ہے بلکہ توحید کو کسی کی تقلید سے مان لیا ہے تو آپ دلیل سے تحقیق نہیں کر سکتے تو بڑے تعجب کی بات ہے کہ

اصول میں تو تقلید کی اور فروع میں تقلید نہیں کرتے حالانکہ اصول زیادہ اہم ہیں تقلید سے خلع عنان کرنا اول تو مجتہدین کی سب وشتم کی طرف مفضی ہوتا ہے پھر صحابہؓ کے سب وشتم کی طرف پھر سب رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی طرف پھر حق تعالےٰ پر بھی کبھی نوبت پہنچتی ہے۔ مولانا فتح محمد صاحبؒ بیان کرتے تھے کہ ایک غیر مقلد حدیث پڑھا رہے تھے اور جہاں حدیث کی تاویل نہ بن آتی تو کہتے تھے تعجب ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کہیں کچھ فرما دیتے ہیں کہیں کچھ فرما دیتے ہیں یہ کیا فرما دیا یہ نتائج ہیں آزادی کے۔

اس سے عار آتی ہے کہ ہم کسی کے محکوم کہے جاویں خیر صاحب انھیں مجتہدین کی محکومیت سے عار ہوگی ہمیں تو بہت سوں کے حکومت میں رہنا پسند ہے۔ ابوحنیفہؒ کی بھی حکومت ہے ماں باپ کی بھی حکومت ہے شیخ طریقت کی بھی حکومت ہے یہ بات نفس کے چاہے خلاف ہو مگر یہ کتنا بڑا فائدہ ہے کہ ہمارے اتنے مصلح ہیں نفس و شیطان ہمارا کچھ بھی نہیں کر سکتا بخلاف ان کے کہ ائمہ کی حکومت میں سے تو نکل گئے اور شیطان کی حکومت میں آگئے ہم جن کے محکوم ہیں وہ سب ہمارے خیر خواہ ہیں اور یہ جس کی حکومت میں گئے وہ عدو مبین ہے اپنی اصلاح کے لئے اپنے اوپر کسی کو بھی اعتماد نہ چاہیئے۔ دیکھو حضرت عمرؓ جیسے مبصر نے اس شخص سے کیا کہا جس نے کہا تھا کہ اگر تم بگڑو تو ہم اس تلوار سے تم کو سیدھا کریں گے تو فرمایا تھا کہ الحمد للہ میں ایسی قوم میں ہوں جس میں میرے محافظ بہت سے موجود ہیں۔ بیعت مروجہ میں یہی مصلحت ہے کہ جانبین کو خیال ہو جاتا ہے دونوں کو ایک دوسرے سے اعانت کی امید ہوتی ہے۔ ایک دیہاتی آدمی مجھ سے بیعت ہوا میں نے پوچھا بیعت کی تمھارے نزدیک کیا ضرورت ثابت ہوئی نماز روزہ تو بلا اس کے بھی کیا جا سکتا ہے۔ کہا میں بیعت اس واسطے ہوا ہوں کہ ویسے تو ذرا سستی بھی نماز روزہ میں ہو جاتی ہے۔ بیعت سے ذرا خیال ہو جاتا ہے کیا کام کی بات ہے۔

تقریر ادب الاعلام ختم ہوئی

اسی سفر میں اس سے تیسرے دن یعنی بتاریخ ۲۳ صفر ۱۳۳۵ھ روز بدھ اسی مقام بڑہل گنج میں ایک مختصر سی تقریر اور ہوئی جس میں تقلید کی بحث ہے وہ بھی یہاں درج کی جاتی ہے۔

سوال محکمہ تعلیم کے مصارف محکمہ چنگی سے پورے ہوتے ہیں تو محکمہ کی تعلیم کی تنخواہ حلال ہے یا نہیں۔ فرمایا استیلاء کافر موجب ملک ہے امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک یہاں بھی مسئلہ امام ابو حنیفہ ہی کا کام آتا ہے۔ ایک انگریز نے لکھا ہے کہ سلطنت کسی کے فقہ پر نہیں چل سکتی سوائے فقہ حنفی کے ایک سیاسی شخص کا یہ کہنا ضرور بڑے تجربے کی خبر دیتا ہے۔ امام ابو حنیفہؒ کی عجیب نظر ہے دیکھئے امام صاحب کا قول ہے کہ آلات لہو کا توڑ ڈالنا واعظ کو یا کسی کو جائز نہیں اگر کوئی توڑ ڈالے تو ضمان لازم آئے گا یہ کام سلطان کا ہے وہ احتساب کرے اور توڑے پھوڑے اور سزا دے جو چاہے کرے دیکھئے اس میں کتنا امن ہے سوائے سلطان کے اور کسی کے احتساب کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ وہ کام بند تو ہوتا نہیں جنگ و جدل و فتنہ ہو جاتا ہے اور باہمی منازعات بڑی دور تک پہنچ جاتے ہیں۔

علیٰ ہذا اقامت حدود سلطان ہی کے ساتھ ہیں فقہ بڑی مشکل چیز ہے فقیہ کو جامع ہونا چاہیئے۔ فقیہ بھی ہو محدث بھی ہو متکلم بھی ہو سیاسی دماغ بھی رکھتا ہو بلکہ کہیں کہیں طب کی بھی ضرورت ہے بعضے امور میں تشریح کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ فقہ مشکل چیز ہے مگر آجکل بعض لوگوں نے اس کی کیا قدر کی ہے کہ فقہاء پر سب وشتم کرتے ہیں یہ گروہ نہایت درجہ مفسد ہے یہ لوگ جان جان کر فساد کرتے ہیں اور اشتعال دلاتے ہیں بعض وقت تو ذرا سی بات میں بڑا فتنہ ہو جاتا ہے ایک شخص نے کہا حضور ہاں ایک جگہ مقلدین کی جماعت میں ایک غیر مقلد آگیا اور آمین زور سے کہی تو اس پر بڑا فساد ہوا اور پولیس تک نوبت پہنچی اور مقدمہ کو بڑا طول ہوا فرمایا

حضرت والا نے اس پر جنگ وجدل کرنا ہے تو زیادتی لیکن تجربہ سے ثابت ہے کہ عمل کچھ ہو مگر جس نیت سے کیا جاوے اس کا اثر ضرور ہوتا ہے اگر اس نے خلوص سے اور عمل بالسنت کی نیت سے کیا ہوتا تو یہ نوبت نہ آتی غیر مقلدین کی آمین اکثر صرف شورش اور مقلدین کے چڑانے کیلئے ہوتی ہے میرے بھائی محمد مظہر نے قنوج میں غیر مقلدین کی آمین سنکر کہا آمین تو دعا ہے اس میں خشوع کی شان ہونی چاہیئے اور ان لوگوں کے لہجہ میں خشوع کی شان نہیں ہے خود سننے سے معلوم ہوتا ہے کہ جیسے کسی کو چھیڑتے ہوں اس نے عرض کیا کہ یہ واقعی بات ہے مقدمہ مذکور جب پولیس میں پہنچا تو ایک ہندو تھانیدار اس کی تحقیقات پر تعینات ہوا وہ بہت سمجھ دار تھا اس نے فساد کا الزام غیر مقلد ہی پر رکھا اور رپورٹ میں لکھا کہ یہ لوگ شورش پسند ہیں اور بلا وجہ اشتعال دلاتے ہیں اور آمین صرف فساد اٹھانے کے لئے کہتے ہیں۔ اس پر غیر مقلدین نے بڑا غل مچایا اور کہا کہ آمین مکہ میں بھی ہوتی ہے، داروغہ نے کہا کہ مکہ کرمہ میں آمین خدا کی یاد کے لئے ہوتی ہوگی دنگے کے لئے نہ ہوتی ہوگی یہاں دنگے کے لئے ہے۔ فرمایا میرا شریک حجرہ ایک لڑکا بیان کرتا تھا کہ ایسے ہی ایک موقع پر ایک انگریز نے تحقیقات کی اور آخیر میں گویا تمام واقعہ کا فوٹو کھینچ دیا اور کہا آمین تین قسم کی ہیں۔ ایک آمین بالجہر اور اہل اسلام کے ایک فرقہ کا وہ مذہب ہے اور حدیثیں بھی اس کے ثبوت میں موجود ہیں اور ایک آمین بالسر ہے اور وہ بھی ایک فرقہ کا مذہب ہے اور حدیثوں میں موجود ہے۔ اور تیسرے آمین بالشر ہے جو آجکل کے لوگ کہتے ہیں اس شخص نے بیان کیا کہ ہندو داروغہ کے سامنے غیر مقلدوں نے امام ابو حنیفہؒ پر اعتراض کیا کہ امام صاحب قابل ہیں کہ اگر کوئی محرم عورت سے نکاح کرے اور وطی کرے تو اس پر حد واجب نہیں یہ کیسی غلطی ہے۔ فرمایا حضرت والا

نے اسی مسئلہ میں امام صاحب پر فدا ہو جانا چاہیئے اس کے بیان کے لئے دو مقدموں کی ضرورت ہے ایک یہ کہ حدیث میں ہے ادرؤ الحدود بالشبہات ایک مقدمہ یہ ہوا اور دوسرا یہ کہ شبہ کس کو کہتے ہیں شبہ کہتے ہیں مشابہ حقیقت کو اور مشابہت کے لئے کوئی وجہ شبہ ہوتی ہے اور اس کے مراتب مختلف ہیں کبھی مشابہت قوی ہوتی اور کبھی ضعیف امام صاحب نے حدود کے ساقط کرنے کے لئے ادنیٰ درجہ کی مشابہت کو بھی معتبر مانا ہے اور صرف نکاح کی صورت پیدا ہو جانے سے کہ باوجود حقیقت نکاح نہ ہونے کے مشابہ تو نکاح کے ہے حد کو ساقط کر دیا انصاف کرنا چاہیئے کہ کہ یہ کس درجہ عمل بالحدیث ہے بات یہ ہے کہ ایک صحیح معنیٰ کو بُرے اور مہیب الفاظ کی صورت پہنا دی گئی ہے اس فتوے کی حقیقت تو غایت درجہ کا اتباع حدیث ہے لیکن اس کو بیان اس طرح کیا جاتا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ نعوذ باللہ امام صاحب نے نکاح بالمحرمات کو چنداں برا نہیں سمجھا اس کے سوا اور بھی چند مسائل اسی طرح بُری صورت سے بیان کر کے اعتراض کئے جاتے ہیں مسئلہ مذکورہ پر اعتراض جب تھا کہ اس پر امام صاحب کوئی زجر و احتساب تجویز نہ کرتے ایسے موقعوں پر جہاں حد کو فقہا ساقط کرتے ہیں تعزیر کا حکم دیتے ہیں ایسے موقعے تمام ائمہ کے نزدیک بہت سے ہیں کہ شبہ سے حد ساقط ہو گئی آخر حدیث ادرؤ الحدود بالشبہات کی تعمیل کہیں تو ہوگی اور کوئی موقع تو ہوگا جہاں اس کو کر کے دکھایا جاوے۔ کیا غضب ہے جو شخص حدیث ضعیف کو بھی قیاس پر مقدم رکھے وہ کس قدر عامل بالحدیث ہے فدا ہو جانا ایسے شخص پر تعجب ہے کہ امام مالک صاحب خبر واحد پر بھی قیاس کو مقدم رکھتے ہیں اور ان کو لوگ عامل بالحدیث کہتے ہیں اور امام صاحب حدیث ضعیف پر بھی قیاس کو مقدم نہیں رکھتے اور ان کو تارک حدیث کہا جاتا ہے فقط

ادب الطریق

ملقب بہ

ادب الرفیق

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حامداً و مصلیاً۔ تقریر حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ مسمی **ادب الطریق** ملقب بہ ادب الرفیق سفر گورکھپور میں مختلف موقعوں پر حضرت والا نے تقریریں فرمائیں ان میں جن کو ذرا استداد ہوا ان کا نام بھی الگ تجویز فرمادیا منجملہ ان کے ایک تقریر یہ ہے جس کی مناسبت نام کے ساتھ مطالعہ سے معلوم ہو جاوے گی۔ یہ تقریر اس وقت ہوئی کہ حضرت والا مقام زیر پورہ ضلع گورکھپور سے بیل گاڑی پر مقام شاہ پور کو روانہ ہوئے بوجہ بعد مسافت راستہ میں ایک پڑاؤ قصبہ گوالا میں کیا رات کو وہاں رہے صبح کو شاہ پور کو روانہ ہوئے اس راستہ میں یہ تقریر ہوئی۔ حضرت والا کے ساتھ اس وقت احقر اور مفتی محمد یوسف صاحب رامپوری اور حضرت کے بھائی منشی محمد اختر صاحب اور ایک خادم اور تھے موخر الذکر خادم ایک مولوی صاحب تھے ان سے خطاب شروع ہوا فرمایا آپ کے حالات سے اور مختلف وقتوں میں سوالات سے اور بات چیت سے مجھے محسوس ہوتا ہے کہ آپ کچھ پریشان ہیں۔ عرض کیا ہاں کچھ پریشانی تو ضرور رہے فرمایا پریشانی کو چھوڑیئے اور حصول مقصود میں جلدی نہ کیجئے (یعنی اس کے جلدی حاصل ہونیکا انتظار نہ کیجئے نہ یہ کہ اس کی تحصیل میں جلدی نہ کیجئے) اس کا نتیجہ سوائے حیرانی کے کچھ نہیں آپ کا کام طلب ہے باقی حصول مقصود کے آپ مکلف نہیں میرے خیال میں یہی وجہ پریشانی کی ہے مولوی صاحب کی حالت ان کلمات کو سن کر ایسی ہوئی جیسے کوئی بچہ کسی مصیبت میں مبتلا ہونے کے بعد یکلخت اپنی مادر مہربان کے پاس پہنچ جاوے اور اس سے اپنی مصیبتیں کہنے لگے۔ آبدیدہ ہو کر عرض کیا سارا قصہ ہی کہہ دوں میں ابتدا میں گیارہ مہینے حضور کی خدمت میں تھانہ بھون میں رہا پھر کانپور چلا گیا پھر گیا حضرت

قدس سرہ حیات تھے۔ حضرت کی تجویز یہ ہوئی کہ مجھے نقشبندیت سے مناسبت ہے، اور اسی کے موافق تعلیم فرمائی اس سے پریشانی بہت پیدا ہوئی حتی کہ نیند بالکل ندارد ہوگئی اور دماغ مختل ہوگیا۔ حضرت نے مجھے بیعت تو نہیں کیا مگر تعلیم نقشبندیت کی کی پریشان ہوکر مکان پر آگیا چند روز بالکل قطع تعلق کرکے متوکلانہ بسر کی لوگوں سے ملنا جلنا بالکل بند کردیا۔ حضرت قدس سرہ کا ۱۳۲۳ھ میں وصال ہوگیا مولوی محمد سمیع صاحب میرے بھائی کو شاہ گنج لے گئے۔ وہاں ایک بزرگ تھے جو سلسلہ میں بڑے سید صاحب کے تھے میرے بھائی کو ان سے بڑا نفع ہوا تب وہ مجھ کو بھی ان کے پاس لے گئے۔ انھوں نے اول درود شریف پڑھنے کو بتلایا اور اس کے بعد مراقبہ ان کے یہاں مراقبہ کا ہونا ضروری ہے پھر مراقبہ لطائف ستہ وغیرہ بتلایا پھر بیعت میں بھی داخل کرلیا مگر میں ہمیشہ حضور کی اجازت ہر کام میں لے لیا کرتا تھا ان کے بعض مریدین میں پریشانی اور بد عقیدگی پائی گئی اس واسطے میرا دل اکھڑ گیا اور ان کے پاس آنا جانا چھوڑدیا۔ اس کے بعد بہت پریشانی بڑھ گئی اور یہ خیال ہوا کہ تو تو کہیں کا بھی نہ رہا ان پر دل نہ جما اور کہیں جانے کی اس واسطے ہمت نہ ہوئی کہ وہ ناراض ہوں گے عجیب کشمکش میں پڑ گیا میرے حواس خراب ہوگئے کہ کیا کروں اپنا سب سے بڑا مربی حضور کو سمجھتا تھا۔ ایسے وقت میں سوا حضور کے کسی پر نظر نہ پڑی مگر حضور تک جا نہ سکا ادھر یہ خیال ستاتا تھا کہ بلا حاضری کے کچھ ہوگا نہیں تاہم حضور کو خط لکھا اور اس بات کی اجازت چاہی کہ... صاحب کے پاس جاؤں۔ آپ نے اس کی اجازت دی۔

حضرت والا نے فرمایا اجازت اور چیز ہے اور مشورہ اور چیز۔ آپ نے اجازت کو مشورہ سمجھا میں اجازت تو عام طور سے دیتا ہوں کہ صلحاء کے پاس جانے میں کچھ حرج نہیں ہے اور مشورے کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ وہ بات بتاؤں کہ جو صرف غیر مضر نہیں بلکہ مفید بھی ہو اس کی مثال یہ ہے کہ طبیب سے اجازت چاہتے ہیں کہ گنا کھالیں وہ اس کو اگر مضر نہیں دیکھتا تو کہہ دیتا ہے کھالو یہ اجازت ہے اور مشورہ یہ ہے کہ طبیب سے کہتے ہیں کہ آپ کے سپرد ہے جو مناسب تدبیر ہو بتلائیے

(بقیہ حاشیہ)

(ان شاء اللہ تعالیٰ باقی آئندہ)

وہ اس وقت ایسی تدابیر نہیں بتلائے گا جو غیر مضر اور مفید ہوں بلکہ وہ تدابیر بتلائے گا جو مفید ہوں اس وقت یہ کبھی نہ کہے گا کہ گنا کھاؤ بلکہ اس وقت کہے گا گلو پیو اور شاہترہ پیو اور کونین کھاؤ اس وقت وہ آپ کا متبع نہ ہوگا بلکہ اپنی رائے کا متبع ہوگا خواہ آپ کی طبیعت کے خلاف ہو اور یہ اتفاقی بات ہے کہ اس کی رائے آپ کی طبیعت کے موافق آ پڑے آپ نے مجھ سے اجازت چاہی تھی میں نے اباحت کے درجہ میں منع نہیں کیا مشورہ آج دونگا میرا اصول یہ ہے کہ میں کسی کے کام میں دخل نہیں دیا کرتا جو لوگ مجھ سے کسی کام میں رائے لینا چاہتے ہیں تو میں دیکھتا ہوں کہ ان کا دل کسی طرف راغب ہے یا نہیں اگر دل ان کا کسی طرف راغب ہوتا ہے تو میں ان کو مقید کرنا نہیں چاہتا اور اگر اس کام میں کوئی خاص محظور نہیں ہے تو اس کام سے منع نہیں کرتا یہ مرتبہ اجازت کا ہے۔ اور مشورہ کا موقع وہ ہے کہ رائے لینے والے کا دل کسی طرف مائل نہ ہو اس وقت میں وہ رائے دیتا ہوں جو علاوہ غیر مستلزم محظور ہونے کے مفید اور ضروری ہو بلکہ اپنے نزدیک وہ رائے منتخب کرتا ہوں جو مفید رایوں میں سے بھی اعلیٰ درجہ کی ہو اور اس وقت بھی میرا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ رائے لینے والے کو مجبور کروں کہ ایسا ضرور کرو بلکہ خلوص کے ساتھ وہ رائے پیش کر دیتا ہوں اور اس بات کا دعویٰ بھی نہیں ہوتا کہ میری رائے ٹھیک ہی ہے۔

مولوی صاحب نے عرض کیا کہ جو کچھ بھی ہو میں اپنا قصہ بیان کرلوں پھر آج حضرت مجھ کو مشورہ دیں .... نے قرآن شریف اور درود شریف کی کثرت کی تعلیم فرمائی جس کا میں اب تک پابند ہوں تین چار سال سے یہی حالت ہے کہ میں نہ ادھر کا ہوں نہ اُدھر کا پریشانیاں بڑھتی

جاتی ہیں حالانکہ میں اس کے دفعیہ کی کوشش برابر کرتا ہوں، جیسے کوئی کہتا ہے ویسے ہی کرتا ہوں مگر کوئی تدبیر کارگر نہیں ہوتی۔ شیخ اول کو بھی چھوڑا طبیعت اس میں پریشان رہی کہ ان کا عتاب نہ ہو دوسرے کسی نے بھی کوئی تسلی بخش بات نہ بتلائی جب کسی کے پاس گیا حضور سے اجازت بھی لے لی خواب بہت دیکھے اپنے نزدیک اطمینان کر کے کسی کے پاس گیا۔ فرمایا خوابوں کا کیا اعتبار اول تو آجکل کسی کا خواب بھی معتبر نہیں خصوصاً اس شخص کا جس کا دماغ مشوش ہو (مولوی صاحب نے چند خواب بیان کیے) فرمایا کہ سب میں احتمال ہے کہ حدیث النفس ہو خوابوں پر بنا کرنا میرے نزدیک صحیح نہیں ہاں استخارہ مسنون ہے۔ استخارہ کے بعد جس بات پر دل جمے وہ کرنا چاہیے اس میں امید صلح ہوتی ہے اور جب تک جمیعت قلب حاصل نہ ہو برابر استخارہ کرنا چاہیے مولوی صاحب نے عرض کیا استخارہ بھی بہت کیا۔ استخارہ میں یہ آیت قلب میں آئی ہے أُولَٰئِكَ عَلَىٰ هُدًى مِّن رَّبِّهِمْ۔ فرمایا حضرت مولانا نے کہ یہ غیر قابل اعتبار ہے میرے نزدیک یہ تصرفات دماغی ہیں جس طرف رائے ہوتی ہے قوۃ واہمہ اسی طرف مائل ہو کر اجازت کی صورت میں دکھلاتی ہے۔ آپ مولوی آدمی ہیں علم رکھتے ہیں ہمیشہ کو یاد کر لیجئے کہ ایسی باتوں میں نہ پڑیئے۔ عرض کیا یہ آیت بھی قلب میں آئی تھی لیکن شکوک بھی رہتے تھے۔ فرمایا تشویش بڑھنے سے دماغ میں ہیں آگیا ہے۔ اور قوۃ واہمہ کا فعل قوی ہو گیا ہے۔ یہ شکوک بھی اوہام ہیں۔ مولوی صاحب ساکت ہو گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد حضرت مولانا نے فرمایا۔

ہے تو چھوٹا منہ بڑی بات یہ تشخیص کہ آپ کو نقشبندیت سے مناسبت ہے میرے دل کو بالکل نہیں لگی آپ کی مناسبت چشتیہ سے اتنی صاف ہے کہ شک کرنا بھی مشکل ہے آپ کی طبیعت میں فطرتاً شورش اور وارفتگی موجود ہے۔ یہ عشق اور محبت کا مادہ ہے اور یہی چشتیت کا ماحصل ہے ایسے شخص کو نقشبندیت کی

تعلیم کرنا فطرت کو بدلنا ہے جس سے کبھی نفع نہیں ہو سکتا نقشبندی وہ لوگ ہوتے ہیں جن کی طبیعت میں متانت ہوتی ہے ان کے مزاج سلاطین کے سے ہوتے ہیں نقشبندی سلوک اہتمام کا ہے اس میں سب کام ضابطہ کے ہیں آپ کے مزاج کے مناسب تو یہ سر و پا سلوک ہے آپ کو ضابطہ میں مقید کرنا تکلیف مالایطاق ہے۔ عرض کیا آپ کی صحبت میں تو مجھ کو سکون تھا اس کے بعد کہیں سکون نہیں فرمایا۔ سبو لہا منہا علیہا شواہد۔ الحمدللہ خود آپ کو اس بات کا اقرار ہے معلوم ہوتا ہے کہ میری تشخیص صحیح تھی پھر آپ کو کیا سوجھی تھی کہ دوسری جگہ مارے مارے پھرے، مگر اس میں بھی ایک نفع ہے الاشیاء تعریف باضدادہا۔ اب آپ کو زیادہ نفع کی امید ہے کیونکہ آپ کو حیرانی بہت ہو چکی اب اگر سکون ہوگا تو بہت آپ کو اس کی قدر ہوگی اور فرمایا ہاں .... کو نقشبندیت سے مناسبت تھی غالباً ان کو دوسری جگہ پریشانی نہیں ہوگی ان سے ہمارا دل زیادہ نہ ملتا تھا عرض کیا ہاں ان کو دوسری جگہ نفع ہوا تھا تب ہی تو انھوں نے مجھ کو بھی کھینچا فرمایا یہ عجیب بات ہے کہ دو بھائیوں کا مزاج ایک سا ہی ہوتا ہے یہ تجویز صحیح نہیں ہے کہ ان کو نفع ہوا تو آپ کو بھی نفع ہوگا۔ نقشبندی نسبت عاقلانہ اور حکیمانہ ہے اور چشتیہ مجنونانہ ہے بس اب تو آپ کے حسب حال یہ ہے ؎

آزمودم عقل دور اندیش را   بعد ازیں دیوانہ سازم خویش را

آپ بہت مزے چکھ چکے اور دیکھ چکے کہ بھٹکے پھرنے سے کچھ نتیجہ نہیں ہوا اب تو آپ ایک ہی طرف کے ہو جایئے (ایک شخص نے عرض کیا سہروردی خاندان میں کیا بات ہوتی ہے فرمایا وظائف زیادہ تر ہیں۔ اشغال بالکل نہیں اصلاح اعمال بہت اور ان کا طریقہ سلف کا سا ہے) مولوی صاحب نے عرض کیا بیشک مجھے آپ کے پاس رہنے سے بہت نفع تھا لیکن کیا کروں مجبوری ہے میں دور بہت ہوں تھانہ بھون آنے اور رہنے کی مقدرت نہیں دور سے کیا ہو سکتا ہے فرمایا چند روز پاس رہنے کی ضرورت ہے پھر دور سے بھی کام ہو سکتا ہے اور

فرمایا میں اور زیادہ وسعت کرتا ہوں کسی طرف قلب کا کھینچنا سبب ہے آپ کی پریشانی کا آپ کو جن جن حضرات سے تعلق ہوا ہے ان سے قطع تعلق کی نسبت آپ کا خیال ہے کہ باعث ناراضی ہے اور یہ خوف آپ کے دل میں بیٹھ گیا ہے اور یہی اصل ہے آپ کی پریشانی کی اس کا ازالہ رفع سبب سے ہو سکتا ہے جب سبب اس کا تعدد تعلقات ہے تو اس کا ازالہ ازالہ تعدد ہے میں کھلے الفاظ میں کہتا ہوں کہ ایک طرف ہو جائیے اتنا دل کمزور نہ کیجئے آخر کون چیز آپ کو یکسو ہونے سے مانع ہے کسی کی ناراضی کا خوف ہے ناراضی کا مضر ہونا کیسے معلوم ہو سکتا ہے اس کے لئے اگر کوئی معیار ہو سکتا ہے تو وہ شریعت ہے آپ غور کیجئے کہ یکسو ہونے میں آپ کونسا کام خلاف شرع کر رہے ہیں جب کوئی کام خلاف شرع نہیں ہے تو حق تعالیٰ کی خفگی کا خوف تو ہے نہیں کسی انسان کی خفگی اگر ہو گی تو کیا ہو گا ؎

ساقیا برخیز در دہ جام را خاک بر سر کن غم ایام را
گرچہ بدنامی ست نزد عاقلاں مانمے خواہیم ننگ و نام را

اور میں کہتا ہوں جو انسان خفا ہو بعد اس کے کہ معلوم ہو جائے کہ حق تعالیٰ اس کام پر خفا نہیں وہ کیا انسان ہے اور اس کی خفگی سے کیا ہو گا اور وہ انسان ہے تو خفا ہو گا ہی نہیں آپ کے دل میں یہ وہم بیٹھ گیا ہے کہ پہلے شیخ خفا ہو جائیں گے میں اطمینان دلاتا ہوں کہ وہ اگر واقعی شیوخ ہیں تو ہرگز خفا نہ ہوں گے، اس وہم کو قلب سے نکال دیجئے ہاں ان کی مخالفت نہ کیجئے اور ان کو اطلاع کر دیجئے تاکہ ان کو کسی دوسرے سے سن کر صدمہ نہ ہو اور کبھی ان کی شان میں کوئی گستاخی نہ کیجئے۔ مجھے پریشانی کا مرحلہ ایسا پیش آچکا ہے کہ کم کسی کو آیا ہو گا متین شیوخ ان مصیبتوں کو کیا جانیں ان کا علم تو اسی شخص کو ہوتا ہے جو خود ان کو چکھ چکا ہے مجھے بچپن سے خوش عقیدگی بہت تھی سوء ظن کا

مادہ بالکل نہ تھا ہر شخص کے ساتھ اعتقاد ہو جاتا تھا اور اصلیت اس کی یہ تھی کہ مجھے طلب بہت تھی ایسی حالت تھی جیسے پیاسا پانی کو ڈھونڈھتا ہے ہر شخص پر یہی نظر پڑتی تھی کہ شاید اس سے کچھ مل جاوے یہ حالت بہت خطرناک ہوتی ہے مگر حق تعالیٰ نے فضل کیا کہ کسی جعلساز اور مکار کے پھندے میں نہیں پڑ گیا۔ اول حضرت گنگوہی سے تعلق پیدا کرنا چاہا مگر حضرت نے طالب علمی کے سبب انکار کیا۔ پھر حضرت حاجی صاحبؒ کے پاس پہنچا یہ ابتداء زمانہ شباب کا ذکر ہے حضرت کے پاس سے لوٹ کر آیا تو سیری نہ ہوئی تھی۔ جو کچھ حضرت حاجی صاحبؒ نے تعلیم فرمایا وہ کرتا رہا مگر اس میں انتظار رہا ثمرات کا اور انتظار بھی تعجیل کے ساتھ میں یہ چاہتا تھا کہ آج ہو جاوے جو کچھ ہونا ہے مل گئے ... صاحب اور انھوں نے خود خواہش کی کہ مجھ سے کچھ حاصل کرو میں طالب تھا ہی اور عقیدت کا مادہ بہت بڑھا ہوا تھا میں نے منظور کر لیا انھوں نے کچھ بتلایا میں نے اس کے موافق شغل شروع کر دیا تو اس قدر پریشانی بڑھ گئی کہ میں بیان نہیں کر سکتا دل دو طرف کھنچتا تھا اور دونوں تعلیموں میں کچھ اختلاف بھی تھا۔ ایسے وقت میں اس شخص کی حالت جس کی پیاس بڑھی ہو اور تعجیل حد سے زیادہ ہو آپ خود اندازہ کر سکتے ہیں دو مہینے تک یہ حالت رہی کہ خودکشی تک کے وسوسے آتے تھے اگر حق تعالیٰ کی دستگیری نہ ہوتی تو خودکشی میں کچھ بھی کسر نہ تھی۔ حتیٰ کہ ایک روز تنہائی میں ایک شخص میرے پاس آئے ان کے ہاتھ میں بندوق تھی اس وقت میں بالکل آمادہ ہو گیا کہ اپنی خواہش ان سے ظاہر کردوں کہ میں حیات سے تنگ آگیا اب دنیا کو مجھ سے پاک کر دو اور قریب تھا کہ ان سے کہہ ہی بیٹھوں پھر سوچا کہ یہ کسی طرح مانیں گے نہیں ہر شخص کو اپنا پس و پیش بھی تو ہوتا ہے۔ قتل وہ شخص کر سکتا ہے جو اپنی جان کھونے پر پہلے آمادہ ہو جائے پھر میرے وہ کوئی مخالف نہیں تھے بلکہ محبت رکھنے والے تھے یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ وہ ایسی بے ہودہ بات کو مان لیں سوائے اس کے کچھ نہ ہوتا کہ میرا چھچھورا پن ظاہر ہوتا اس خیال سے زبان پر

آئی ہوئی بات رک گئی خدا تعالیٰ کو بہتر کرنا تھا غرض اس قدر پریشانی تھی کہ یہ نوبتیں ہو ہو گئیں بآخر حضرت حاجی صاحبؒ کو لکھا حضرت گنگوہی کو اس واسطے اطلاع نہ کی کہ میں خود جانتا تھا کہ مولانا یہی کہیں گے کہ سب کو چھوڑ کر ایک طرف ہو جاؤ اور میرے دل میں خیال یہ جما ہوا تھا کہ خذ ما صفا ودع ما کدر حضرت حاجی صاحبؒ کو لکھا حضرت کو سخت تشویش ہوئی۔ حضرت کو مجھ سے بیحد محبت تھی حضرت پریشان ہوگئے اور سنا ہے کہ فرماتے تھے کہ جوان آدمی ہے جوش بڑھا ہوا ہے تحمل نہ ہوا وہاں سے کوئی صاحب آنیوالے تھے زبانی کہلا بھیجا کہ جبتک تمہارا یہ خادم زندہ ہے کیوں کسی سے رجوع کرتے ہو۔ حضرت کی عادت کے بالکل خلاف ہے کبھی کسی کو اپنی طرف رجوع کرنے کے لئے کوئی لفظ نہیں کہا مگر میرے ساتھ اس قدر خصوصیت تھی (حق تعالیٰ کو یوں ہی منظور تھا) کہ یہ لفظ فرمائے اور خط بھی لکھا۔ میں کانپور میں تھا ظہر کا وقت تھا یہ پیام اور خط پہنچا وہ اثر کیا اُس لئے جو آگ پر پانی کرتا ہے مغرب کا وقت نہ آیا تھا کہ سب پریشانی رفع ہوگئی پھر اطمینان سے کام کرتا رہا الحمدللہ حضرت کی برکت سے طریق کی حقیقت سمجھ میں آگئی پھر یہ وسوسہ ہوا کہ دوسرے صاحب سے قطع تعلق ہوگا تو ناراض ہوں گے سوچتا رہا کیا کروں سمجھ میں یہ آیا کہ گول مول بات رکھنا تو ٹھیک نہیں اطلاع کر دینا چاہئے۔ پھر خفا ہوں یا کچھ ہوں جوانی اور ہوشیاری کا عالم تھا ایک تدبیر کے ساتھ ان سے قطع تعلق کیا تاکہ قطع کی نسبت انہیں کی طرف رہے وہ . . . میں تھے میں نے ان کو خط لکھا کہ بمقتضائے الدین نصح میں نہایت ادب سے خیرخواہانہ عرض کرتا ہوں کہ بعض باتیں آپ کے خلاف شرع ہیں ان کو چھوڑ دیجئے اور میں نے یہ بھی لکھا کہ میں دعا کرتا ہوں کہ آپ کی حالت شریعت کے مطابق ہو جاوے اس سے وہ بیحد خفا ہوئے اور خود ہی قطع تعلق کر دیا اور نہایت خفگی کا خط آیا جس میں یہ بھی تھا کہ میں تم کو وہ دولت دینا چاہتا تھا جو مجھ کو حضرت علی رضی اللہ عنہ سے پہنچی ہے تم اس کے اہل تھے مگر قسمت تمہاری اور ... یہاں تک لکھا تھا کہ دعا کرو خدا میرا میرے زندقہ پر اور تمہارا تمہاری شریعت پر خاتمہ کرے میری جو غرض تھی یعنی قطع تعلق وہ پوری ہوگئی ہیں یہ قصہ تھا اس واسطے میں اس کی کچھ پرواہ نہ کی پھر . . . وہ صاحب کہتا کہ جون آئے یہ وقت میرے واسطے بہت نازک تھا میں

سوچتا تھا کہ اب ان سے ملاقات ضروری ہوگی میں کیا عذر کروں گا اور یہ ممکن نہیں کہ میں ملوں نہیں مگر میں دل کڑا کر گیا تو نہ ان سے ملا نہ اُن کے پاس گیا نہ کچھ کہا نہ کچھ سُنا انھوں نے جب ایسا دیکھا تو بہت بُرا بھلا کہا۔ ایک لوہار نے اس کو مجھ سے نقل کرنا چاہا اور میرا طرفدار بن کر ۔۔۔ صاحب کی شان میں کچھ گستاخی کرنا چاہی میں نے اس کو ڈانٹ دیا کہ خبردار جو کچھ کہا ہم جانیں اور وہ جانیں تم کون بیچ میں بولنے والے (بحمد اللہ میں نے تہذیب سے باہر کبھی قدم نہیں رکھا) وہ میرے بزرگ ہیں ان کو منصب ہے کہنے کا اور جانے کتنی دفعہ انھوں نے ہم کو بچپن میں مارا ہوگا اور ہم نے کتنی دفعہ ان پر پیشاب کیا ہوگا ہم اور وہ دو دو نہیں ہیں اس نے یہ باتیں جا کر اُن سے نقل کر دیں اس کا بڑا اثر ہوا پھر ایک شخص نے ان سے کہا آپ ہی مل لیجئے کہا مل تو لوں مگر میرا خیال ہے کہ وہ مجھ سے نہ ملے گا اور کہیں ٹل جاوے گا اس نے کہا نہیں ایسا ہرگز نہ ہوگا میں ذمہ دار ہوں مگر ان کو بہت غیظ تھا کہا میں ملوں گا بھی تو بڑا بن کر تو ملوں گا نہیں وہ بڑا سمجھتا تو خود ہی آ کر نہ ملتا ہاں رند بن کر ملوں گا اور پائجامہ اتار کر اس کے سامنے جاؤں گا تو کیا اس حالت میں بھی وہ مجھ سے ملے گا اس شخص نے کہا اس حالت میں میں ذمہ نہیں کرتا۔

اسی اثنا میں عید آ گئی اتفاق سے ان سے موٹھ بھیڑ ہو گئی مگر میں نے سلام نہیں کیا اس پر بڑے خفا ہوئے پھر بقرا عید آ گئی مجھے اس وقت قرائن سے معلوم ہو گیا کہ آج امامت کرنا پڑے گی تردد ہوا کہ میں ان کے سامنے نماز کیسے پڑھاؤں گا ان کو امام بنانا چاہیئے مگر اس کو اور لوگ شاید نہ مانیں اور میں امام بن گیا تو علاوہ بدتمیزی کے ان کو کدورت رہے گی کیونکہ مجھ کو باطل پرست سمجھتے ہیں آخر یہ کیا کہ نماز جلال آباد جا کر پڑھی غرض ان سے بول چال نہیں ہوئی پھر وہ چلے گئے اور وفات بھی ہو گئی بس سن لیا آپ نے بہت یوں کرنا چاہیئے مولوی صاحب نے عرض کیا اس سے پریشانی ہے کہ میں حضرت سے دور ہوں اور حضوری کی کوئی صورت نہیں فرمایا آپ کچھ بھی کہیں لیکن بڑی وجہ پریشانی کی کشاکشی ہے اور میں

کہتا ہوں کہ ان قصوں سے نفع یہ ہے کہ آپ کو راہ کی بصیرت ہوئی مجھے اس پریشانی سے بڑا نفع ہوا گھر میں اس کی مثال دیا کرتے ہیں کہ ایسا ہے جیسے کوئی گلستان میں رستہ قطع کررہا تھا درمیان میں برابر ایک خارستان آگیا یہ شخص اس میں جا گھسا پھر لوٹ پھر کے اسی گلستان میں آکر چلنے لگا تو اس کو مقصود کی قدر زیادہ ہوئی ہے نیز اس کو اس خارستان میں گذرنے تمام ان دشواریوں کا علم ہوجاتا ہے جو راہ میں پیش آتی ہیں پھر وہ دوسروں کو لے چلنے میں بڑا ماہر ہوجاتا ہے گھر میں سمجھ اس فن کی بہت اچھی ہے ہاں عمل میں نہیں افسوس کہ ایسا آدمی کام نہ کرے۔ کام نہ کرنے سے بعضے اخلاق بھی بے اصلاح ہیں اور اس پریشانی سے مختلف شیوخ کے بعد حضرت کی دستگیری دیکھ کر بڑا نفع ظہور شان حاجی صاحبؒ کا ہوا زمانہ قبض میں اوروں سے بھی رجوع کیا حضرت کسی نے وظیفے بتادیئے اور کسی نے کچھ کسی نے کچھ محقق ایک بھی نہ ملا۔ حضرت کا عجیب طریقہ تھا اور اصل میں مرض کو ایسا صحیح پکڑ لیتے تھے کہ دوسرا کوئی نہیں کرسکتا اور شفقت ایسی تھی کہ نظیر ملنا مشکل ہے اسی وجہ شفا حکمی ہوتی تھی۔ حضرت مولانا گنگوہیؒ بھی حضرت ہی کے طریقہ پر تھے اور حضرت کے طریقہ کے پورے جامع تھے۔ مگر لوگوں کو اس کا پتہ نہ چلتا تھا کیونکہ مولانا کو مجلس میں اصول و فروع کے بیان کا اہتمام نہ تھا صرف ایک عالم معلوم ہوتے تھے اور میں ایسا اوچھا ہوں کہ کسی بات کو نہیں چھپاتا میرا خیال ہے کہ فن تصوف کو آجکل طشت از بام کرنا چاہیئے ہزاروں قسم کی گمراہیوں اور تلبیسوں میں لوگ پڑے ہوئے ہیں اصلاح بلا اس کے کیسے ہو میں اصول و فروع سب کو کھلم کھلا بیان کردیتا ہوں چھپانے کی چیز اپنی حالت ہے (میرا خیال اس کی نسبت بھی یہ ہے کہ خاص خاص لوگوں کے سامنے بمصلحت اس کو بھی ظاہر کردے تو حرج نہیں) اپنی حالت ایک راز ہوتا ہے حق تعالیٰ کے ساتھ دوسروں پر اس کا ظاہر کرنا حق تعالیٰ کی غیرت کے خلاف ہے اور فن کو تو علی الاعلان پکار پکار کر ظاہر کرنا اور شائع کرنا چاہیئے۔ مولوی صاحب نے عرض کیا مجھے عقیدت راسخ تو آپ ہی سے ہے فرمایا مجھے اس کا انتظار ہی نہیں کہ دوسرے کسی سے اتنا عقیدہ نہ ہو جتنا مجھ سے ہو محبت احباب کا تو انتظار ہے محبت اور عقیدت

الگ الگ چیز یں ہیں خدا کا کوئی طالب ہو اور مجھ سے سو دفعہ قطع کر دے پھر میں ویسا ہی خادم ہوں میں اس کو بڑی تنگ ظرفی سمجھتا ہوں جو آجکل کے مشائخ میں ہے کہ ذرا طالب جدا ہوا تو مردود بنا یا پھر کسی طرح راضی ہی نہیں ہوتے کوئی ان سے پوچھے کہ تم سے بھی اپنے شیخ کے ساتھ کوئی غلطی ہوئی تھی یا معصوم تھے اور بسا اوقات طالب سے غلطی کثرت محبت کی وجہ سے ہوجاتی ہے اس کی تو قدر کرنا چاہیئے اس وقت اس کو مردود بنانا خود ان ہی کی غلطی ہے ایسا طالب تو بے بہا نعمت ہے ہر چھوٹا چھوٹا نہیں ہوتا بعض وقت حق تعالیٰ بڑے لوگوں پر چھوٹوں کی برکت سے فضل فرماتے ہیں اس وقت بڑا بنتا تکبر ہے حقیقت میں بڑا وہ ہے۔

فرمایا مولوی صاحب آپ کے پاس تو عذر بھی ہے اوروں سے قطع تعلق کرنے کے لئے کہ میں پہلے سے تھانہ بھون ہی سے تعلق رکھتا ہوں ما الحب الا للحبیب الاول، بس ایک طرف ہوجایئے ہاں اتنا ضرور ہے کہ پہلے شیخ کو گو وہ کیسے ہی بے نفس ہوں اطلاع کر دیجئے تاکہ آپ کا اور ان کا دونوں کا قلب مطمئن ہوجاوے۔ اطلاع نہ کرنے میں آپ کو یکسوئی نہ ہوگی۔ مولوی صاحب نے عرض کیا نہیں بلکہ میرے قلب کی حالت یہ ہے کہ اطلاع کرنے میں یکسوئی نہ رہے گی فرمایا تو اطلاع کی ضرورت نہیں کوئی گناہ تو کر ہی نہیں رہے بس ایک طرف ہو کر بنام خدا کام شروع کیجئے آپ کو چشتیت کی تعلیم ہونا چاہیئے آپ کا ہر حال اس کا شاہد ہے چشتیہ اور نقشبندیہ دونوں کی شان میرے مذاق میں تو اسی ایک شعر سے واضح ہوتی ہیں ع رند عالم سوز را با مصلحت بینی چہ کار یہ چشتی کی حالت ہے کہ ع کار ملک است آنکہ تدبیر و تحمل بایدش۔ یہ نقشبندی کی حالت ہے کہ ہر کام میں انتظام اور تدبیر ہوتی ہے جیسے سلاطین میں ہوتی ہے۔

مولوی صاحب نے عرض کیا حضور کی دعا سے اس وقت میرے قلب کو بہت طمانیت حاصل ہوئی مگر مشکل یہ ہے کہ سامنے آپ کے اور حالت

ہوتی ہے اور پیچھے اور فرمایا یہ ضرور ہے مگر یہ تقلب مضر نہیں پریشانی کبھی نہ ہوگی اس قسم کا تغیر ہر شخص کو پیش آتا ہے مرید تو کیا شیخ کی حالت میں بھی وقت افادہ اور غیر افادہ میں فرق ہوتا ہے مرید کو شیخ کے پاس بیٹھنے سے نفع ہوتا ہی ہے شیخ کو بھی مرید کی بدولت بہت سی باتیں حاصل ہوتی ہیں اسی کو مولانا فرماتے ہیں ۔

بانگ مے آید کہ اے طالب بیا　　جود محتاج گدایان چوں گدا

دیکھئے مدرسہ میں مدرس طالب علموں کے افادہ کے لئے مقرر ہوتا ہے اور طالب علموں کو اس سے نفع پہنچتا ہے اور طالب علموں کا نفع اس پر موقوف ہے لیکن کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ مدرس کو طالب علموں سے کچھ نفع نہیں پہنچتا آپ خود عالم ہیں اس بات کو بخوبی جانتے ہیں بارہا کا تجربہ ہے کہ کوئی مضمون کتاب میں پڑھتے وقت باوجود کوشش اور مطالعہ کے اور باوجود استاد کے سمجھانے کے سمجھ میں نہ آیا اور ہمیشہ اس میں الجھن رہی اور جس وقت طالب علم پڑھنے بیٹھا قلب میں دفعۃً آگیا یہ طالب علم ہی کی برکت ہے یا کچھ اور فائدہ کے وقت حق تعالیٰ کی طرف سے تائید ہوتی ہے طالب اور مطلوب کی باہم احتیاج کے لئے یہ شعر حافظ کا خوب ہے۔ شعر

سایہ معشوق گر افتاد بر عاشق چہ شد
ما باو محتاج بودیم او بما مشتاق بود

اسی شعر میں مولانا کے شعر مذکور سے ادب ازید ہے اس میں طالب و مطلوب میں مساوات سی پائی جاتی ہے اور اس میں لفظ بدل دیا طالب کے لئے احتیاج اور مطلوب کے لئے اشتیاق اطلاق کیا۔

تقریر ادب الطریق ختم ہوئی۔

تاریخ بیضیض ۱۵ ربیع الاول ۱۳۳۵ھ روز چہار شنبہ
۲۰ جنوری ۱۹۱۷ء مقام میرٹھ محلہ کریم علی

ادب الاعتدال

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حامداً ومصلیاً

تقریر حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ مسمی ادب الاعتدال

یہ تقریر بھی منجملہ ان تقریروں کے ہے جو سفر گورکھپور میں ہوئیں یہ تقریر ریل میں مابین اسٹیشن مؤ و اعظم گڈھ ہوئی وقت ٹھیک پونے دو گھنٹے تاریخ ۲ صفر ۱۳۳۵ھ روز یکشنبہ بعد طلوع آفتاب مطابق ۲۸ دسمبر ۱۹۱۶ء۔ اس ہمراہیوں سے دو درجے بھرے ہوئے تھے تخمیناً چودہ پندرہ آدمی۔

موضع اعظم گڈھ میں زائرین کا بہت ہجوم ہوا اور بہت سے ان میں اس بات کے طالب ہوئے کہ ہماری بستی میں تشریف لے چلئے فرمایا وقت بہت تنگ ہے میں خواجہ عزیز الحسن صاحب سے وعدہ کر چکا ہوں کہ ان کے ساتھ ایک مقام پر یاست بھرت پور میں جاؤں اور ان کو لکھا جس کا دل چاہے کہ مجھ کو منگل کے روز الہ آباد میں ملیں آج اتوار ہے مجھ کو پرسوں الہ آباد پہنچنا ضروری ہے بیچ میں سرائے میر اور فتح پور کا بھی وعدہ کر چکا ہے اب اتنا وقت کسی طرح نہیں ہے کہ اور کہیں جاسکوں۔ فتحپور کیلئے بھی بمشکل دو گھنٹے ملے ہیں اور مقامات پر جانے کی ایک صورت، یہ ہو سکتی ہے کہ اس وقت تو میں الہ آباد چلا جاؤں اور خواجہ صاحب سے مشورہ کروں وہ وہاں ملیں گے اگر وہ اپنے ساتھ لیجانا ملتوی کر دیں تو الہ آباد سے پھر لوٹ آؤں گو مجھ کو اس میں تکلیف ہوگی مگر خیر میں اس کو گوارا کروں گا بد نظمی نہ ہونی چاہیئے لیکن اس کے لئے بھی کئی شرطیں ہیں ایک یہ کہ میں حطمی وعدہ نہیں کرتا کہ میں لوٹ آؤں گا۔ خواجہ صاحب سے مشورہ کے بعد جو کچھ

؎ یہ ایک موضع ہے ضلع اعظم گڈھ میں۔

طے ہوگا اس پر عمل ہوگا۔ دوسرے یہ کہ میں خواجہ صاحب پر زور نہیں دوں گا کہ وہ اپنے ساتھ نہ لیجائیں۔ اس واسطے مناسب ہے کہ جس جس کو مجھے اپنے یہاں لے چلنا ہو وہ سب اپنا اپنا ایک ایک وکیل جو ان کے نزدیک معتمد علیہ ہو میری ہمراہ بھیجدیں وہ وکلا وہاں خواجہ صاحب سے کہیں اگر خواجہ صاحب نے منظور کرلیا تو میں ان وکلاء کے ساتھ واپس آجاؤں گا اور اس میں بھی شرط یہ ہے کہ معتد بہ تعداد مقامات کی ہوجاوے ایک دو جگہ کے لئے اتنے لمبے سفر کو دہرانا نہیں ہوسکتا اس وقت لوگ مقامات کے نام لکھوادیں اگر تعداد معتد بہ ہوگئی تو خیر یہ طول گوارا کیا جاوے گا۔ لوگوں نے کہا خواجہ صاحب کو تار دیدیں فرمایا تار کے قصے بہت دیکھے ہیں مشورہ طلب باتوں میں تار سے کچھ کام نہیں چلتا کیونکہ اتنا مضمون تار میں کیسے جاسکتا ہے آپ لوگ آپس میں مشورہ کرکے وکلا منتخب کرلیں اور میرے پاس لے آویں اگر پانچ مقام بھی ہوگئے تو میں چلا آؤں گا۔

چنانچہ تھوڑی دیر کے بعد چار جگہ کے آدمیوں نے آمادگی ظاہر کی وہ چار جگہ یہ ہیں۔ ہمی پور، پورہ معروف، مبارکپور، بہادرگنج ان سب نے پوری آمادگی ظاہر کی۔ لیکن جب مؤ سے روانہ ہوئے تو اسٹیشن پر انبوہ میں کچھ پتہ نہ چلا کہ کس کس کے وکیل ساتھ ہیں جب ریل میں بیٹھ گئے اور روانہ ہوگئے تو فرمایا جو جو لوگ بلانا چاہتے تھے انھوں نے اپنے اپنے وکیلوں کے بھیجنے کا کیا انتظام کیا۔ خدام نے عرض کیا ہم کو نہیں معلوم ظاہراً تو لوگ سست ہوگئے اس وجہ سے کہ ان کو پوری امید نہیں رہی فرمایا میں جب کسی کا بلایا ہوا جاتا ہوں تو اس کے آدمی کو ضرور ساتھ لے لیتا ہوں بس یہ کام ساتھ رہنے کا مشکل ہے صرف بلاوا دیدینا تو کچھ بات نہیں تمام راستہ کا بار سفر کا اور انتظامات کا مدعو کے سر رہتا ہے بلانے والے کی صرف زبان ہلتی ہے اور بہت سے بہت یہ کہ روپیہ خرچ کردیا جب انتظام کا بار اپنے ذمہ پڑتا ہے تب معلوم ہوتا ہے کہ بلانا کیا چیز ہے انتظام کارے دارد۔ اس سے طلب کی بھی جانچ ہوجاتی ہے جو طالب ہوگا وہ سو بکھیڑے اپنے ذمہ لے گا اور اس میں اپنی آسایش بھی ہے راستہ اور سفر کی ضروریات سے جیسا کہ داعی کا آدمی

واقف ہوسکتا ہے ایسا مدعو نہیں ہوسکتا اسی سفر میں اگر بھائی اکبر علی کا آدمی گورکھپور سے ساتھ نہ ہوتا تو ڈوری گھاٹ کے اسٹیشن پر کس قدر مصیبت کا سامنا ہوتا جو کچھ تجویزیں ہم نے اور بھائی اکبر علی نے کی تھیں کہ سواری وغیرہ کا انتظام پورا کر دیا تھا وہ سب درمیان میں ایک جگہ ریل نہ ملنے سے الٹ پلٹ ہوگئیں اگر وہ خدمتگار نہ ہوتا تو سردی میں اور اندھیرے میں رات کو کہاں پڑتے۔ وہ واقف تھا اس نے اتنا تو کر لیا کہ دھرم شالہ میں جا ٹھیرایا میں کہیں از خود جانے سے بڑی عار رکھتا ہوں الا آنکہ بہت ہی مخلص اور خاص آدمی ہو کہ اس کے یہاں جانے میں کچھ تامل نہیں کرتا اس سے شرطیں لگانے کو تکلف اور ایذا سمجھتا ہوں اور بلا خاص تعلق کے کسی کے یہاں جانے میں میں بہت ہی شرطیں لگاتا ہوں اور پوری طرح دیکھ لیتا ہوں کہ وہ دل سے بلاتا ہے یا نہیں اور ابھی کوئی دینی یا دنیاوی مفسدہ تو اس پر مرتب نہیں پوری طرح چھان بین کر کے جب جاتا ہوں حتیٰ کہ بعض لوگ میری ان شرائط کو دیکھ کر یہ سمجھتے ہیں کہ اس کے مزاج میں بہت خودکشی ہے مگر تعجب ہے کہ اس پر بھی ایک مہربان نے اس کو آوارہ گردی سمجھ کر اعتراض کیا۔ یہ ایک صاحب ہمارے مجمع کے مخالف ہیں بڑے ناز نخروں سے سفر کرتے ہیں۔ ایک موقع پر کسی نے بلایا تو طعنہ کے طور پر کہا کہ ہم پٹواریوں کی طرح مارے مارے نہیں پھرتے اور ایک دفعہ بعض اہل بدعت نے وہابیوں کی شناخت یہ بھی چھاپی تھی کہ دور دور کی دعوتیں کھاتے ہیں کیا مشکل ہے ایک طرف تو وہ اعتراض کہ یہ اپنے آپ کو کھینچتے ہیں اور ایک طرف یہ کہ پٹواری بنا دیا اگر معترضین کے کہنے کا خیال کیا جاوے تو زندگی محال ہے اس واسطے آدمی کو چاہیئے کہ اپنا معاملہ حق تعالےٰ کے ساتھ صاف رکھے اور دنیا کو بکنے دے کوئی کچھ کہا کرے۔ احقر نے عرض کیا تعجب ہے کہ مخالفین یہ اعتراض کرتے ہیں کہ ہم لوگ دعوتیں کھاتے پھرتے ہیں وہ خود تو بہت زیادہ دعوتیں کھاتے ہیں اور تکلف کی دعوتیں چاہتے ہیں۔ منہ سے مانگ کر لیتے ہیں جیسے مناظرہ رامپور میں ہوا

کہ قادیانی لوگ فرمائش کر کرکے بہت سا گھی اور شکر اور انڈا اور مرغی اور بکرے کا گوشت اور کیا کیا روزانہ لیتے تھے اور سفر خرچ میں بھی نواب صاحب سے سینکڑوں کی رقم وصول کی بخلاف ہمارے مجمع کے کہ کبھی کوئی فرمائش نہیں کی اور بہت اصرار کی بھی تو ماش کی دال کی اور سالن میں گھی کم کر دینے کی۔ فرمایا ہاں بہت جگہ دیکھا کہ یہ لوگ گھر گھر کے وصول کرتے ہیں کسی کے پانچ انڈے روز مقرر ہیں اور کسی کے ناشتے میں حلوا اور پراٹھے مقرر ہیں۔ کسی کی فیس بہت زیادہ مقرر ہے جو علاوہ سفر خرچ کے وصول کی جاتی ہے غرض سیاحین میں کوئی مجمع صلحاء کا نہیں دیکھا کہیں یہ نہیں دیکھا کہ دس پانچ آدمی ایسے ہوں جن کو صالح اور دیندار کہا جا سکے کوئی شاذ و نادر اور اکیلا دیندار ہو تو ہو۔ اور ہمارے ہاں بحمد اللہ اتنے دیندار موجود ہیں کہ مجمع کے مجمع ہو سکتے ہیں۔ ہر مجمع میں ممکن ہے کہ دس پانچ آدمی ایسے دکھائے جا سکیں جن کا صالح ہونا مسلم ہو۔ اکثر غیر مقلد لوگ اپنا نام اہل حدیث رکھتے ہیں لیکن حدیث سے ان کو مس بھی نہیں ہوتا صرف الفاظ یاد رہتے ہیں اور حدیث میں جو بات سمجھنے کی ہے جس کی نسبت وارد ہے من یرد اللہ بہ خیرا یفقہہ فی الدین وہ اور چیز ہے اگر وہ صرف الفاظ کا سمجھنا ہوتا تو کفار بھی تو الفاظ سمجھتے تھے وہ بھی فقیہ ہوتے اور اہل خیر ہوتے تفقہ فی الدین یہ ہے کہ الفاظ کے ساتھ دین کی حقیقت کی پوری معرفت ہو سو ایسے لوگ حنفیہ میں بکثرت ہیں۔ حضرت حاجی صاحبؒ ایک شیخ تھے عالم ظاہری پورے نہ تھے مگر تحقیق کی شان یہ تھی کہ ایک دفعہ بھوپال سے حج کرنے آئے تھے حضرت سے بیعت ہوتے، ان کے ساتھ ایک دوسرے شخص بھوپال کے تھے جو سخت غیر مقلد تھے اور ان پہلے صاحب کو بھی وہ غیر مقلد سمجھتے تھے۔ ان بھوپالی غیر مقلد صاحب نے اس سے سمجھا کہ حضرت غیر مقلد کو بھی بیعت کر لیتے ہیں انھوں نے ان صاحب کی معرفت حضرت حاجی صاحب سے دریافت کرایا کہ میں بھی بیعت ہونا چاہتا ہوں مگر غیر مقلد ہی رہوں گا۔ حضرت نے اس شرط کو منظور فرمالیا پھر وہ خود حاضر ہوئے

اور تصریحاً پوچھا فرمایا ہاں کچھ حرج نہیں۔ بس بیعت کرلیا لیکن بیعت ہوتا تھا خدا جانے کیا اثر ہوا کہ اس کے بعد اول ہی وقت نمازیں نہ آمین کہی نہ رفع یدین کیا۔ حضرت کو خبر ہوئی تو حضرت چونک اٹھے اور بلا کر ان سے پوچھا کہ اگر آپ کی تحقیق اور رائے بدل گئی تب تو خیر اور اگر میری خاطر سے ایسا کیا تو میں ترک سنت کا وبال اپنے اوپر نہیں لیتا۔ یہ دیکھئے تحقیق کی شان ہے اور سنت سے ہمارے حضرات کو اور خصوصاً حضرت حاجی صاحبؒ کو سنت کے ساتھ غایت درجہ کا تعشق تھا پھر ایسے لوگوں کو متعصب کہا جائے تو کس قدر ظلم ہے ہاں متصلب ہیں متعصب نہیں۔ تصلب اور چیز ہے اور تعصب اور چیز۔ متصلب فی الدین اس شخص کو کہتے ہیں جو دین میں پختہ ہو اور متعصب ناحق ہٹ کرنے والے کو کہتے ہیں۔

علیگڈھ کالج کے بعض طلبہ نے مجھ سے کہا کہ علماء متعصب ہیں میں نے کہا ایک مثال دیتا ہوں اور آپ ہی پر فیصلہ رکھتا ہوں اس سے بخوبی واضح ہو جائیگا کہ سنتا ہے تمھاری ماں اول رنڈی تھی پھر نکاح کرلیا اس کے بعد تم پیدا ہوئے کیا یہ بات صحیح ہے۔ سو اول تو اس میں عیب کیا ہے کہ ایک عورت رنڈی تھی اس نے توبہ کرلی اور نکاح کرلیا اس کے بعد جو اولاد ہوگی وہ تو حلال کی ہوگی اس سے اس شخص کے نسب میں کچھ طعن نہیں ہوتا۔ دوسرے اس سے قطع نظر اگر یہ بات واقعی ہو تب تو ایک واقعی بات کے تحقیق کرنے میں کچھ بھی حرج نہیں اب میں پوچھتا ہوں آپ سے کہ میں فرضی صورت کو چھوڑ کر یہی صورت اختیار کرتا ہوں کہ یہ بات واقعی ہو اور ایک مجمع میں بیان کی جائے تو کیا وہ شخص ٹھنڈے دل سے اس واقعہ کو سنکر جواب دے گا یا جوش کے مارے آپے میں نہ رہے گا بلکہ اگر اس پر جوش نہ ہو تو آپ کے نزدیک یہ داخل بیغیرتی ہوگا یا نہیں اور اگر آپ انکار کریں تو ہم امتحان کرکے دکھا دیں۔ بتلایئے کہ اس کو جوش کیوں ہوگا اور یہ جوش کا ہونا آپ کے نزدیک بجا کیوں ہے اور جوش کا نہ ہونا بیغیرتی کیوں ہے۔

اگر وہ شخص واقعی بات کہتا ہے تب تو سچی بات پر غیظ آنا کیا معنے اور اگر جھوٹی بات کہتا ہے تب بھی جوش کے کچھ معنے نہیں خدا کا شکر کرنا چاہیئے کہ اس کی ماں میں یہ عیب نہیں اور اس کہنے والے کو نرمی سے اور دل سوزی سے اور جن الفاظ کو وہ پسند کرے ان الفاظ سے سمجھا دینا چاہیئے کہ بھائی یہ بات غلط ہے اور اگر نہ مانے تو اس کے حال پر چھوڑ دینا چاہیئے اور اس سے کچھ تعرض نہ کرنا چاہئے تو اس پر جوش ہونے کی وجہ یہی ہے کہ اپنی ماں کی عزت ہر شخص کے دل میں ہوتی ہے اس کی نسبت کوئی برا لفظ سننا قطع نظر واقعیت اور غیر واقعیت سے گوارا نہیں ہوتا بس ہم کو ہماری نظر میں دین کی عزت ماں سے زیادہ ہے کوئی ناشائستہ لفظ دین کی نسبت سننا گوارہ نہیں ہوتا اور فوراً جوش آہی جاتا ہے اور جوش نہ آنے کو ہم بے غیرتی سمجھتے ہیں۔ سوال کی طرح سوال کر دتب دیکھو ہم ناراض ہوتے ہیں یا نہیں خود ہماری کتابوں ہی میں اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت ایسے سوال لکھے ہوئے ہیں جن سے توحید اور رسالت اڑی جاتی ہے اور علماء نے ان کے جواب نہایت متانت سے دیئے ہیں غیض و غضب کا کچھ کام نہیں ان سوالوں میں تحقیق مدِ نظر ہے اور آپ لوگوں کو تحقیق مد نظر صرف استہزا بالدین اور چھیڑ چھاڑ منظور ہے سو اس کو تو ہم کبھی نہیں سن سکتے۔ یہ جواب ہے تمہارے سوال کا اور اگر اس کو بھی تعصب ہی کہتے ہو تو دوسری بات لیجئے آپ ایسے متعصبین سے تحقیق ہی نہ کیجئے ایسے جوش کے حضرات پر لسنے علماء ہیں جنھوں نے کبھی ایسی بد دینی کی باتیں نہ سنیں تھیں آپ ہم سے پوچھئے ہم ایسے غیرت دار نہیں وجہ یہ کہ ہم تمہاری صحبت سے اور بار بار سننے سے بے غیرت ہو گئے ہیں ہم سے بے تکلف پوچھئے جو کچھ پوچھنا ہو۔ جن صاحب نے یہ کہا تھا کہ علماء میں تعصب ہے ان پر تو ایسا اثر ہوا کہ وہ فوراً میرے موافق بن گئے اور طالب علموں کو بھی سنا کہ آپس میں کہتے تھے جس کو جواب لینا ہو یہاں آجاؤ مگر کسی کو یہ توفیق نہ ہوئی کہ سوالات کرتے۔ بلکہ ان سے یہ بھی کہا گیا تھا کہ اپنے شبہات

آزادی کے ساتھ لکھ کر بھیجدو یہ بھی کسی سے نہ ہوا ان لوگوں کی باتیں ہی باتیں ہیں دوسرے کے سر الزام رکھ کر خود کام سے بچنا چاہتے ہیں غرض علماء سے بدگمانی دور ہی دور سے ہے ہمارے علماء تو ایسے کریم النفس اور شفیق ہیں کہ ان سے نفرت ہو ہی نہیں سکتی لیکن تصلب کیسے چھوڑ دیں نرمی اور چیز ہے اور مداہنت اور چیز ہمارے علماء نرم تو بہت ہی زیادہ ہیں ہمارے علماء کی کوئی تحریر دل آزار نہیں دکھائی جاسکتی ہاں جواب ایسا ہوتا ہے کہ اس کا جواب نہ آسکے تحقیق کی شان یہ ہے لیکن کہیں کوئی کلمہ بیہودہ نہ ہوگا بات کا جواب پورا دیں گے کسی کی رو رعایت نہ کریں گے ان سے مداہنت نہیں ہوسکتی۔ یہ طریقہ ان کو پسند نہیں کہ گنگا پر گئے تو گنگا داس اور جمنا پر گئے تو جمنا داس۔ آج کل لوگوں نے یہ شعر یاد کر لیا ہے ؎

حافظا گر وصل خواہی صلح کن با خاص و عام
با مسلماں اللہ اللہ با برہمن رام رام

یہ حافظ کا شعر کہا جاتا ہے مگر یہ حافظ شیرازی کا نہیں ہے کوئی آنکھوں کا حافظ ہوگا وہ تو ہندوستان آئے بھی نہ تھے رام رام کیا جانیں ہمارے ان علماء سے جب کوئی ملتا ہے تو پھر کبھی نہیں کہتا کہ متشدد ہیں ہاں مخالفین کے علماء متشدد بھی ہیں اور ان کا عالم بھی بہت ہی ناتمام ہے ایک غیر مقلد مجھ سے کہنے لگے کہ ہمارے علماء سوائے آمین اور رفع یدین کے کچھ نہیں جانتے اسی واسطے ہم معاملات کے مسائل آپ سے پوچھا کرتے ہیں حالانکہ یہ شخص بہت ہی سخت ہیں ان کے دوسرے بھائی بھی غیر مقلد ہیں مگر وہ نرم ہیں وہ کہنے لگے ہمارا یہی دعوٰے غلط ہے کہ ہم غیر مقلد ہیں ہم تو نہ عالم ہیں نہ محدث جنتک حضرت

ے مگر حضرت نے خود ہی سے سنائے شبہات کو جمع کرکے ان کا حل کیا اس رسالہ کا نام "الانتباہات المفیدہ عن الاشتباہات الجدیدہ" رکھدیا یہ جامع رسالہ قابل دید ہے اس کو علم کلام جدید کہنا چاہئے اس کی نظیر پہلے کبھی نہیں ہوئی ۱۲

گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ زندہ تھے ان سے پوچھتے تھے اب آپ سے پوچھتے ہیں اور فرمایا ہم ایک دفعہ گڑھی گئے (یہ ایک قصبہ ہے ضلع مظفر نگر میں) وہاں کے رئیس نے کسی تقریب میں مجمع کیا تھا اور یہ دونوں بھائی بھی آئے ہوئے تھے وہاں انھوں نے آمین پکار کر نہیں کہی مجھے اس کی قدر ہوئی۔ مولانا شیخ محمدؒ کے زمانہ میں ایک دفعہ کیڑی کے ایک آدمی جمعہ میں آئے ہوئے تھے انھوں نے مولانا کے پیچھے آمین کہی تمام جماعت بھر میں کھلبلی مچ گئی کسی نے کہا نکال دو کسی نے کہا مار دو۔ مولانا نے سب لوگوں کو ساکت کیا اور کہا کوئی ایسی بات نہیں ہوئی جو اس قدر غل مچاتے ہو پھر ان صاحب کو بلا کر پوچھا جنھوں نے آمین بالجہر کہی تھی کہ جن لوگوں نے آمین زور سے نہیں کہی ان کی نماز تمھارے نزدیک ہوئی یا نہیں۔ جواب دیا نماز تو ہو گئی فرمایا پھر کیوں اتنے مجمع کو پریشان کرنا کیا ضرورت تھی۔ فرمایا حضرت والا نے ہم لوگوں کا بھی یہی مسلک ہے ہم آمین بالجہر کے ایسے خلاف نہیں کہ اس کے واسطے فوجداریاں کی جائیں۔ قنوج کی جامع مسجد میں ایک دفعہ میرے وعظ کی خبر سن کر غیر مقلدین جمعہ میں شریک ہوئے اور آمین بھی زور سے کہی جب کسی نے کچھ نہ کہا تو دوسری رکعت میں تھوڑوں نے کہی۔ دیکھئے نرمی کا یہ اثر ہوتا ہے بعد نماز میں نے وعظ کہا اور بدعات رسوم کا بیان کیا غیر مقلدین نے کہا آج معلوم ہوا کہ ہم بھی بدعات میں مبتلا ہیں۔ آیت یہ تھی۔ قل لازواجك ان كنتن تردن الحيوٰة الدنيا وزينتها فتعالين امتعكن واسرحكن سراحا جميلا۔ جس میں میں نے بیان کیا کہ قرآن شریف کے الفاظ تو بتلاتے ہیں کہ بیبیوں سے کہہ دینا چاہیئے کہ اگر تم دین کی پابندی نہ کرو گی تو تم کو طلاق دیدیں گے یہ ان کی محبت تھی دیکھئے ہم لوگوں نے آمین کے باب میں سختی نہیں کی ہمارے علماء میں تشدد ہی نہیں قنوج ہی میں مجھ سے ایک شخص نے مولود شریف پڑھنے کی درخواست کی میں نے کہا مجھے پڑھنے سے تو انکار نہیں ہے مگر میرا پڑھنا آپ کو پسند نہ آئے گا وہ بولے

جس طرح پڑھو گے ہم کو پسند ہے میں نے وعدہ کرلیا وہاں ایک غیر مقلد بیٹھے تھے صاحب فرمائش نے ان سے کہا تم بھی آنا جن کے مکان پر میں ٹھیرا ہوا تھا انھوں نے کہا لاحول ولا قوۃ الا باللہ۔ میں نے کہا لاحول کا ہے پر پڑھی آپ کو کیا معلوم ہے کہ میں کیسے پڑھوں گا آپ آویں اور مجلس کے کنارہ پر بیٹھیں اور کوئی بدعت ہو فوراً اُٹھ جاویں چنانچہ بعد عصر بیان ہوا اور میں نے بطور وعظ بیان کیا وہ صاحب علیحدہ بیٹھے رہے میں نے اس آیت کا بیان کیا۔ الٓـر کتب انزلناہ الیک لتخرج الناس من الظلمات الی النور الآیۃ مغرب تک بیان ہوا اور وہ برابر بیٹھے رہے اور بعد میں کہا ایسے مولود شریف سے کیا انکار ہے وہی غیر مقلد کہنے لگے کہ ہم اپنے آپ کو عامل بالحدیث کہتے ہیں مگر ہمارا عمل بالحدیث صرف آمین بالجہر اور رفع یدین تک محدود ہے اور دیگر امور میں یہ حالت ہے کہ میں عطر میں تیل ملا کر بیچتا ہوں۔ کبھی وسوسہ بھی نہیں گذرا کہ یہ حدیث کے خلاف ہے۔ فرمایا حضرت والا نے یہ حالت ہے ان لوگوں کی جو حدیث حدیث کہتے پھرتے ہیں خود ایک غیر مقلد کہتے تھے کہ ہم میں متقی کم ہیں اور حنفیہ میں خشیت اتقاء، زہد وغیرہ والے کثرت سے ہیں۔ محمد آباد کے اسٹیشن پر چار پانچ آدمی ملنے کو آئے اور بہت خلوص سے ملے فرمایا اس نواح میں دو چار دن رہنا ہوتا ہے تو سرور ہوتا ہے یہاں کے لوگ بڑے مخلص جانبین سے محبت ہو تو عجیب نعمت ہے یہ حب فی اللہ ہے۔ یہی کچھ چیز ہے اور جو محبت کسی غرض سے ہوتی ہے وہ لاشے اور محض دھوکہ ہے۔ امام شافعی صاحب کا قول ہے کہ جنت کی تمنا یہ خبر سن کر ہوگئی ہے کہ وہاں احباب سے ملاقات ہوگی پہلے صوفی اور فقیہ اب لوگوں نے تصوف اور فقہ دونوں کے معنے بدل دیئے ہیں اور دونوں کو متنافیین قرار دیا ہے حالانکہ ان میں متنافی نہیں کیونکہ تصوف کے معنے ہیں تعمیر الظاہر والباطن ظاہر کی تعمیر اعمال سے اور باطن کی اخلاق سے اور فقہ کی امام صاحب نے تعریف کی ہے معرفت النفس مالہا وما علیہا یہ عام ہے۔ اعمال ظاہری و باطنی سب کو تو تصوف

اور فقر میں منافات کہاں ہے پہلے لوگ فقہ اور تصوف کے جامع ہوتے تھے یہ بلا آجکل ہی پھیلی ہے کہ دونوں کو علیحدہ سمجھ کر دونوں کو خراب کیا حالانکہ ان دونوں کا ساتھ ہے۔ شاہ ولی اللہ صاحب نے لکھا ہے کہ صحبت کیلئے اس شخص کو اختیار کرو جو محدث بھی ہو اور فقیہ بھی صوفی بھی اعتدال اسی سے ہوتا ہے یہ قول ان کا قول جمیل میں ہے۔ شاہ عبدالعزیز صاحب کا خاندان ماشاء اللہ ان اوصاف کا جامع ہے جن میں مولانا اسمٰعیل صاحب بھی ہیں بعض لوگ مولانا کو غیر مقلد سمجھتے ہیں حالانکہ یہ بالکل غلط ہے۔ میرے ایک استاد بیان فرماتے تھے کہ وہ سید صاحب کے قافلے کے ایک شخص سے ملے ہیں ان سے پوچھا تھا کہ مولانا غیر مقلد تھے انھوں نے کہا یہ تو ہم کو معلوم نہیں لیکن سید صاحب کے تمام قافلہ میں یہ مشہور تھا کہ غیر مقلد چھوٹے رافضی ہوتے ہیں اس سے سمجھ لو کہ اس قافلہ میں کوئی غیر مقلد ہو سکتا ہے ایک حکایت اور فرمائی سند یاد نہیں، کسی نے مولانا سے مسئلہ پوچھا فرمایا کہ امام صاحب کے نزدیک یوں ہے اس نے کہا آپ اپنی تحقیق فرمایئے فرمایا میں کیا کہتا ہوں امام صاحب کے سامنے۔ مولانا کے غیر مقلد مشہور ہونے کی وجہ یہ ہوئی کہ مولانا بعض جاہل غالی مقلدین کے مقابلہ میں بعض مسائل خاص عنوان سے تعبیر کرلئے اور ایک بار ان کے مقابلہ میں آمین زور سے کہدی کیونکہ غلو اس وقت ایسا تھا کہ میں نے ایک کتاب میں دیکھا ہے کہ ایک شخص نے زور سے آمین کہدی تھی تو اس کو مسجد کے اونچے فرش پر سے گرا دیا تھا، مولانا کو اس پر بہت جوش ہوا اس کتاب میں ہے کہ آپ نے بیس مرتبہ آمین کہی۔ شاہ عبدالعزیز صاحب سے لوگوں نے یہ واقعہ بیان کیا اور کہا ان کو سمجھایئے فرمایا وہ خود عالم ہیں اور تیز ہیں کہنے سے ضد بڑھ جاوے گی خاموش رہو۔ مولانا نے ایک رسالہ بھی رفع یدین کے اثبات میں لکھا ہے لیکن غیر مقلد ہرگز نہ تھے۔ ایک حکایت مولوی فخرالحسن صاحب بیان کرتے تھے اس سے بھی مولانا کے حنفی ہونے کی تائید ہوتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ مولانا کے ایک بیٹے محمد عمر نام مجذوب تھے اور بہت بھولے لیکن بہت ذہین چنانچہ

ایک شخص ان کے سامنے کنز لے گیا کہ اس کا سبق پڑھا دیجئے، کہا میں نے یہ کتاب کبھی دیکھی نہیں مگر جب وہ طالب علم پڑھنے بیٹھا تو بہت اچھی طرح سے پڑھا دی حتیٰ کہ تھوڑا تھوڑا پڑھ کر اس نے کتاب بند کی تو کہا بھائی دس ورق تو پڑھو اور بھولے ایسے تھے کہ ایک بار مولوی محبوب علی صاحب کے وعظ میں پہنچے۔ مجمع بہت تھا مگر واعظ صاحب کی آواز پست تھی ان کو آواز نہ آئی تو گھر لوٹ کر گئے اور کہا کہ دعا کریں گے کہ اس واعظ کی آواز بڑھ جاوے اور دعا مانگی پھر فوراً آدمی بھیجا دیکھنے کے لئے کہ بتلاؤ آواز کچھ بڑھی یا نہیں۔ سو یہ صاحبزادے ایک دفعہ جامع مسجد کے حوض کے پاس کو گذرے وہاں غیر مقلدین میں مذاکرہ حدیث ہو رہا تھا یہ بھی بیٹھ گئے۔ ہمراہیوں نے عرض کیا حضرت کہ یہ لوگ غیر مقلد ہیں فرمایا بلا سے حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا تو بیان ہو رہا ہے۔ بیان کرنے والے نے ایک مقام میں امام صاحب پر کچھ طعن کیا انھوں نے ایک دھول رسید کی اور کہا چلو یہاں بے ایمان ہیں، ان کی وجاہت بہت تھی کوئی بول نہ سکا سو اس قصہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا غیر مقلد نہ تھے اگر غیر مقلد ہوتے تو ان کا بیٹا ایسا کیوں ہوتا، واللہ اعلم جیسے ہمارے مجمع کو بھی تو بعض لوگ غیر مقلد کہتے ہیں اور غیر مقلد ہم کو مشرک کہتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ ہمارے مجمع میں بعض مقلدین کی طرح تقلید جائز نہیں حتیٰ کہ اگر امام صاحب کی دلیل سوائے قیاس کے کچھ نہ ہو اور حدیث معارض موجود ہو تو قول امام کو چھوڑ دیا جاتا ہے جیسے ما اسکر کثیرہ فقلیلہ حرام میں ہوا ہے کہ امام صاحب نے قدر غیر مسکر کو جائز کہا ہے اور حدیث میں اس کے خلاف کی تصریح موجود ہے یہاں امام صاحب کے قول کو چھوڑ دیتے ہیں مگر اس کے لئے بڑے متبحر کی ضرورت ہے کسی مسئلہ کی نسبت یہ کہنا بڑی مشکل ہے کہ اس میں

دلیل سوائے قیاس کے کچھ نہیں ہے۔ اس واسطے کہ کہیں احتجاج بعبارت النص ہوتا ہے اور کہیں باشارۃ النص ہوتا ہے اور یہ سب احتجاج بالحدیث ہے۔

البتہ ما اسکر کثیرہ فقلیلہ حرام کے خلاف واقعی کوئی دلیل سوائے قیاس کے نہیں ہے رہے آثار صحابہ سو وہ حدیث کے مقابل نہیں ہو سکتے فرمایا ایک صاحب کہتے تھے کہ غیر مقلدین جو عمل بالحدیث کا دعوے کرتے ہیں اس سے کیا مراد ہے بعض احادیث مراد ہیں یا کل اگر بعض مراد ہیں تو ہم بھی عامل بالحدیث ہیں اور اگر کل مراد ہیں تو وہ بھی عامل بالحدیث نہیں کیونکہ تعارض کے وقت دو حدیثوں میں سے ایک کو ضروری چھوڑنا پڑتا ہے۔

فرمایا جو لوگ اہل حق کو سب وشتم کرتے ہیں ان کے چہروں پر نور علم نہیں پایا جاتا بلکہ خالص کفار اتنے ممسوخ نہیں پائے جاتے جتنے یہ لوگ ہیں۔ اس کی وجہ میں نے بطور لطیفہ کے کہا تھا کہ کفر فعل باطن ہے اس کا اثر چھپا ہوا رہتا ہے اور سب وشتم فعل ظاہر ہے اس کا اثر نمایاں ہو جاتا ہے۔ انگریزی خوانوں پر نور ایمان نہ سہی مگر شان تو ہوتی ہے ان میں وہ بھی نہیں خدا بچاوے۔ شعر

چوں خدا خواہد کہ پردہ کس درد
میلش اندر طعنۂ پاکاں برد

دیگر

چوں خدا خواہد کہ پوشد عیب کس
کم زند۔ در عیب معیوباں نفس

تبیض ختم ۸ ربیع الثانی ۱۳۳۵ھ۔ بمقام میرٹھ
یہ تقریر سب ریل میں ہوئی مابین اسٹیشن مود اعظم گڈھ

ادب العشیر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حامداً و مصلیا :- تقریر حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ مسمیٰ بہ ادب العشیر بتاریخ ۲۷ صفر ۱۳۳۵ھ روز یکشنبہ بعد مغرب وقت تخمیناً ۳۱ منٹ۔ مطابق ۲۴ دسمبر ۱۹۱۶ء۔

یہ تقریر سفر گورکھپور میں ہوئی اس وقت کہ حضرت والا گورکھپور سے بجانب مئو روانہ ہوئے راستہ میں اسٹیشن انڈارا جنکشن پر گاڑی تبدیل کرنے کے لئے اترنا ہوا گاڑی میں کچھ وقفہ تھا لوگوں نے ویٹنگ روم میں بٹھا دیا اس وقت تیس چالیس زائرین کا مجمع ہوگیا وہاں یہ تقریر ہوئی۔

فرمایا ایک شخص نے جو پانی پت کے قریب کے رہنے والے تھے پندرہ روپے تھانہ بھون کے مدرسہ میں دئے میرا دل کھٹکا اس سے پوچھا تم اس مدرسہ میں یہ رقم کیوں دیتے ہو کہا کارِ خیر سمجھ کر۔ میں نے کہا کارِ خیر سمجھ کر دینا تھا تو کسی اپنے قریب کے مدرسہ میں جیسے پانی پت میں کیوں نہیں دیا مجھ کو یہ شبہ ہے کہ تھانہ بھون کے مدرسہ کو ترجیح دینے کی وجہ یہ ہے کہ مجھے بھی خوش کرنا منظور ہے اس نے اس کا اقرار کیا میں نے کہا یہ نیت کس قدر فاسد ہے کہ کارِ خیر میں شرک کی نیت کیسی میں ایسی رقم نہیں لیتا۔

لوگ ظاہر صورت عمل کی دیکھ لیتے ہیں کہ کارِ خیر ہے اور اس کی اصل اور حقیقت پر نظر نہیں کرتے یہ کیا کارِ خیر ہوا جس میں مصلحت سے زیادہ مفسدے ہیں آجکل عام طور سے یہ خیال ہوگیا ہے کہ نیک جگہ خرچ کرنا ہر حال میں اچھا ہے اور لینے والوں کو یہ خیال ہوگیا ہے کہ لے لینا کسی حال میں بُرا نہیں حالانکہ یہ بالکل غلط ہے۔

بعض جگہ لینے میں مفاسد بھی ہوتے ہیں۔ چنانچہ الہ آباد میں مجھ سے ایک شخص

بیعت ہوا اور بعد میں ایک روپیہ نذر دیا میں نے لینے سے انکار کیا اس نے کہا میں خلوص سے دیتا ہوں، میں نے کہا مانا تم خلوص سے دیتے ہو اور اس وجہ سے مجھ کو واپس بھی نہ کرنا چاہیئے لیکن اس میں ایک بڑا مفسدہ ہے وہ یہ کہ جن کے پاس روپیہ دینے کو نہیں ہے وہ بیعت نہ ہوسکیں گے تو غریب آدمیوں کے لئے بیعت کا سلسلہ مسدود ہی ہوجائے گا تو اس کے یہ معنی ہوئے کہ خدائے تعالیٰ کا راستہ بھی روپے ہی سے مل سکتا ہے۔

میرے نزدیک بیعت کے بعد دینے کی رسم یصدون عن سبیل اللہ میں داخل ہے یہ بات اس شخص کی سمجھ میں نہ آئی مگر طوعاً و کرہاً اس نے روپیہ رکھ لیا تھوڑی دیر نہ گزری تھی کہ اسی مجمع میں سے ایک غریب آدمی کھڑا ہوا اور بیعت کی درخواست کی اور کہا میں بہت دیر سے اس تمنا میں تھا مگر دینے کو کچھ پاس نہ تھا اس وجہ سے ہمت نہ پڑتی تھی میں نے اس شخص سے کہا دیکھ لیجئے اسی وقت حق تعالیٰ نے دکھا دیا اب آپ بتایئے کہ یہ روپیہ میں لے لیتا تو اس سے کس قدر لوگوں کو ضرر ہوتا۔

حضرت رسوم میں یہی خرابیاں ہیں کہ ان کی بدولت حقائق بالکل مٹ گئے ہیں جسکی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ یہ رسمیں اہل بدعت کی نکالی ہوئی ہیں اور بدعت کا خاصہ یہ ہے کہ اس سے نور قلب اور نور عرفان ندارد ہوجاتا ہے اور آدمی ایسے مغالطوں میں پڑ جاتا ہے چنانچہ اہل بدعت کے جتنے استدلال آپ دیکھیں گے سب ایسے ہی ہوں گے کہ ان سے اپنا دل خوش کر لیتے ہیں لیکن جس کے قلب کو حقیقت شناسی سے ذرا بھی مس ہو وہ اس کو کبھی قبول نہیں کرتا حتیٰ کہ اگر اس کے خلاف پر دلیل بھی اس کے پاس اس وقت نہ ہو مگر قلب ہے کہ انکار کئے جاتا ہے۔ پھر یہ کہ رسوم اگر امور دنیا میں ہی ہوتے تب بھی اتنا مضائقہ نہ تھا مصیبت تو یہ ہے کہ دین میں بھی رسوم شامل کر لئے ہیں سو ان رسوم میں ایک بڑی خرابی یہ ہے کہ ان کو آدمی ہمیشہ دین ہی سمجھتا رہتا ہے اور تمام عمر اس پر تنبہ نہیں ہوتا اور غیر دین کو دین سمجھے جاتا ہے دنیاوی رسوم میں تو کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ اس کی کوئی دنیوی خرابی وقوع میں

آجاتی ہے تو متنبہ ہو سکتا ہے مثلاً شادی بیاہ کے رسوم کہ ان کے نتائج تباہی و بربادی ظاہر ہو جاتے ہیں تو لوگوں کو تنبہ ہو جاتا ہے اور مضر دین سمجھ کر نہ سہی مضر دنیا سمجھ کر تو چھوڑ سکتے ہیں بخلاف رسوم دین کے کہ ان پر تنبہ ہونے کا کون باعث ہو سکتا ہے بلکہ بالعکس ان میں عدم تنبہ کا ایک داعی موجود ہوتا ہے وہ یہ کہ ان رسوم میں چٹک مٹک بہت ہوتی ہے جس میں دل خوب لگتا ہے پھر آدمی ان کو چھوڑے تو کیونکر اور ہم نے تو ایسے لوگوں کی صحبت پائی ہے جن میں رسمیں بالکل نہ تھیں سادہ زندگی بسر کرنے والے تھے ان کی معشت دیکھ کر ہم کو تو یہ بات بخوبی ثابت ہو گئی ہے کہ آسائش کی زندگی بھی وہی ہے جس میں تصنع اور تکلف اور بناوٹ نہ ہو۔ ہماری طرف کا ندھلا ایک قصبہ ہے وہاں کے رہنے والے ایک بزرگ مولوی مظفر حسین صاحب تھے ان کے یہاں جب کوئی مہمان آتا تو پوچھ لیتے کہ کھانا کھا کر آئے ہو یا یہاں کھاؤ گے۔ اگر اس نے کہا یہاں کھاؤں گا تو پوچھتے کہ تازہ پکوایا جائے یا رکھا ہوا کھا لوگے اگر اس نے کہا تازہ کھاؤں گا تو پوچھ لیتے کہ کونسی شے مرغوب ہے جو چیز مرغوب ہوتی وہی پکوا دیتے یہ کس قدر آرام دہ بات ہے۔

انھیں بزرگ کا قصہ ہے کہ انھوں نے مولانا مملوک علی صاحب نانوتوی سے فرمایا جن کا قیام دہلی رہتا تھا کہ مولانا جب آپ وطن جایا کریں تو راستہ میں مجھ سے مل کر جایا کریں مولانا نے کہا اچھا لیکن میری منزل میں حرج نہ ہوا کرے انھوں نے کہا نہیں جیسا آپ فرماتے ہیں ویسا ہی ہوگا۔ ایک دفعہ کا قصہ ہے کہ مولانا دہلی سے نانوتہ جا رہے تھے راستہ میں مولوی مظفر حسین صاحب سے ملنے کے لئے ٹھہرے مولوی مظفر حسین صاحب نے حسب معمول پوچھا کھانا کھا لیا ہے یا کھاؤ گے۔ انھوں نے کہا کہ کھائیں گے۔ مولوی صاحب نے کہا کہ تازہ تیار کراؤں یا جو رکھا ہوا ہو وہی لے آؤں انھوں نے کہا جو رکھا ہوا ہو وہی لے آیئے۔ مولوی صاحب ایک مٹی کے برتن میں کھچڑی کی کھرچن لے آئے اور کہا کہ رکھا ہوا تو یہ ہے بس وہ

اسی کو کھا کر رخصت ہو گئے۔ بتایئے اس میں آرام ہے یا ان رسوم میں جن کے آجکل لوگ پابند ہیں اور جس کو تہذیب و خاطر داری کہا جاتا ہے۔ ان حضرات کا خود بھی معمول یہی تھا مولوی مظفر حسین صاحب جہاں جاتے فوراً کہدیتے میں تمہارا مہمان ہوں ایک دن ٹھہروں گا یا دو دن۔ ایک دفعہ یہ بزرگ مولانا گنگوہی قدس سرہ کے مہمان ہوئے صبح کو مولانا نے ناشتہ کے لئے کہا آپ رامپور جانے والے تھے اس لئے آپ نے کہا کہ کھانا تیار ہونے میں دیر لگے گی میری منزل کھوٹی ہوگی ہاں اگر رات کا رکھا ہوا ہو تو لاؤ مولانا نے ماش کی دال اور باسی روٹی لادی آپ نے دال روٹی پر الٹ کر پلے میں باندھ لی اور رخصت ہو گئے۔ جب رامپور پہنچے تو حکیم ضیاء الدین صاحب سے کہا کہ مولوی رشید احمد بڑے اچھے آدمی ہیں حکیم صاحب نے کہا ہاں بڑے بزرگ ہیں۔ فرمایا میں ان کے بزرگ ہونے کی تعریف نہیں کر رہا ہوں میں تو کہہ رہا ہوں کہ وہ بہت اچھے آدمی ہیں اگر خود نہیں سمجھتے ہو تو پوچھ ہی لو، انھوں نے کہا اچھا حضرت فرمایئے آپ نے کہا دیکھو کیسے اچھے آدمی ہیں انھوں نے مجھے کھانے کے لئے کہا مگر میرے کہنے پر جو کھانا رکھا ہوا تھا بلا تکلف لادیا میں اس واسطے کہہ رہا ہوں کہ وہ بڑے اچھے آدمی ہیں۔

ایک دفعہ حضرت مولانا گنگوہی مولانا محمد یعقوب صاحب کے صاحبزادہ حکیم معین الدین صاحب کے یہاں مہمان ہوئے یہ صاحب بہت ہی بے تکلف ہیں اتفاق سے ان کے یہاں اس روز کھانے کو کچھ بھی نہ تھا مولانا سے عرض کیا کہ ہمارے یہاں تو آج فاقہ ہے لیکن اکثر احباب آپ کی دعوت کیا کرتے ہیں اگر آپ فرمائیں تو میں ان کی دعوت منظور کرلوں فرمایا میں تو تمہارا مہمان ہوں جو حال تمہارا ہے وہی میرا بس فاقہ ہی سے بیٹھ رہے خدا کی قدرت شام کے قریب ایک جگہ سے گیارہ روپے آگئے وہ خوش خوش مولانا کے پاس آئے کہ لیجئے آپ کی برکت سے گیارہ روپے آگئے اب تو خوب بڑھیا دعوت کریں گے مولانا نے فرمایا نہیں معمولی کھانا پکوالو کہا اب ہم معمولی کیوں پکوائیں گے۔ اب تو جس طرح جی چاہے گا دعوت کریں گے۔ تو جب ہم نے ایسے لوگوں کو دیکھا ہے پھر ہماری نظروں میں آجکل کی خاطر داری

کیا آسکتی ہے۔ جس کی حقیقت سوائے تصنع اور دکھلاوے کے کچھ بھی نہیں اور جس میں مفاسد ہی مفاسد ہیں اگر دنیادار بھی نمائش چھوڑ کر یہی طریقہ اختیار کریں تو قطع نظر گناہوں سے بچنے کے دنیا میں بھی تو تباہ نہ ہوں دیکھئے کیسی کیسی ریاستیں ان تکلفات میں تباہ ہوگئیں اور لطف یہ ہے کہ خود سب کے سب ان رسوم کے شاکی ہیں مگر چھوڑتے نہیں آدمی کو چاہیئے اتنے پاؤں پھیلائے جتنی گنجائش ہو اور ان تکلفات میں اس کا خیال ہو ہی نہیں سکتا سب کو چاہیئے کہ ایک دم ان رسوم کو الگ کریں سادہ زندگی عجیب چیز ہے اور حلال کی کمائی میں تو سوائے سادہ زندگی کے کچھ ہو ہی نہیں سکتا یہ چٹک مٹک جب ہی ہو سکتی ہے جب کمائی حرام کی ہوتی ہے۔ میرے ایک دوست ہیں مولوی ظہور الحسن صاحب سب رجسٹرار ان کو اپنے ایک بھائی کے مقدمہ میں الہ آباد جانا پڑتا تھا۔ الہ آباد میں ایک وکیل تھے مولوی محمد نام (مولوی جزو علم ہے لقب نہیں ہے) انھوں نے ان کو وکیل کیا تو یہ جب الہ آباد جاتے انھیں کے یہاں ٹھہرتے۔ ایک دفعہ کا قصہ ہے کہ یہ ان کے یہاں ٹھہرے ہوئے تھے انھوں نے ان کے بچوں کو سنا یہ کہتے پھرتے تھے کہ آج ہمارے یہاں شیخ جی آئے ہیں یہ سمجھے کہ کوئی اور مہمان ہوں گے مگر اس روز وقت پر کھانا نہیں آیا انھوں نے خیال کیا کہ آج شیخ جی جو آئے ہوئے ہیں ان کے لئے پُر تکلف کھانے پکے ہوں گے اس وجہ سے دیر ہوگئی ہے۔ جب بہت ہی دیر ہوگئی تو انھوں نے ایک نوکر سے پوچھا کہ وہ شیخ جی جو ان کے یہاں آئے ہوئے ہیں نظر نہیں آئے وہ کہاں ہیں نوکر یہ سن کر بہت ہنسا اور کہا کہ ان کے یہاں کی اصطلاح ہے کہ شیخ جی فاقہ کو کہتے ہیں آج ان کے یہاں فاقہ ہے دیکھئے سادگی اس کا نام ہے کہ پاس ہوا تو خود بھی کھا لیا اور مہمان کو بھی کھلا دیا اور نہ ہوا تو قرض نہ کیا اور تربیت دیکھئے کتنی اچھی ہے کہ اولاد کو بچپن ہی سے تنعم کے خلاف کا عادی بنا دیا آجکل تنعم اس قدر ہوگیا ہے کہ ایسی باتوں کو ذلت کی تعلیم سمجھتے ہیں اپنے آپ کو کھینچنا بڑا سمجھنا کسی کے سامنے نہ لچنا آجکل کی یہی

تہذیب ہے اور نوکر کو تو آدمی ہی نہیں سمجھتے ہر کام میں وہ بات اختیار کی جاتی ہے جس میں ترفع تکبر بناوٹ ضرور ہو نئی نئی وضع نئے نئے فیشن بنائے جاتے ہیں اور ان میں جو کچھ ایجادیں اور اضافے ہوتے ہیں ان سب کی بنا تکبر ہی پر ہوتی ہے پھر اسی کی عادت بچوں کو ڈالتے ہیں حتیٰ کہ یہ معاشرت طبعی ہو جاتی ہے بول چال میں کھانے پینے میں اٹھنے بیٹھنے میں چلنے پھرنے میں غرض تمام حرکات سکنات تکلف سے خالی نہیں۔ ایک دفعہ ایک شخص میرے پاس آئے اور نہایت انکساری سے کہا میں خادم ہونا چاہتا ہوں بعد تفتیش کے معلوم ہوا ان کی مراد اس سے بیعت کی درخواست تھی۔ کوئی آکر کہتا ہے دامن میں لے لو، کوئی کہتا ہے غلام بنا لو یہ کیا تکلفات ہیں۔

ایک صاحب تشریف لائے اور سلام کرکے کھڑے ہو گئے بہت دیر ہو گئی میں نے کہا بیٹھتے کیوں نہیں کہنے لگے بلا اجازت کیسے بیٹھوں میں نے کہا اچھا ایک ہفتہ تک اجازت نہیں بس فوراً بیٹھ گئے۔ میں نے کہا یہ کیا واہیات ہے یا تو بلا امر بیٹھتے نہ تھے یا اب باوجود نہی کے بیٹھ گئے اور رواج یہ ہے کہ جب رخصت ہوں گے تو الٹے پاؤں چلیں گے پشت کرنا بے ادبی سمجھتے ہیں ظاہری برتاؤ تو اس قدر اچھا مگر اطاعت کا نام نہیں ہاں رسمی تعظیم و تکریم بہت ہے ہم لوگوں کی طبیعتیں ہی بدل گئی۔

صحابہؓ رسمی تعظیم بہت نہ کرتے تھے مگر مطیع اس قدر تھے کہ دنیا کو معلوم ہے صحابہ کو جو تعلق حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے تھا وہ تعشق کا مرتبہ ایسا رکھتا ہے کہ دنیا میں کسی محب اور محبوب میں اس کی نظیر ملنا مشکل ہے لیکن حالت یہ تھی کہ اس کے بھی پابند نہ تھے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو آتے دیکھ کر کھڑے ہی ہو جایا کریں خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ان کو اس سے منع فرما رکھا تھا۔ لباس میں وضع میں بیٹھنے کی جگہ میں کسی بات میں دوسروں سے امتیاز نہ رکھتے تھے۔ اس سے زیادہ کیا ہو سکتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم چلنے میں اس کے بھی پابند نہ تھے

کہ سب سے آگے رہیں بلکہ کبھی برابر ہو کر چلتے تھے کبھی پیچھے ہو جاتے تھے آجکل کی تہذیب تو یہ ہوتی ہے کہ سب سے آگے حضور صلی اللہ علیہ وسلم رہا کرتے۔ سو غور سے دیکھئے کہ آجکل کے لوگ اپنے بزرگوں کے زیادہ جان نثار ہیں یا صحابہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زیادہ جان نثار تھے۔ تجربہ تو یہ بتلاتا ہے کہ جہاں ظاہری بناوٹ ہوتی ہے وہاں حقیقت نہیں ہوتی۔ جس کو بات بات میں جھکتا اور تسلیم اور آداب عرض کرتے دیکھئے سمجھ لیجئے کہ دل میں اس کے آپ کی وقعت ذرا بھی نہیں ہے زیادہ تعظیم و تکریم میں علاوہ اس کے کہ بے معنے چیز ہے یہ بھی بڑی خرابی ہے کہ دوسرے کو ضرر ہوتا ہے اس میں رعونت پیدا ہو جاتی ہے۔ اسی واسطے حدیث میں مدح فی الوجہ سے ممانعت آئی ہے۔ اسی حدیث سے تعظیم و تکریم کی ممانعت بھی بدرجہ اولیٰ ثابت ہوتی ہے کیونکہ مدح کی دو قسمیں ہیں قالی اور حالی تعظیم مدح حالی ہے۔ جب قالی سے ممانعت ہے تو حالی سے بدرجہ اولےٰ ہوگی نیز بہت زیادہ تکلف کرنے کا ادنیٰ اثر یہ ہے کہ اس سے دل نہیں ملتا اور بعض لوگوں کی اس سے یہ غرض ہوتی ہے کہ دوسرے کو اپنی طرف مائل کریں سو اس کی تدبیر بھی یہ نہیں ہے بلکہ اس کی تدبیر بھی یہی ہے کہ زیادہ تکلف نہ کیا جاوے۔ دیکھئے غور کے قابل بات ہے بعض بزرگوں کا برتاؤ مہمان کے ساتھ میں سنتا ہوں کہ وہ ظاہرا تو بدتمیزی ہے اور آجکل کی تہذیب کے خلاف ہے مگر درحقیقت بہت گہری بات اور عاقلانہ اور کریمانہ برتاؤ ہے وہ یہ ہے کہ انھوں نے کھانا منگایا اور مہمانوں کے اور اپنے سب کے سامنے چنا گیا بس پہلے اپنے آپ کھانا شروع کر دیا تاکہ مہمان سمجھ لے کہ یہاں تکلف نہیں ہے اور دل کھول کر کھاوے پھر وہ کھانا کھاتے میں مہمان کی طرف دیکھتے بھی نہیں اور ایسے بن جاتے ہیں کہ گویا ان کو کھانا کھلانے کا سلیقہ ہی نہیں اور درحقیقت اس پر نظر رکھتے ہیں کہ کھانا دسترخوان پر ہے یا نہیں بلکہ خدمتگار کو تعلیم ہے کہ ذرا کسی کے سامنے کھانا کم ہو فوراً لاؤ اس طریقہ سے مہمان کس قدر انبساط اور

آزادی سے کھا سکتا ہے مگر آجکل کی تہذیب یہ ہے کہ میزبان مہمان پر مسلط ہو جاتا ہے۔ قبلہ یہ کھایئے قبلہ وہ کھایئے اس سے مہمان بالکل منقبض ہو جاتا ہے ممکن ہے کہ اس کا جی اس وقت ایک چیز کو چاہتا ہو دوسری کو نہ چاہتا ہو اور اس جبر سے وہ کھالے تو انبساط نہ ہوا اور بعض وقت متعدد کھانے اس طرح سے کھلائے گئے کہ مقداریں بڑھ گئے اور ہضم نہ ہوئے آپ کی تو خاطرداری ہوئی اور مہمان کو تکلیف ہوئی یہ کیا خاطرداری ہے۔ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کا دسترخوان نہایت وسیع ہوتا تھا۔ ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ آپ کے دسترخوان پر ایک اعرابی بھی تھا وہ ذرا بڑے بڑے لقمے کھاتا تھا آپ نے اس سے کہا کہ بھائی بڑے بڑے لقمے مت کھاؤ اس سے نقصان پہنچنا محتمل ہے وہ اعرابی فوراً کھڑا ہو گیا اور کہا کہ وہ شخص کریم نہیں جس کی نظر مہمانوں کے لقموں پر ہو تمھیں کھلانے کا سلیقہ نہیں تمھارا کھانا نہ کھانا چاہیئے۔ انھوں نے بہت کچھ عذر کیا کہ اس میں یہ مصلحت تھی مگر اس نے ایک نہ سُنی خفا ہوتا ہوا چلدیا۔ امام مالک صاحبؒ کے یہاں امام شافعی صاحب مہمان ہوئے جب کھانے کا وقت آیا تو خادم نے پہلے امام شافعی صاحب کے سامنے کھانا رکھا امام مالک صاحب نے اس کو منع کیا اور پہلے اپنے سامنے رکھوایا ظاہرا معلوم ہوتا ہے کہ مہمان کو اپنے سے کم سمجھا چنانچہ اگر آجکل کوئی ایسا کرے تو ضرور یہی سمجھا جائے کہ مہمان سے اپنے آپ کو بڑا سمجھا اور عجب نہیں کہ مہمان خفا ہو کر اٹھ جائیں اور بعض مواقع میں یہ بات بے اصل بھی نہ ہوگی آجکل ہم لوگوں میں تکبر ہے ہی وہ لوگ بے نفس تھے اور اخلاق شرعی ان کے لئے عادت بن گئے تھے ان کا یہ فعل ہرگز از راہ تکبر نہ تھا بلکہ اس واسطے تھا کہ مہمان کو انقباض نہ ہو دیکھئے کتنی باریک نظر ہے اور چونکہ اس میں خلوص تھا اس واسطے مہمان پر بھی برا اثر نہ ہوا یہاں سے اور یہ بات بھی سمجھ میں آگئی ہوگی کہ آجکل ایسا کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ یہ سمجھنا مشکل ہے کہ ہم نے کس واسطے ایسا کیا یہاں اس میں سلامتی ہے کہ اکرام کی صورت باقی رکھی جائے۔ کیا کیا جائے کہ یہاں تکلفات عادت ہو گئے

ہیں جن کو طبیعت ثانیہ کہا جا سکتا ہے یہاں تو تکلفات کی وہ مثال ہو گئی ہے جیسے ہمارے یہاں تھانہ بھون میں ایک شخص تھے کہ گالی بکنے کے بہت عادی تھے کسی سے بے گالی بات نہ کرتے گو ان کا گالی بکنا از راہ تکبر نہ ہوتا تھا صرف عادت تھی لیکن سننے والوں کو تو بُری بات گوارا نہیں ہو سکتی اس پر کون نظر کرتا کہ اس کا منشا کیا ہے لوگ ان کی فکر میں تھے یہ تو سب کو ذلیل کرتا ہی ہے کسی موقع پر اس کو بھی ذلیل کرنا چاہیئے۔ چنانچہ ان کے یہاں ایک شادی کا موقع ہوا سب لوگوں نے یہ اتفاق کر لیا آج اس کے یہاں کوئی مت جاؤ اب یہ بہت پریشان ہوئے اور برادری کی خوشامد درآمد کرنا شروع کی مگر لوگوں نے کہا کہ ہم یوں نہ مانیں گے گالیاں بکنے سے توبہ کرو اور توبہ بھی شاہ ولایت صاحب کے مزار پر چل کر اور قبر پر ہاتھ رکھ کر کرو مجبور ہو کر گئے اور قبر پر ہاتھ رکھ کر کہا کہ شاہ صاحب میں نے ان لوگوں کو بہت گالیاں دی ہیں آج میں توبہ کرتا ہوں کہ ان کی ماں کو یوں توبہ کروں کبھی گالی نہ دوں گا لوگ ہنس پڑے اور کہا یہ شخص معذور ہے اس کی خطا معاف کرو۔ وہی حالت ہمارے تکلفات کی ہو گئی ہے کہ سمجھا دیا جائے اور بتلا دیا جائے اور جزئیات ایک ایک بیان کر دی جائیں اور ان کی زبان سے سب کو دہروا دیا جائے مگر جب کوئی کام کریں گے تو وہ ہو گا تکلف ہی کا اصل یہ ہے کہ تعلیم پر عادت غالب ہوتی ہے۔ جیسے ایک بادشاہ کا قصہ ہے کہ اس نے وزیر سے دریافت کیا کہ طبع غالب ہوتی ہے یا تعلیم اس نے کہا کہ طبع غالب ہوتی ہے۔ بادشاہ نے کہا کہ ایسا نہیں ہے تعلیم وہ چیز ہے کہ حیوان کو بھی مہذب بنا دیتی ہے۔ دیکھو یہ ہماری بلّی ہے اپنے سر پر شمع لے کر برابر کھڑی رہتی ہے۔ بتلایئے طبیعت غالب ہوئی یا تعلیم وزیر اس وقت تو خاموش ہو گیا اگلے دن ایک چوہا پکڑ کر ساتھ لے گیا اور بادشاہ کے سامنے ہی اس بلّی کے آگے وہ چوہا چھوڑ دیا۔ بس تعلیم و تہذیب سب ندارد ہو گئی اور بلّی شمع کو پٹک کر چوہے کے پیچھے دوڑی۔ وزیر نے کہا حضور اب بتلایئے وہ تعلیم کہاں گئی۔ بات یہی ہے کہ تعلیم طبیعت پر کبھی غالب نہیں ہو سکتی ۔

جب تک کوئی غرض مزاحم نہ ہو اس وقت تک بناوٹ کی تہذیب رہتی ہے مگر کوئی غرض غالب ہو جاوے تو طبیعت اصلیہ کا ظہور ہونے لگتا ہے۔

بس اب ریل آگئی اور یہ تقریر ختم ہوئی لیکن اسی سفر میں اور کئی موقعوں پر بھی اسی موضوع پر تقریریں ہوئیں جن کا الحاق خود حضرت والا نے اسی کے ساتھ مناسب سمجھا لہٰذا وہ بھی یہیں درج کی جاتی ہیں۔ ازاں جملہ وہ تقریر ہے جو سرائے میر کے اسٹیشن پر شب ۲۰ صفر ۱۳۳۹ھ شب دوشنبہ ایک بجے شب ہوئی جبکہ لوگوں نے مصافحہ میں بہت تنگ کیا اسٹیشن پر یہ حالت تھی کہ پلیٹ فارم پر پہنچنا مشکل ہو گیا اور دن بھر قصبہ سرائے میر میں بھی یہی ہوا تھا کہ ہر نقل و حرکت کے بعد جدید مصافحہ کرتے تھے حتیٰ کہ استنجے کو جاتے وقت بھی مصافحہ کرتے اور بیت الخلا سے نکلنے کے بعد پھر مصافحہ اور منع کرنے پر بھی نہ مانتے اور کپڑے اور ہاتھ پکڑ پکڑ کر مصافحہ کے لئے کھینچتے اسٹیشن پر فرمایا تھا کہ تھانہ بھون کی ایک حکایت سن لو ایک وقت میں چند شریر لڑکوں کی ایک کمیٹی قائم تھی وہ شہر کے انتظامات میں بھی دخل دیتے تھے اتفاق سے تھانہ بھون میں ایک میاں جی تشریف لائے جو کہ بہت دیندار شخص تھے ان کے آنے سے پہلے ایک میاں جی تھے ان کو یہ اندیشہ ہوا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ مجھ پر لوگ انھیں ترجیح دیں اس لئے انھوں نے اُن لڑکوں کو ایک عرضی لکھی کہ ان میاں جی کے رہنے سے مجھے اپنے نقصان کا اندیشہ ہے ان کے یہاں سے نکلنے کا انتظام کر دیا جائے۔ جب وہ عرضی پہنچی تو ایک لڑکے نے کہا کہ اس کا انتظام میں کر دوں گا بس وہ لڑکا اپنے گھر آیا اور اپنی ماں سے کہا کہ میرے لئے دو روغنی روٹیاں پکا دو آج میں دوپہر میں نہیں آؤں گا مجھے کچھ کام ہے۔ بس آپ روٹیوں کو باندھ وہیں پہنچے جہاں وہ نئے میاں جی تھے وہ بیچارے اشراق کی نماز پڑھ رہے تھے جب وہ نماز سے فارغ ہو کر چلے تو آپ نے ان کے سامنے جا کر سلام کیا انھوں نے جواب دیدیا آپ نے دو قدم کے بعد سلام کیا انھوں نے دوبارہ بھی جواب دیا چار قدم کے بعد پھر تیسری مرتبہ سلام کیا اب وہ متغیر ہوئے کہ یہ قدم قدم پر سلام

(باقی ان شاء اللہ تعالیٰ آئندہ)

کیسا اس نے جب دیکھا کہ یہ چڑنے لگے پھر تو سلام کا تار باندھ دیا اب وہ بیچارے
بہت گھبرائے ارادہ کیا کہ جس مکان میں ٹھہرے ہوتے تھے وہاں چلے جائیں
اس نے ہاتھ پکڑ لیا کہ کہاں چلے میں تو سنّت ادا کرتا ہوں اور آپ واجب
کے ادا کرنے میں بھی سُستی کرتے ہیں بس زبردستی گھر میں جانے سے روک لیا
جب کھانے کا وقت آیا اور انھوں نے اس وقت جانا چاہا اس نے
روٹیاں سامنے رکھدیں کہ کھانا یہیں کھا لیجئے۔ دوپہر میں سنت ادا کرنے لگے
وہ بیچارے ایسے گھبرائے کہ بستی چھوڑ کر بھاگ گئے۔ مسکرا کر فرمایا یہ
بار بار مصافحہ کرنا ان میاں جی کی طرح سے میرے بھی نکالنے کی ترکیب ہے۔
صاحبو! میں ویسے ہی نکل جاؤں گا ترکیبوں کی کیا ضرورت ہے۔ پھر فرمایا
حدیث میں آیا ہے ان من تمام تحیاتکم المصافحة جس کا مطلب یہ ہے کہ
مصافحہ متمم سلام ہے اور سلام کے لئے کچھ قواعد مقرر ہیں تو مصافحہ کے لئے
جو کہ اس کا تابع ہے بطریق اولیٰ ہوں گے مثلاً لکھا ہے کہ اذان کے
وقت سلام نہ کرو کھانا کھاتے وقت سلام نہ کرو اور اور بھی مواقع ہیں
جن کا ماحصل یہ ہے کہ مشغولی کے وقت سلام نہیں کرنا چاہیئے۔ اس
سے معلوم ہوا کہ مشغولی کے وقت مصافحہ بھی نہیں چاہیئے۔ بہت سے
علماء تو وداعی مصافحہ کو بھی بدعت کہتے ہیں مگر خیر ہمارے علماء
جائز کہتے ہیں چونکہ وداع کے وقت سلام تو نصوص سے ثابت ہے
اور مصافحہ متمم سلام ہے تو مصافحہ بھی درست ہوا مگر ہر چیز کی حد
ہوتی ہے۔

یہاں مصافحہ کی کوئی حد ہی نہیں ہے استنجے کے بعد بھی مصافحہ
اٹھنے کے بعد بھی مصافحہ۔ بیٹھنے کے بعد بھی مصافحہ اسی واسطے میں
نے یہ ترکیب کی تھی کہ کمرہ میں بیٹھ کر کواڑ بند کر لیتا تھا اس سے بہتوں

ضروری اطلاع:۔ خط و کتابت کرتے وقت یا پتہ تبدیل کرانے وقت نمبر خریداری کا ضرور حوالہ دیں۔

کی دل شکنی ہوئی ہوگی مگر کیا کیا جائے اپنا تحمل بھی تو دیکھنا چاہیئے میری طبیعت کسل مند ہے یہ سفر میں نے بغرض آسایش کیا ہے اور جب یہ بھرمار مصافحہ کی ہوگی تو پھر آسایش کہاں نیز تعلیم کی بھی ضرورت ہے کبھی کسی کے کان میں یہ پڑا ہی نہیں کہ ایسا مصافحہ نہ چاہیئے مصیبت یہ ہے کہ آجکل کے مشائخ بجائے اس کے کہ اس سے منع کریں اور اس کی کوشش کرتے ہیں کیونکہ اس سے ان کی گرم بازاری ہوتی ہے اس واسطے میں نے اس دل شکنی کو گوارا کیا کہ یہ بات یاد تو رہے گی۔ سنا ہے مدینہ طیبہ میں رجبی کے دن خطیب معراج شریف کا بیان کرتا ہے بعد ختم بیان کے لوگوں کا عقیدہ یہ ہے کہ اس کے بدن کو ہاتھ لگانا موجب برکت ہے۔ مجمع بہت ہوتا ہے خطیب تنگ آجاتا ہے اس کے لئے پہلے ہی سے کپڑے کا ایک مقصورہ بنایا جاتا ہے پس وہ اٹھ کر اس میں چلا جاتا ہے اور پھر اس کے چاروں طرف پہرہ ہو جاتا ہے تب نجات ملتی ہے اور واقعی بات یہ ہے کہ ہر وقت کا مصافحہ مصیبت ہے ہر چیز موقع کی اچھی ہوتی ہے محبت کی بھی تو حد ہونی چاہیئے یہ نہیں کہ اپنا شوق پورا کرنے کے لئے دوسرے کی تکلیف کا بھی خیال نہ کیا جائے متنبی کہتا ہے ؎
واسکت سکے مالا یکون جواب یعنی میں خاموش رہتا ہوں تاکہ محبوب کو جواب دینے کی زحمت نہ اٹھانی پڑے مصیبت یہ ہے کہ دین صرف نماز روزہ کا نام سمجھ لیا ہے دین کا ایک جزو یہ بھی تو ہے جو حدیث میں ہے واحب لاخیک المسلم ما تحب لنفسك تکن مسلما یعنی دوسرے مسلمان کے لئے وہی بات پسند کرو جو اپنے واسطے کرتے ہو تب مسلمان ہوگے جب اپنی تکلیف گوارا نہیں ہوتی ہے تو دوسرے کی تکلیف کیوں گوارا کی جائے اس کی تعلیم سے حدیثیں بھری پڑی ہیں کہ اپنے کسی فعل سے بھی دوسرے کو تکلیف نہ دی جائے نہ قولاً نہ فعلاً مسلم میں حدیث ہے مقداد بن اسود اس کے راوی ہیں یہ اپنا قصہ بیان کرتے ہیں کہ ہم تیرہ آدمی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں مہمان ہوئے صحابہ کی عادت تھی کہ مہمانوں کو تقسیم کر لیا کرتے تھے چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو بھی تقسیم کر دیا چند آدمی اپنے حصے میں رکھے ان میں یہ بھی تھے۔ کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم عشاء کے

ف یہ اگر التزام سے کیا جائے تو بدعت ہے جیسا کہ آجکل ہوتا ہے ۱۲ جامع عفت انتخابات التالفات

بعد تشریف لائے اور ہم لیٹے ہوتے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس طرح سلام کرتے کہ جاگتا آدمی تو سن لے اور سوتا آدمی جاگ نہ جائے۔ دیکھئے تہذیب یہ ہے کہ دوسرے کو تکلیف نہ پہونچے اس کی رعایت ہر شخص کے ساتھ چاہیئے اور حدیث بقیع غرقد میں حضرت عائشہ فرماتی ہیں قام رویدا وانطلق رویدا یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم آہستہ آہستہ اٹھے اور آہستہ آہستہ تشریف لے گئے تاکہ حضرت عائشہ کی نیند میں خلل نہ آئے اپنے سے چھوٹوں کی بھی یہ رعایت ہے آجکل بڑوں کے سامنے بھی دبنا نہیں چاہتے۔ اب لوگ تہجد کو اٹھتے ہیں تو ڈھیلے پھوڑتے ہیں کھٹ کھٹ چلتے ہیں گویا بتلانا چاہتے ہیں کہ ہم تہجد کو اٹھے تہذیب تو کہیں باقی ہی نہیں رہی ادب کے معنے لوگوں نے بار بار جھکنے کھڑے ہونے اور آداب وتسلیمات لے لئے ہیں حقیقت میں مؤدب تھے تو صحابہ تھے مگر نہ ان میں بار بار اٹھنا تھا نہ بار بار جھکنا تھا نہ چبا چبا کر باتیں کرنا تھا لیکن موقع پر دیکھئے کہ جان دینے میں بھی تامل نہ تھا۔ زیادہ صورت تعظیم وتکریم کو اختیار کرنا اس بات کی دلیل ہوتی ہے کہ یہ شخص وقت پر کچھ بھی کام نہ دے گا نیز ایسی تعظیم سے دوسرے شخص کا ضرر ہوتا ہے کہ اس کے اندر عجب پیدا ہو جاتا ہے حدیث میں جو آیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جب چلتے تو کچھ آدمیوں کو آگے اور کچھ کو پیچھے کر لیتے جب اس پر عمل کر کے دیکھا جاتا ہے تب اس کی قدر ہوتی ہے کہ اس میں جانبین کی کس قدر منفعت ہے مگر ان باتوں کا خیال تو کیا ان کا داخل شریعت ہونا بھی اب معلوم نہیں رہا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس طرح بیٹھتے کہ کوئی امتیاز نہ ہوتا۔ عرب میں اب بھی یہ رسم ہے کہ سب یکساں بیٹھتے ہیں۔ ایک مرتبہ مکہ معظمہ میں پاشا نے حجاج کو محمد حسین سندھی مطوف کے مکان پر جمع کیا سب لوگ وقت سے پہلے پہنچ گئے پاشا اپنے وقت پر آئے، لوگ ان کی تعظیم کے لئے کھڑے ہو گئے مگر وہ ایک کونے میں بیٹھ گئے جہاں پہلے ایک معمولی آدمی بیٹھتا تھا اور مجمع میں سے کسی نے اونچی جگہ بیٹھنے کی تواضع بھی کی بتایئے اس میں کیا حرج ہو گیا تکلفات کے رواج ڈال لینے سے ایک خرابی یہی پیدا ہوتی ہے کہ اگر پھر تکلف نہ کیا جائے تو برا ماننے کی

نوبت آتی ہے اور جب تکلفات کا رواج ہی نہیں تو برا ماننے کا موقع بھی نہ ہوگا حدیث میں آیا ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم مجمع میں اس طرح بیٹھتے کہ کوئی ناواقف آتا تو اس کو پوچھنا پڑتا من محمد فیکم صحابہ کہتے ھذا الابیض المتکئ متکے کے معنی ٹیک لگانے والے کے ہیں کسی وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہاتھ ٹیکے بیٹھے ہوں گے اس وقت یہ لفظ کہا گیا ہے اور اس کے یہ معنے نہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تکئے پر بیٹھے تھے۔ کیونکہ عربی زبان میں اتکاء کے معنے مطلق ٹیک لگانے کے ہیں اور اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم تکیہ اور مسند پر بیٹھا کرتے تو آنے والا شناخت ہی نہ کر لیتا کیونکہ ظاہر ہے کہ مجلس میں جو تکیہ پر بیٹھا ہوتا ہے وہی بڑا ہوتا ہے۔ اور ہجرت کے واقعہ میں ہے کہ جب مسجد قبا میں آنے والے حضرت صدیق اکبرؓ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دھوکہ میں مصافحہ کرتے رہے جب دھوپ چڑھ آئی تو حضرت صدیق حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر چادر تان کر کھڑے ہو گئے تب معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم یہ ہیں۔ سو حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس قدر سادگی سے رہتے تھے اب یہاں قابل لحاظ یہ بات ہے کہ معلوم ہونے پر دوبارہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی نے مصافحہ نہیں کیا نیز یہ کہ حضرت صدیقؓ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تکلیف سے بچانے کے لئے خود ہی سب سے مصافحہ کیا کہئے کیا ادب ہے حقیقی ادب اس کو کہتے ہیں کس جان نثاری سے لوگ آئے تھے اور ان کے لئے مصافحہ کس درجہ نعمت غیر مترقبہ تھی مگر اپنی خواہش پوری کرنے کے مقابلہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تکلیف کا زیادہ پاس کیا آجکل کا مصافحہ نہ تھا۔ آجکل تو لوگ غضب ہی کرتے ہیں۔ ایک مرتبہ میں گردن جھکائے وظیفہ پڑھتا تھا ایک شخص آئے اور مصافحہ کے لئے کھڑے رہے میں نے آنکھیں بند کر لیں تاکہ وہ چلے جائیں مگر وہ اس پر بھی نہ گئے اور پکار کر کہا کہ مصافحہ میں نے بھی کہدیا کہ وظیفہ اور بعض لوگ کندھا پکڑ پکڑ کر کھینچتے ہیں کہ مصافحہ کر لیجئے۔ مصافحہ کیا ہوا کہ بلائے جان ہو گیا اور پھر کتنا ہی کہئے کوئی سنتا نہیں ابھی ایک شخص کو منع کیا اور دوسرا اُسی طرح مصافحہ کرنے کو تیار۔ فرمایا اور یہ رسم بھی قابل اصلاح ہے کہ مسافر چلتے وقت جبکہ اسباب باندھتا

ہوتا ہے اس وقت اس کو گھیرتے ہیں اس وقت اس کو مخلی بالطبع چھوڑ دینا چاہیئے
جب تک اسباب باندھے اس سے ہٹکر ایک طرف بیٹھ جانا چاہیئے ہاں اس کی اعانت
کے واسطے اگر ایک دو آدمی پاس رہیں جن سے بے تکلفی ہو تو خیر جب تہیۂ سفر کر چکے تو
اطمینان سے مل لیں فقط

سرائے میر کے اسٹیشن کی تقریر ختم ہوئی پھر ایک تقریر اسی موضوع پر ریل میں مابین
الہ آباد و کانپور ہوئی بتاریخ یکم ربیع الاول ۱۳۳۵ھ شب پنجشنبہ وہ بھی حسب ایماء حضرت
والا کے ادب العشیر کے ساتھ ملحق کی جاتی ہے وہ یہ کہ عدل بین النساء کا ذکر ہوا خواجہ
صاحب نے کہا عدل کیا مشکل ہے کیونکہ فعل اعضاء ہے دونوں کو ہر بات میں برابر رکھا
کسی بات میں ایک کو ترجیح نہ دی یہ مشکل کیا ہے فرمایا یہ عنوان تو بہت مختصر ہے آپ نے
تو وہ مثال کر دی کہ کسی نے ایک شعر لکھا تھا جس کا ایک مصرعہ بہت چھوٹا اور ایک بہت
بڑا تھا کسی شاعر نے اعتراض کیا کہ میاں مصرعے برابر نہیں فرمایا ضرورت شعری میں ایسا
ہوتا ہی ہے مولانا جامی کے کلام میں بھی موجود ہے ۔ الٰہی غنچۂ امید بکشا داس کو
ٹھیرا ٹھیرا کر پڑھا) گلے از روضۂ جاوید بنما۔ اس کو جلدی سے ادا کر دیا اور اس طرح
ثابت کر دیا کہ مصرعے چھوٹے بڑے ہیں۔ ایسے ہی آپ نے مختصر عنوان لے لیا اور جلدی
سے کہکر ثابت کر دیا کہ عدل کچھ بڑا کام نہیں ذرا سی بات ہے فعل اعضاء ہی تو ہے
اول تو خود فعل اعضاء بھی کہنے ہی میں ذرا سا ہے مگر کرنے میں ذرا سا نہیں کیونکہ یہاں
ایک بلی کی میاؤں بھی ہے کہ اس عدل کی مانع ہو جاتی ہے۔ آپ نے اس کا قصہ سُنا
ہو گا کہ چوہوں نے بلی کو زیر کرنے کی تجویزیں سوچیں کسی نے کہا میں کان پکڑوں گا
اور کسی نے کہا میں گلا دباؤں گا اور کسی نے کہا میں دُم کاٹ لوں گا۔ ایک پرانا تجربہ کار
چوہا بولا کہ ایک چیز۔ اور رہ گئی وہ کون پکڑے گا جس وقت وہ میاؤں کرے گی اس کو
کون پکڑے گا۔ تو حضرت ایک میاؤں بھی ہے کہ اس کے سامنے آپ کا مختصر عنوان
کام نہیں دیتا وہ یہ ہے کہ عورت کجی کرے گی اور سمجھانے سے جب وہ راضی نہ ہو گی
تو مرد کیا کرے گا بہت سے بہت آپ یہ کہیں گے کہ اس کا کہنا نہ مانے اور عدل پر قائم

رہے جو فعل اعضاء ہے مگر قلب کو رنج تو ضرور ہو گا اور دل اس میں مشغول ہو جاویگا پھر وہ رنج لے کر دوسری کے پاس جاوے گا اس سے بھی بے لطفی ہو گی عجب نہیں کہ اس رنج کی وجہ سے اس کی بھی کوئی بات ناگوار ہو اور اس سے بھی ناچاقی ہو جاوے اور ایک میاؤں کی جگہ دو میاں ہو جاویں بتایئے اس کی کیا ترکیب ہے سخت مصیبت کا سامنا ہے مگر یہ جب ہے کہ مرد سلیم القلب ہو رنج اور خوشی کا احساس اس کو ہوتا ہو ایسے شخص کی تو اس صورت میں واقعی زندگی تلخ ہو گی اور جس کو احساس ہی نہ ہو تو اس کا ذکر ہی نہیں وہ تو آدمیت سے ہی خارج ہے مگر وہ عدل ہی کیا کرے گا۔ پس یہ کام تو صابر کا ہے یا سخت مزاج کا کہ رنج والم سہا کرے اور عدل کو ہاتھ سے نہ دے یا ڈنڈے مار کر سیدھا کر لے مار کے سامنے سب سیدھے ہو جاتے ہیں یا عدل کا لفظ ہی اٹھا دے۔ بس ایک طرف کا ہو جاوے دوسرے کو کالمعلقہ کر دے اور اپنی زندگی آسایش سے بسر کرے مگر یہ شخص وہاں کی زندگی تلخ پاوے گا۔ جس کی تلخی اس زندگی کی تلخی سے اشد ہے آپ نے کہہ تو دیا کہ عدل کیا مشکل ہے مگر میں ایک مثال میں پوچھتا ہوں کہ ایک کپڑا آوے اور دونوں بیبیاں اس کی خواہش کریں اور عورتوں کی ہٹ آپ جانتے ہیں اس وقت بتلایئے مرد کیا کرے گا۔ ایک کو دے تو عدل کے خلاف اور مصیبت کا سامنا اور دونوں کو نہ دے تو دونوں ناراض بس یہ ہو سکتا ہے کہ دو ٹکڑے کر دے مگر اس صورت میں کپڑا بے بیونت ہو کر ایک کے بھی کام کا نہ رہے گا اور پھر تو سب کا ناک منہ چڑھے گا پھر آخر یہ شخص کہاں تک ان امور کا تحمل کرے گا کہدینا تو سہل ہے کہکے دکھایئے بس تخالف نہ ہونے کی صورت ایک یہی ہو سکتی ہے کہ دونوں عورتیں سلیم الطبع ہوں اور خود ہی باہم تخالف نہ کریں جیسا کہ بعض جگہ موجود ہے۔ فقط

ادب الاسلام

لقب ذم شیبہ اہل الاصنام

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہ و نصلی علےٰ رسولہ الکریم

این	متےٰ	کم	کیف	ماذا	من ضبط	المستمعون	اشتات
کہاں ہوا	کب ہوا	کتنا ہوا	بیٹھ کر یا کھڑے ہو کر	کیا مضمون تھا	کس نے لکھا	تعداد سامعین	متفرقات
قصبہ شاہپور ضلع گورکھپور جامع مسجد	۲۶ صفر ۱۳۳۵ھ روز جمعہ	ایک گھنٹہ ۱۰ منٹ	منبر پر	عبادات اسلامی کی تحریف اور تشبیہ بالکفار کی تردید	احقر محمد مصطفےٰ مقیم میرٹھ محلہ کرم علی	۱۰۰ سو آدمی	سفر گورکھپور میں ہوا۔

تمہید

حضرت والا نے بغرض تبدیل آب و ہوا و استراحت گورکھپور کی طرف ماہ صفر ۱۳۳۵ھ میں سفر کیا اور اپنے بھائی منشی اکبر علی صاحب منیجر ریاست مجھولی ضلع گورکھپور کے پاس دورہ میں تشریف لے گئے دو تین دن مختلف مقامات پر قیام رہا کیونکہ منشی صاحب دورہ میں تھے۔ اسی دورہ میں منشی صاحب نے قصبہ شاہپور ضلع گورکھپور کا کوچ کیا حضرت والا بھی اسی مقام پر پہنچے اتفاقاً جمعہ کا دن اسی مقام پر آگیا قیام حضرت والا کا قصبہ سے قریب ایک میل کے فاصلہ پر تھا جمعہ کی نماز پڑھنے کے لئے قصبہ میں تشریف لے چلے۔ جب بنگلہ سے جمعہ کی نماز کو چلے تھے تو راستہ

میں منشی اکبر علی صاحب نے احقر سے پوچھا کہ آج بعد نماز جمعہ وعظ ہوگا یا نہیں میں نے عرض کیا کہ میں کیا کہہ سکتا ہوں حضرت کی رائے یہ ہے ہاں اتنا مجھے معلوم ہے کہ اب تک کہیں وعظ نہیں فرمایا ہے۔ گورکھپور میں بھی درخواست کی گئی تھی تو یہی جواب دیا تھا کہ میں نے یہ سفر استراحت کے لئے کیا ہے۔ طبیعت ضعیف ہے وعظ کے تعب کی متحمل نہیں بیان کرنے سے سفر کی غایت ہی فوت ہو جاوے گی۔ یہ سن کر منشی اکبر علی صاحب خاموش ہو گئے۔ بعد نماز جمعہ قاضی صاحب امام جامع مسجد کھڑے ہوئے اور پکار کر کہا کہ آپ لوگوں کو اگر شوق وعظ کا ہو تو مولانا صاحب سے عرض کیا جاوے اس پر چند آدمیوں نے یکے بعد دیگرے شوق ظاہر کیا اور رفتہ رفتہ سب نمازیوں نے اتفاق کیا کہ ہاں وعظ ضرور ہونا چاہئے قاضی صاحب نے کہا حضرت کچھ بیان فرما دیجئے۔ فرمایا میں اس سے معذور ہوں کیونکہ تھوڑے بیان سے لوگوں کی سیری نہ ہوگی اور زیادہ بیان کا میں متحمل نہیں ہوں قاضی صاحب نے کہا ہم یہ اطمینان دلاتے ہیں کہ تھوڑے سے تھوڑا بیان بھی ہماری تسلی کے لئے کافی ہے۔ دیکھئے قرآن شریف میں بڑی سورتیں بھی ہیں اور قل ھو اللہ بھی ہے۔ فرمایا بس قل ھو اللہ پڑھ دوں تو آپ کافی سمجھیں گے۔ کہا ہاں چاہے آپ صرف قل ہو اللہ ہی پڑھ دیں اور اس کا ترجمہ بھی نہ کریں اور یہ بات ہم صاف اور سچے دل سے کہتے ہیں۔ اس پر حضرت والا بیان پر آمادہ ہو گئے اور بیان سے پہلے فرمایا کہ میرا ارادہ اس سفر میں بیان کا بالکل نہ تھا مگر اس وقت ایسے پیرایہ سے فرمائش کی گئی ہے جس کا مجھ پر بڑا اثر ہوا ایسا کہ اصرار کرنے سے ہرگز نہ ہوتا وہ یہ کہ وعظ کی مقدار کو میری رائے پر چھوڑ دیا گیا ہے یہ ترک اصرار میرے اوپر اصرار سے زیادہ موثر ہوا۔ لہذا بیان کرتا ہوں۔ احقر اس سے تعجب کر رہا تھا کہ قاضی صاحب نے درخواست کی اور اول دو چار آدمیوں نے اس سے اتفاق کیا پھر تمام مجمع نے اس ترتیب سے مترشح ہوتا تھا کہ باہمی متفق تجویز سے ایسا ہوا ہے۔ چنانچہ بعد میں معلوم ہوا کہ جناب منشی اکبر علی صاحب کی سکھائی ہوئی یہ تدبیر تھی کہ اس طرح

درخواست اور تائید کرنا اور کوئی اصرار نہ کرنا نہ مطلق وعظ پر نہ وعظ کی مقدار پر سو یہ تدبیر کارگر ہو گئی اور وعظ ہوا۔

خطبہ ماثورہ: اما بعد۔ فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ اقیموا الصلوٰۃ ولاتکونوا من المشرکین ٥ یہ ایک آیت کا ٹکڑا ہے اس میں اللہ جل شانہ وعم نوالہ نے ایک بات کا حکم کیا ہے اور ایک بات سے منع کیا ہے میں یہ بیان کرتا ہوں کہ کس بات سے منع کیا ہے اور کس بات کا حکم کیا ہے اور دونوں باتوں میں تعلق کیا ہے اس سے ایک بڑی بات نکلے گی کہ وہ ایک دستور العمل ہوگا اور تمام اعمال میں اس کا خیال نہایت نافع ہوگا۔ یہ حاصل ہے میرے اس وقت کے تمام بیان کا۔ ترجمہ نماز کو قائم کرو اور مشرکین میں سے مت ہو۔ قائم کرنے کے معنے ہیں درست کرنا اور سیدھے سیدھے پڑھنا اور پابندی کے ساتھ پڑھنا اس کے لئے دوسرا لفظ یہ ہے کہ نماز کے حقوق پورے پورے ادا کرو اور ظاہر ہے کہ کسی چیز کی درستی اسی وقت ہوتی ہے جبکہ اس کے تمام اجزاء ٹھیک ہوں اور جو نسبت باہم ان اجزاء میں ہو وہ بھی قائم رہے اور اگر ایسا نہ کیا جاوے تو اس کو درست کرنا نہیں کہتے مثلاً کوئی کھانا پکائے تو کھانا اچھا جب ہی کہا جائے گا کہ جب سارے اجزاء اس کے ڈالے گئے ہوں اور ان اجزاء کی باہمی نسبت بھی ٹھیک ہو حتیٰ کہ اگر نمک بھی زیادہ کر دیا گیا تو یہ نہیں کہا جاوے گا کہ کھانا ٹھیک پکایا۔ اسی طرح اس حکم کی تعمیل کہ نماز کو درست کرو۔ جب ہی ہوگی جبکہ اس کے پورے حقوق ادا کئے جائیں اس وقت کہا جائے گا کہ نماز کو درست کیا۔ درست کرنے کا ترجمہ عربی میں اقامت ہے اور اگر ایسا نہ کیا اس کے اجزاء پورے ادا نہ کئے یا ان اجزاء کے تناسب کو قائم نہ رکھا تو یہ نہیں کہہ سکتے کہ نماز کو درست کیا بلکہ یہ کہیں گے کہ نماز کو بگاڑا اور خراب کیا تو اقیموا الصلوٰۃ کے یہ معنے ہوئے کہ نماز پڑھو اور اس طرح پڑھو کہ پورے حقوق ادا ہوں نہ کہ

ایسی نماز کہ فقط نام نماز کا لگ جاوے اس کو نماز ہی نہ کہا جائے گا دیکھو موٹی سی بات ہے کہ ایک حاکم یا آپ کا ایک دوست کہے کہ ایک نوکر ہم کولا دو اور آپ اس کے اس حکم کی تعمیل یہ کریں کہ چار پائی پر ڈال کر ایک آدمی لنجا اپاہج بیمار جو کسی کام کا نہ ہو فقط جان اس میں ہو لیجا کر پیش کریں اور وہ پوچھے کہ یہ کیا ہے آپ جواب دیں کہ آپ کے حکم کی تعمیل کی ہے آدمی لایا ہوں تو اس پر وہ حاکم کیا برتاؤ کرے گا یا وہ دوست آپ کا اس فرمائش کی تعمیل سے خوش ہوگا اور کیا جب وہ کہے کہ یہ کیسا آدمی لائے ہو تو یہ جواب معقول ہوگا کہ آپ نے آدمی مانگا تھا۔ آدمی آدم کی اولاد کو کہتے ہیں یہ اولاد آدم ہے اور جاندار ہے کون کہہ سکتا ہے کہ یہ آدمی نہیں ہے آپ کے حکم کی تعمیل پوری کردی گئی وہ اس کے جواب میں کہے کہ تم اس کو آدمی کہہ لو ہم نے نام کا آدمی نہیں مانگا تھا کام کا آدمی مانگا تھا ہم کو تو اس سے خدمت لینی تھی اور یہ الٹا خود خدمت کا محتاج ہے۔ صاحبو یہ بات اس کی ٹھیک ہے یا وہ ضابطہ کا جواب کہ آپ نے آدمی مانگا تھا آدمی لا دیا بالکل ظاہر ہے کہ ٹھیک بات اسی کی ہے۔ پس ثابت ہوا کہ جس چیز کی فرمائش ہو اس میں ایک نام کا درجہ ہوتا ہے اور ایک کام کا نام کا درجہ کوئی منظور نہیں کرتا۔ ہر شخص کی غرض یہی ہوتی ہے کہ کام کی چیز ملے دیکھئے پنساری سے آپ بادام مانگیں اور وہ نام کے بادام دیدے یعنی ایسے بادام دے جن کے اندر مغز نہ ہو تو آپ واپس کریں گے یا نہیں اگر وہ آپ کو کہے کہ بادام مانگے تھے میں نے بادام دیدیئے تو آپ یہی کہیں گے کہ اصلی مقصود تو کام ہے اور وہ مغز سے نکلتا ہے نام کے بادام کس کام آدیں گے اے صاحبو ذرا ہم کو شرم کرنی چاہیئے کہ اپنے معاملات میں تو درجہ کام کا چاہتے ہیں اور خدا کے معاملات میں نام کے درجہ کو کافی سمجھتے ہیں اور اس پر اطمینان کر لیتے ہیں کہ ہم نے خدا تعالیٰ کے حکم کی تعمیل کر دی اور اس پر ثواب اور جزا کی امید لگائے بیٹھے ہیں۔ نماز

ایسی پڑھتے ہیں کہ نہ طہارت کی خبر نہ کپڑے کی خبر بعض لوگ ایسا چھوٹا کپڑا باندھتے ہیں کہ رکوع اور سجدہ میں ستر کھل جاتا ہے۔ اگرچہ چوتھائی[له] گھٹنا بھی کھل گیا تو نماز نہیں ہوئی مگر اس کی کچھ پرواہ نہیں نہ سجدہ ٹھیک نہ رکوع نہ دو سجدوں میں فصل بعض لوگ سجدہ میں سے اتنا سر نہیں اٹھاتے جو فاصل بین السجدتین ہو جائے کتابوں میں لکھا ہے ایسے دونوں سجدے ایک ہی سجدہ کے حکم میں ہیں تو اس صورت میں ایک سجدہ ہوا جب دوسرا سجدہ ہی نہیں ہوا تو نماز کیسی ایک سجدہ کر لینے کے بعد چاہیئے کہ سیدھا بیٹھ جائے اور سب اعضاء ٹھیر جائیں تب دوسرا سجدہ کرے اگر اتنا وقفہ بھی نہ ہو تو اتنا تو ضرور ہے کہ اتنا سر اٹھایا جائے کہ اقرب الی القعود ہو جائے گو ایسی نماز مکروہ ہوگی اور ایک اور نئی ایجاد ہوئی ہے نماز میں کہ بہت لوگوں نے عادت کر لی ہے کہ قومہ بالکل ہی ندارد کر دیتے ہیں۔ قومہ کہتے ہیں رکوع کے بعد سیدھا کھڑا ہونے کو یہ نماز میں واجب ہے بلا اس کے نماز نہیں ہوتی اور یہ مسئلہ سب نماز پڑھنے والوں کو معلوم ہے۔ گو بعض کو اس کا وجوب نہ معلوم ہو تب بھی یہ تو ضرور معلوم ہے کہ رکوع کے بعد سمع اللہ لمن حمدہٗ یا ربنا لک الحمد کہا جاتا ہے معلوم نہیں جن لوگوں نے قومہ اڑا دیا ہے یہ دونوں لفظ وہ کس وقت کہتے ہوں گے شاید رکوع میں کہتے ہوں مگر رکوع بھی ان کا لمبا نہیں دیکھا جاتا بس سوائے اس کے کیا کہا جاوے کہ نماز کا ایک جز واڑا ہی دیا یہ تو خدا کی بتلائی ہوئی نماز میں ترمیم ہے جب نماز پڑھتے ہی ہو تو اس سے کیا فائدہ کہ پڑھی پڑھائی کو غارت کر دو اگر اعلیٰ درجہ کی نہیں ہو سکتی تو ادنے درجہ کی تو ہو جائے اس کے اجزاء ضرور یہ تو ادا ہو جائیں جس سے کسی درجہ میں تو کہا جا سکے کہ نماز ہے نماز کی صورت تو درست ہو جائے حقیقت نہ سہی مگر ہم نے تو صورت کی بھی

له بعض کے نزدیک گھٹنا مستقل عضو ہے اور بعض کے نزدیک ران کے تابع ہے چوتھائی گھٹنا کھلنے سے نماز کا فاسد ہونا پہلے قول پر ہے حضرت مولانا نے احتیاطاً اسی کو اختیار کیا ہے ۱۲ ناظر

یہ گت بنائی ہے روح تو الگ رہی ہماری اس نماز کی مثال تو وہ بھی صحیح نہیں رہی جو ابھی میں نے بیان کی تھی کہ پنساری کے یہاں جاویں اور بادام مانگیں اور وہ نرے چھلکے مغز سے خالی دیدے یا کوئی آدمی منگائے اور ایک اپاہج بیمار کو اس کے سامنے پیش کر دیں۔ اب یہ مثالیں بھی ہماری نماز کی نہ رہیں بلکہ ہماری اس نماز کی مثال اب تو یہ ہو گئی کہ کسی سے بادام مانگیں اور وہ بادام کے کوئلے ہاتھ میں رکھدے یا آدمی مانگا جائے اور وہ مرگھٹ میں سے ایک مردہ لاکر پیش کر دے صاحبو یہ کیا بیہودگی ہے کیا ایسی نماز سے ہمارا پیچھا چھوٹ سکتا ہے ذرا تو ہم کو خیال چاہیئے یہ کیا غضب ہے کہ اپنی فرمائش پر تو نام کی چیز ملنے سے بھی ناراض اور خدا تعالیٰ کی فرمائش پر نام کی چیز بھی نہیں مہیا کی جاتی حالانکہ حق تو یہ تھا کہ حق تعالیٰ کی فرمائش پر وہ چیز پیش کی جاتی جو کام کی بلکہ اعلیٰ سے اعلیٰ ہوتی اگر یہ بھی نہ ہو تو علیٰ سبیل التنزل کہا جاتا ہے کہ ایسی چیز تو ہوتی جو اپنی فرمائش پر پیش کی جاسکے کام کی چیز تو وہ ہوتی ہے جس میں روح ہو نماز کی روح کیا چیز ہے اس کا بیان آیت میں اس طرح ہے اقم الصلوٰۃ لذکری یعنی نماز کو درست کرو میری یاد کے واسطے خدا تعالیٰ کا تصور قلب میں اور اس کو یاد رکھنا نماز کی روح ہے اس سے تو ہم کوسوں دور ہیں کام کی نماز تو یہی ہے جس میں حق تعالیٰ ہی کی طرف دھیان ہوتا یہ اگر میسر نہیں تو کاش نام ہی کی نماز ہوتی کہ رحمت خدا کیا عجب ہے اسی وقت قبول کر لیتی مگر جبکہ اس کے اجزاء ضروریہ ہی ندارد ہیں تو اس پر تو نماز کا نام بھی نہیں لگ سکتا صاحبو عمل کی صورت تو درست کر لو بڑوں کے یہاں کبھی محض صورت بھی قبول ہو جاتی ہے بلکہ بعض اوقات حقیقت سے زیادہ صورت کی قدر کی جاتی ہے۔

جیسے مٹی کے خربوزے ککڑی بنا کر رئیسوں کے یہاں لیجاتے ہیں تو اس پر انعام ملتا ہے لیکن شرط یہ ہے کہ نقل تو ہو انعام اسی بات کا ملتا ہے کہ اس نے ہو بہو نقل اتار دی۔ یہاں تو نقل بھی نہیں نماز کی صرف شکل بھی

اگر بنائی جائے تو امید ہے کہ اس زمانہ میں قبول ہو جائے اس کا ثبوت حدیث میں ہے کہ فرمایا حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے کہ تمہارا وہ زمانہ ہے کہ اگر کوئی دسواں حصہ مامور بہ میں کمی کرے تو ہلاک ہو جاوے قبول نہیں اور ایک زمانہ وہ آئے گا کہ اگر کوئی دسواں حصہ عمل کا بھی کرلے گا یعنی کیفاً تو نجات پاجاویگا تو ہم لوگوں کے واسطے تو بہت ہی آسان ہے مگر شاباش ہماری غفلت کو کہ ہم سے آسان کام بھی نہیں ہوسکتا ہم کو تو اس انعام کی بہت قدر کرنی چاہیئے اس حدیث سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ وہ زمانہ وہ ہوگا کہ اس میں اعمال کے حقوق کی رعایت میں کمی ہو جائے گی اور یہی راز ہے معمولی عمل کے کافی ہو جانیکا کیونکہ جب کسی شے کی کمی ہو جاتی ہے تو تھوڑی چیز بھی غنیمت سمجھی جاتی ہے ہم لوگ تو اس قدر آسانی میں ہیں کہ ذراسی توجہ سے اور ہاتھ پیر ہلانے سے بڑے بڑوں کی برابر حصہ پاسکتے ہیں ہمارے واسطے مشقت تو رہی ہی نہیں صحابہ نے ایسی مشقتیں اٹھائی ہیں کہ ہمارا کیا حوصلہ ہے مگر اللہ اکبر ان کا استقلال کہ جب جس نے بھی عمل کیا تو عزیمت کے اوپر کیا رخصت پر بھی عمل نہ کیا بدون کسی عذر یا مصلحت کے۔

حضرت ابوذر غفاریؓ ایک صحابی ہیں انھوں نے اسلام کا چرچا سنا تو اپنے گاؤں سے اپنے بھائی کو مکہ مکرمہ بھیجا تاکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات کی تفتیش کریں تاکہ حق کی تحقیق ہو جائے۔ انھوں نے واپس جاکر کچھ حالات بیان کئے مگر ان سے ان کی تسلی نہ ہوئی آخر خود مکہ مکرمہ آئے مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے مل نہ سکے کیونکہ اس وقت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچنا بہت مشکل تھا بچہ بچہ اسلام کا اور مسلمانوں کا دشمن تھا یہ پردیسی آدمی کوئی ان کا ٹھکانا بھی مکہ مکرمہ میں نہ تھا جہاں ٹھہرتے اور کھانے پینے کا آرام ہوتا مگر زمزم شریف عجیب دولت ہے انھوں نے ایک مہینے تک اسی پر گذر کی جب بھوک لگتی تو اسی کو پی لیتے جب پیاس لگتی تو اسی کو پی لیتے ایک روایت میں ہے کہ ابوذرؓ ایسے موٹے ہو گئے کہ پیٹ میں بٹ پڑ گئے۔

مدت کے بعد حضرت علیؓ نے ان سے پوچھا تم یہاں کیسے ٹھیرے ہوا نھوں نے اپنا سارا قصہ ان سے کہدیا حضرت علیؓ نے کہا کہ چلو حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک تمھیں میں پہنچا دوں مگر زمانہ خوف کا ہے اس طرح چلو کہ کوئی یہ نہ پہچانے کہ تم میرے ساتھ چل رہے ہو، میں آگے آگے تھوڑے فاصلے پر چلوں گا اور تم میرے پیچھے آنا اور اس پر بھی اگر کوئی شخص مل گیا تو میں پیشاب کرنے کے بہانے سے راستہ کے کنارے بیٹھ جاؤں گا تم گذرتے چلے جانا کسی طرح یہ ثابت نہ ہو کہ تم میرے ساتھ ہو ورنہ تمھارے واسطے بھی بُرا ہوگا اور میرے واسطے بھی یہ وہ وقت تھا کہ مسلمان کے ساتھ ہونا بھی جرم تھا دیکھیے کس قدر خطرناک وقت تھا کہ مسلمان کے ساتھ ہوتا بھی جرم تھا مگر دل کی لگی اسی کو کہتے ہیں کہ اسی ترکیب سے سیدھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچے اور اول ہی جلسہ میں مسلمان ہوگئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس وقت تم اپنے گاؤں کو چلے جاؤ، ہمیں امید ہے کہ ہجرت کی اجازت ہوجاوے گی تب وہاں آجانا اور اپنے اسلام کو یہاں ظاہر نہ کرنا ابوذرؓ نے عرض کیا کہ حضرت کفر کو تو ہمیشہ ظاہر کیا اسلام کو کیا چھپاؤں گا۔ یہاں یہ سمجھ لینا چاہیے کہ یہ مخالفت امر نہیں ہے کیونکہ اظہار سے نہی شفقۃً تھی اس خیال سے کہ مبادا کوئی مخالف ایذا پہنچاوے اس صورت میں تعمیل امر نہ کرنا مخالفت نہیں ہے بلکہ عمل علی العزیمت ہے (اور اسی لئے یہ قصہ بیان کیا گیا ہے) غرض انھوں نے گوارا نہ کیا کہ اخفاء اسلام کریں اور اظہار کے لئے بھی یہ غضب کیا کہ وہ صورت اختیار کی جس میں جان کا خطرہ تھا مسجد حرام میں پہنچے وہیں کفار کی بیٹھک تھی جس کا نام دارالندوہ تھا جو اب حرم شریف کا جزو ہے وہاں سب کفار جمع تھے آپ نے کیا کیا کہ اپنے ایمان کی اذان دیدی اذان بالمعنی المصطلح نہیں بلکہ بمعنی اعلان ایمان کے ہے یعنی سب کے سامنے کھڑے ہو کر علی الاعلان کلمۂ شہادت پڑھا پھر کیا تھا کفار تو مسلمانوں کے خون کے پیاسے تھے سب لپٹ پڑے اور بہت مارا۔ شعر

بجرم عشق توام میکشند وغوغائیست
تو نیز بر سر بام آکہ خوش تماشائیست

اور اس سے کچھ تعجب نہ کیجئے کہ ایک شخص دین کے واسطے اتنی ہمت کرے کیونکہ ایک مخلوق کی محبت میں دیکھا ہوگا کہ کیا کیا ہو جاتا ہے۔ ایک بازاری عورت کے پیچھے لوگوں کی بعض دفعہ کیا کیا گتیں بنتی ہیں اس مار کی قدر وہی شخص جان سکتا ہے جس کو عشق کا مزہ آچکا ہو۔ حضرت ابوذرؓ نے نہ غل مچایا نہ کچھ ان کی خوشامد درآمد کی بلکہ چپ چاپ کھڑے پٹتے رہے، عجب نہ تھا کہ کفار مار ہی ڈالتے مگر قدرت خدا کہ حضرت عباسؓ آگئے یہ بڑے رحمدل تھے اور بڑے قوی تھے ان کی آواز بارہ میل جاتی تھی اور کیوں نہ ہو ہاشمی تھے خاندان بنی ہاشم تھا ہی بہت قوی خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں تیس آدمیوں کی قوت تھی۔ چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک پہلوان کو پچھاڑا تھا ان کا نام رُکانہ تھا جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے تھے اور کہا تھا کہ اگر آپ مجھے پچھاڑ دیں تو میں مسلمان ہو جاؤں آپ نے انکو پچھاڑ دیا انھوں نے کہا کہ یہ اتفاقی بات تھی کہ میں پچھڑ لیا۔ اب کے پچھاڑئیے تو جانوں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر اُن کو اٹھا کر پھینک دیا یہ صاف ثبوت ہے اس بات کا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں قوت بدنی بھی بہت تھی۔ غرض یہ بات ثابت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں تیس آدمیوں کی قوت تھی۔ یہاں سے ملحدوں کے تعداد ازواج پر اعتراض کا جواب بھی نکلتا ہے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں تیس آدمیوں کی برابر قوت تھی اور ایک آدمی کو ایک بیوی رکھنے کی اجازت تمام دنیا دیتی ہے تو اس حساب سے بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تیس بیویاں رکھنے کی گنجائش تھی تیس کی جگہ اگر نو ہی رکھی تو اس تعداد ازواج پر کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت کمی کی حساب سے ایک تہائی سے بھی کم پر بس کیا، ذرا انصاف سے کام لینا چاہیے اور یوں کوئی بک بک کرتا پھرے تو اس کا کیا علاج اور یہ تعداد ازواج بھی بطور نفس پروری نہ تھا کیونکہ اس کے

خلاف پر بہت سے قرائن ہیں۔ دیکھئے سوائے حضرت عائشہ کے سب بیواؤں سے عقد کیا اور سب سے اول جو شادی کی اُس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر پچیس برس کی تھی یہ وقت عین شباب کا تھا اس وقت میں تو کنواری سے کرنا تھا مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خدیجہؓ سے کیا ان کی عمر اس وقت چالیس برس کی تھی اور بیوہ تھیں دیکھئے یہ نفس پروری ہے یا نفس کشی اور جب تک وہ زندہ رہیں ان کے سامنے اور کوئی نکاح نہیں کیا۔ یہاں سے یہ شبہ بھی جاتا رہا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بیوہ عورتوں سے اس واسطے عقد کئے کہ کنواری ملتی کہاں آپ کوئی گھر کے امیر نہ تھے اور شبہ اس طرح رفع ہوا کہ حضرت خدیجہؓ ملکۃ العرب کہلاتی تھیں انہوں نے خود اپنی خواہش سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے نکاح کیا تھا۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وقعت لوگوں کے دلوں میں یہ تھی کہ ملکۃ العرب نے خود خواہش کی تو غریب غربا کنواریوں کا ملنا کیا مشکل تھا۔ نیز دوسری دلیل اس بیہودہ بکواس کی تردید کی کہ کنواری لڑکیاں مل کہاں سکتی تھیں سورۂ حٰم سجدہ کے پڑھ کر سنانے کا واقعہ ہے وہ اس طرح ہے کہ کفار نے ایک دفعہ اکٹھا ہو کر مشورہ کیا ان میں ابوجہل بھی تھا کہ یہ شخص جو دعوے نبوت کرتے ہیں اس کے فرو کرنے کے واسطے بجائے مخالفت کے تدبیر سے کام لیا جائے تو بہتر ہے وہ یہ ہے کہ ان سے پوچھنا چاہئے کہ یہ دعویٰ کس غرض سے کرتے ہیں۔ اگر وہ غرض بلا اس دعوے کے پوری کر دی جاوے تو غالباً یہ دعوے آپ چھوڑ دیں گے اس طرح بہت سہولت کے ساتھ ہم کو کامیابی ہو جاتے گی۔ چنانچہ ان میں سے ایک شخص نے جو بہت فصیح اور بلیغ تھا اس کام کا بیڑا اٹھایا اور حضور میں حاضر ہوا اور کہا کہ آپ یہ بتلا دیجئے کہ آپ کو اس دعوے سے کیا مقصود ہے اگر حسین لڑکیوں کی خواہش ہے تو وہ جتنی آپ کہیں ہم پہنچا دی جا دیں اور اگر مال مقصود ہے تو جتنا آپ کہیں ہم مال جمع کر دیں اور اگر عمارت اور سرداری منظور ہے تو ہم سب آج سے آپ کو اپنا سردار مان لیتے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس کی باتوں کو خاموشی کے ساتھ سنتے رہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت تھی کہ جواب

یں جلدی نہ کرتے تھے اوّل پوری بات سن لیتے تھے تب جواب دیتے تھے۔ جب وہ جو کچھ کہنا تھا کہہ چکا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے فرمایا کہہ چکے اب جواب سنو اور سورۂ حم سجدہ کے شروع کی آیتیں شروع کیں حمٓ تنزیل من الرحمٰن الرحیم آگے تک جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس آیت پر پہونچے فان اعرضوا فقل انذرتکم صاعقۃ مثل صاعقۃ عاد و ثمود اور اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر تم نہیں مانو گے تو میں ڈراتا ہوں اس عذاب سے جو عاد اور ثمود پر آیا تھا۔ اس آیت کو سن کر وہ کہتا ہے۔ خدا کے لئے بس کیجئے اور وہاں سے بھاگا اور نہایت بدحواسی کیساتھ اسی مجمع میں پہنچا ابو جہل وہاں موجود تھا ہی اس نے دور سے اس کو دیکھ کر کہا کہ یہ گیا تھا اور چہرہ لیکر اور آرہا ہے اور چہرہ لے کر، ابو جہل فراست اور دانائی اور عقلمندی میں مشہور تھا وہ بشرہ سے یہ سمجھ گیا کہ اس پر بھی کچھ اثر ہو گیا کیونکہ قرآن شریف کی دلربائی کفار بھی جانتے تھے حتیٰ کہ یہ تجویز ہوا کرتی تھی کہ جس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم قرآن شریف پڑھا کریں اس وقت گڑبڑ کیا کرو اور غل مچایا کرو تاکہ کوئی سننے نہ پاوے کیونکہ سننے کے بعد ممکن نہیں کہ قرآن کی طرف کشش نہ ہو اس کا ذکر اس آیت میں ہے وقال الذین کفروا لا تسمعوا لھٰذا القرآن والغوا فیہ لعلکم تغلبون اور یہاں سے خدا کی قدرت بھی نظر آتی ہے کہ عقلمندوں کو ایسے گڑھوں میں گراتا ہے کہ قرآن کے اس قدر قائل اور فراست اور دانائی اور عقلمندی میں مشہور مگر ایمان نہ لاتے تھے۔ سچ یہ ہے کہ ہدایت بلا توفیق خداوندی کے نہیں ہو سکتی دیکھئے عقلا یورپ موجد ہیں ایسے صنائع کے جن کی ایجادوں سے حیرت ہوتی ہے مگر ایسے صریح مغالطہ میں پڑے ہوئے ہیں کہ نہایت درجہ قابل حیرت ہے جس قدر عقلمندی میں اعلیٰ درجہ رکھتے ہیں اُسی قدر ان میں دہریت ہے اور خدا کے منکر ہیں دنیا میں تو کوئی فعل بلا فاعل کے نہ ہو سکے اور اتنے بڑے عالم کے لئے صانع کی ضرورت تسلیم نہیں کرتے یہ قدرت خدا کا نظارہ ہے۔ غرض ابو جہل نے اُسے دور ہی سے دیکھ کر کہا کہ یہ گیا تو تھا اور چہرہ لے کر اور آیا اور چہرہ لے کر

جب وہ پہونچا اس نے سارا واقعہ بیان کیا اور کہا کہ جب انھوں نے یہ آیت پڑھی ہے تو مجھے ایسا معلوم ہوا کہ اب بجلی گرنے کو ہے میں اپنی جان بچا کر بھاگا۔ دیکھئے اس واقعہ سے ثابت ہے کہ عورتیں بھی آپ کے سامنے پیش کی گئیں تو اس کہنے کی گنجائش نہیں رہی کہ بیوہ عورتیں اس واسطے کی تھیں کہ کنواری لڑکیاں مل نہ سکتی تھیں جبکہ آپ نے باوجود کنواریاں مل سکنے کے بیوہ عورتوں سے عقد کئے تو وہ شخص جس کو ذراسی بھی عقل ہے سمجھ سکتا ہے کہ کسی اور مصلحت پر اس کی بنا تھی ان مصلحتوں کا بیان کرنا یہاں مقصود نہیں بلکہ صرف یہ بتلانا ہے کہ ایسے شخص کو شہوت پرست کہنا دین تو برباد کرنا ہے ہی عقل کے پیچھے بھی لٹھ لے کر پھرنا ہے۔ غرض حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں ہر طرح کی قوت تھی اور یہ آپ کا ذاتی کمال تو تھا ہی خاندان سے بھی میراث میں پایا تھا۔ بنی ہاشم سب قوی تھے۔ حضرت عباسؓ انھیں میں سے تھے۔ حضرت ابوذرؓ کے پٹنے کے وقت، وہ آگئے انھوں نے سب کو ہٹایا اس طرح کہ خود ان پر الٹے پڑگئے ان میں اسلام سے پہلے بھی یہ رحم تھا یہ عالی خاندانی کی دلیل ہے۔ خاندانی اور غیر خاندانی میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خداوند تعالےٰ نے ایسے خاندان میں پیدا کیا تاکہ کسی بڑے سے بڑے کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اقتدار کرنے میں عار نہ ہو اسی واسطے حق تعالیٰ نے سب انبیاء کو خاندانی بنایا ہے۔ اگرچہ خدائے تعالےٰ کے یہاں نسب کا چنداں اعتبار نہیں بلکہ کسب کا اعتبار ہے ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم مگر لوگوں کے مذاق کا اعتبار کیا تاکہ کسی کو بھی اتباع سے عار نہ ہو غرض حضرت عباسؓ نے ان کو اپنی جان پر کھیل کر بچالیا یہ خون سے ایسے رنگین ہوگئے تھے جیسے بت قربانی کے خون سے رنگے جاتے تھے۔ اب یہاں کوئی سننے والا کہہ سکتا ہے کہ آج کی مار سے سب نشہ ان کا اتر گیا ہوگا۔ اور آئندہ ان کو ہمت نہ رہی ہوگی کہ کسی کے سامنے اظہار ایمان کریں مگر شعر

نہ سازد عشق را کنج سلامت ‌ ‌ ‌ ‌ خوشا رسوائیے کوئے ملامت

اگلے دن پھر اسی مجمع میں پہونچے اور پھر اسی اعلان کے ساتھ کہا اشھد ان لا الٰہ الا اللہ، آج اس سے بھی زیادہ غیظ و غضب کے ساتھ کفار لپٹ پڑے اور اور بھی زیادہ مارا خدا کی قدرت کہ پھر حضرت عباسؓ آگئے۔ پھر انھوں نے اُسی طرح اُن کو بمشکل بچایا۔ اس کو کہتے ہیں محبت اور یہ ہے اسلام ہمارا کیا مُنہ ہے کہ ہم بھی اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کا نام لیں، پھر یہ اپنے گاؤں چلے گئے۔ یہاں کوئی یہ شبہ کرسکتا ہے کہ دین تو مشکل اس وقت تھا جیسا کہ ان شواہد سے معلوم ہوا پھر یہ بات کیسے صحیح ہوئی کہ آج کل دین کی گرانی ہے دین کی گرانی تو اس وقت تھی اس کے جواب کے لئے ذرا سی سائنس دانی کی ضرورت ہے وہ یہ کہ سائنس کا اصول ہے کہ جب کسی کا محبوب سامنے ہوتا ہے تو اس کو قوت رہتی ہے اور وہ اسی قوت کی وجہ سے بہت سے موانع کو دفع کرسکتا ہے۔ صحابۂ کرام کے زمانہ میں یہ بات موجود تھی یہ کتنی بڑی بات تھی کہ ہمارے سر پر ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم موجود ہیں اس قوت کی وجہ سے موانع کا اثر کم ہوسکتا تھا تو اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود سے قوت تھی اس وجہ سے موانع کا چنداں اثر نہ ہوتا تھا۔ دوسرے اس وقت صرف بیرونی موانع تھے اندرونی موانع نہ تھے اور اس وقت میں قسم قسم کے دواعی شر کے موجود ہیں۔ اغیار تو باعث شر کے ہوتے ہی ہیں اپنے بھی داعی شر ہیں بلکہ کفار سے آجکل صرف ضرر ظاہری ہے اور جو کفار مہذب ہیں اُن سے ضرر ظاہری بھی نہیں ہے وہ زبان سے بھی کہتے ہیں کہ مداخلت مذہبی نہ کریں گے اور نہ برتاؤ میں بھی اُن کے تہذیب ہے۔ دل آزاری بھی پسند نہیں کرتے وہ کسی طرح بھی مخل فی الدین نہیں ہیں۔ آجکل زیادہ مخل فی الدین وہ لوگ ہیں جو اغیار نہیں سمجھے جاتے۔ وہ اس قدر داعی الی الشر ہیں کہ خدا کی پناہ کسی کو کھلم کھلا دشر کی طرف بلاتے نہیں پھرتے مگر کتابیں اس طرح کی تیار کردی ہیں جو کھلم کھلا بلانے سے بہت زیادہ اثر رکھتی ہیں۔ بس وہ اپنا کام کر رہی ہیں اس اثر سے عوام کی آجکل وہ حالت ہے کہ صبح کو کچھ شام کو کچھ کسی کو اپنے ایمان پر بھروسہ نہیں رہا یصبح الرجل مؤمنا و یمسا کافرا اور سبب اس زہریلے اثر کا دین

کی ناواقفی ہے اور دین سے اس ناواقفی کے بہت سے اسباب موجود ہیں مثلاً یہ کہ مسلمان عام طور سے معاش کی تعلیم وغیرہ میں لگے ہوئے ہیں۔ اتنی فرصت ہی نہیں کہ دین کی طرف توجہ کریں پھر مذہب کی کیا خبر ہو۔ اور اس میں بھی چنداں مضائقہ نہ ہوتا۔ اگر ذہن میں یہ بات رہتی کہ ہم دنیا دار ہیں مصیبت تو یہ ہے کہ باوجود دین سے مس نہ رہنے کے اپنے آپ کو دین دار سمجھتے ہیں بلکہ دوسروں کی رہبری کے لئے تیار ہیں اس وقت میں مسلمانوں کو مسلمانوں ہی سے زیادہ ضرر پہونچ رہا ہے۔ یہ لوگ اس قدر آزاد ہیں جن پر مسلمان ہونے کا اطلاق ہونا بھی مشکل ہے ہمارے نواح کے ایک قصبہ کا ایک واقعہ ہے کہ ایک تعلیم یافتہ شخص ایک بار کہنے لگے کہ میں محمد صاحب کی بہت قدر کرتا ہوں آپ بڑے ریفارمر تھے اور بہت اصلاح قوم کی کی۔ رہی نبوت سو وہ صرف ایک مذہبی خیال ہے مسلمانوں نے خوش عقیدگی کی وجہ سے مان لیا ہے بتایئے ایسے شخص کے کفر میں کیا شبہ ہے یا اسلام ایسی چیز ہے کہ کسی طرح جا ہی نہیں سکتا کفر کے عقیدے دل میں رکھو اور کلمات کفر زبان سے بکو اور اسلام ہے کہ اس میں فرق ہی نہیں آتا حضرت اسلام خداوند تعالے سے ایک خاص تعلق کا نام ہے اور خداوند تعالیٰ کی ذات سب سے زیادہ بے نیاز ہے اس کو زبردستی تعلق قائم رکھنے کی ضرورت نہیں دنیا دار جو ذرا سا بھی بڑا ہے وہ کسی کو منہ بھی نہیں لگاتا پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ خداوند تعالےٰ سے کوئی تعلق قطع کرے اور خدا تعالےٰ اس سے زبردستی جوڑتے پھریں۔ پھر اگر مرتے کھپتے پر بھی بندہ کے تعلق کو حق تعالےٰ منظور فرمالیں تو زہے قسمت اور زہے عنایت ہے سو ایسے کلمات بکنے سے یقیناً اسلام جاتا رہتا ہے اور غضب یہ ہے کہ اس شخص کے نکاح میں ایک مسلمان عورت ہے نکاح کسی طرح قائم نہیں اور جھڑا جھڑ بچے بے نکاح ہو رہے ہیں۔ تعلیم یافتہ ہونے کا نام لگ جانے سے عوام الناس میں ایسے لوگوں کی عزت ہو جاتی ہے

اور اُن کا اثر پڑتا ہے۔ بتایئے کہ اتنا نقصان مسلمانوں کو غیر قوم سے پہونچ سکتا ہے ہرگز نہیں اب مولوی جو اس تعلیم سے منع کرتے ہیں تو لوگ تعجب سے پوچھتے ہیں کہ صاحب دنیاوی تعلیم میں کیا حرج ہے مگر جو نتائج ظہور میں آرہے ہیں ان کو دیکھئے۔

بریلی میں ایک لڑکا میرے سامنے لایا گیا کہ اس کو ذرا نصیحت کردیجئے یہ نماز نہیں پڑھتا میں نے اس سے پوچھا کہ بھائی نماز کیوں نہیں پڑھتے اس نے کہا کہ سچ کہدوں میں تو خدا تعالیٰ کے وجود ہی کا قائل نہیں یہ کہا اور کہکر رو دیا اور کہنے لگا کہ میرے ماں باپ سے مواخذہ ہوگا کہ مجھے علم دین نہیں پڑھایا اور نہ نیک صحبت کی طرف کبھی توجہ دلائی۔ یہ لڑکا ایک اسلامی کالج میں پڑھتا تھا۔ اب دیکھئے اس کی کیا حالت ہے میں نے ان لوگوں سے کہا کہ اس کو اس کالج سے نکال کر گورنمنٹ کالج میں بھیجئے وہاں یہ اتنا خراب نہ ہوگا جتنا کہ یہاں ہوا گیا انتہا ہے کہ گورنمنٹ کالج کو ترجیح دینی پڑی اس کالج پر جو مسلمانوں کا کالج کہلاتا ہے اور جس پر لوگ ہم سے لڑتے مرتے ہیں کہ اس کالج کو علماء بُرا کہتے ہیں دیکھئے یہ اثر آپ کے نزدیک بُرا ہے یا نہیں۔ گورنمنٹ کالج میں یہ اثر نہیں ہوتا وجہ یہ کہ اس میں ہندو بھی ہوتے ہیں جب دو قوم اجنبی ایک جگہ رہتی ہیں تو دونوں میں مقابلہ رہتا ہے۔ اُس مقابلہ میں مذہبی پختگی بڑھ جاتی ہے اور وہاں ایک قوم ہے کوئی ایک دوسرے کا مقابل نہیں اس لئے خوب آزادی ہے اور مذہبی امور کی طرف کسی کو توجہ ہے نہیں حمیت پیدا نہیں ہوتی اور وہاں اس قدر خرافاتیں ہوتی ہیں کہ بات بات میں کفر کی نوبت آتی ہے۔

ایک دفعہ چند شریر لڑکے اکٹھے ہوئے ڈاڑھی منڈواتے تو سب ہی ہیں۔ مگر جہل کو مرکب بنایا اور معصیت کو کفر تک پہونچایا اس طرح کہ ایک لڑکا داڑھی نہیں منڈاتا تھا اس کو کہہ سُن کر داڑھی منڈانے پر راضی کیا اور ایک بکرا منگایا پھر لڑکوں میں اعلان کیا کہ آج فلاں کمرہ میں عقیقہ ہوگا۔ جب سب جمع ہوگئے تو ایک باپ بنا اور اس لڑکے کو بیٹا بنایا اور اس کو سب کے بیچ میں بٹھاکر ڈاڑھی منڈوائی

اور اس پر خوب قہقہے اڑے اور بکرا ذبح کر کے کھانا کھلایا گیا۔ یہ ایک بہت ہی ادنیٰ حرکت ہے مگر اس کی حقیقت یوں معلوم ہو سکتی ہے کہ گورنمنٹ کے کسی حکم کے ساتھ اس کا نصف معاملہ کر کے دیکھو بغاوت ہوتی ہے یا نہیں پھر حق تعالیٰ کے احکام کے ساتھ یہ بغاوت کیسے نہیں ہے اس بغاوت ہی کو شریعت کی اصطلاح میں کفر کہتے ہیں عدالت میں اگر کوئی حاکم حکم سنا دے اس پر ذرا ہنس دیجئے کوئی کلمہ بھی منھ سے نہ نکالئے مگر دیکھئے اسی وقت توہین میں چالان ہوتا ہے یا نہیں حضرات مسلمانوں کی یہ نوبت ہے یہ ہیں وہ مضرتیں جو قوم کو مسلمانوں کے ہاتھوں سے پہونچ رہی ہیں اور غیر قوموں سے یہ نقصان نہیں پہونچتے غرض وہ لڑکا گورنمنٹ کالج میں داخل ہوا۔ ایک سال کے بعد اس کی حالت یہ ہوئی کہ خدا کا بھی قائل تھا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی قائل تھا اور نماز کا بھی پابند تھا۔ بات یہ ہے کہ لوگ بچوں کو ابتدا سے فکر معاش میں اس طرح ڈالتے ہیں کہ بالکل اسی میں منہمک کر دیتے ہیں اگر کتابی تعلیم دین کی نہیں ہو سکتی تو زبانی تعلیم تو ممکن ہے مگر یہ بھی نہیں کرتے کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ بچوں کو نماز سکھلائی جاوے۔ دین کے ارکان اُن ان کو سنائے جائیں اس میں تو ان کو کچھ محنت نہیں پڑے گی اور کچھ وقت بھی زیادہ خرچ نہ ہوگا۔ اگر بڑوں کو خیال ہو تو دین کے تمام ضروری اصول و فروع اُن کو سکھا سکتے ہیں مگر یہ سب کچھ جب ہی ہو جبکہ دین کی پرواہ ہو اصل یہ ہے کہ دین کی کسی کو پرواہ ہی نہیں چھوٹوں کو یہ عذر ہے کہ بڑوں نے ہم کو اس طرف نہ لگایا اور بڑوں نے یوں دل کو سمجھا لیا ہے کہ علم معاش سے فرصت نہیں ہے، کیوں صاحبو! قانون کی ضروری باتیں بچوں کے کان میں کیسے پڑ جاتی ہیں کسی بچے کو ہم نے یہ نہ دیکھا کہ علم معاش میں منہمک ہو کر اسے یہ معلوم نہ ہوا ہو کہ مارنا پیٹنا جرم ہے اور وہ سربازار دنگا فساد کرتا پھرتا ہو اگر کسی بچے نے ایسا کیا ہوگا تو اس کے مربی نے فوراً ڈانٹا ہوگا کہ یہ طریقہ شرفا کا نہیں ہے اور قانوناً جرم بھی ہے اس سے جیل خانہ پہونچ جانے کا اندیشہ ہے میں انھیں مربی سے پوچھتا

ہوں کہ اسی بچہ نے جب نماز نہیں پڑھی تو کیوں نہیں ٹوکا کیا اس کا ان کے پاس کوئی جواب ہے۔ پس اصل یہ ہے کہ دین کی پرواہ نہیں اس کا نتیجہ آنکھ مچنے پر معلوم ہوگا۔ دین کو ایسا چھوڑا ہے کہ نام ہی آنا غضب ہے اس کا نام آیا اور سو چیلے کھڑے ہوئے۔ تعلیم معاش پر ہماری اول تو یہی شکایت تھی کہ اس میں انہماک افراط کے درجہ پر پہونچ گیا ہے جس سے دین سے بےخبر ہوگئی ہے اور دوسری شکایت یہ ہے کہ وہ صرف دین سے غافل کرنے والا ہی نہیں بلکہ دین سے مخالف بنانے والا بھی ہے غرض ہر چہار طرف سے دین سے غفلت ہے اور دین کو بگاڑنے کے سامان جمع ہیں جب یہ حالت ہے کہ دین کے ممد اسباب تو موجود نہیں اور دین کے مخالف اسباب موجود ہیں تو یہ زمانہ دین کی گرانی کا زمانہ ہے اور یہ قاعدہ ہے کہ گرانی کے زمانہ میں تھوڑی چیز بھی بہت سمجھی جاتی ہے۔ لہذا اس وقت دین کی قیمت خدائے تعالےٰ کے یہاں بہت ہے۔ یہ مضمون اُس حدیث سے نکلتا ہے جس کو میں نے ابھی بیان کیا تھا کہ فرمایا حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے کہ اب زمانہ وہ ہے کہ اگر کوئی مامور بہ میں دسویں حصہ کی بھی کمی کرے تو ہلاک ہو جائے اور ایک زمانہ وہ آئے گا کہ اگر کوئی مامور بہ کا دسواں حصہ بھی بجا لاوے گا تو وہ نجات پا جاوے گا۔ اس حدیث کا مضمون کافی طور سے بیان ہو چکا اور اس مضمون کی تائید ایک اور حدیث سے بھی ہوتی ہے وہ یہ ہے یاتی زمانٌ القابض علی الدین کالقابض علی الجمر اوکما قال دیکھ لیجئے آجکل کوئی شریعت پر عمل چاہتا ہے تو ضرور رکاوٹیں پیدا ہوتی ہیں عقائد سے تو کوئی ہٹا نہیں سکتا کیونکہ عقیدہ فعل قلب ہے۔ ہاں اعمال میں رکاوٹیں ہیں۔ خصوصًا معاملات میں کہ پچاس میں ایک بھی معاملات میں عامل بالدین نکلنا مشکل ہے اور معاملات میں رکاوٹیں اعمال سے زیادہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ عمل پھر بھی شخص واحد کا فعل ہے آدمی تنہا اپنے اختیار سے کر سکتا ہے اور معاملات وہ اعمال ہیں کہ جن کا تعلق دوسرے سے ہوتا ہے جب تک کہ دونوں باہمت اور پکے نہ ہوں معاملہ کی اصلاح کیسے ہو۔ مذاق عام طور سے بگڑے ہوتے ہیں۔ اگر ایک شخص اصلاح معاملہ

کی کوشش کرتا ہے تو دوسرا پکا نہیں ہوتا اور آپرٹوسن مجدسی ہو اس کو بھی بگاڑ لیتا ہے بس اسی طرح سے ایک سے دوسرا دوسرے سے تیسرا متاثر ہو کر سب ایک بلائے عام میں مبتلا ہو گئے ہیں کہ سب کے معاملات بگڑ گئے ہیں اور مسائل شرعیہ پر اعتراض کرتے ہیں کہ بہت تنگ ہیں۔ حالانکہ تنگی خود کرلی ہے جب ایک بات کا رواج سب مل کر چھوڑ دیں تو اس کے کرنے میں تنگی ہو ہی جائے گی۔
مثلاً اب رواج پڑیہ کا ہوگیا اب لوگ پرانے زمانہ کو یاد کرکے کہتے ہیں کہ پہلے رنگ کی بہت تکلیف تھی کسم بھگویا جاتا تھا اور کئی کئی روز تک ٹپکایا جاتا تھا اور بڑے اہتمام کرنے پڑتے تھے جب کپڑے رنگے جاتے تھے اب اُن کو اُس طریقہ سے رنگنا دشوار نظر آتا ہے مگر اس کی وجہ یہ نہیں کہ واقعی دشوار ہے بلکہ رواج چھوٹ گیا ہے صرف اس وجہ سے دشوار معلوم ہوتا ہے ورنہ پہلے زمانہ میں رنگتے ہی تھے پہلے تو کچھ بھی دشواری نہ معلوم ہوتی تھی غرض جس ایک کام کو عام طور سے آدمی کرنے لگیں وہ کیسا ہی مشکل ہو آسان ہو جاتا ہے اور اگر آسان سے آسان کام کو بھی چھوڑ دیں تو مشکل ہو جاتا ہے اور جس کام کی عادت ڈال لیں خواہ وہ کیسا ہی بُرا ہو اس کی برائی نظر سے چھپ جاتی ہے۔ جیسا ایک بادشاہ کا قصہ ہے کہ وزیر نے پیشین گوئی کی کہ کل کو ایسی بارش ہوگی کہ جو شخص اس کا پانی پیوے گا وہ پاگل ہو جائے گا۔ بادشاہ نے برتنوں میں پانی بھروا کر رکھ لیا اگلے دن بارش ہوئی تمام لوگوں نے اس کا پانی پیا سب کے سب پاگل ہو گئے۔ بادشاہ اور وزیر نے جو پانی پہلے سے بھروا کر رکھ لیا تھا وہ پیا اس لئے وہ جنون سے محفوظ رہے اب لوگوں میں چلسے ہوتے شروع ہوئے کہ بادشاہ اور وزیر پاگل ہو گئے ہیں ان کو معزول کر دینا چاہیئے۔ بادشاہ نے و سے کہا کہ اب کیا کرنا چاہیئے وزیر نے کہا کہ تدبیر یہی ہے کہ ہم بھی بارش کا پانی پی لیں۔ غرض بادشاہ اور وزیر نے بھی وہ پانی پی لیا اور جیسے اور پاگل تھے ویسے ہی وہ بھی ہو گئے اب لوگوں میں یہ چلسے ہوئے کہ بادشاہ اور وزیر اچھے ہو گئے اب ان کو معزول کرنے کی ضرورت نہیں تو جیسے ان

پاگلوں نے بادشاہ اور وزیر کو اپنی طرف نہ ہونے کی وجہ سے پاگل سمجھا اسی طرح اب بددین لوگ دینداروں پر ہنستے ہیں کیونکہ بددینی کا مذاق غالب ہوگیا ہے اس کی برائی ذہن سے جاتی رہی ہے اور دینداری کم رہ گئی ہے اگر کسی میں وہ ہے بھی تو ایک نئی سی بات معلوم ہوتی ہے۔ ریل کے معاملات میں بعض دفعہ مشاہد ہوا کہ حقوق ادا کرنے والے پر لوگ ہنستے ہیں حالانکہ ادائے حقوق جملہ عقلاء کے نزدیک بھی اور شرعاً بھی مستحسن ہے اور اس کی ضد بالاتفاق قبیح ہے مگر طبائع میں خیانت اور حق تلفی کا مادہ غالب ہو رہا ہے اس واسطے ادائے حقوق پر بھی تعجب ہوتا ہے۔ ایک ڈپٹی صاحب ہیں جو بہت دیندار ہیں وہ اپنے ایک لڑکے کا ٹکٹ آدھا لیتے تھے۔ اور گھر والوں سے اس کی تحقیق کر رہے تھے کہ اس کی عمر کیا ہے۔ تحقیق کرنے سے معلوم ہوا کہ اس کی اتنی عمر ہے جس پر ٹکٹ پورا لگنا چاہیئے۔ آس پاس جو لوگ کھڑے تھے وہ سب ہنس رہے تھے کہ دیکھو اس بچے کے لئے آدھا ٹکٹ بھی کھپ سکتا تھا اگر آدھا ٹکٹ لیتے تب بھی کوئی نہ ٹوکتا یہ خود ہی اپنا پیسہ پھینکتے ہیں۔ ایک اور شخص بی اے ہیں وہ ریل میں سوار ہوئے وقت کم تھا اسباب تلوا نہ سکے جہاں اترے وہاں انھوں نے کہا اسباب تول لو بابو نے دیکھا اور کہا جاؤ لیجاؤ انھوں نے کہا نہیں اسباب زیادہ ہے (خدا تجھے نیکی دے وہ ایسے ہی ہوتے ہیں) ان کی وضع قطع سے یہ نہیں معلوم ہوتا تھا کہ یہ انگریزی جانتے ہیں اس لئے اسٹیشن ماسٹر اور وہ بابو انگریزی میں آپس میں گفتگو کرنے لگے۔ ایک نے دوسرے سے کہا معلوم ہوتا ہے کہ اس نے شراب پی رکھی ہے اس کے نشہ میں ہے۔ انھوں نے کہا جناب میں شراب پیئے ہوئے نہیں ہوں میں مسلمان ہوں مذہب اسلام میں حق تلفی جائز نہیں محصول لے لیجئے۔ بابو نے کہا کہ جاؤ جی ہم کو فرصت نہیں (عجب بات ہے کہ چھپے ہوئے کو تو پکڑتے ہیں اس کے واسطے چلتی گاڑی میں بھی گشت کرتے ہیں اور یہ محصول دے رہے ہیں اور نہیں لیتے) اب انھیں فکر ہوئی کہ آخر میں کیا کروں میں محصول

دے رہا ہوں اور یہ لوگ نہیں لیتے مگر حق تعالیٰ کا ارشاد ہے ومن یتق اللہ یجعل لہ مخرجاً فوراً سمجھ میں آگیا بس حساب کیا کہ کتنا محصول واجب ہے اتنی رقم کا ایک ٹکٹ کسی اسٹیشن کا لے کر پھاڑ دیا اس طرح کرایہ ادا ہوگیا یہ خدا کا خوف تھا لیکن اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ طبائع میں بالکل انقلاب ماہیت ہوگیا ہے اور یہ اگرچہ ہدایۃً برا ہے لیکن اس کے عام ہوجانے سے اس کی برائی نظروں سے اٹھ گئی ہے بلکہ بجائے برائی کے رواج عام ہوجانے سے اس کی بھلائی ذہنوں میں آگئی ہے پھر ایسے فعل پر عمل کیسے ہو جس کے مقابل کی بھلائی ذہنوں میں موجود ہے یہ دشواریاں ہیں جن کی وجہ سے دین پر قائم رہنے والے کو چنگاری کے ہاتھ میں لینے کے ساتھ حدیث میں تشبیہ دی گئی ہے۔ لیکن جس طرح عمل اس وقت میں دشوار ہے اسی طرح (میں بشارت سناتا ہوں آپ کو کہ) اس وقت عمل کا ثواب بھی زیادہ ہے۔ فرماتے ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کہ ایسے وقت میں ایک عمل کرنے والے کو ثواب پچاس آدمیوں کا ملے گا صحابہؓ نے سوال کیا ان میں کے پچاس کا یا ہم میں کے پچاس کا (ان کے پچاس ہونگے تو ہمارے نکمے ہوں گے) جواب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ تم میں کے پچاس کا، دیکھئے کتنی بڑی بات ہے اس حدیث کے بموجب اس وقت ایک عمل کا ثواب حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ کے پچاس عمل کے برابر ملتا ہے کتنی بڑی فضیلت ہے یہ اور بات ہے کہ ان کا ایک ہی حصہ ہمارے پچاس سے کیفاً بڑھا ہوا ہو۔ صحابہ کے اعمال ہم سے ضرور بڑھے ہوئے ہیں ان کا ایک اور ہمارے سو بھی برابر نہیں ہوسکتے حدیث میں موجود ہے لو انفقوا احدکم مثل الاحد ذہبا ما بلغ مد احدھم ولا نصیفہ او کما قال یعنی اگر کوئی احد پہاڑ کی برابر بھی سونا خیرات کردے گا تو صحابی کے ایک مُدؔ یا اس کے نصف کے برابر بھی نہ ہوگا ہمارے اعمال کیسے بھی ہوں لیکن ان میں وہ چیز نہیں ہے جو صحابہؓ کے اعمال میں تھی اُن میں روح بھری ہوئی تھی اور ہمارے اعمال میں صرف صورت ہے اور کسی کے عمل میں روح ہو بھی تب بھی اُن کیسی روح نہیں ہے خیر پچاس تو ہیں گو وہ

ؔ مد دہلی کی تول سے تقریباً ایک سیر کا ہوتا ہے ۱۲

بچاس ایک کے بھی برابر نہ ہوں ہم صحابہؓ سے تو بن نہیں سکتے تاہم ان کی نقل تو کر سکتے ہیں۔ ہماری نماز نقل بھی ہوتی تو قدر سے دیکھی جاتی مگر کچھ بھی نہیں ہے، ہم لوگوں نے نماز کو غارت ہی کر دیا ہے نہ اس میں روح ہے نہ صورت اگر پڑھتے ہیں تب بھی کسی کام کی نہیں ہوتی چہ جائے کہ پڑھیں بھی نہیں۔ ان ہی حالات کی وجہ سے فرماتے ہیں اقیمو الصلوٰۃ یعنی نماز کو درست کرو صرف پڑھنے کا حکم نہیں فرمایا بلکہ درست کر کے ادا کرنے کا حکم فرمایا درست کرنا کیا معنیٰ درست کرنا یہ ہے کہ اس کے حقوق ادا کئے جائیں سو ان حقوق میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اس پر پابندی ہو میں نے اس واسطے اس بیان کو چھیڑا کہ دیہات میں نماز کی پابندی نہیں ہے۔ اول تو پڑھتے ہی نہیں اور اگر پڑھتے بھی ہیں تو گنڈے دار اور اگر کوئی پابندی بھی ہے تو بہت سے بہت یہ کہ وقت کے اندر ادا کر لیتے ہیں جماعت کی پابندی نہیں کرتے حالانکہ یہ سب ضروری باتیں ہیں اور اگر کوئی اس کا بھی پابند ہے تو صرف اس کی ذات تک وہ پابندی محدود ہے گھر میں دوسروں کو تاکید نہیں کرتے صاحبو! خود بھی پابندی کرو اور عورتوں اور بچوں کو بھی پڑھواؤ۔ ان کا سوال بھی تم سے ہوگا۔ سب پابندی کے ساتھ پڑھواؤ کسی کی نماز بھی گنڈے دار نہ ہو۔ ہمارے یہاں ایک مولانا شیخ محمد صاحب تھے ایک دفعہ چاند ہوا گاؤں کے لوگ ان کے سامنے گواہی دینے کے لئے آئے انھوں نے ایک شخص سے پوچھا کہ نماز بھی پڑھتے ہو کہا ایک دفعہ مولویوں نے بہت غل مچایا تھا اور سب لوگوں نے ایکا کر لیا تھا کہ جو کوئی نماز نہ پڑھے گا اس کے جنازے کی نماز نہ پڑھی جائے گی جب تو ہم نے نماز پڑھی تھی پھر تو ہماری توبہ ہے، دیہات میں یہی حالت ہے (توبہ توبہ) بعض لوگ نماز کو منحوس سمجھتے ہیں خیر ایسوں نے تو اگر کسی کے دباؤ سے نماز پڑھ بھی لی تو نمازیوں میں ان کا شمار نہیں کیونکہ دل میں نماز کے قائل تک نہیں میرا خطاب اس وقت ان لوگوں سے ہے جو نماز کے قائل ہیں اور اس کو اچھا سمجھتے ہیں ان کو تو چاہیئے کہ نماز کو نماز کی طرح پڑھیں یعنی ایک تو یہ کہ پابندی ہونی چاہیئے اور ایک یہ کہ وقت کا خیال رہے بعض لوگ عصر کی نماز اس وقت پڑھتے ہیں کہ جب سب کاموں سے نمٹ جائیں

سورج ڈوب رہا ہے اور یہ نماز پڑھ رہے ہیں اور اس کی وجہ کچھ تو سستی اور لا پروائی ہے اور کچھ یہ ہے کہ یہ خیال ہوتا ہے کہ ابھی پھر مغرب کی نماز پڑھنا ہے دو دو دفعہ کام کا حرج کون کرے ایک دفعہ ہی نمٹ کر دونوں کو پڑھ لیں گے صاحبو موٹی سی بات ہے کہ دونوں نمازوں میں جتنی دیر لگتی ہے دونوں کو جمع کر کے پڑھو تب اور دونوں کو علیحدہ پڑھو تب ہر حالت میں اتنی ہی دیر لگے گی مثلاً پانچ پانچ منٹ دونوں میں لگتے ہیں تو اگر دونوں کو جمع کر کے پڑھو گے تو بھی دس ہی منٹ کا حرج ہوگا اور اگر دونوں کو الگ الگ اپنے اپنے وقت پر پڑھو تو گو پانچ پانچ منٹ کر کے دو دفعہ حرج ہوگا مگر ہوگا تو وہی دس منٹ کا تو اگر کام کو چھوڑ کر وقت پر نماز پڑھ لو گے تو نماز بھی ٹھیک ہو جائے گی اور حرج بھی اتنا ہی ہوگا پھر یہ خیال کیسے ٹھیک ہے کہ دو دو دفعہ حرج کون کرے دو دفعہ کرنے میں حرج بھی تو آدھا آدھا ہوتا ہے اسی طرح ایک حق یہ ہے کہ رکوع سجدہ ٹھیک کرو نیز جو تسبیح و اذکار نماز میں پڑھی جاتی ہیں وہ سب کسی کو سنا لو نیز قرآن شریف بھی صحیح کرو اگر شین قاف نہ نکلے تو زیر زبر کی تو غلطی نکال لو نیز خود بھی پڑھو جورو بچوں کو بھی پڑھاؤ ان کے اوپر حق تعالیٰ نے تم کو حاکم کیا ہے جیسے دنیا کے کام ان کو سکھلاتے ہو دین کے بھی سکھلاؤ ورنہ تم سے باز پرس ہوگی۔ پھر جن پر قدرت ہے ان میں سے جو کوئی نماز نہ پڑھے اس پر سختی کرو کوئی سزا مقرر کرو جرمانہ تو حنفیہ کے نزدیک جائز نہیں اور طرح سے اس کے ساتھ سختی کرو مثلاً یہ کہ اس کو اپنے ساتھ کھانا نہ کھلاؤ ایک ہی دفعہ میں عقل سیدھی ہو جائیگی اور میں خود اس شخص سے کہتا ہوں کہ نماز برادری والوں کا یا محلہ والوں کا تو کام نہیں خدا تعالیٰ کا کام ہے اس کا ادا کرنا ضروری ہے۔ جس شخص کی نماز فوت ہوتی ہو اس کو چاہیئے کہ خود اپنے اوپر یہ سزا مقرر کر لے کہ جس دن نماز قضا ہو جاوے کھانا نہ کھاوے۔ ایک وقت یا چند وقت ایسا کرے آپ ہوش درست ہو جاویں گے اور نفس قابو میں آجاوے گا اور میں وعدہ کرتا ہوں کہ ایک وقت نہ

کھانے سے یا چند وقت نہ کھانے سے مرے گا نہیں۔ یہ بات طباً ثابت ہے کہ آدمی کئی کئی دن تک فاقہ کرنے سے مر نہیں سکتا۔ غرض ہمت کر کے کام کرو اور بے ہمت تو لقمہ بھی منہ میں نہیں جاتا یہ تو بیان ہوا اقیموا الصلوٰۃ کا اور اس میں خلاف ارادہ طول ہو گیا خیر اس سے بھی کچھ نفع ہی ہو گا۔ ان شاء اللہ۔ آگے فرماتے ہیں ولا تکونوا من المشرکین۔ جس کا ترجمہ یہ ہے کہ مشرکین میں سے مت ہو اس میں غور کرنے کی یہ بات ہے کہ نماز کے حکم میں اور اسی نہی میں جوڑ کیا ہے۔ اس میں ایک نکتہ ہے وہ یہ کہ مشرکین عرب حج کرتے تھے مگر نماز نہ پڑھتے تھے چنانچہ حج کرنے والوں کو نہ روکتے تھے اور نماز پڑھنے والوں کو سخت تکلیفیں پہونچاتے تھے۔ سو وہ حج کے تو خلاف نہ تھے لیکن نماز کے بالکل خلاف تھے اور یہود و نصاریٰ نماز پڑھتے تھے حج نہ کرتے تھے اس لئے حج نہ کرنے پر حدیث میں یہودی یا نصرانی ہو کر مرنے کی وعید کی گئی ہے اور یہاں آیت میں بے نمازی کو مشرک سے تشبیہ دی گئی اور گویہ دونوں فرقے ہیں کافر لیکن یہود و نصاریٰ سے مشرک اور زیادہ برے ہیں کیونکہ یہود و نصاریٰ موحد تو ہیں گو ان کی توحید کارآمد اور کافی نہیں اور عدم مغفرت میں دونوں برابر ہیں تو نماز کا ترک کرنا دوسرے عبادات کے ترک سے زیادہ برا ہوا پس مطلب یہ ہوا کہ نماز چھوڑ کر مشرکوں کے مشابہ نہ بنو اور اس عنوان سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ایسا کوئی کام نہ کرنا چاہیے جس میں کفار کے ساتھ مشابہت ہو۔ اب رہا یہ کہ آیت میں اقیموا الصلوٰۃ پر کیوں نہیں اکتفا کیا تو اس میں نکتہ یہ ہے کہ مسلمان بے نمازی سے نفرت پیدا ہو کیونکہ کوئی ایسا نہیں جس کو شرک سے نفرت نہ ہو کیونکہ توحید ہر شخص کو محبوب ہے اور توحید کی ضد مبغوض ہے۔ جب فرمایا کہ نماز پڑھو اور مشرک نہ بنو تو اس لفظ سے وحشت ہو گی یہ ایسا ہے جیسے کہا جائے کہ اطاعت اختیار کرو اور باغی نہ بنو تو اس کے معنی یہی ہوتے کہ اطاعت

اختیار کرو اور باغی نہ بنو تو اس کے معنی یہی ہوتے ہیں کہ اطاعت اختیار کرنا بغاوت سے بچنا ہے اور ترک اطاعت بغاوت ہے ایسے ہی نماز پڑھنا شرک سے بچنا ہے اور نہ پڑھنا مشرک بننا ہے گو اس کے معنی یہ نہیں کہ نماز نہ پڑھنے سے آدمی کافر و مشرک ہو جاتا ہے کیونکہ یہ عقیدہ اہل سنت کے خلاف ہے بلکہ معنی یہ ہیں کہ یہ عمل مشرکوں کا سا ہے۔

جیسے حدیث میں وارد ہے من ترك الصلوٰة متعمدا فقد کفر ای عملاً یعنی کام کافروں کا سا کیا جیسے کہتے ہیں کہ فلانا چمار ہو گیا اس کے یہ معنی نہیں کہ واقعی چمار ہو گیا بلکہ مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ چماروں کے سے کام کرنے لگا تو نماز نہ پڑھنے والے کو مشرک فرمانا بمعنی حقیقی تو نہیں ہے مگر جس معنی میں بھی ہو لفظ نہایت موحش ہے مشرک سے برا کوئی نہیں اس واسطے اللہ تعالےٰ نے نفرت دلانے کے لئے اقیموا الصلوٰۃ کے ساتھ ولا تکونوا من المشرکین بھی بڑھا دیا کیونکہ صرف نماز کے حکم سے اتنی تاکید نہ ہوتی اور اس سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ مشرک بننا ترک نماز سے بہت زیادہ برا ہے کیونکہ یہ قاعدہ ہے کہ جب ایک چیز کو دوسری چیز سے تشبیہ دی جاتی ہے تو وجہ شبہ مشبہ بہ میں زیادہ ہوتی ہے خواہ زیادتی کسی حیثیت سے ہو مثلاً کہتے ہیں کہ زید شیر ہے یعنی ایسا بہادر ہے جیسا شیر تو اس میں ضرور ہے کہ بہادری شیر میں زید سے زیادہ ہے، ایسے ہی جب ترک نماز کو مشرک بننے کے ساتھ تشبیہ دی گئی تو یہ بات مسلم ہوئی کہ شرک ترک نماز سے بھی زیادہ برا ہے تو شرک کس قدر بری چیز ہوئی۔ دیہات میں شرک بھی کثرت سے ہے خصوصاً عورتوں میں شرک کا اثر بہت ہے مسلمانوں کے گھروں میں یہ بلا ہے کہ دیوی اور سیتلا کو پوجتی ہیں کسی کے چیچک نکلتی ہے تو اس سے ڈرتی ہیں اور اس کو کوئی متصرف چیز سمجھتی ہیں اور سیتلا کی پوجا کرتی ہیں یہ کیا خرافات ہے جیسے اور مرض ہیں

ایسے ہی چیچک بھی ہے اور مرضوں کو کیوں نہیں پوجتے اور مسلمان کے نزدیک تو کوئی با ارادہ اور مؤثر چیز بھی خواہ وہ کتنی ہی بڑی با تصرف کیوں نہ ہو پوجنے کے قابل نہیں ہوسکتی مسلمان کے نزدیک تو پوجنے کے قابل بس ایک خدا ہے۔ اُسی کا اُس کو خوف ہوسکتا ہے اور اسی سے امداد چاہ سکتا ہے اس کے سوا اور کوئی چیز مسلمان کی نظر میں قابلِ خوف اور قابل استعانت نہیں تمام دنیا خدا تعالےٰ کے سامنے ایسی ہی بندی ہے جیسے ہم ہیں پھر ہم کو اپنے جیسے عاجزوں کا کیسا خوف مگر جہالت نے راہ مار رکھی ہے۔ فرضی چیزوں کی پوجا کرتے ہیں۔ ہندوؤں کے مندروں پر چڑھاوے چڑھاتے ہیں اور رہیں مسلمان اور شرک کے اور بھی شعبے ہیں مثلاً بعض لوگ کسی دن کو منحوس سمجھتے ہیں یا اور کسی چیز کو منحوس سمجھتے ہیں۔ بعض لوگ شگون لیتے ہیں اور بعض سمجھتے ہیں کہ شہید لپٹتے پھرتے ہیں کوئی بیمار ہوتا ہے تو کہتے ہیں کہ شہید مرد آگئے اور اُن کے چڑھاوے چڑھاتے ہیں۔ پھر اُن شہید مرد صاحب سے غیب کی خبریں پوچھتے ہیں اول تو یہی غلط ہے کہ شہید لپٹتے پھرتے ہیں شہیدوں کو نعم آخرت کے سامنے اس کی کیا ضرورت ہے کہ دنیا میں آدیں اور آدیں بھی کاہے کے لئے لوگوں کو ستانے کے لئے جنھوں نے اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم پر گردنیں کٹوادی ہیں وہ اس گناہ کے مرتکب ہوں گے کہ خلق خدا کو ستاتے پھریں یہ تو صریح اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے خلاف ہے اور معمولی گناہ نہیں بلکہ بہت سخت گناہ ہے کیونکہ حق العبد ہے جو توبہ کرنے سے بھی معاف نہیں ہوتا ان کی نسبت یہ خیال جنھوں نے اللہ کے لئے گردنیں کٹوائی ہیں کس قدر لغو خیال ہے اور آن کو عالم الغیب سمجھنا یہ دوسری غلطی ہے کیا شہید ہوجانے سے غیب کا علم ہوجاتا ہے لاحول ولا قوۃ الا باللہ شریعت نے ان باتوں کو رد کیا ہے شہیدوں کا

لپٹنا جس کو کہتے ہیں صرف شیطانی اثر ہے وہ کبھی شہید بنتا ہے اور کبھی کوئی مشہور نام لے دیتا ہے کہ میں شیخ سدو ہوں یا فلاں ہوں مسلمان کو بڑا پکا ہونا چاہیئے۔ شیاطین کا کیا ڈر یہ سب شرک کی باتیں ہیں مرد عورت سب اس میں مبتلا ہیں۔ صاحبو ہمارے حالات کس قدر ابتر ہیں۔ دین کا کوئی جزو بھی باقی نہیں عقاید کی تو یہ حالت اور اعمال کو دیکھئے کہ جو فعل اول اعمال ہے یعنی نماز علی العموم وہ بھی متروک ہے مسلمانوں کی بستی ہے اور مشکل سے دو چار نمازی نکلتے ہیں ہر کام میں حکم اکثر پر ہوا کرتا ہے مسلمان آدھے سے زیادہ نمازی ہوتے تو کہا جا سکتا تھا کہ مسلمان نماز پڑھتے ہیں لیکن آدھے سے کم بھی نمازی نہیں فیصدی دو چار بھی مشکل سے نمازی نکلتے ہیں تو ئے قاعدہ مذکورہ یعنی للاکثر حکم الکل یہ کہنا صحیح ہوگا کہ مسلمان بے نماز ہیں نماز کی تو یہ حالت ہوئی۔ ایک عمل روزہ ہے اس کی حالت یہ ہے کہ کہیں معلوم ہوا ہے کہ اس کی طرف سے بعض جگہ اس قدر جہالت ہے کہ بعض عورتوں نے سنا بھی نہیں کہ روزہ بھی مسلمانوں کے یہاں کوئی چیز ہے۔ جب ان روزمرّہ کے اعمال کی یہ حالت ہے تو ان اعمال اسلام کی نسبت کیا کہا جائے جن کا کوئی معین وقت نہیں جیسے زکوٰۃ اور حج اعمال کی حالت یہ ہوئی۔ اور ایک جزو دین کا معاشرت ہے اس میں تو نہ صرف جہالت ہے بلکہ شرعی معاشرت کے مقابلہ میں ایک دوسری معاشرت کھلم کھلا موجود ہے جو کا دیتے ہیں۔ پیتل کے وہ برتن جو ہندوؤں کے ساتھ مخصوص ہیں مسلمان رکھتے ہیں جیسے لوٹیا وغیرہ۔ عورتیں لہنگا پہنتی ہیں پیٹ اور دوسرے وہ اعضاء جو ستر میں داخل ہیں کھلے رہتے ہیں۔ شادی بیاہوں میں ہندوؤں کی رسمیں کرتے ہیں جیسے کنگنا باندھنا وغیرہ تمام معاشرت بالکل ہندوؤں کیسی ہے۔ دھوتی باندھتے ہیں بعض دھوتی باندھنے والے نماز کے وقت دھوتی کو پیچھے سے کھول لیتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اب تو کچھ حرج نہیں رہا۔ میں کہتا ہوں اس سے یہ تو معلوم ہوا کہ

باندھنے والے خود بھی دھوتی کو بُرا جانتے ہیں جب ہی تو نماز کے وقت اس کو کھولنے کو ضروری سمجھتے ہیں ورنہ کھولنے کی کیا ضرورت ہے پھر صاحو جب برا جانتے ہو تو بجائے دھوتی کے لنگی اور پاجامہ پہنو کھیت کیار کے کام سب ہماری طرف بھی ہوتے ہیں اور ہماری طرف اکثر لوگ لنگی اور پاجامہ ہی پہنتے ہیں دھوتی بہت کم لوگ باندھتے ہیں اس کی جتنی ضرورتیں بتلائی جاتی ہیں وہ سب خیالات ہیں بس صرف رواج اور رسم ہے۔ میں کہتا ہوں بڑے شرم کی بات ہے کہ ہم نے تو کثرت سے ہندوؤں کی رسمیں اختیار کر رکھی ہیں بھلا ہندوؤں نے بھی کوئی رسم ہماری لی ہے قطع نظر گناہ سے غیرت بھی تو کوئی چیز ہے یہ اور بات ہے کہ ہندوؤں میں سے کوئی خاص شخص مسلمانوں کی کوئی عادت اختیار کر لے مگر ساری قوم میں کوئی رسم ہماری نہیں پھیلی اور ہمارے یہاں ان کی رسمیں ساری قوم میں موجود ہیں، حالانکہ مشرکین کی کوئی بات بھی نہیں لینا چاہیئے۔ ہمارے اسلام میں اپنی عادات اور تعلیمات بہت کافی اور سب سے اچھی موجود ہیں پھر کیا ضرورت ہے کہ ہم دوسروں کی معاشرت لیتے پھریں اور معاشرت کوئی دین سے الگ چیز نہیں ہے وہ بھی دین کا ایک جزو ہے کیونکہ دین کے پانچ جزو ہیں۔ عقائد، عبادات، معاملات معاشرت، اخلاق۔ پانچوں جزو کسی کے اندر پورے ہوں تب اس کو دین دار کہیں گے۔

دیکھئے حسین وہ شخص ہے جس کا چہرہ بھی ٹھیک ہو، آنکھیں بھی ٹھیک ہوں، قد بھی ٹھیک ہو۔ اگر ایک بات میں بھی کمی ہو اور ذرا سا بھی عیب ہو تو حسین نہ کہا جائے گا۔ مثلاً سارا جسم ٹھیک ہو لیکن نکٹا ہو تو اس کو حسین نہیں کہا جائے گا اور آج کل مسلمانوں کی حالت یہ ہے کہ پانچوں

چیزوں میں سے ایک چیز بھی نہیں اور حسین بننے کو تیار ہیں اور اگر بعض افراد میں اجزائے دین ہیں بھی تو سارے اجزا نہیں ایک دو کو لے کر باقی کو چھوڑ دیا ہے اور سمجھتے ہیں کہ ہم کامل ہو گئے۔ یاد رکھو کامل وہ ہے جو سب اجزا کو لے سب چیز مسلمانوں کی سی ہو کوئی چیز بھی مشابہ کفار نہ ہو حدیث میں آیا ہے کہ میری امت میں تہتر فرقے ہو جائیں گے اور سب دوزخ میں جائیں گے سوائے ایک کے۔ پوچھا گیا کہ وہ ایک کونسا ہے اشارہ فرمایا وہ وہ ہے کہ جو میرے اور میرے اصحاب کے طریقہ پر ہو۔ سو یہ لفظ جو ترجمہ ہے ما کا عام ہے کیا مطلب کہ وہ اجزائے خمسہ میں متبع ہو قولاً بھی فعلاً بھی اور اتباع قولی عام ہے خواہ قول جزئی ہو یا قول کلی ہو جس سے کہ قاعدہ کلیہ ثابت ہو پس اجازت کے موقع پر جائز فعل کا کرنا بھی قول کلی کا اتباع ہے۔ میرے اس جملہ سے یہ اعتراض اٹھ گیا جو ممکن ہے کہ کسی کو ہوتا کہ مولوی لوگ بھی پورے متبع نہیں مثلاً اچکن پہنتے ہیں حالانکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے یا صحابیؓ سے اچکن پہننا ثابت نہیں اصل یہ ہے کہ عادات میں اصل اباحت ہے جو وضع شریعت میں ممنوع نہ ہو (تشبہ بھی ممانعت کی علت ہے) تو اس میں کچھ حرج نہیں تو یہ بھی اتباع ہی ہوا کہ شریعت نے جس چیز کو منع نہیں کیا اس کو اختیار کر لیا جائے یعنی شریعت کی حدود سے قدم باہر نہ رکھا جائے مثلاً شریعت نے لنگی یا پاجامہ کی حد مقرر کر دی ہے کہ ٹخنوں سے نیچا نہ ہو تو ٹخنے کھلا پاجامہ خواہ کسی وضع ہو بشرطیکہ تشبہ بالکفار نہ ہو شریعت جائز رکھتی ہے تو جواز کی حد میں رہنا بھی قولاً اتباع ہے اگر بالکل حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے موافق ہو کہ سنن عادیہ میں سے بھی کوئی سنت نہ چھوڑے تو سبحان اللہ۔ مگر ہم میں اتنی ہمت نہیں ایسے لوگ بھی ہوئے ہیں جنھوں نے سرمو اتباع سے قدم باہر نہیں رکھا۔ ایک بزرگ نے صرف اس وجہ سے خربوزہ نہیں کھایا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی کیفیت قطع کسی حدیث میں نہیں ملی۔ صحابہؓ نے بے چھنا جو کا آٹا کھایا صرف پھونک مار کر بھوسی اڑا دیتے

تھے اور گیہوں کا آٹا ہوتا تو اس کی روٹی بے سالن کے کھاتے کیونکہ گیہوں خود سالن ہے۔ خواجہ نقشبند رحمۃ اللہ علیہ نے ایک مرتبہ خدام سے فرمایا کہ صحابہؓ جو کہ آٹے کی روٹی بغیر چھانے ہوئے کھایا کرتے تھے اس سنت پر بھی عمل کرنا چاہیئے اب سے اسی طرح روٹی پکائی جائے کہ جو کا آٹا ہو اور اس کو چھانا نہ جائے چنانچہ اُسی طرح روٹی پکائی گئی اس کے کھانے سے سب کے پیٹ میں درد ہوا آپ نے فرمایا کہ ہم سے بڑی بے ادبی ہوئی کہ ہم نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی برابری کا دعوےٰ کیا ہم کو نیچے کے درجے میں رہنا چاہیئے اور رفقاء سے کہا تو یہ کرو آٹا چھان کر کھایا کرو بے چھنا آٹا کھانا حالاً حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی برابری کا دعوےٰ ہے کس قدر باریک بات ہے یہ بات ذکر اللہ اور صحبت سے حاصل ہوتی ہے کہ آدمی حق تعالےٰ کے معاملات کو سمجھنے لگتا ہے۔ شیخ نے وسعت بھی اختیار کی تو کس نیت سے پھر وسعت پر عمل کرنے میں سنت کے ادب کو بھی ملحوظ رکھا ہم حیوان ہوتے تو کہتے اچھا عمل بالسنت کیا کہ پیٹ میں درد ہی ہو گیا گویا (نعوذ باللہ) سنت سے وحشت ہو جاتی ہماری حالت یہ ہے کہ جو بات اپنے آپ کو پسند ہوئی اور اتفاق سے شریعت نے بھی اُس کا امر کیا تو اس پر تو عمل کر لیا اور شریعت کی تعریف کرنے لگے اور جو بات اپنے آپ کو پسند نہ ہوئی یا اس میں اپنا کچھ نقصان ہوا تو اس کے پاس کو بھی نہ جاویں یہ وہ حالت ہے کہ جس کو خدا تعالےٰ نے اس طرح بیان فرمایا ہے ومن الناس من یعبد اللہ علی حرف فان اصابہ خیر اطمان بہ وان اصابتہ فتنۃ انقلب علی وجھہ خسر الدنیا والآخرۃ ذلک ھو الخسران المبین یعنی بعض آدمی وہ ہیں جو حق تعالےٰ کی عبادت کا دم بھرتے ہیں مگر کنارے پر رہتے اگر ان کو کچھ نفع پہونچا تب تو مطمئن ہو گئے اور اگر کوئی تکلیف پہونچی تو بس منہ پھیر کر چل دیئے فرماتے ہیں کہ انھوں نے دنیا بھی کھوئی اور دین بھی آجکل یہ حالت ہے کہ لوگ فرائض کے مسئلے پوچھتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ شرعی حکم کی طلب ہے حالانکہ مقصود صرف یہی ہوتا ہے کہ ہم کو میراث مل جائے اگر ان کو دور کے

رشتہ سے پانچ ہزار میراث کے مل گئے تو کہتے ہیں شریعت کیسا اچھا قانون ہے کسی کا حق نہیں مارتا ہر ایک کا پورا پورا حق دلواتا ہے حق تلفی تو اس قانون میں ہے ہی نہیں اور اگر انہیں معلوم ہو گیا کہ ہمیں کچھ نہ ملے گا تو کہتے ہیں بس رہنے دیجئے فرائض نکالنے کی ضرورت نہیں ہم سے تو یہ مال گیا حتیٰ کہ بعض لوگوں نے فرائض نکلوائے جب دیکھا کہ ان کا حصہ نہیں ہے تو کہا بس رہنے دو آگے کیوں تکلیف کرتے ہو اب ضرورت نہیں رہی۔ ایک شخص نے مجھ سے ایک فرائض لکھوائی اس کا ان کا حصہ نہ آیا تو پوچھنے لگے کہ میرا حصہ کیوں نہ آیا مجھے تو بڑی امید تھی میں نے کہا کہ فلاں وارث موجود ہے اس کے ہوتے آپ کو نہیں مل سکتا تو کہنے لگے کہ پھر اس وارث کو نہ لکھو سبحان اللہ واقعات میں تراشں خراش ہوئی اختیاری ہو گئی یہ حالت ہے ہم لوگوں کی کہ بس دنیا کے نفع نقصان کو دیکھتے ہیں اگر دین بھی ساتھ میں آ گیا تو خیر ورنہ کچھ اس کی پرواہ نہیں تو ہم لوگ دین کو بھی دین ہونے کی نیت سے نہیں لیتے اور اہل اللہ اگر دنیا بھی لیتے ہیں تو دین کی نیت سے۔ دیکھئے حضرت خواجہ نقشبند نے وسعت بھی اختیار کی تو کس نیت سے ہم لوگ اگر وسعت اختیار کرنے میں بھی نیت کر لیں کہ عزیمت پر عمل کرنے میں تکلیف ہے اور ہم کو اس کے تحمل کی ہمت نہیں تب بھی غنیمت ہے مگر ایک تو حدِ جواز سے باہر نہ جانا چاہئے۔ دوسرے صرف کسی ایک جزو دین کو منتہیٰ نہ قرار دے لیں بلکہ تمام اجزاء دین میں پورا پورا اتباع کریں کیونکہ ما انا علیہ میں ما کلمہ عموم ہے جو شامل ہے اجزاء خمسہ کو عقائد میں عبادات میں معاملات میں معاشرت میں اخلاق میں سب میں دین کے پابند رہیں سلام کھانا پینا سونا اٹھنا بیٹھنا سب اسلام کا سا ہو۔ دیکھو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عشار کو عتمہ کہنے سے منع فرمایا حالانکہ یہ بھی ایک لغت تھا مگر چونکہ اہلِ جاہلیت اس کو بولتے تھے اس واسطے پسند نہیں فرمایا تشبہ کے بارے میں بہت لوگوں کی طبیعتوں میں الجھن ہوتی ہے کہ اس میں کیا حرج ہے مگر میں اس کا پتہ آپ ہی کے برتاؤ میں بتاتا ہوں۔ دیکھئے اگر اس وقت زمانۂ حرب میں کوئی جرمنی

لباس پہنے بلاضرورت زبان جرمنی بولے محض اترانے اور تفاخر کے لئے تو حکام کو کیسا ناگوار ہو جبکہ تشبہ کوئی چیز نہیں تو یہ ناگواری کیوں ہوتی ہے. پھر شریعت پر کیا اعتراض ہے اگر وہ منکرین اور مخالفین کی مشابہت سے منع کرتی ہے۔ غرض حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان الفاظ کی بھی اجازت نہیں دیتے جن کو کفار استعمال کرتے تھے اس سے وہ الفاظ گو بالکل حرام نہیں ہوجاتے مگر ان کا استعمال بے ادبی تو ہے بلکہ یہ سن لینے کے بعد کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے ممانعت فرمائی ہے پھر حرام اور مکروہ کا سوال کرنا ہی دلیل ہے عدم محبت کی۔ حرام اور مکروہ کی تحقیق کیوں ہے جس کو اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع کیا اس سے رک جانا چاہیئے۔ آجکل لوگوں نے متکبرانہ انگریزی کے الفاظ ایسے زبان پر چڑھائے ہیں کہ کوئی جملہ ان سے خالی نہیں ہوتا پھر علماء سے پوچھتے ہیں کہ کیا انگریزی کا لفظ بولنا حرام ہے علماء ان کو حرام تو کہیں گے نہیں۔ بس ان کو گنجائش مل جاتی ہے کہ جب حرام نہیں تو پھر ہم پر کیا اعتراض میں کہتا ہوں کبھی کچہری میں جاکر عربی اور فارسی کے پُرانے الفاظ نہ بولے ذرا یہ بھی تو کیجئے یہ بھی تو حرام نہیں۔ اور میں ذمہ لیتا ہوں کہ ان کے بولنے سے آپ پر کچہری میں کوئی مقدمہ بھی قائم نہ ہوگا اور کسی قسم کا خطرہ بھی نہیں بلکہ آپ کی لیاقت کی دلیل ہوگی کہ کہ آپ کو یہ زبانیں بھی آتی ہیں مگر آپ کبھی ایسا نہ کریں گے۔ وجہ کیا ہے کہ حکام اسکو اگرچہ ناجائز اور کوئی جرم نہیں کہتے مگر پسند بھی نہیں کرتے بلکہ میں ترقی کرکے کہتا ہوں کہ ناپسند بھی نہیں کرتے صرف اتنی بات ہے کہ خود نہیں بولتے بس آپ صرف اس بات سے کہ وہ خود استعمال نہیں کرتے ان الفاظ کو ناپسند کرنے لگے اتباع کے یہ معنی ہیں جس شخص کو اللہ و رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے محبت ہے اسی طرح اُس کو بے دین قوم کے الفاظ استعمال نہ کرنے کے لئے یہ وجہ کافی ہے کہ اللہ و رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو خود استعمال نہیں کیا نہ عارض کی وجہ سے ان کو پسند کیا۔ حرام اور مکروہ کیا چیز ہے جیسے عربی و فارسی کے الفاظ حکام کے سامنے اس واسطے نہیں بولے جاتے کہ حکام ان کو خود نہیں بولتے ہیں مگر آجکل اس کا عکس ہے کہ جان جان کر کفار کے الفاظ

بولتے ہیں۔ کانپور میں ایک مرتبہ دو لڑکے مسجد میں نماز پڑھنے آئے ان میں سے ایک دوسرے سے انگریزی میں گفتگو کرنے لگا دوسرے نے کہا بھائی مسجد میں تو انگریزی مت بولو اس نے کہا کیوں کیا مسجد میں انگریزی بولنا گناہ ہے پھر انھوں نے ایک ملازم کو مجھ سے دریافت کرنے کے لئے بھیجا میں نے کہا گناہ تو نہیں مگر ادب کے خلاف ضرور ہے لوگ اس کو معمولی بات سمجھتے ہیں گو اس پر فتویٰ کوئی نہ لگایا جا سکے مگر آخر ادب بھی تو کوئی چیز ہے۔ دیکھئے بعض آداب کے ترک پر عدالت میں ناخوشی ہوتی ہے میرے ایک ملنے والے کا مقدمہ عدالت میں تھا وہ پیشی کے وقت عطر مل کر گئے مقدمہ سے وہ رہا کر دیئے گئے مگر پھر بلا کر سمجھایا گیا کہ دیکھو یورپین کے سامنے عطر مل کر کبھی مت جانا۔ سو عطر مل کر آنا کوئی جرم نہ تھا چنانچہ عدالت نے بھی اس کو جرم قرار نہیں دیا اس کی وجہ سے کوئی مقدمہ ان پر قائم نہیں ہوا لیکن فہمائش کی گئی اس وقت کسی نے یہ نہ کہا کہ عطر مل کر آنا کیا جرم ہے بلکہ یہی کہا ہوگا کہ بہت اچھا حضور قصور ہوا پھر کیا وجہ ہے کہ خدا کا اور خدا کے گھر کا ادب نہ ہو اور وہاں وہ الفاظ استعمال کئے جائیں جو مخالفین و کفار کے الفاظ ہیں۔ ادب ایک بڑی چیز ہے اور ترک ادب کوئی معمولی بات نہیں حرام اور مکروہ کا تلاش کرنا یہ جب ہی ہو سکتا ہے کہ جب دل میں ادب نہ ہو اور جب دل میں ادب ہوتا ہے تو حکم سنتے ہی آدمی گردن جھکا لیتا ہے صحابہؓ کی یہی شان تھی صحابہؓ نے کبھی حرام اور مکروہ نہیں پوچھا۔ جب بعد میں اس قسم کے سوالات ہونے لگے تب فقہاء نے احکام کے مراتب کو استنباط کر کے قائم کر دیا۔ غرض اجزاء خمسہ دین میں بھی یہی برتاؤ رکھئے کہ جس بات کی نسبت معلوم ہو جائے کہ یہ دین کی بات ہے اس کو اختیار کیجئے اور جس کی نسبت معلوم ہو جائے کہ یہ دین کے خلاف ہے اس سے الگ رہئے یہ ہے اسلام کامل اس پر کاربند ہو کر دیکھئے کہ پھر کسی بات کی دوسروں سے حاصل کرنے کی کونسی احتیاج رہتی ہے جس کو کسی چیز سے انس ہوتا ہے دوسری چیز کی طرف میلان نہیں ہوتا۔ جس کو اسلامی مذاق حاصل ہے وہ دوسروں کے افعال کی طرف کیسے مائل ہوگا۔ بلا ضرورت کوئی چیز بھی غیر قوم کی نہ لیجئے اس وقت مجھ کو بالقصد یہ بیان کرتا تھا لاتکونوا من المشرکین سے یہ مسئلہ بخوبی مستنبط ہو گیا جس چیز میں بھی مشرکین کی مشابہت ہو وہ سب اس میں داخل ہیں سب صاحب رسوم شرکیہ چھوڑ دیں چال ڈھال میں کھانے پینے میں لباس میں شادی بیاہ میں کوئی عادت اور رسم کفار کی نہ رکھیں اور نماز پابندی سے پڑھیں اور خود بھی پڑھیں اور اپنے گھر والوں سے اور اوروں کو بھی پڑھوا دیں۔ اب دعا کریں کہ حق تعالیٰ توفیق دیں۔ آمین ثم آمین۔

اَدَبُ التَّرک

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حامدًا ومصلیًا

تقریر حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب رحمۃ اللہ تعالےٰ علیہ مسمیٰ با ادب الترک

یہ تقریر بھی منجملہ ان تقریروں کے ہے جو سفر گورکھپور میں ہوئیں یہ تقریر ریل میں مابین میرٹھ و دیوبند ہوئی۔ تاریخ ۵ ربیع الاول ۱۳۳۵ھ روز دوشنبہ یکم جنوری ۱۹۱۷ء قبل دوپہر حاضرین احقر اور میر معصوم علی صاحب اور خواجہ عزیز الحسن صاحب اور حاجی وجیہہ الدین صاحب سوداگر میرٹھ مقدار وقت یاد نہیں غالبًا آدھا گھنٹہ۔

خواجہ صاحب نے پوچھا کہ میرا جی چاہتا ہے کہ توکل کروں اور سب تعلقات چھوڑ کر اللہ اللہ کروں ہنس کر فرمایا جلدی نہ کیجئے جب سب اولاد کی شادی بیاہ ہو چکیں اور آمد بھی بند ہو جاوے اس وقت مناسب ہے اور تعلقات والے کو ترک اسباب کرنا مشکل ہے ہفتہ میں دو ہفتہ میں اللہ اللہ کرنے سے جی اکتا جاتا ہے یہ مباحات ہی کی برکت ہے کہ اشغال مختلف ہونے سے نشاط بحال ہو جاتا ہے۔ میں اپنا تجربہ عرض کرتا ہوں کہ (کہنے کی بات تو ہے نہیں مگر اس وقت سب اپنے ہی ہیں) میں نے بھی ایک دفعہ ترک تعلقات کیا تھا نتیجہ یہ ہوا کہ وساوس میں مبتلا ہو گیا کیونکہ حق تعالےٰ مرئی تو ہے نہیں محض خیال سے دفعۃً پُر ہونا قلب کا مشکل ہے اور تعلقات سے قلب خالی کیا گیا اور پُر ہوا نہیں خالی قلب میں شیطان کو دخل کا موقع مل گیا اور وساوس پیدا ہوئے سمجھ میں آیا کہ یہ ٹھیک نہیں ذکر شغل طاعت میں مشغول رہے اور مباحات بالکلیہ نہ چھوڑے سفر کرنا، چلنا پھرنا، احباب سے ملنا خط و کتابت یہ سب اشغال تھوڑے تھوڑے رکھے یہی حکمت ہے۔ حضور

صلی اللہ علیہ وسلم ادعیہ مختلفہ کی تعلیم فرماتے ہیں چلنے کی اور اٹھنے کی اور سوار ہونے کی اور جاگنے کی اور کھانے کی اور پینے کی کہ ایک شغل سے طبیعت اکتا جاتی ہے۔ البتہ اگر مغلوب العشق ترک کرے تو مضائقہ نہیں مگر غلبہ عشق غیر اختیاری چیز ہے اپنے ارادہ سے حاصل نہیں کیا جا سکتا ارادہ والے کے لئے یہی ترک ہے کہ انضباط اوقات کرے ایک وقت طاعت کے لئے ہو تو ایک وقت مباحات کے لئے بھی ہو وقت کو ضائع نہ کرے۔ غیر مفید یا مضر کام میں صرف نہ کرے۔ ایک ڈپٹی کلکٹر منشی صاحب ایک بزرگ سے بیعت ہوئے اور ترک تعلقات کر دیا ملنا، سفر کرنا، خط و کتابت سب چھوڑ دیا ضربیں ایسی لگاتے کہ محلہ بھر تنگ آگیا سب کوستے تھے کہ یہ مر جاوے تو اچھا ہو ان کے دماغ میں یبوست مفرط ہو گئی اور نہ کوئی کیفیت اور مزہ بھی ذکر کا حاصل نہ ہوا پیر صاحب کو لکھا جواب ندارد مجھے لکھا میں نے جواب دیا کہ تفصیلی مشورہ تو بعد میں دوں گا، فوری علاج یہ ہے کہ جن اشغال میں آپ لگے رہتے ہیں سب ایک دم چھوڑ دیجئے لوگوں کے لئے ہدایا لیجئے دیجئے تفریح ہوا خوری کیجئے اول ہی دن میں سب پریشانی جاتی رہے پھر مفصل مشورہ دیا گیا کہ بالکلیہ ترک مباحات نہ کیجئے تقلیل کر دیجئے اور بہتر یہ ہے کہ یہاں چند روز کے لئے چلے آیئے میں آپ کے حالات دیکھ کر انضباط اوقات کی صورتیں بتا دوں گا چنانچہ وہ آئے میں نے بہت تھوڑا سا ذکر بتا دیا اور مختلف کاموں کے لئے اوقات مقرر کر دیئے بس شگفتہ ہو گئے پھر اہل محلہ دعا دیتے تھے کہ جس نے ان کی ضربیں چھوڑائی ہیں اس کا خدا بھلا کرے اب ان کو اپنا حال لکھنے کے لئے یہ الفاظ کافی ہوتے ہیں کہ الحمد للہ میری حالت اچھی ہے لوگوں کو مقصود کا ہی پتہ نہیں غیر مقصود کو مقصود سمجھ کر عمر بھر خبط میں مبتلا رہتے مقصود کام کرنا ہے نہ ثمرات نہ حالات عرض کیا گیا سخت سخت مجاہدہ سے فائدہ تو بہت جلدی ہوتا ہو گا فرمایا اگر ایسا ہوتا تو اکھاڑہ کے پہلوان اور چکی پیسنے والی بڑے ولی ہوتے کیونکہ محنت سخت کرتے ہیں محنت قاعدہ کی زیادہ مفید ہوتی ہے۔ ایک دفعہ ایک تالا بند ہو گیا تھا اس پر لوگوں نے بہت زور لگائے مگر نہ کھلا میں نے کنجی سے

آہستہ سے کھولا فوراً کھل گیا تالے کے ساتھ کشتی لڑنے سے کیا فائدہ تالا طریقہ سے کھلتا ہے ایسے ہی اصلاح کے لئے اور وصول الی اللہ کے لئے یہی طریقہ ہے اور وہ اتباع سنت ہے یہ ہمارے واسطے اس لئے مقرر ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم طریقہ جانتے تھے ہمیں کوئی ضرورت غور وفکر واختراع وایجاد کی نہیں آنکھ میچ کر پیچھے چلے جاویں اب سنت کو دیکھئے حدیث میں آیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ آدمیوں کو خواب میں دیکھا کہ دریا کا سفر کر رہے ہیں حدیث کا لفظ یہ ہے ملوک علی الاسرۃ بادشاہوں کی وضع سے تخت پر بیٹھے جا رہے ہیں یہ بادشاہ ہی تھے جنھوں نے جہاد کئے حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے ان کی فضیلت فرمائی اس سے معلوم ہوا کہ مال دین کے لئے مضر نہیں جبکہ اس کے ساتھ اتباع ہو حاصل یہ کہ مال قبیح لعینہ نہیں بلکہ مقاصد کی وجہ سے قبیح ہو جاتا ہے ہاں اگر کوئی شخص ایسا ہو جس کی طبیعت ہی ایسی ہو کہ اتباع اور مال دونوں جمع نہ ہو سکیں تو اس کو ترک مال ہی کا مشورہ دیا جائے گا۔ خلاصہ یہ کہ بہت غلو ترک میں مناسب نہیں توسط اور اعتدال چاہیئے سب کو ترک اسباب کی تعلیم بھی نہ دینی چاہیئے ہر شخص کی طبیعت اور حالت مختلف ہوتی ہے اس واسطے ترک کے درجات بھی مختلف بتانے چاہئیں۔ ساری دنیا اگر ایک سی ہو جاوے تو تارکین تو تارکین اسباب بھی پھر تارک نہ رہیں کیونکہ ضرورتیں ان کی پوری نہ ہوں اور مشغولی اختیار کرنی پڑے ان کا اطمینان بھی ان بے اطمینانیوں کی وجہ سے جاتا رہے۔ ایک بزرگ کا قول ہے کہ شیطان ہر شخص کی موجودہ حالت کو بیوقعت بتاتا ہے اور اس سے اپنا کام خوب بناتا ہے اہل توکل سے تو کہتا ہے کہ اس حالت میں یہ خرابی ہے کہ اپنا بوجھ دوسروں پر ہے یہ نامردی ہے ؎

چو باز باش کہ صیدے کنی ولقمہ دہی

طفیل خوارہ مشوچوں کلاغ بے پر وبال

ان سے توکل چھوڑا کر اسباب میں گھسا دیتا ہے اور اہل تعلقات سے کہتا ہے

تمھاری بھی کیا حالت ہے دن بھر تو تو میں میں رہتے ہو کوئی وقت بھی یادِ خدا کا نہیں فلاں شخص کیسا تارکِ اسباب ہے تم کیا نہیں کر سکتے یہاں تک کہ ان سے تعلقات کو چھوڑا کر ہی چھوڑتا ہے اور ان میں اتنی ہمت ہوتی نہیں کہ ترک اسباب کے بعد مطمئن رہیں نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پریشان ہو جاتے ہیں اور بعد چندے اس سے پشیمانی ہوتی ہے اور یہ ادھر کے رہتے ہیں نہ اُدھر کے لطف یہ ہے کہ اگر کوئی ترک اسباب کی ہمت کرے بھی تو اس حالت پر بھی قیام نہیں رہنے دیتا اس کو بھی پھر بے وقت ثابت کرتا ہے یہ شیطان کا ایسا مکر ہے کہ ہر جگہ چل ہی جاتا ہے اور اس مکر کو پہچاننا آسان کام نہیں بہت ہی باریک نظر کی ضرورت ہے چاہیے کہ اپنی طرف سے حالت کے بدلنے کی کوشش نہ کرے بلکہ اول کسی بڑے مبصر سے ضرور رائے لیلے اسی واسطے شیطان ایسے بزرگوں سے بہت گھبراتا ہے کیونکہ وہ اس کے مدت کے مکر ذرا میں توڑ دیتے ہیں عرض کیا گیا کہ بلا ترک تعلقات اصلاح کیسے ہو۔ فرمایا ترک ضروری بیشک ہے مگر ترک کی حقیقت تقلیل تعلقات ہے یعنی فضول تعلقات کو اور مضر تعلقات کو چھوڑ دینا نہ مطلقاً تارک بن جانا اس کے مبصر تو حضرت حاجی صاحب تھے۔ تصوف بالکل مردہ ہو گیا تھا حضرت حاجی صاحب نے اس کو زندہ کیا اور حقائق بالکل محو ہو چکی تھیں ان کو تازہ کر دیا تصوف رسم کا نام رہ گیا تھا اول تو جعلسازیاں بہت اور سچے لوگوں میں بھی صرف ڈھچر رہ گیا تھا حضرت نے اس کو بالکل زندہ کر دیا حضرت کا الہامی طریقہ سب کے کام کا ہے۔ حضرت کی مجلس میں بیٹھ کر ہر شخص کو حص آتا اور امیدیں بڑھتی تھیں اور امنگیں پیدا ہوتی تھیں کہ ہم بھی کر سکتے ہیں۔

خواجہ صاحب نے کہا عمدہ ترکیب یہ سمجھ میں آتی ہے کہ تھوڑی جائداد خرید لے جو خرچ کے لئے کافی ہو بس پھر اللہ اللہ کیا کرے اس طرح ذکر بڑے اطمینان سے ہو سکتا ہے۔ فرمایا جائداد سے بھی اطمینان نہیں ہو سکتا اس میں بھی جھگڑے ہیں

اگر اس کی نگرانی نہ کرو اور دوسرے کے سپرد کر دو تو تلف ہو جاتی ہے وہ بھی جب ہی باقی رہتی ہے جب خود اس میں پھنسے رہو پھر اطمینان کہاں اور اصل بات یہ ہے کہ اپنی تجویز سے کچھ ہوتا نہیں حق تعالیٰ کی طرف سے جو پیش آوے اس پر راضی رہے اس میں تائید بھی ہوتی ہے تجویز سے تفویض بہتر ہے ؎

گہ گریزی بر امید راحتے　　　زاں طرف ہم پیشت آید آفتے

اور فرمایا ہے ؎

چونکہ برمیخت بہ بندد سرشتہ باش　　　چوں کشاید چابک ابرجستہ باش

جو شیخ صاحب جائداد ہوتا ہے اس سے فیض کم ہوتا ہے نیز اس کی طرف کشش بھی کم ہوتی ہے کیونکہ اس میں شان مسکنت کی کم ہوتی ہے اپنی امتیازی شان سے اس کو طالبین کی طرف ایسا التفات ہونا مشکل ہے جیسے متوکل محض کو ہو کہ وہ اپنے کو مساکین کا ہم جنس دیکھتا ہے نیز لوگوں کے ذہن میں بھی یہ رہتا ہے کہ ہم کو وہ کیوں منہ لگائیں گے وہ بڑے آدمی ہیں اور امیر دمستغنی ہیں اس واسطے رجوع بھی کم کریں گے اور جو شیخ ہدایا لینے والا ہوتا ہے اس سے فیض بہت ہوتا ہے اور لوگوں کو اس کی طرف کشش زیادہ ہوتی ہے کیونکہ ہدیہ میں خاصیت ہے تحالف کی لینے والے کو اور دینے والے کو دونوں کو ایک دوسرے کی طرف میلان ہوتا ہے۔ یہ حدیث میں بھی ہے اور تجربہ سے بھی ثابت ہے اور طالب اور مطلوب دونوں کو میلان ہوتا یہی اصل ہے فیض کی گو ظاہر میں معلوم ہوتا ہے کہ ہدایا لینے والے شیخ میں حرص ہوگی اور اس وجہ سے بھی اس سے فیض کم ہوگا لیکن یہ غلط ہے اس کو حرص نہیں کہتے حرص کے معنی ہیں نہ ملنے کی صورت میں تلاش کرنا اور قلب کا اس کی طرف کھنچنا یہ اگر پایا جاوے تو واقعی مرض ہے۔ خلاصہ یہ کہ یوں تو ہدیہ لینے میں بھی کچھ خدشات ہیں مگر خیر ان کا علاج ہو سکتا ہے معاملہ فی ما بینہ و بین اللہ صاف رکھنا چاہیے دوسروں کے شبہوں کو کہاں تک مٹایا جاوے اور ان مفاسد سے بچنے کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ کسی کے سامنے ہدیہ نہ لے لیکن اس میں بھی ایک مفسدہ ہے وہ یہ کہ بات چھپتی ہے نہیں

معلوم ہو ہی جائے گا کہ یہ ہدایہ لیتے ہیں پھر جبکہ کسی کو مقدار نہ معلوم ہو گی تو عام طور سے یہ خیال ہو گا کہ بہت ہدایا آتے ہوں گے اور یہ بڑے آدمی ہیں پھر وہی بات پیدا ہو جاوے گی جو ریاست اور جائیداد کے ہونے میں تھی۔ اسی لئے میں روپے کو چھپاتا نہیں اس واسطے کہ اصلی حالت ظاہر ہے چھپانے میں کسی کو تو یہ خیال ہوتا ہے کہ آمدنی بہت ہے اور یہ بڑے آدمی ہیں اور اس میں وہی خرابی ہے جو میں نے بیان کی اور کسی کو یہ خیال ہوتا ہے کہ یہ مطلق لیتے ہی نہیں ہیں اس خیال کے علم سے لینے والے کے دل میں عُجب پیدا ہوتا ہے ان سب باتوں کے خیال رکھنے کی ضرورت ہے میں کچھ نہ کچھ سب پہلوؤں پر نظر رکھتا ہوں لیکن کچھ نہ کچھ مفسدہ مرتب ہو ہی جاتا ہے اور آنکھ تو ہر حال میں جھپکتی ہے باوجود اتنی پرانی مشق کے کہ مدت ہو گئی ہدایا ہی پر گذر ہے۔

اسی سفر میں قنوج میں یہ واقعہ پیش آیا کہ ایک شخص نے جن سے کچھ تعلقات تھے گو مراسم نہ تھے دو روپے دیئے میں نے انکار کیا لیکن انھوں نے کسی طرح نہ مانا اور نہایت عاجزی کے ساتھ اصرار کیا اور دوسروں نے بھی سفارش کی مجھ کو روپے لینے پڑے اس کے بعد انھوں نے ایک سوال کیا جس کا خلاصہ یہ تھا کہ ایک عیسائی کے پیش کردہ اعتراضوں کے جواب مانگتے تھے اور جواب بھی وہ جو اس کے مذاق کے موافق ہوں میں نے ان کو ناصحانہ فہمائش کی کہ اس کی صحبت کو چھوڑ دیں اور اس سے کہدیں کہ علماء سے تحقیق کرو مگر وہ یہی چاہتے رہے کہ اس کے مذاق ہی کے موافق جواب مل جاوے۔ گفتگو بہت بڑھ گئی تب میں نے ان کو لتاڑا مگر قرائن سے معلوم ہوا کہ اس کا اثر بھی ان پر اچھا نہیں ہوا۔ مجھ کو بہت

کوفت ہوئی اور دماغ پر صدمہ محسوس ہوا۔ اس کے بعد وہ مجھ کو اپنے گھر میں لے گئے اور مستورات نے پھر ہدیہ دیا اس وقت مجھ کو نہایت شرمندگی ہوئی کہ میں نے تو ان کو لتاڑا اور ان کی طرف سے یہ احسان کیا جارہا ہے تو اس پر انفعال ہوا کہ ان سے وہ دو روپے لینے سے پہلے کیوں نہ سوچ لیا تھا اور کسی کے کہنے میں جلدی کیوں آگیا اب میں دو مصیبتوں میں مبتلا ہوگیا کہ جو ہدیہ گھر میں دیا گیا اس کو لوں تو طبیعت کے خلاف ہے کہ ابھی ان کو لتاڑا ہے اور ابھی ان کے گھر سے ہدیہ لے لوں۔ اور اگر نہ لوں تو وہ دو روپے بھی واپس کرنے چاہئیں جو باہر لئے تھے اور ان کے واپس کرلے میں کچھ فائدہ نہ تھا کیونکہ اس سے ان پر کچھ اثر اچھا نہ پڑتا بلکہ عناد پیدا ہوتا اور ان کے ظاہری مراسم قائم رہنے سے کچھ امید اصلاح کی تھی وہ بھی جاتی رہتی۔ عجب کشمکس تھی غصہ بہت آیا ہوا تھا لیکن بالآخر یہی ذہن میں آیا کہ اس بات کو نسیًا منسیا کردینا چاہیئے اور یہ گھر میں کا ہدیہ بھی لے لینا چاہیئے اور میں اس وقت ایسا بن گیا کہ گویا ان سے تیز گفتگو ہوئی بھی نہیں تھی دیکھیئے اس لین دین میں یہ کشمکش پیش آتی ہے۔ ہے تو یہ بہت جھگڑے کی جڑ ہے اس میں مصلحت بھی بہت بڑی ہے۔ وہ یہ کہ اس میں علاج ہوتا ہے پندار اور دعوائے استغناء کا ریاست اور جائداد ہونے کی صورت میں یہ مصلحتیں فوت ہوتی ہیں۔

غرض شیخ کے لئے زیادہ مناسب ہے کہ ریاست و جائداد نہ رکھے رہے طالبین ان کا حکم یہ ہے کہ ان کے واسطے کوئی ضابطہ معین نہیں ہوسکتا بعضوں کے لئے ترک اسباب مناسب ہوتا ہے اور بعضوں کے لئے ترک اسباب زہر کا اثر رکھتا ہے۔ لہذا تجویز

حسب موقع مناسب ہے جو حالت جس طالب کی دیکھے اسی کے موافق ہدایت کرے اور وقوع کے وقت سوچنے سے بات سمجھنے میں آہی جاتی ہے اور حق تعالیٰ تائید فرماتے ہیں پہلے سے کاوش میں نہ پڑے۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے جب کوئی بات پوچھی جاتی تو فرماتے کہ یہ واقعہ ہوا ہے یا نہیں اگر کہا جاتا کہ نہیں ہوا ہے اور ویسے ہی فرضی صورت پوچھی جاتی ہے تو پوچھنے سے منع فرماتے تھے کہ غیر واقعہ بلائیں کیوں پڑے وقت پر ضرور کوئی بتلانے والا مل جاوے گا اور اگر کوئی شبہ کرے کہ مجتہدین نے کیوں فرضی صورتیں نکال نکال کر فتوے لکھے اور کتابیں بنائیں تو اس کا جواب یہ ہے مجتہدین کو اس ضبط کی ضرورت تھی۔ احکام ظاہری اگر ضبط نہ ہو جاتے تو دین بالکل گڑبڑ ہو جاتا اب دین منضبط ہو چکا اب فرضی صورتوں کے تراشنے کی ضرورت نہیں جب واقعہ پیش آوے گا کوئی بتلانے والا مل جاوے گا اور اگر کوئی بتلانے والا نہ ہو تو اس وقت طالب کو چاہیئے کہ دعا کرے حق تعالیٰ کی طرف سے وہ مشکل حل ہوگی۔

خواجہ صاحب نے عرض کیا کہ حضور نے توکل کیا تھا اور اسباب کو ایک دم چھوڑ دیا تھا۔ فرمایا میری نہ کہیئے میرے ساتھ کچھ بکھیڑا نہ تھا صرف ایک اہل کا فکر تھا اور نوکری چھوڑتے وقت یہ ضرور قلب پر بار تھا کہ خدا جانے ان کی حالت کیا ہو یہ متحمل ہوں یا نہ ہوں خدا کی قدرت کہ انہوں نے مجھ سے بھی زیادہ مستعدی ظاہر کی تو ایسے شخص کو ترک اسباب کرتا کیا مشکل ہے ایسے شخص کی ریس عیال دار لوگ کیسے کر سکتے ہیں اس کے آگے کچھ تھوڑا سا مضمون اور تھا وہ ضبط سے رہ گیا۔ فقط۔

تاریخ ختم مبیضہ ۶ رجمادی الاول ۱۳۳۵ھ

وعظ جناب مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ تعالےٰ علیہ
مقام چرتھاول ضلع مظفر نگر

احکام اور مسائل متعلق موت

بسم اللہ الرحمن الرحیم

چونکہ موت کے متعلق مسائل کے معلوم ہونے کی زیادہ ضرورت ہے لہذا اس وقت بیان کئے جاتے ہیں افسوس ایسی یقینی چیز جس کے آنے میں کسی کو کلام نہیں اُس کو ایسا دل سے بھلا رکھا ہے۔ دیکھو اللہ تعالےٰ کے وجود میں ملحدین کو شبہ ہوا ہے لیکن موت کے آنے میں کسی کو شک نہیں۔ موت وہ چیز ہے کہ عیش و آرام کو مکدر راحت و چین کو منغص کردیتی ہے بلکہ منکرین حساب کو بہ نسبت معتقدین کے زیادہ خوف ہونا چاہیئے تھا کیونکہ ان کے عقیدے کے بموجب ان کے تمام آرام چین موت کے ساتھ منقطع ہوتے ہیں لیکن اس کی نسبت ایسی غفلت ہوئی ہے کہ مومنین و منکرین سب نے مل کر بھلا دیا ہے۔ موت کے یاد دلانے کے واسطے سب سے بڑا محرک مردہ کو دیکھنا اور تجہیز و تکفین میں حاضر ہوتا ہے لیکن افسوس آجکل مردہ کو دیکھ کر ہر شخص یہی خیال کرتا ہے کہ یہ دن اسی کے واسطے تھا نہ کہ میرے لئے اگر یہ سمجھا جاتا کہ یہ حال ہمارا بھی ہونے والا ہے اور ہمارے واسطے بھی یہ دن آنے والا ہے تو واللہ ہرگز ایسی بیفکری کی باتیں ظہور میں نہ آتیں۔ میت کی تجہیز و تکفین کے واسطے آتے ہیں اور طرح طرح کی گفتگو ہوتی ہے کبھی ترکہ کا ذکر ہے کہ منقولہ میں کیا چھوڑا اور جائداد کیا ہے۔ خیر یہاں تک بھی غنیمت ہے کہ ذکر تو مردہ ہی کا ہے لیکن بعض تو اپنے مقدمہ معاملہ کا ذکر شروع کرتے ہیں کل ہمارے فلاں مقدمہ کی تاریخ ہے فلاں وکیل کے پاس جانے کی ضرورت ہے کبھی مدت کے ملے ہوئے دوستوں سے مل کر اظہار خوشی ہو رہا ہے آپ سے تو عرصہ میں ملاقات ہوئی کیا کہوں فرصت نہیں ہوئی گویا یہ بھی دوستوں کی

ملاقات کا ایک ذریعہ ہے عورتوں کی حالت کیا بیان کی جائے ہر شخص جانتا ہے کہ یہ ایسی مجمعوں میں بھی کیسی بیہودگی اور بے تمیزی سے کام لیتی ہیں تعزیت کے لئے جاتی ہیں اور وہاں اپنے مردہ رشتہ داروں کا ذکر کر کرکے روتی ہیں لیکن یہ مصنوعی رونا بھی تھوڑی دیر کے بعد ختم ہوجاتا ہے اور پھر ادھر اُدھر کی فضول باتیں شروع ہوجاتی ہیں کسی کی غیبت ہورہی ہے کسی کے افعال پر اعتراض ہورہا ہے کسی کے نسب پر حرف گیری ہورہی ہے اور پھر بڑا غضب یہ ہے کہ ایک بیوہ کو سب کے ساتھ علیحدہ علیحدہ منہ ڈھکنا پڑتا ہے بھلا کہاں تک خون کا پانی کرے کوئی یہ نہیں دیکھتا کہ ایک تو یہ بیچاری خود ہی زندہ درگور ہوگئی ہے اس کی ذرا تو دلداری کرتے نہیں بلکہ ہر آنے والی بی بی کو اس امر میں کوشش ہوتی ہے کہ میرے ساتھ نالہ وبکا زیادہ جوش کے ساتھ ہوتا کہ اظہار ہمدردی ہو۔ ایک بیوہ کو دیکھو اور اس کا دن میں صبح سے شام تک چالیس پچاس کے ساتھ رونا اور بیان کرنا ظاہر اکوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ یہ بندی خدا کی کس طرح زندہ رہجاتی ہے بجز اس کے کہ اپنی زندگی کی وجہ سے بچ جاتی ہے اور پھر یہ زور شور تین روز اس درجہ کا رہتا ہے کہ العظمت اللہ اور بعد تیجے کے بھی چالیسویں تک اگر چالیس پچاس کا نمبر روزانہ نہیں ہوتا تو دس پندرہ سے کم بھی نہیں کیسی ہی تندرست عورت ہو لیکن بعد چالیسویں کے اگر کوئی دیکھے تو معلوم ہو کہ ناک پکڑے سے دم نکلتا ہے علاوہ حرمت شرعی کے کیا یہ امور اس قابل نہیں ہیں کہ ان کی اصلاح کے واسطے تمام ادنیٰ واعلیٰ پوری کوشش کریں بھائیو اگر ایمان کی پرواہ نہیں تو ذرہ جان ہی کا خیال کرلو مرنے والا مرگیا ان زندوں کے مال پر رحم کرو میرے ایک دوست بیان کرتے تھے کہ میرے بھائی صاحب کے انتقال کے بعد چالیس روز میں والدہ کی ایسی کیفیت ہوئی تھی جیسے کوئی پرانا دق کا مریض ہو اور یہ صرف اسی کا نتیجہ تھا کہ برادری کی عورتوں کے ساتھ ہر روز بیس بیس مرتبہ طوعاً وکرہاً رونا پڑتا تھا کھانا کھانے بیٹھے ہیں اور کوئی ڈولی آگئی بس کہاں کا کھانا فوراً جٹ نی بچھا منہ ڈھک لیا دوپہر کو مرکھپ کر ذرا کمر ٹیکی ہے اور کوئی دوسرے مہربان آپہونچیں بس فوراً گریہ شروع ہوگیا یہاں تک کہ رات میں ایک دو بجے اگر کوئی مہمان آتا ہے تو بجائے اس کے کہ سلام دعا ہو بس دروازہ ہی سے رونے کی

آواز سے اپنی آمد کی خبر دی جاتی ہے غرض چالیس روز تک اس کے مقابلہ میں فرض و واجب کی بھی کیا حقیقت ہے۔ بعض عورتیں تو فی الحقیقت ایسی بدحواس ہو جاتی ہیں کہ نماز وغیرہ ان سے چھوٹ جاتی ہے اور جو عالی ہمت پڑھنے والی ہوتی ہیں ان کو نماز کی برکت سے کبھی دس پانچ منٹ کی راحت بھی مل جاتی ہے کیونکہ اگر نماز پڑھنا شروع کر دیا ہے تو کسی کے آنے پر نماز کے ختم تک کام شروع کرنے میں تامل کیا جاتا ہے لیکن پھر بھی دعا کی نوبت نہیں پہونچی بس سلام پھیرتے ہی منہ بسورنا شروع ہو جاتا ہے۔ غرض کہاں تک کوئی ان مکروہات کو بیان کرے مفصل کیفیت ہر شخص بخوبی جانتا ہے۔ بتلاؤ تو جب علماء ان امور میں اصلاح کی شکایت کرتے ہیں ان کا کیا نفع ہے تمہاری جان کو دنیا و آخرت کے عذاب سے بچاتے ہیں اللہ تعالیٰ کی عجیب قدرت ہے جو امور شرعاً ممنوع ہیں اور قابل وعید ہیں ان پر دنیا میں بھی کوئی کم یا زیادہ سزا ضرور ہے تو جو عذاب اخروی ہونے والا ہے اگر اس سے قطع نظر کر کے دیکھو تو معلوم ہو جائے گا کہ عذاب دنیوی بھی کچھ کم نہیں ہے لیکن شارع علیہ السلام نے جو طریقہ موت کی یاد کا ارشاد فرمایا ہے اس پر کچھ توجہ نہیں کی جاتی بلکہ جہاں تک غور کیا جاتا ہے ساری خرابیاں موت کے بھلا دینے ہی کی وجہ سے ہو رہی ہیں۔

حقیقی بھائی ادنیٰ ادنیٰ چیزوں پر کیسے ایک دوسرے کے دشمن جانی ہو جاتے ہیں کہیں نالش پر سر پھوٹ رہے ہیں کہیں آپس پر تلواریں کھنچ رہی ہیں کیا ممکن کہ چار بزرگوں میں کوئی بات فیصل ہو جائے ہزارہا روپیہ برباد کیا جاتا ہے اور ہائی کورٹ تک نوبت پہونچتی ہے۔ اگر موت کا ذرا بھی خیال ہوتا تو ہرگز یہ حال نہ ہوتا اگر کوئی فرشتہ ہمارا دنیوی معاملات میں انہماک دیکھ کر آسمان پر جائے اور اس سے فرشتے دریافت کریں کہ دنیا والے کبھی موت کو بھی یاد کرتے ہیں تو وہ ضرور کہے کہ ان کے کسی برتاؤ و انداز سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ وہ ابھی تک آپ کو مرنے والا سمجھتے ہیں دیکھو اگر کسی شخص پر کوئی مقدمہ فوجداری کا قائم ہو جائے اور پیشی مقدمہ میں ایک مہینہ کی مہلت بھی ہو لیکن اس کو ہنسنا بولنا سب ناگوار ہوتا ہے اگر کوئی اس قسم کی باتیں کرتا ہے تو کہتا ہے کہ میاں تم کو ہنسی سوجھتی ہے یہاں دل کو لگ رہی ہے اس شخص کو تو ایک مہینہ کی مہلت بھی تھی

موت کی تو کچھ بھی مہلت نہیں لیکن باوجود اس کے کسی برتاؤ سے اس کا خوف ظاہر نہیں ہوتا زبانی یہ کہنا کہ ہم کو موت کا خوف ہے ہرگز قابل تصدیق نہیں کیونکہ الیقین ہو الاعتقاد الجازم مع غلبۃ الحال۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ موت کے آنے کا یقین بہت ضعیف ہے اور ساری خرابیاں کی جڑ یہی ہے کہ لوگ موت سے بیخبر ہیں اگر یہ یاد رہے تو سارے حوصلے بجھ جائیں شہوت وغضب کا غلبہ نہ رہے جب دنیوی تکلیف کے اندیشہ سے کسی مقدمہ وغیرہ میں ہمارا غم بڑا بیا ہوتا ہے افسوس خیال نہیں کیوں ہمارا عیش و آرام تلخ نہ کر دیا بالخصوص بوڑھوں کے لئے بچوں کو توقع ہے کہ ہم جوان ہوں گے جوانوں کو یہ کہ ہم بوڑھے ہوں گے لیکن افسوس یہ بوڑھے کس خیال میں ہیں کیا آپ کو بچپن اور جوانی کی امید ہے دنیوی امور میں سب سے زیادہ چاق و چوبند یہ بوڑھے ہی ہوتے ہیں۔ انسان کی عمر بڑھتی جاتی ہے اور اس کے ساتھ حرص مال بھی بڑھتی جاتی ہے۔ اس بڑھاپے میں اولاد کی بہبودی کی بڑی فکر ہوتی ہے یہ خواہش ہوتی ہے کہ جہاں سے ہو سمیٹ سمیٹ کر ان کے واسطے چھوڑ جائیے اولاد کی فکر میں اپنی اوقات ضائع کرنا اور زندگی تلخ کرنا بڑے نادانی کی بات ہے تمہارا آرام و تکلیف تو تمہارے اعمال پر موقوف ہے اگر اولاد کے واسطے دین برباد کیا اور ان کے عیش کا سامان مہیا کیا تو ان کا عیش تمہارے کس کام آئیگا یہ توقع بھی نہیں کی جا سکتی کہ ایک پیسہ بھی تمہارے واسطے خرچ کریں اگر یہ خیال ہو کہ ہمارے واسطے تیجہ اور دسواں کیا جائیگا تو یاد رکھو کہ اس سے تم کو کچھ بھی نفع نہ ہوگا۔ کیونکہ یہ امور برادری کے خوف سے کئے جاتے ہیں اور جب خرابی نیت سے خود کوئی ثواب نہیں پاتے تو تم کو کیا بخشیں گے۔ اس پر تعجب نہیں ہو سکتا کہ کلمہ و قرآن پڑھا جائے اور ثواب کچھ نہ ہو دیکھو خود نماز جو لوگوں کے دکھلانے کو پڑھی جائے مقبول نہیں ہوتی بلکہ دوزخ میں لے جانے والی ہے جیسا کہ فرمایا ہے شیخ شیرازیؒ نے ۔ شعر

کلید در دوزخ است آں نماز ؎ کہ در چشم مردم گذاری دراز

تیجے میں جو لوگ ہوتے ہیں وہ دو قسم سے خالی نہیں یا تو برادری کے خوف سے حاضر ہوتے ہیں کہ اگر ہم نہ جائیں گے تو ہمارے یہاں کون آئیگا۔ چنانچہ دیکھا جاتا ہے کہ اگر کچھ بھی نہ پڑھے اور عذر بیان کر کے چلا جائے تو کچھ شکایت نہیں ہوتی اور اگر کوئی گھر بیٹھے سارا قرآن ختم کر کر مردہ کو بخشدے ہرگز شکایت رفع نہیں ہوتی پھر ظاہر ہے جو لوگ اس برادری کی شکایت رفع کرنے کی نیت سے

آئے ہیں ان کے پڑھنے پڑھانے کا کیا ثواب ہو سکتا ہے۔ دوسری قسم کے لوگ وہ ہیں جو پیسوں اور چنوں کے واسطے آئے ہیں ان کی برائی یہی کافی ہے کہ ہمیشہ تمہارا مرنا مناتے ہیں جب کوئی کم تا پیتا پیدا ہوتا ہے یہ لوگ اس کی موت کا انتظار کرتے ہیں اور کیوں نہ کریں جبکہ ان کی وسعت اور فراغت اسی پر منحصر ہے یہ بھی صاف ظاہر ہے جو پیسوں اور چنوں کے واسطے آئے ہیں ان کے کلمہ کلام کا کیا ثواب ہوگا نہ دینے والوں کو نفع نہ لینے والے کو۔ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کے کلمہ سے کیا خوش ہونگے جو اس کے اسم مقدس کو ایک ایک چنے کے عوض میں بیچتے ہیں اللہ تعالیٰ کا نام دونوں عالم کی قیمت میں بھی ارزاں ہے۔ شعر

قیمت ہر دو عالم گفتیٔ ‏ ‏ ‏ نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز

حدیث شریف میں مذکور ہے کہ قیامت میں ایک گنہگار کے ۹۹ دفتر اعمال بد کے کھولے جائیں گے اور ہر دفتر اتنا بڑا ہوگا جہاں تک نظر پہنچے میزان رکھی ہوگی اور پلہ برائیوں کا جھک جائے گا وہ شخص نہایت مایوس ہوگا اللہ تعالیٰ فرمائیں گے اے شخص ہم تجھ پر ظلم نہیں کریں گے تیری ایک نیکی ہمارے پاس باقی ہے وہ عرض کرے گا اے باری تعالیٰ ان ۹۹ دفتروں کے سامنے ایک نیکی کیا کام دے گی حکم ہوگا تو اس کو لے تو جا اور وزن کرا وہ پرچہ لیکر میزان پر جائے گا اور وزن کرائیگا فوراً پلہ نیکیوں کا وزنی ہو کر جھک جائیگا اس پرچہ میں یہ کلمہ شہادت ہی لکھا ہوگا یہ اللہ تعالیٰ کے نام کی برکت ہے کہ قیامت رُکی ہوئی ہے لاتقوم القیامۃ حتی یقال اللہ اللہ اور دنیا میں بھی اس قاعدہ کی پابندی ہے جب رعایا باغی ہو جاتی ہے ان کے گھروں کو آگ لگا دی جاتی ہے اور عام سزا کا حکم دیا جاتا ہے اسی طرح سے صور پھونکا جائیگا۔ گویا اللہ کا نام تمام آسمان و زمین کی جان ہے ایسے عزیز نام کو ایک ایک چنے کی عوض میں بیچنا کیسی حماقت اور گستاخی ہے۔ اگر کوئی قرآن مجید کو اوپلے کے عوض میں بیچنے لگے تو کیا یہ کسی مسلمان کو ناگوار نہ ہوگا لیکن حقیقت میں یہ دونوں کام یکساں ہیں کیونکہ روپیہ پیسہ اللہ تعالیٰ کے نام مبارک کے مقابلہ میں اوپلے سے بھی حقیر ہے۔ اشعار

اللہ اللہ میکنی از بہر نان ؛ بے طمع پیش او اللہ راجواں + کہ گہے اللہ دمے میزنی ؛ از برائے مسکہ دوغے میزنی خلق راگیرم کہ بفریبی تمام ؛ در غلط اندازی تا ہر خاص و عام + کارہا باخلق آری جملہ راست ؛ باخدا تزویر و حیلہ کے رواست کارہا او راست باید داشتن ؛ رایت اخلاص و صدق افراشتن + اگر کوئی تمہارے سامنے پاخانہ پھرے اور پھر بغیر وضو کئے ہوئے نماز شروع کردے تو جیسے تم کو اس پر غصہ آئیگا اور منع کروگے

ایسے ہی علما جب قاعدہ قرآن پڑھتے دیکھتے ہیں تو منع کرتے ہیں اس پر قرآن شریف کی تعلیم کی اجرت کو قیاس نہ کرنا چاہیے کیونکہ وہ تو ضرورۃً اشاعت قرآن کے لیے جائز ہے اور یہاں ثواب مقصود ہے اور ثواب کی قیمت دونوں عالم بھی نہیں ہوسکتے لہذا تعلیم پر حق الخدمت کو تیجے کی قرآن خوانی پر قیاس کرنا قیاس مع الفارق ہے۔ اسی طرح ختم تراویح کے دن جو حافظ کو چندہ اکٹھا کر کر دیا جاتا ہے وہ بھی ناجائز ہے جہاں مشروط یا معروف ہو کیونکہ روپیہ کی طمع سے قرآن پڑھنا ہے ایسے پڑھنے کا ثواب کیا ہوسکتا ہے یہ غنیمت ہو اگر اس پر مواخذہ نہ ہو اور حافظ کا محض روپیہ کے واسطے پڑھنا ظاہر ہے کیونکہ ۱۵ رمضان کو اگر یہ معلوم ہو جاوے کہ کچھ نہ ملے گا تو حافظ صاحب ہرگز نہ پڑھیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ ان کو بھی محنت کی عوض میں دیا جاتا ہے تو کسی چکی پیسنے والی کو بلا لیا ہوتا اس سے نصف بلکہ چوتھائی پر راضی ہو جاتی اگر کوئی یہ کہے کہ صاحب بغیر اس کے کوئی حافظ نہیں ملتا تو میں یہ کہوں گا کہ ایسے حافظوں سے قرآن مجید سننے سے یہ بہتر ہے کہ کوئی الم ترکیف سے تراویح پڑھا دیا کرے یہ اول تو دین فروشی ہے اور دوسرے لوگوں پر دباؤ ڈال کر چندہ لیا جاتا ہے چندہ کی فہرست مجمع میں پیش کی جاتی ہے دوسروں کی دیکھا دیکھی کچھ لکھنا ہی پڑتا ہے بعد کو غیرت دلائی جاتی ہے میاں یہ تو تمھاری حیثیت کے خلاف ہے کم سے کم دو چند تو کر دیجیے طوعاً وکرہاً جب چاروں طرف سے زور ڈالا جاتا ہے بیچارہ کو بڑھانا پڑتا ہے۔ یہ رقم قطعاً حرام ہوتی ہے کیونکہ حلت عطایا میں طیب خاطر شرط ہے اول تو یہ وہ موقع تھا کہ خوشی سے دیا جاتا تب بھی لینا جائز نہ ہوتا اور اس پر اور ایک امر موجب حرمت مزید ہو گیا جب معلوم ہوا کہ ایسے کاموں سے میت کو ثواب نہیں ہوتا تو کس امید پر انسان اولاد کے واسطے اپنا ایمان خراب کرے جبکہ مرنے کے بعد ان سے کچھ بھی نفع نہ پہنچے اور اس کے اعمال اس پر سوار ہو جاویں ان کی قسمت میں اگر عیش ہے تو عیش ملیگا اگر مصیبت ہے مصیبت پہونچے گی غرض ان کی کیفیت کے بعد مرنے کے تم کو کچھ خبر نہ ہوگی۔ بعضے بڑھیوں کا مسئلہ ہے کہ اولاد اگر آرام سے ہوگی تو میری گور ٹھنڈی رہیگی یہ خبر نہیں کہ ٹھنڈک وہاں کچھ کام نہیں آسکتی۔ اولاد کا عیش و آرام قبر کے سانپ بچھوؤں اور آگ سے کچھ بھی ٹھنڈک نہیں پہونچا سکتا اگر مفید ہے تو اپنا عمل ہے اور موت کا یاد رکھنا جیسا کہ فرمایا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اکثروا ذکر ھادم اللذات کیا اس سے یہ مراد ہے کہ صرف موت کا نام لے لیا کرے بلکہ اگر اول سے آخر تک ساری حالت پیش آمدنی میں میں

مرتبہ غور کرلیا کرے تو شہید کا ثواب پائے بعض علماء نے لکھا ہے کہ موت کی تکلیف اس سے زیادہ ہے کہ چھ سو تلواریں ایک دم سے لگائی جائیں۔ ایک بال پکڑ کر دیکھو سارے جسم کو اس سے کیا نسبت ہے جب بال کے اکھڑنے سے ایسی تکلیف ہوتی ہے تو خیال میں آسکتا ہے کہ تمام جسم سے روح نکلنے میں کیسی تکلیف ہوتی ہوگی اور کوئی عذاب بھی نہ ہو تو صرف یہی تکلیف دنیا کے عیش تلخ کرنے کو کافی ہے۔ حضرت ابراہیم ادھمؒ کے ترک سلطنت کے بعد ایک وزیر آپ کے پاس حاضر ہوا اور عرض کیا کہ آپ نے ہم لوگوں کا دل توڑ دیا اگر سلطنت کے ساتھ درویشی کو جمع کیا جاتا تو کیا مضائقہ تھا آپ نے فرمایا بھائی فکر کے ساتھ کوئی کام نہیں ہوسکتا اگر تم مجھ کو ایک فکر سے چھوڑا سکو تو میں سلطنت کرلے کا وعدہ کرتا ہوں۔ وزیر نے خیال کیا کوئی دنیوی فکر ہوگی جس میں ہم لوگوں کی کوشش کارآمد ہوگی بہت خوشی سے کہا حضرت فرمایئے کیا فکر ہے آپنے فرمایا اللہ تعالیٰ قرآن میں فرماتا ہے فریقٌ فی الجنۃ وفریق فی السعیر مجھے اس امر کی فکر ہے کہ میں کس فریق میں ہوں گا۔ وزیر سنکر متحیر ہوگیا اور کچھ جواب نہ دیسکا منجملہ معتقدات کے منکر نکیر کا قبر میں آنا اور مردہ سے سوال کرنا ہے اگر جواب معقول نہیں ملتا تو نہایت سختی کرتے ہیں سر کو مونگری سے کوٹتے ہیں وہ ایسی مونگری ہے اگر پہاڑ پر پڑے تو ریزہ ریزہ کردے ایک اور فرشتہ اندھا اور بہرہ عذاب کے لئے مسلط ہوتا ہے اور قیامت تک عذاب ہوتا رہتا ہے پھر اس کا خیال کرے کہ قیامت میں زمین مثل گرم تابنہ کے ہوگی سب بیقرار ہونگے گرمی آفتاب سے بھیجے مثل ہانڈیوں کے پکتے ہوں گے کسی کو قرار و چین نہ ہوگا جب یہ واقعات پیش آنے والے ہیں تو کس خواب غفلت میں پڑے سو رہے ہو کیا معافی کا پروانہ آگیا ہے اگر اعمال صالحہ سے امید نجات ہے تو معاصی کی وجہ سے احتمال مواخذہ بھی ہے نہ معلوم نامۂ اعمال داہنے ہاتھ میں آئے یا بائیں میں۔ ایک بزرگ نے کہا ہے قیامت میں جس نے جو گناہ کیا ہوگا اس کی صورت نظر آئے گی مثلاً بدکار بدکاری کرتا ہوا نظر آئیگا چور چوری کرتا ہوا معلوم ہوگا۔ عقائد میں سے ایک یہ ہے کہ پل صراط پر گذر ہوگا ابرار سلامتی سے گذر جائیں گے کفار و فاسق کٹ کٹ کر گر پڑیں گے۔ شعر

چوں چنیں کار است اندر رہ ترا | خواب چوں می آید اے ابلہ ترا

یہ مراد نہیں ہے کہ سو مت بلکہ یہ کہ اس سے بے فکر نہ ہونا چاہیئے اس تفصیل سے جو موت کو یاد کریگا

اور بیس مرتبہ اس سے گناہ کبیرہ صادر ہو سکتے ہیں وہ تو ولی کامل ہو جائے گا۔ حکایت مشہور ہے
کہ ایک بادشاہ کسی درویش سے ملا کرتے تھے ایک مرتبہ جب چلنے لگے تو فقیر نے ایک گولی منگا کر
ان کو دی بادشاہ نے درویش کا تبرک سمجھ کر اس کو کھا لیا تھوڑی دیر کے بعد اس قدر غلبہ شہوت
ہوا کہ بے تاب ہو گئے تمام بیبیوں اور لونڈیوں سے صحبت کی لیکن پھر بھی چین نہ آیا دل میں خیال
کیا کہ مجھ کو ایک گولی سے یہ حالت پیش آئی شاہ صاحب دن میں کئی گولیاں کھاتے ہیں معلوم
ہوتا ہے بڑے بدکار ہوں گے درویش کو کشف سے بادشاہ کا خطرہ معلوم ہو گیا بعد کو جب
بادشاہ سے ملاقات ہوئی تو درویش نے کہا افسوس ہے کہ ایک چلہ میں شاید تمہارا انتقال ہو جائے
سنتے ہی سناٹا نکل گیا فوراً تخت سلطنت چھوڑ چھاڑ کر گوشہ عزلت اختیار کر لیا لڑکے کو ولیعہد
بنایا چلتے وقت درویش نے بہت سی گولیاں دیدی تھیں اور کہا تھا صبح شام ان میں سے ایک
ایک کھا لیا کرنا عبادت کی قوت رہے گی چنانچہ یہ روز ان میں سے دو گولیاں استعمال کرتے رہے
لیکن خبر بھی نہ ہوئی ایک دن کم ہوا اور دوسرا گذرا یہاں تک کہ چالیسواں دن آ پہونچا لیکن موت
کے متعلق آثار نہ معلوم ہوئے چالیس دن جب پورے گذر گئے تو بادشاہ درویش کے پاس پھر
حاضر ہوئے اور مدت گذرنے اور موت کے نہ آنے کا حال بیان کیا درویش نے کہا یہ تمہارے خطرہ کا
جواب تھا کہ یہ فقیر بڑا بدکار ہو گا۔ تمہیں تو چالیس دن کی مہلت تھی پھر بھی گولیوں سے تم پر کچھ
اثر نہ ہوا مجھ کو تو ایک ساعت کا بھی اطمینان نہیں۔ موت کی یاد میں یہ بھی داخل ہے کہ معاملات
کو صاف رکھے اپنے ذمہ میں لوگوں کے جو حقوق ہوں ان کی اطلاع اپنے عزیزوں کو کرتا رہے
تاکہ اگر کسی کو رحم آجائے تو اس کے بعد اس کو دَین سے بری کرا دے صاحب قرض کی روح
جنت میں نہیں جاتی بلکہ جب تک قرض ادا نہ ہو معلق رہتی ہے افسوس ہے کہ جن ماں باپ نے
اس کے واسطے اپنے ایمان کو فدا کر دیا ان کی روح کو یہ معلق رکھتا ہے درمختار میں ایک روایت
نقل کی ہے کہ ایک ایک دانگ کے عوض میں جو دو تین پیسہ کا ہوتا ہے سات سو نمازیں دلائی
جائیں گی آجکل تو لوگ اس کو بھی لازمۂ ریاست سمجھتے ہیں کہ کسی کا حق ٹال کر دیں مطل الغنی
ظلم اجارہ میں قبل شروع کرنے کام کے جانبین کی رضامندی شرط ہے بعد کو اپنی تجویز سے دیدینا
حرام ہے بلکہ حکام کو بازار کے نرخ میں دست اندازی شرعاً جائز نہیں ہے مالک کو اختیار ہے چاہے

جس نرخ سے فروخت کرے نرخ تو اللہ تعالیٰ ہی کی جانب سے ہے ان اللہ ھو القابض الباسط حقوق عباد ایسی سخت چیز ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے آخر وقت میں سب لوگوں کو جمع کر کر فرمایا کہ لوگو جس کسی کا مجھ پر کوئی حق ہو وہ آج مجھ سے لیلے یہ نہ چاہتا ہوں کہ قیامت میں مجھ پر دار و گیر ہو اگرچہ ظاہر میں معلوم ہوتا ہے کہ ہم نے کسی کا حق مار لیا لیکن حقیقت میں بہت ہی کم ظلم کا مال ہضم ہوتا ہے کسی پر کوئی مقدمہ قائم ہو گیا ہزاروں کے وارے نیارے ہو گئے کسی کو کوئی بیماری ایسی لگ جاتی ہے کہ دوا و ڈاکٹروں کی فیس میں گھر بک جاتا ہے کیا خوب کہا ہے۔ شعر

بترس از آہ مظلوماں کہ ہنگام دعا کردن — اجابت از در حق بہر استقبال می آید

آنچہ بر تو آید از ظلمات و غم — آں ز بیباکی و گستاخی است ہم

بعض مسلمان سود میں مبتلا ہیں بہت کم ایسے ہوں گے جو سود دینے سے بچے ہونگے جائداد کو رہن کرنے میں سود دیتے ہیں۔ بعض اوقات کسی نئی جائداد پر مائل ہو کر مکان کو و جائداد کو رہن کر دیتے ہیں اور برسوں سود دیتے رہتے ہیں جب سود دینے کی برائی سنتے ہیں تو اپنی مجبوری ظاہر کرتے ہیں توبہ نہیں کرتے ایسے لوگوں کے حال سے صاف ظاہر ہے کہ یہ لوگ تو موت کے خیال سے کوسوں بھاگے ہوں گے اگر موت کو قریب و یقینی سمجھتے تو کیوں اس طول امل و بلائے عظیم میں مبتلا ہوتے ایسے لوگوں کا بجز اس کے کوئی علاج نہیں کہ اس جائداد کو فوراً بیچکر قرضہ سے اپنی جان کو آزاد کریں ورنہ سود کا قصہ کبھی ختم نہیں ہو سکتا اگر کہیں سے روپیہ برسنے کی امید تھی تو خریداری ہی کو اتنے عرصہ تک ملتوی کرنا چاہیئے تھا جہاں تک تجربہ ہوا معلوم ہوا ہے کہ ایسے لوگ اکثر اپنی پہلی جائداد کو بھی کھو بیٹھتے ہیں سود لینے والے کو ستر گناہ ہوتے ہیں ان میں سے ادنیٰ یہ ہے کہ اپنی ماں سے برا کام کیا اور باقی ۶۹ اس سے زیادہ ہیں اور دینا اور لینا برابر ہے بقولہ علیہ السلام وھم سواءٌ" اگر مہاجن آپس میں یہ تجویز کریں کہ کسی مسلمان کو ہرگز روپیہ نہ دیا جائے تو کارروائی کی ہزاروں تجویزیں سمجھ میں آجاویں لیکن دین کی تو فکر ہی نہیں سوچے ہماری بلا! اگر چھوڑنے کا ارادہ کیا جائے تو سو باتیں نکل آئیں لیکن بعضے ان میں سے خلاف وضع ہوں گی پھر وضع ہی کو اختیار کر لو یا دین کو دنیا میں کوئی کسی پر عاشق ہو جاتا ہے تو کیا کیا ذلت گوارا کرتا ہے بر سر بازار جوتیاں کھانا گوارا ہوتی ہیں لیکن دوست کی گلی نہیں چھوٹتی اللہ تعالیٰ جوتیاں بھی نہیں لگاتے

محبت اور وضع داری جمع نہیں ہو سکتیں۔

اے دل آں بہ کہ خراب از مئے گلگوں باشی
بے زر و گنج بصد حشمت قاروں باشی

در رہِ منزل لیلیٰ کہ خطرہاست بجاں
شرط اول قدم آنست کہ مجنوں باشی

صاحبزادہ کی شادی میں اگر کہیں قرض نہ ملے تو آخری تجویز یہی ہوتی ہے کہ زمین زلیور بیچ کر کام کیا جاوے اور یہ سب بلا ضرورت برادری کی خوشی کے واسطے کیا جاتا ہے اللہ تعالیٰ کی رضامندی کے واسطے اگر یہ کام کیا جائے تو کیا بعید ہے جب ظاہراً کوئی امید ادائیگی کی بالفعل نہیں ہے کو کس امید پر زلیور مکان رہن کرتے ہو کوئی بزرگوں کے پاس آکر کہتا ہے صاحب ایسا تعویذ یا وظیفہ بتلایئے کہ قرض ادا ہو جائے۔ اس کی تو ایسی مثال ہے کوئی کہے صاحب ایسا تعویذ دیجئے کہ بیٹا ہو جائے لیکن نکاح نہ کروں گا تو پھر بیٹا کیا منہ سے جھڑے گا۔

چند امور ایسے عرض کرتا ہوں جن کا مرنے کے وقت خیال رکھنا چاہیئے ہماری حالت پر افسوس ہے کہ لوگوں کو مرنا بھی نہیں آتا۔ صحابہ سب لکھے پڑھے نہ تھے لیکن سمجھدار تھے یہ کیا مبارک شریعت ہے جس میں مرنے کے بھی قاعدے بتلائے گئے ہیں جب کوئی بیمار ہو تو اس کی عیادت کے واسطے جانا مسنون ہے کوئی ایسی بات نہ کہے جس سے مریض کو کسی قسم کا یاس ہو بلکہ امید کی بات کہے۔ اکثر عورتیں مریض کے پاس بیٹھ کر ایسی ناامیدی کے کلمات کہتی ہیں جس سے مریض کی دل شکنی ہوتی ہے خدا ہی کرے گا جو یہ بچا رہ جائیگا۔ شارع علیہ السلام نے جانوروں پر بھی رحم فرمایا اور حکم دیا کہ ایک جانور کے سامنے دوسرا نہ ذبح کیا جائے تاکہ اس کی دل شکنی نہ ہو بھلا انسان کا تو خیال کرنا چاہیئے کہ اس کا دل نہ دکھے جب ایسی ناامیدی کے کلمے اس کے سامنے کہے جائیں گے تو مریض کو ضرور اپنی جان کا اندیشہ ہو جائیگا۔ بلکہ ایسے الفاظ استعمال کرنے چاہئیں جس سے اس کو معلوم ہو کہ اب مرض بہت ہی خفیف ہے اور میں جلد اچھا ہو جاؤں گا۔

مسلمان کی دلداری بڑی عبادت ہے ہر امر میں اس کا لحاظ چاہیئے اس کی نسبت ایک کام کی بات عرض کرتا ہوں جس سے یہ امر سہل ہو جائے۔ دیکھو ہر شخص جانتا ہے کہ اولیا اللہ کی تعظیم ضروری ہے اور انھیں مسلمانوں میں اولیا بھی ہیں کسی کے ماتھے پر تو لکھا ہی نہیں ہر شخص کی نسبت یہی گمان کرے کہ شاید یہ اللہ کا ولی ہو یا آئندہ ہو جائے جب ایسا خیال کرے تو کیوں کسی کے دل کو دکھائے المسلم من سلم المسلمون من یدہٖ ولسانہٖ۔ جب کسی مریض سے مایوسی ہو جائے اور خود اس کی بھی توقع زیست نہ رہے تو آخری وقت میں ان باتوں کا خیال رہے۔ اس کے سامنے دنیا کی بات نہ کہی جائے کوئی بات ایسی نہ کہی جائے جس سے اس کی توجہ الی الحق میں فرق آوے جیسا کہ رواج ہے ایک طرف بی بی کھڑی کہہ رہی ہے مجھے کس پر چھوڑے چلے۔ کبھی بچوں کو اس کے سامنے لایا جاتا ہے تھوڑا سا وقت کلمہ کلام میں صرف کرتا وہ پیار و محبت میں جاتا ہے اس بات کی کوشش چاہیئے کہ خاتمہ تو خیر پر ہو جائے خود کسی بچہ وغیرہ کو سامنے مت لاؤ اگر دیکھنا چاہے تو فوراً دکھلا دو تاکہ اس کے خیال سے بھی جلد نجات ہو۔ اس کے سامنے اللہ کا نام لو کلمہ پڑھو توبہ استغفار پکار پکار کر کرو لیکن اس سے مت کہو اس مضمون کو اردو میں بھی کہو کہ اے اللہ میرے گناہ معاف فرما تاکہ وہ بھی سن کر کہنے لگے قرآن مجید خاص کر یٰسین شریف قریب پڑھی جائے۔ آجکل اس سورت سے جاہلوں کو بڑی وحشت ہوتی ہے بعضے برا مان جاتے ہیں اور نعوذ باللہ نا مبارک سمجھتے ہیں۔

اس پر ایک قصہ یاد آیا دہلی میں ایک ڈوم تراویح میں آتا تھا حافظ صاحب سے کہہ رکھا تھا کہ جس دن وہ سورت آوے جو مُردوں پر پڑھی جاتی ہے مجھے خبر کر دینا تاکہ میں اس روز نہ آؤں لوگ اس کو مذاق سمجھے ایک روز پوچھنے لگا حافظ صاحب وہ سورت کب آجاوے گی انھوں نے کہا وہ تو رات پڑھی گئی سنتے ہی نہایت غمگین ہوا اٹھ کر چلا گیا دوست آشناؤں سے ملا یہاں تک کہ تیسرے روز مر گیا۔ یہ سورت اس وقت کے واسطے اس لئے مقرر فرمائی گئی ہے کہ اس میں بعث و نشر کا ذکر ہے قیامت کے حالات ہیں اور آخر میں مبارک الفاظ بھی سبحان الذی بیدہٖ ملکوت کل شئ والیہ ترجعون ط نہایت مناسب ہیں تاکہ اس کے عقیدے تازے ہو جا دیں۔

(۳) جنت کا ذکر کرے اور دوزخ کا ذکر مردہ کے سامنے نہ کیا جائے اس میں ایک نکتہ ہے ایمان کے لئے دو چیزیں ضروری ہیں خوف و امید۔ خوف اس غرض سے کہ گناہوں کو چھوڑے اور اعمال صالحہ کی طرف متوجہ رہے۔ مرتے وقت اعمال کا موقع نہیں ڈرانے سے پھر کیا نتیجہ ہو سکتا ہے بجز اس کے کہ ناامید ہو کر بے ایمان مرے سبحان اللہ یہ شریعت کیسی معقول ہے اگر غور کیا جائے تو سب حکمتیں سمجھ میں آجائیں۔

(۴) قریب مرتے کے منہ قبلہ کی طرف کر دیں۔ اگر مردہ کے منہ سے کوئی کلمہ کفر کا نکلا ہو یا کلمہ سے انکار کیا ہو تب بھی غیبت نہ کریں کیونکہ وہ معاف ہے۔ جب بیماری میں معذور تھا تو اب تو بدرجہ اولیٰ ہونا چاہیئے اور قلب کی ہم کو خبر نہیں ہے۔ حضرت مرشدی حاجی صاحبؒ بیان فرماتے تھے کہ لوہاری میں ایک بزرگ تھے جب وہ مرنے لگے تو لوگوں نے کہا حضرت کلمہ پڑھیئے آپ نے منہ پھیر لیا۔ پھر کہا گیا۔ پھر آپ نے منہ پھیر لیا لوگوں کو نہایت حیرت ہوئی دل میں کہنے لگے اب کیا امید ہے کہ جب ایسا شیخ کامل کافر ہو کر مرے۔ میاں جی نور محمد صاحب تشریف لائے پوچھا خانصاحب کیسے ہو کہنے لگے الحمد للہ اور کہا حضرت ان لوگوں سے فرما دیجئے کہ مجھ کو دق نہ کریں یہ مجھ کو مسمٰی سے اسم کی طرف لاتے ہیں۔ شعر

دست بوسی چوں رسید از دست شاہ
پائے بوسی اندراں دم شرم گاہ

جب مشاہدہ ہو گیا پھر اسم کی کیا ضرورت ہے ایسے مقام پر تو یہ تنزل ہے۔ اگر موت میں سختی ہو اس سے بھی بدگمانی نہ کرنا چاہیئے۔ کیونکہ بعض روایات میں آیا ہے جب کسی بندہ کا درجہ بڑھانا منظور ہوتا ہے اور اس کے گناہ بہت ہوتے ہیں سکرات کی تکالیف میں مبتلا کیا جاتا ہے جس سے اس کے گناہوں کا کفارہ ہو جاتا ہے اور دنیا سے پاک و صاف ہو کر جاتا ہے ساری خرابیاں جہالت کی ہیں اگر علماء کی صحبت اختیار کریں تو ضروری باتیں سب معلوم ہو جا دیں لیکن لوگوں کو تو ہر وقت یہ خوف رہتا ہے کہ ایسا نہ ہو مولوی صاحب کچھ کہہ بیٹھیں میاں تمہاری

صورت خلاف شرع ہے، پاجامہ خلاف سنت ہے برخلاف اس کے اگر کوئی طبیب کہدے کہ میاں تم پر سوداویت کا غلبہ معلوم ہوتا ہے جلد اس کا علاج کرلو ایسا نہ ہو کہ مرض بڑھ جائے تو اس کو بڑی شفقت سمجھتے ہیں افسوس ایمان کو بدن کی برابر بھی عزیز نہیں رکھتے اگر ان لوگوں کو جسم کی برابر بھی ایمان کی محبت ہوتی تو مولویوں کی نصیحت پر برا نہ مانتے اوپر کی مثال سے معلوم ہوگیا ہوگا۔ مردہ پر تکالیف وغیرہ دیکھ بدگمانی نہ کریں بعض اوقات اولیاء اللہ کو خود اپنا حال نہیں معلوم ہوتا کہ میں کس درجہ کا ہوں اس میں بہت سی حکمتیں اور مصلحتیں ہوتی ہیں۔ بعض اوقات کسی نوکر کی خدمت تم کو پسند ہوتی ہے اور اس کو اپنے دل میں بہت محبوب و عزیز سمجھتے ہو لیکن اس کے سامنے اپنی توجہ و محبت کا اظہار نہیں کرتے ایسا نہ ہو کہ گستاخ ہو جائے اور کام میں بے پروائی کرنے لگے یہی معاملہ بعض لوگوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے۔ ایک بزرگ نجم الدین صاحب تھے ان کو اس کی نہایت تمنا و التجا تھی کہ کسی طرح یہ معلوم ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک میرا کیا مقام ہے ایک مرتبہ ان کے ایک مرید ان کی اجازت سے کسی دوسرے بزرگ کی زیارت کو گئے انھوں نے دریافت کیا کہو بھائی تمھارے یہودی پیر اچھے ہیں انھوں نے اس وقت بہت ضبط کیا جب واپس آئے تو پیر نے پوچھا کہ وہاں گئے تھے کہا حضرت گیا تو تھا مگر وہ تو بڑے ہی گستاخ و بے ہودہ معلوم ہوتے ہیں، انھوں نے کہا کیا معاملہ ہوا کہنے لگے حضرت آپ کی شان میں ایسی گستاخی کی جس سے مجھ کو بہت رنج ہوا۔ پیر نے کہا کیا کہا اصرار کے بعد کہا حضرت انھوں نے آپ کو اس طرح پوچھا کہ تمہارے یہودی پیر اچھے ہیں۔ پیر کو یہ سنتے ہی حالت وجد طاری ہوگئی۔ یہ ایک رمز تھا دونوں بزرگوں کے درمیان انھوں نے یہ خبر کی تھی کہ تم کو نسبت موسوی حاصل ہے لیکن یہ نسبتیں بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ حاصل ہوئی ہیں آپ ہی کی ذات مبارک سے فیض آیا ہے۔ بعض اوقات جن کی یہ نسبت ہوتی ہے موسیٰ علیہ السّلام کا نام لے کر مرتے ہیں۔

در نیابد حال پختہ ہیچ خام   پس سخن کوتاہ باید والسلام

ایک اس بات کا خیال چاہیے کہ بعد مرنے کے اس کی تعریف کریں۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ ایک جنازہ گذرا لوگوں نے اس کی تعریف کی آپ ﷺ نے فرمایا وجبت دوسرا ایک اور جنازہ گذرا تو لوگوں نے اس کی برائی کی آپؐ نے فرمایا وجبت صحابہ نے عرض کیا حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس سے آپ کی کیا مراد تھی۔ آپ نے فرمایا جسکی تمنے تعریف کی اس کے واسطے جنت واجب ہوگئی اور جس کی تمنے برائی کی اس پر دوزخ واجب ہوگئی انتم شهداء الله فی الارض۔

مکہ معظمہ میں اب بھی یہ دستور ہے جب بازار میں سے کوئی جنازہ نکلتا ہے سب دکاندار کھڑے ہو جاتے ہیں اور کہتے ہیں بڑا اچھا آدمی تھا۔ آخر معدن دین اور معدن الاسلام ہے۔ یہاں لوگ کفار کی رسموں کی تقلید کرتے ہیں اور ہر امر میں ان سے فیض حاصل کرتے ہیں ہندوؤں کی رسمیں ہندوؤں کے عقیدے اختیار کرتے ہیں۔ چیچک میں گوشت سے پرہیز کرتے ہیں۔ بعض جگہ شادی کی تاریخیں پنڈتوں سے پوچھی جاتی ہیں بعض جگہ لباس ہندوؤں کا استعمال کرتے ہیں۔ بجائے لنگی کے دھوتیاں باندھتے ہیں برتن ہندوؤں کے برتتے ہیں نام ہندوؤں کے سے رکھتے ہیں۔

جو زیادہ تہذیب و تعلیم کے مدعی ہیں وہ اپنی شان کے مناسب نصاریٰ کی وضع اختیار کرتے ہیں کھانے میں چھری کانٹے استعمال کئے جاتے ہیں گویا اپنے انجام کی خبر دیتے ہیں کہ ہم چھریوں اور کانٹوں کے عذاب کے مستحق ہیں۔ لباس میں کوٹ پتلون کو پسند کرتے ہیں۔ ایسے ایک شخص ایک مرتبہ میرے پاس تشریف لائے تھے کوئی کرسی وغیرہ نہ تھی بہت دیر تک کھڑے رہے جب زیادہ دیر ہوئی اور بیٹھنے پر اصرار ہوا تو ایک دفعہ اپنے بدن کو تول کر بھد سے گر گئے۔ چونکہ اجسام ثقیل کا میلان مرکز کی طرف ہوتا ہے اس وجہ سے گرنا تو سہل ہوا لیکن اٹھنے میں بے چاروں پر مصیبت ہوگئی۔ انگریزجن کا لباس ہے ان کو اس کی کچھ ضرورت نہیں ہوتی ہے۔ مزاج ان کے گرم ہیں اس وجہ سے جنگلوں میں رہنا پسند کرتے ہیں حفاظت کے لئے کتے رکھتے ہیں بھلا ہم لوگوں کو کتوں کی کیا ضرورت ہے بجز

اس کے کہ ایک شان سمجھی جائے۔ اور حاکم وقت کی تقلید ہے۔

ایک شخص ریل میں کتا لئے ہوئے بیٹھے تھے اور ظاہرا وضع بھی ایسی نہ تھی جس سے مسلمان سمجھے جاتے۔ ایک دوسرے صاحب گئے تو آپ نے شکایت کی کہ آپ نے سنت سلام سے کیوں پرہیز کیا انھوں نے یہ عذر کیا کہ حضرت میں نے مسلمان نہیں سمجھا تھا کہنے لگے کیا اسلام صرف وضع سے معلوم ہوتا ہے اور کہنے لگے میں نے سنا ہے حدیث شریف میں مذکور ہے کہ جہاں کتا ہوتا ہے وہاں فرشتے نہیں آتے پس یہ خیال کر کر کہ جب تک کتا میرے پاس رہے گا موت کا فرشتہ نہیں آنے کا میں نے کتا رکھنا اختیار کیا ہے۔ انھوں نے کہا جناب کتے بھی تو مرتے ہیں جو فرشتہ کتے کی جان نکالے گا وہی آپ کے واسطے بھی کافی ہوگا۔ کتے کی موت مر گئے۔

حکایت:۔ ایک بزرگ کے زمانے میں کوئی کفن چور مشہور تھا اور وہ ان کا عقیدت مند بھی تھا۔ ایک روز ان بزرگ نے چور سے کہا کہ تم ہمارا کفن بھی کیوں چھوڑو گے۔ کہنے لگا حضرت آپ کیا فرماتے ہیں آپ کے ساتھ ایسی گستاخی کر کے کہاں رہوں گا۔ درویش نے کہا تمھارا کچھ اعتبار نہیں مجھ کو اطمینان نہیں ہو سکتا۔ چور نے کہا آخر آپ کو کس طرح اطمینان ہو کہا مجھ سے پانچ روپے لے لو۔ اس نے کہا آپ کے اطمینان کے لئے یہی صحیح۔ ایک روز درویش صاحب کا انتقال ہو گیا اور کفن چور اپنی حسب عادت کفن کی فکر میں گئے جب ہی اندر ہاتھ بڑھایا انھوں نے ہاتھ پکڑ لیا اور کہا کیوں صاحب یہی ٹھہری تھی۔

اولیاء اللہ سے شاذو نادر ایسی باتیں وقوع میں آئی ہیں۔ عقیدے نہ خراب کرنے چاہئیں۔ ہاتھ پکڑتے ہی کفن چور فوراً ڈر کر مر گیا۔ بزرگ اپنے ایک خلیفہ کو خواب میں نظر آئے۔ اور یہ سب قصہ بیان کیا کہ وہ

بد عہد آیا تھا دیکھو ہم سے روپیہ بھی لے چکا تھا لیکن پھر بھی اپنی حرکت سے باز آیا۔ ہم نے تو ہنسی سے اس کا ہاتھ پکڑا تھا لیکن وہ ایسا بزدل تھا کہ مر ہی گیا ہمیں تو محض اسے مطلع کرنا تھا کفن کا کچھ ایسا خیال نہ تھا۔

عریاں ہی دفن کرنا تھا زیر زمیں مجھے
ایک دوستوں نے اور لگا دی کفن کی شاخ

خلیفہ کو حکم دیا کہ تم اس کی تجہیز و تکفین کرو اور میرے پاس دفن کرنا۔ مجھے ہاتھ پکڑنے کی لاج ہے میں اس کے واسطے بخشش طلب کروں گا۔ بزرگوں سے تعلق رکھنے کا یہ نفع ہے۔

ایک ضروری امر یہ ہے کہ کفن دفن میں دیر نہ کی جائے اس میں گوشت و پوست بگڑ جانے کا احتمال ہے۔ بدبو سے آب و ہوا کے خراب ہونیکا بھی اندیشہ ہے۔ شریعت نے ان امور پر کیسی توجہ فرمائی ہے۔ کیسی پردہ داری ہے اگر اولاد ماں باپ کو ایسی بڑی حالت میں اپنی آنکھوں سے دیکھے گی تو اس کو کیسا صدمہ ہوگا یا نفرت ہو جائے گی۔ بعض اوقات کوئی ایسا مادہ ہوتا ہے جس کے اثر سے خراب بدبو آ جاتی ہے۔ بعض لاش کو دوسری جگہ لے جاتے ہیں اس خیال سے کہ ماں باپ کے پاس دفن کریں گے، کیا وہاں بھی ماں کا دودھ پیئے گا۔ اگر منع کیا جائے تو سختی سمجھتے ہیں حالانکہ حدیث شریف میں ہے مومن کے واسطے گھر سے اس کی قبر تک فرشتے دعا و استغفار کرتے ہیں اس سے ظاہر ہے کہ جس قدر زیادہ فاصلہ ہوگا اس کی رحمت کا سامان ہے یہ بڑی نادانی ہے۔ خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی مصلحتوں میں دخل دینا اگر کوئی باورچی کھانا پکاتا ہے توکوئی اس کے کام میں دخل نہیں دیتا۔ اگر انجینئر کسی اچھے خاصے مکان کے گرانے کا حکم دے تو فوراً اگر لاکھ روپیہ کا مکان ہو گرا دیا جاتا ہے۔ نہ معلوم اللہ اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے کاموں میں دخل

دینے کی کیوں جرأت کی جاتی ہے یہ رب کو معلوم ہے کہ انسان کی خلقت خاک ہے اور زمین اس کی اصل ہے اس لئے جہاں تک جلد ممکن ہو سکے اصل میں پہنچا دو۔ کیا بری رسم ہے کہ مردوں کو عورتوں کے اختیار میں چھوڑ دیتے ہیں عورتوں کو ان امور میں ہرگز دخل نہ دینے دو ان کو رونے چھیکنے دو۔ عاقل مردوں کو جمع کرو۔ بعد مرنے کے فوراً اہتمام تجہیز و تکفین شروع کر دو۔ جب لیکر چلو تو جلدی چلو حدیث شریف میں ہے مُردوں کو جلد قبر کی طرف لے چلو اگر نیک ہے تو اس کی راحت کی طرف جلد لیجاؤ اگر بد ہے تو جلد اپنی گردنوں کو اس سے چھوڑاؤ۔ اگر اچھا ہے تو انعام و اکرام کی طرف لیجاتے ہو جیسے پیاسے کو پانی کے پاس دار الظلمت جس کو سمجھے ہوئے ہو وہ مومن کے لئے بڑی نورانی ہے۔ ایک روز شاہ اکبر کی رات میں آنکھ کھل گئی چراغ گل ہو گیا تھا بہت گھبرائے قبر یاد آئی فوراً چراغ روشن کرایا، بیربل کو بلایا اور کہا کہ اس اندھیرے کو دیکھ کر مجھ کو قبر کی تاریکی یاد آئی جس سے نہایت وحشت ہے۔ خدا نے دشمن کے منہ سے سچی بات نکلوا دی اس نے کہا حضور مسلمانوں کی قبر میں اندھیرا ہی نہیں۔ آپ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ۲۳ سال کی روشنی جیسے آب و تاب کے ساتھ اب تک قائم ہے اسی طرح جب آپ زیر زمین تشریف لے گئے ہیں وہی روشنی زیر زمین موجود ہے جس سے مسلمانوں کی قبریں روشن اور نورانی ہو جاتی ہیں۔ اگرچہ یہ بات اس نے خوشامد میں کہی لیکن سچی کہی فی الحقیقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک ایسی ہی ہے جس سے قبر میں روشنی ہوتی ہے۔ مُردے سے جب فرشتے پوچھتے ہیں من ھذا الرجل مومن جواب میں کہتا ہے یہ ہمارے نبی علیہ السلام ہیں۔ نور ایمان سے اس جواب کی توفیق ہوتی ہے۔ یا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے روضۂ مبارک سے اس کی قبر تک پردے اٹھ جاتے ہیں اور یہ صورت مبارک کو دیکھ لیتا ہے۔ اس طرح زیارت کی امید پر مسلمانوں کو موت کی تمنا بھی جائز ہے کسی نے شوق میں کیا خوب کہا ہے ؎

کشتئے کہ عشق دارد نہ گذاردت بدینساں — بجنازہ گر نیائی بمزار خواہی آمد

ایک خراب رسم موت کے متعلق یہ ہے کہ موت کی خبر دور دراز تک دی جاتی ہے باہر سے لوگوں کی آمد شروع ہو جاتی ہے گھر والے کو مہمانداری کی فکر میں ایک دوسری مصیبت پیش آتی ہے آٹے پسوائے جاتے ہیں دالیں دلوائے جاتے ہیں شادی کی طرح جلسہ کا اہتمام کیا جاتا ہے اور مہمانوں کی آسائش کی فکر کیجاتی ہے

اس سے سمجھدار شخص خیال کرسکتا ہے کہ اس طرح لوگوں کے آنے سے اس مصیبت زدہ کا غم غلط ہوتا ہے یا اور بلا کا سامنا ہے یتیم و بیوہ کا مال اس طرح برباد ہوتا ہے اس کی اصلاح یوں ہو سکتی ہے کہ عزیز اقارب کو موت کی اطلاع دی جائے اور ساتھ ہی اس میں یہ بھی لکھدیا جائے کہ تم ہرگز یہاں کا ارادہ نہ کرنا ہمنے مولویوں سے ممانعت سنی ہے جانے والا تو رسم ادا کرنے کو جاتا ہے ورنہ بعد مرجانیکے اس کے ہاں جانے کی اب کیا حاجت ہے اس کو سنکر خوش ہو جائیگا کہ ایک دردسری گئی اگر بالفرض ناراض بھی ہوگا تو مضائقہ نہیں خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا رضامند کرنا مقدم ہے یہ نہیں ہوسکتا کہ مخلوق بھی خوش رہے اور اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کی پوری تعمیل ہو جائے۔ اگر اللہ سے کچھ تعلق ہے تو کوئی دقت و دشواری نہیں دنیا میں اگر کوئی کسی پر عاشق ہوجاتا ہے تو اس کی رضا کے مقابلہ میں کسی کے ملامت و فضیحت کی پرواہ نہیں کرتا اگر اس محبت میں یہ امور پیش آویں تو کیا عجب ہے۔ ایک رسم یہ ہے کہ مُردے کے ساتھ ناج وغیرہ قبر پر لیجاتے ہیں اس میں اظہار و نمود کی نیت ہوتی ہے۔ اگر کوئی اس نیت کا اظہار کرے تو اس سے پوچھا جائے کہ اگر صرف ایصال ثواب مقصود تھا تو قبر تک لیجانے کے کیا ضرورت تھی ایسے طریقے اختیار کرنے چاہئیں تھے جس سے ثواب زیادہ ہوتا صدقات میں سب جانتے ہیں کہ اخفا بہتر ہے۔ باوجود انکار کے منکرین کے دل اپنی نیتوں سے خوب واقف ہوں گے یہ اناج مردے کے واسطے ہوتا ہے یا برادری کے خوف سے اور ملامت سے بچنے کے لئے اس طریقہ کو بالکل چھوڑ دینا چاہئیے اور ہرگز کسی ملامت گر کی ملامت کا خوف نہ کرنا چاہیئے اس کا ہرگز انتظار نہ کرنا چاہیئے کہ پہلے کوئی دوسرا کرے۔ برادری کے برا کہنے کا خوف ہے اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی خفگی کا خیال نہیں ہمت کرو ان رسوم کفار کو چھوڑ دو۔ اس میں تمھارے دین و دنیا کی سلامتی ہے۔ ایصال ثواب سے منع نہیں کیا جاتا لیکن اس میں نیت اظہار و نمود نہ ہو بالخصوص غریبوں کو احکام شریعت پر زیادہ توجہ سے عمل کرنے کی ضرورت ہے کیونکہ امیر تو اپنے غم میں یہاں کچھ عیش بھی اٹھاتے ہیں اور تمھاری سب امیدیں آخرت پر ہی منحصر ہیں تو کیسے افسوس و حسرت کا سبب ہوگا اگر تم اپنی حرکتوں سے آخرت بھی برباد کردوگے۔

تمہید وعظ عُودُ العید

(بضم عین عُود)

بعد الحمد والصلوٰۃ یہ احقر مدعا طراز ہے کہ جس روز اس تقریر کے بیان کرنے کا ارادہ تھا اتفاق سے کوئی ضبط کرنے والا نہ تھا اور باوجود گنجائش زمانہ کے بعض مشاغل کی تنگی تاخیر کی اجازت دیتی نہ تھی اس لئے خود احقر نے اس کو قبل بیان بہت مختصر ضبط کر لیا اور وعظ کے وقت اسی کو کسیقدر بسط کے ساتھ بیان کر دیا اجزاء ما بہ البسط چونکہ اصل تقریر کے درجہ میں ضروری نہ تھا اس لئے ان کا ضبط نہ ہونا مضر نہیں سمجھا گیا بس اسی تحریر شدہ تقریر کو داخل مواعظ کیا جاتا ہے گو اور وعظوں سے صورۃً یہ بہت چھوٹا ہو گا لیکن مَاقَلَّ وَدَلَّ (کلام مختصر مطالب کثیر) کا مصداق ہونے سے معناً یہ کسی سے چھوٹا نہیں۔

کتبہ: اشرف علی عفی عنہ

۲۷ ذی قعدہ ۱۳۳۵ھ۔ مقام تھانہ بھون

سلسلۃ التبلیغ کا وعظ مسمّٰی بہ

عُودُ العِید

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

الحمد للّٰہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللّٰہ من شرور انفسنا ومن سیاٰت اعمالنا من یھدہ اللّٰہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الہ الا اللّٰہ وحدہ لا شریک لہ ونشھد ان سیدنا ومولانا محمدًا عبدہ ورسولہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم اما بعد فقد قال اللّٰہ تعالیٰ لَنْ یَّنَالَ اللّٰہَ لُحُوْمُھَا وَلَا دِمَآؤُھَا وَلٰکِنْ یَّنَالُہُ التَّقْوٰی مِنْکُمْ کَذٰلِکَ سَخَّرَھَا لَکُمْ لِتُکَبِّرُوا اللّٰہَ عَلٰی مَا

هَدٰکُمْ وَبَشِّرِ الْمُحْسِنِیْنَ ۔ (ترجمہ) اللہ تعالیٰ کے پاس نہ ان کا گوشت پہنچتا ہے نہ خون ان کا لیکن اس کے پاس تمہارا تقویٰ پہنچتا ہے اسیطرح اللہ تعالےٰ نے ان جانوروں کو تمہارا زیرِ حکم کردیا ہے تاکہ تم اس بات پر اللہ کی بڑائی کرو کہ اس نے تم کو توفیق دی اور اخلاص والوں کو خوشخبری سنا دیجئے ۔

اس آیت میں کچھ مضمون قربانی کے متعلق مذکور ہے قرب ذی الحجہ کے سبب اس بیان کو اختیار کیا جاتا ہے کہ سامعین ابھی سے اس کے اہتمام کے لئے آمادہ ہوجاویں۔ حاصل اس آیت کا قربانی کی بعضی غایتوں اور حکمتوں کا بیان فرمانا ہے اور گو آیت موقع ذکرِ حج میں وارد ہے۔ مگر خود ان حکمتوں کے بیان میں تخصیص حج کی مقصود نہیں گو حج کو بھی شامل ہے اور حاصل ان حکمتوں کے دو امر ہیں ایک امر باطنی ایک امر ظاہری امر باطنی نیت تقرب واخلاص ہے جس کو ایک عنوان عام یعنی تقویٰ سے تعبیر فرمایا ہے کہ یہ دونوں یعنی نیت تقرب واخلاص اس کے اعلیٰ شعبوں سے ہیں اور باطنی ہونا اس کا ظاہر ہے مشاہدہ بھی ہے کہ فعل قلب ہے اور حدیث میں بھی ہے اِنَّ التَّقْوٰی ھٰھُنَا وَاَشَارَ اِلٰی صَدْرِہٖ (تقویٰ اس جگہ ہے آپ نے اپنے سینہ کی طرف اشارہ فرمایا) اس کی مقصودیت کو اوپر کی آیتوں میں تعظیم شعائر سے کہ وہ بھی امر مبطن ہے اور اس آیت میں اس عنوان سے بیان فرمایا ہے لَنْ یَّنَالَ اللہَ لُحُوْمُھَا الخ (اللہ تعالےٰ کے پاس ان کا گوشت نہیں پہنچتا) اور امر ظاہری ذبح کے وقت اللہ تعالیٰ کا نام لینا جس کو اوپر کی آیتوں میں لِیَذْکُرُوا اسْمَ اللہِ عَلٰی مَارَزَقَھُمْ مِّنْ بَھِیْمَۃِ الْاَنْعَامِ (تاکہ وہ ان مخصوص چوپاؤں پر اللہ کا نام لیں جو اس نے ان کو عطا فرمائے ہیں) سے اور اس آیت میں لِتُکَبِّرُوا اللہَ (تاکہ تم اس بات پر اللہ کی بڑائی بیان کرو) سے تعبیر فرمایا ہے اور یہ امر ظاہری یعنی ذکر اسم اللہ اور تکبیر اللہ اسی امر باطنی یعنی تعظیم بالقلب و نیت تقرب واخلاص کا ترجمان ہے یعنی اسی لئے موضوع ہے کہ اس سے اُس کا اظہار ہو پس ان میں باہم دال ومدلول کا سا تعلق ہے پس ان میں حقیقی اتحاد اور اعتباری تغایر ہے اس اعتبار سے یہ دونوں حکمتیں ایک ہی حکمت ہیں اور ہرچند کہ ظاہراً عَلٰی مَا ھَدٰکُمْ (اس بات پر کہ تم کو ہدایت کی) مطلق ہدایت کو شامل ہے لیکن خصوصیت مقام و نقل عن اہل التفسیر سے اس کی تفسیر خاص یہ ہے

عَلٰی مَا ھَدٰ ىكُمْ مِنَ الَّتِیْ مُجِ اللّٰہِ تَعَالٰی (اس بات پر کہ تم کو اللہ کے لئے ذبح کرنے کی توفیق دی) جس کا حاصل یہ ہے کہ تم اس بات پر اللہ تعالیٰ کی بڑائی کرو یعنی ذبیحہ پر اللہ اکبر کہو کہ اس نے تم کو اس فعل موجب تقرب کی توفیق دی چنانچہ اگر وہ توفیق نہ دیتے تو ممکن ہے کہ بعض کی طرح تم ذبح ہی میں شبہات نکال لیتے یا ذبح کرتے مگر غیر اللہ کے نام یا اللہ ہی کے نام پر ذبح کرتے یا نیت درست نہ ہوتی یا تو بالکل اخلاص نہ ہوتا یا کامل نہ ہوتا جیسے بعض لوگ ردی جانور ذبح کرتے ہیں جو علامت ہے محبت کی کمی کی اور جس قدر محبت کم ہوگی اسی قدر اخلاص کم ہوتا ہے کیونکہ اس میں آمیزش ہوگی غیر کی محبت کی اور اس غیر کو من وجہ مقصود سمجھنے کی مثلاً مال اگر اس کو مقصود نہ ہوتا تو ردی کیوں ڈھونڈھتا غرض یہ عمل اخلاص کے ساتھ کرنا توفیق ہی پر موقوف ہے پس اس توفیق پر تم حق تعالیٰ کی دل سے بھی تعظیم کرو اور زبان سے بھی اللہ اکبر کہہ کر اس کا اظہار کرو پس یہ تفسیر ہے عَلٰی مَا ھَدٰىكُمْ (اس بات پر کہ اس نے تم کو توفیق دی) کی اور اسی تعظیم و تکبیر کی مقصودیت کا اس سے بھی پتہ چلتا ہے کہ ان ایام میں دوسرے طرق سے یہ تکبیر مشروع ہوئی ہے چنانچہ ایک تو عید کا دوگانہ مقرر کیا گیا جس میں ایک تو تکبیرات انتقالات مشترک تکبیریں ہیں یعنی جیسی اور نمازوں میں ہیں اور ان کے علاوہ تکبیرات زائدہ بھی ہیں جن کا عدد ائمہ کے نزدیک مختلف ہے امام صاحب کے نزدیک چھ تکبیریں ہیں جو نماز کی گیارہ تکبیروں کے ساتھ مل کر سترہ ہوتی ہیں جو رکعات فرائض کے برابر ہونے سے ایک مہتم بالشان عدد ہے اور دوسرا طریق اس کی مشروعیت کا یہ ہوا کہ یوم عرفہ کے شروع سے ایام تشریق کے خاتمہ تک ہر نماز کے بعد باواز بلند تکبیر کہی جاتی ہے تیسرا طریق یہ ہے کہ عیدگاہ کے راستہ میں بھی کہی جاتی ہے اور اس تکبیر کے اشتراک سے ذبح اور صلوٰۃ کا جو باہمی تناسب معلوم ہوتا ہے مولانا رومی کے ارشاد میں اس کی تصریح بھی ہے ؂

معنی تکبیر این ست اے امیم کای خدا پیش تو ما قرباں شدیم
وقت ذبح اللہ اکبر میکنی ہمچنیں در ذبح نفس کشتنی
گوی اللہ اکبر وایں شوم را سر ببر تا وارہد جاں از عنا
تن چو اسمٰعیل و جاں ہمچو خلیل کرد جاں تکبیر بر جسم نبیل

ہمچو اسمٰعیل پیشش سربنہ شاد و خنداں پیش تیغش جاں بدہ

(تکبیر کی حقیقت یہ ہے کہ اے خدا تمھارے سامنے قربان ہوتے ہیں ذبح کے وقت تو تکبیر کہتا ہے ایسے ذبح نفس کے وقت جو مارنے کے لائق ہے اللہ اکبر کہو اور اس منحوس کا سر کاٹ اور جان کو تکلیف سے رہائی دے مثل تن اسمٰعیلؑ کے اور جان مانند خلیل اللہؑ کے کی جان نے تکبیر بر رگ جسم پر مانند اسمٰعیلؑ اپنا سر اس محبوب حقیقی کے سامنے رکھ اور ہنسی خوشی اسکی تلوار کے سامنے جان دے) اور اگر لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ (تاکہ اللہ کی بڑائی بیان کرو) کو جو کہ آیت میں مذکور ہے ان سب تکبیرات صلوٰتیہ وغیر صلوٰتیہ کے لئے عام لیا جاوے جیسا کہ وَاذْكُرُوا اللّٰهَ فِيٓ اَيَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ (اور چند دن اللہ تعالیٰ کا ذکر کرو) میں ان ایام کے سب اذکار و تکبیرات بالاجماع مراد ہیں تو تقریر آیت کی اس طرح ہوگی کہ تسخیر انعام اس لئے ہوئی کہ ہمکو تکبیر مقصود ہے چنانچہ ہم نے دوسرے طرق سے اس تکبیر کو مشروع فرمایا ہے جو علامت ہے اس کے مقصود ہونے کی اور اس تسخیر للذبح سے یہ مقصود حاصل ہوتا ہے اس لئے اس مقصود کی تحصیل کے لئے ہم نے انعام (چوپائے) کو مسخر کر دیا پس آیت ہی مشتمل ہو جاوے گی۔ ان ایام کی تمام طاعات کو قربانی کو بھی تکبیرات غیر صلوٰتیہ کو بھی اور صلوٰۃ کو بھی جیسا کہ اس کی ردیف یعنی عید الفطر کی نماز کو بعض مفسرین نے سورۂ بقرہ کی آیت شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ الخ (رمضان کا ایسا مہینہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا) میں جو ایسا ہی ایک جملہ یعنی لتکبروا اللہ علیٰ ما ھدٰىكُمْ (تاکہ تم اللہ کی بڑائی بیان کرو اس بات پر کہ اس نے تم کو توفیق) واقع ہے اس کا مدلول تفسیری کہا ہے پس ادھر ان دونوں یوم کے بعض احکام کا اشتراک اور ادھر ان دونوں میں اس جملہ کا اشتراک اور پھر جملہ سورۂ بقرہ کا مفسر بصلوٰۃ العید ہونا اس جملۂ سورۂ حج کے مشتمل لصلوٰۃ العید ہونے کو قریب کئے دیتا ہے پس اس تقریر پر یہ آیت مشتمل ہوگی ان ایام کی دو قسم کی طاعت کو ایک باطن جس کی یہ تعبیریں ہیں نیت تقربؔ اخلاص و تعظیم بالقلب اور ایک ظاہر جس کی یہ تعبیریں ہیں صلوٰۃ، تکبیرات تسمیہ علی الذبیحہ (ذبیحہ پر بسم اللہ پڑھنا) پس سامعین کو ان ایام میں دونوں امر کی رعایت ضروری ہے نہ صرف ظاہر پر کفایت کریں کہ قربانی اور نماز کا نام کر لیا اور بس اور نہ مدعیان کاذب کی طرح نرے باطن پر کفایت کریں کہ اخلاص ہی اصل ہے اور ہم

اس اصل کو لئے ہوئے ہیں کہ یہ اعتقاد نری گمراہی ہے وعظ روح الارواح اس جامعیت کی ضرورت کے بیان میں قابل ملاحظہ ہے اور خود قرآن ہی کیسا اس میں واضح ہے کہ آیت میں دونوں امر سے تنصیصاً تعرض ہے اللہ تعالیٰ ہم سب کو فہم سلیم اور دونوں طاعتوں کے جمع کی توفیق دے۔ اب میں اس تقریر کو ختم کرتا ہوں اور اس کا نام عُودُ العید رکھتا ہوں اس لئے کہ عُود کے دو معنے ہیں ایک خوشبوئے خاص دوسرے ساز خاص اور چونکہ یہ تقریر مشتمل ہے دو طاعت کے بیان میں ایک ذبح جس میں اراقۃ دم (خون بہانا) ہوتا ہے اور یہ دم فی سبیل اللہ ہے اور بعض دمار فی سبیل اللہ کی نسبت حدیث میں ہے لَوْنُہٗ لَوْنُ الدَّمِ وَرِیْحُہٗ رِیْحُ الْمِسْکِ (اس کا رنگ خون کا رنگ ہے اور اس کی بو مشک کی بو ہے)۔ پس اس دم ذبیحہ کو بھی مشابہت دم شہید کے سبب حکماً خوشبو دار قرار دے کر عود سوختنی سے تشبیہ دی گئی اور عود سے یہ مناسبت سمجھی گئی کہ ایک تو عود کو آگ سے مناسبت ہے اور دم طحال وکبد ولحم ذبیحہ کو بھی بوجہ پکائے جانے کے آگ سے تلبس ہے دوسرے اس عمل کی جزا جنت میں ہے اور جنت میں عُود کا سلگنا حدیثوں میں آیا ہے سو طاعۃ اراقہ کو تو عُود کے ایک معنے سے مناسبت ہوئی دوسری طاعت یعنی تکبیر صلوٰتیہ یا غیر صلوٰتیہ اس کو جہر کے سبب عود کے دوسرے معنے سے مناسبت ہوئی دوسری طاعت یعنی تکبیر صلوتیہ یا غیر صلوٰتیہ اس کو جہر کے سبب عود کے دوسرے معنے سے مناسبت ہے اس لئے ان معانی کی رعایت سے اس کا یہ نام مناسب ہوا نیز لفظی لطافت اس نام میں یہ ہے کہ اس کے متصل والی عید الفطر کے متعلق جو بیان ہوا تھا اس بیان کا نام عَوْدُ العِیْد[1] رکھا گیا ایک حرکت کی تبدیلی کے بعد گویا وہی نام اس کا ہو گیا اور اس میں یہ شبہ نہ کیا جاوے کہ عُود تو آلات محرمہ سے ہے طاعت کو اس سے تشبیہ دینا خلاف ادب ہے بات یہ ہے کہ مجازات واستعارات وتشبیہات میں ایسی تنگی نہیں خود قرآن مجید میں متاع کی مذمت ہے اور حدیث میں امرأۃ صالحۃ (نیک عورت) کو خَیْرُ الْمَتَاعِ (بہتر پونجی) فرمایا گیا ہے۔ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا عید ہی کے متعلق ارشاد ہے لِکُلِّ قَوْمٍ عِیْدٌ وَھٰذَا عِیْدُنَا (ہر قوم کے لئے عید ہے اور ہماری یہ عید ہے)

[1] بفتح العین عَود ۱۲

ظاہر ہے کہ قوم کفار کی عید بمعنی لہو ولعب ہے تو ذوق لسانی میں ہذا عیدنا کا صاف مدلول یہ ہے کہ هٰذَا لَعِبُنَا (یہ ہمارا کھیل ہے) تو مجازاً اس کو یوم اللعب کہدیا گیا اور حضرت علیؓ کا قول ہے ؎

اَلسَّیْفُ وَالْخَنجرُ رِیحَانُنَا اُفٍّ عَلَی النَّرجِسِ وَالْآسِ

شَرَابُنَا مِنْ دَمِ اَعْدَائِنَا وَکَاسُنَا جُمْجُمَۃُ الرَّاسِ

(تلوار اور خنجر ہمارے پھول ہیں نرگس اور کیلہ پر تف ہے اپنے دشمنوں کا خون پیتے ہیں اور ہمارے پیالے ان کے سروں کی کھوپڑیاں ہیں)

بہرحال یہ کوئی شبہ کی بات نہیں۔

بحمد اللہ اصل تقریر تو ختم ہوچکی اب ایک مختصر شبہہ کا رفع کرنا باقی ہے۔ بس پھر مجلس ختم ہے وہ شبہہ بھی ایسے شخص کو ہوگا جس نے میری تقریر حدیث سُنَّۃُ اَبِیْکُمْ اِبْرَاهِیْمَ (تمہارے باپ ابراہیمؑ کی سنت ہے) کے متعلق جو ابھی پرسوں کیرانہ میں ہوئی ہے جس کا نام میں نے سنتِ ابراہیم رکھا ہے سنی ہوگی یا بعد ضبط اوس کی نظر سے گذرے گی اول میں اس تقریر کا خلاصہ عرض کرتا ہوں پھر اس سے جو شبہہ ہوسکتا ہے اس کو ظاہر کروں گا، پھر اس کا جواب دوں گا وہ تقریر یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا مَا هٰذِهِ الْاَضَاحِیُّ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ یعنی یہ قربانیاں کیا چیز ہیں آپ نے فرمایا سُنَّۃُ اَبِیْکُمْ اِبْرَاهِیْمَ (تمہارے باپ ابراہیمؑ کی سنت ہے) سو احقر نے اس میں یہ بیان کیا تھا کہ صحابہ نے قربانی کی حقیقت پوچھی تھی آپؐ نے حقیقت بیان فرمائی جس کا حاصل یہ ہے کہ یہ سنت ہے ابراہیم علیہ السلام کی اور ظاہر ہے کہ سنت سے مراد ہر سنت تو ہے نہیں کیونکہ ابراہیم علیہ السلام کا ہر فعل تو قربانی نہیں ہے بلکہ مراد سنت خاصہ ہے پس جواب یہ ہوا کہ اَلتَّضْحِیَۃُ سُنَّۃٌ خَاصَّۃٌ لِاِبْرَاهِیْمَ (قربانی سنت خاصہ ابراہیم کی) بس ایک مقدمہ تو یہ ہوا جو حدیث سے ثابت ہے اب دیکھنا چاہیئے کہ وہ سنت خاصہ کونسا فعل ہے سو قرآن میں جو اس کے متعلق قصہ مذکور ہے اس میں ان کے دو فعل منقول ہیں۔ ایک ذبح ولد دوسرا ذبح کبش (مینڈھا) فدیہ اور ہرچند کہ سرسری نظر میں

جو آپ کا اخیر فعل ہے یعنی ذبح کبش وہ مصداق معلوم ہوتا ہے سنت ابراھیم کا لیکن اگر غور کر کے دیکھا جاوے تو اس بنا پر کہ اصل مامور بہ ذبح ولد تھا یہی احق ہے سنت کے مصداق ہونیکا پس دوسرا مقدمہ یہ ہوا کہ سنۃ ابراھیم ذبح الولد جو قرآن سے ثابت ہے اور اس کے عدم وقوع کو مانع ارادہ نہ سمجھا جاوے کیونکہ ذبح بمعنے ذبح کردن جو کہ فعل اختیاری ہے وہ تو واقع ہوا البتہ اس کا اثر مطاوع یعنی مذبوح شدن واقع نہیں ہوا تو ذبح پر عدم وقوع کا حکم ہی غلط ہے نیز انبیا علیہم السلام کا خواب وحی ہے اور وحی میں غلط کا احتمال نہیں اور خواب میں اِنِّیْ اَذْبَحُکَ (میں تم کو ذبح کرتا ہوں) نص ہے تو ضرور ذبح کو واقع کہا جاوے گا پس جب یہ اس کا مصداق ہوا تو اب عبارت جواب کی یہ ہے کہ اَلتَّضْحِیَۃُ ذِبْحُ الْوَلَدِ (قربانی لڑکے کا ذبح کرنا ہے) اور ظاہر ہے کہ یہ حل ظاہراً صحیح نہیں اور تصحیح ضروری ہے کیونکہ دونوں مقدمے صحیح ہیں تو نتیجہ ضرور صحیح ہوگا یعنی التضحیۃ ذبح الولد اور اس کو نتیجہ بالمعنی الاصطلاحی نہ سمجھا جاوے کیونکہ وہ لازم ہوتا ہے صغریٰ اور کبریٰ کو اور یہاں سنۃ ابراھیم ذبح الولد جو مقدمہ ثانیہ ہے کلیہ نہیں مگر مدعا کا اثبات اس کے کبریٰ ہونے کے طور پر کیا بھی نہیں گیا بلکہ تقریر کی توجیہ یہ ہے کہ سنت سے مراد جب ذبح الولد ہے تو جملہ التضحیۃ سنۃ ابراھیم میں بجائے لفظ سنت ابراھیم کے لفظ ذبح الولد رکھدو تو عبارت یہ بن جاوے گی کہ التضحیۃ ذبح الولد اور یہی مدعا تھا، غرض جب دونوں مقدمے صحیح ہیں تو مدعا بھی صحیح ہونا لازم ہے پس اس کو سمجھنا چاہیئے یہاں موضوع و محمول میں دو دو احتمال ہونے سے کل چار احتمال اس حل میں ہو سکتے ہیں ایک صورۃ التَّضْحِیَۃِ صُوْرَۃُ ذِبْحِ الْوَلَدِ (صورت قربانی لڑکے کا ذبح کرنا ہے) دوسرا رُوْحُ التَّضْحِیَۃِ رُوْحُ ذِبْحِ الْوَلَدِ (روح قربانی ذبح کرنا روح ولد کا ہے) تیسرا صُوْرَۃُ التَّضْحِیَۃِ رُوْحُ ذِبْحِ الْوَلَدِ (قربانی کی صورت روح ہے ذبح ولد کی) چوتھا رُوْحُ التَّضْحِیَۃِ صُوْرَۃُ ذِبْحِ الْوَلَدِ (روح قربانی کی ذبح ولد کی صورت ہے) اور بجز ثانی کے سب کا بطلان ظاہر ہے پس ثانی متعین ہو گیا یعنی ان دونوں فعل کی رُوح اور لُب اور مغز ایک ہے مطلب یہ کہ تضحیہ کی جو حقیقت اور مغز ہے وہ ہے جو ذبح ولد کی حقیقت اور مغز ہے اب یہ بات رہ گئی کہ وہ مغز ذبح الولد کا کیا ہے کہ اسی کو روح تضحیہ کہا جاویگا سو وہ مغز ذبح الولد کا بالکل امر وجدانی ہے یعنی وہی امر ہے کہ تصور کیا جاوے کہ اگر بحکم حق میں ولد کو ذبح کر ڈالوں تو

مجھ پر کیا حالت گذرے سو ظاہر ہے کہ سخت ناگواری طبعی گذرے اور ایسی حالت میں اس فعل کو کر ڈالنا یہ اس ناگواری طبعی کو برداشت کر لینا ہو پس وہ امر جو گذرے وہ یہ ہوا کہ طبعی ناگواری شدید کو خدا کے حکم سے برداشت کرنا اور اسی کو صوفیہ کی اصطلاح میں فناء نفس کہتے ہیں پس روح ذبح الولد کی فناء نفس ٹھہرا پس یہی فناء نفس روح تضحیہ کی ہوئی پس معنی جملہ التضحیۃ ذبح الولد کے یہ ہوئے کہ روح التضحیۃ روح ذبح الولد پس حقیقت تضحیہ کی فناء نفس ہوا اور میں نے اس پر یہ حکم متفرع کیا تھا کہ جب روح اور حقیقت تضحیہ کی یہ ہے تو خود اس تضحیہ میں اور اس کے متعلق جمیع احکام واعمال میں نفس کا ذرا اتباع نہ کیا جاوے بالکل احکام شرعیہ کا اتباع کیا جاوے واجبات میں لزوماً اور مستحبات میں بطریق محبت پس یہ حاصل تھا اس تقریر کا اس تقریر سے یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ تقریر سنۃ ابراہیم سے تو قربانی کی حقیقت فناء نفس معلوم ہوتی ہے اور آج کی تقریر عُود العید (بضم عین) سے قربانی کی حقیقت تعظیم بالقلب معلوم ہوتی ہے جس کا ترجمان تکبیر باللسان (زبان سے اللہ اکبر کہنا) ہے پس ان میں تدافع ہوتا ہے جواب یہ ہے کہ سنۃ ابراہیم میں حقیقت بمعنے ماہیت ہے چنانچہ حدیث میں حل اس کی دلیل ہے اور عود العید میں حقیقت بمعنی غایت ہے چنانچہ قرآن میں لام کے لِتُکَبِّرُوا اللّٰہَ (تاکہ وہ اللہ کا نام لیں) اس کی دلیل ہے اور صوفیہ کی اصطلاح میں لفظ حقیقت کا اطلاق دونوں معنی میں شائع ہے اُس اصطلاح پر دونوں تقریروں میں لفظ حقیقت وارد ہو گیا بس کچھ تدافع نہ رہا اور باوجود اس کے میں نے تقریر عود العید میں لفظ حقیقت کو بھی بچا لیا ہے۔ اب ختم کرتا ہوں اور اس غایت پر بھی میں وہی احکام متفرع کرتا ہوں جو سنت ابراہیم میں حقیقت تضحیہ یعنی فناء نفس پر متفرع کئے تھے یعنی جب حکمت اس طاعت کی تکبیر بالقلب واللسان (دل اور زبان سے تکبیر کہنا) ہے اور اس تکبیر کیلئے لازم ہے نفس کی تصغیر پس کبیر کے مقابلہ میں صغیر کا اتباع نہ کیا جاوے کبیر ہی کے احکام کو متبوع اصل قرار دیا جاوے۔ خلاصہ یہ کہ ان احکام میں مثل جمیع احکام کے نفس کا ذرا اتباع نہ کیا جاوے پس ترجیح احکام النصوص علی احکام النفوس؎ لازم عام ہے وعظ سنت ابراہیم کی حقیقت کے لئے اور وعظ عود العید کی غایت کیلئے سو اس طرح سے دونوں وعظوں کی تفریعات بھی متماثل ہو گئیں۔ بس دعا کیجئے اللہ تعالیٰ ہم کو فہم صحیح اور توفیق عمل نصیب فرماویں۔ آمین

فقط ختم وعظ عُود العید ؎

(؎ احکام نصوص کو احکام نفوس پر ترجیح دینا)

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ اٰیَۃً

(رواہ البخاری)

سلسلہ التبلیغ کا وعظ

مسمّیٰ بہ

سبیل النجاح

منجملہ ارشادات

حکیم الامّۃ مجدّد الملّۃ حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی

(رحمۃ اللہ تعالےٰ علیہ)

ناشر: محمد عبدالمنّان غفرلہ

مکتبہ تھانوی — دفتر الابقاء

مسافرخانہ بندر روڈ کراچی
ایم۔اے جناح روڈ

سلسلۃ التبلیغ کا وعظ مسمّٰی بہ

سبیل النجاح

این	کہاں ہوا	جامع مسجد۔ قنوج
متٰی	کب ہوا	۱۶ صفر المظفر سنہ ۱۳۳۱ھ
کم	کتنی دیر ہوا	دو گھنٹہ ۳۰ منٹ
کیف	کس ہیئت پر بیان ہوا	منبر پر بیٹھ کر بیان فرمایا
لم	سبب بیان کیا تھا	اہل شہر کی درخواست پر
ماذا	کیا مضمون تھا	کامیابی کی حقیقت اور اسکا طریقہ اور یہ کہ احکام شرعیہ سے اصل مقصود فلاح آخرت ہے مگر فلاح دنیا بھی ان کو لازم ہے اور ان لوگوں کی اصلاح جو منافع و مصالح دنیا کو احکام کے اسرار میں بیان کرتے ہیں۔
من ای شان	کس طبقہ کو زیادہ نافع تھا	عموماً سب مسلمانوں کو اور خصوصاً نو تعلیم یافتوں کو
من ضبط	کس نے ضبط کیا	مولانا مولوی سید احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے مسودہ اجمالی ضبط کیا اور ان کے برادر خورد ظفر احمد عفا اللہ عنہ نے تسوید تفصیلی کی۔
السامعون	سامعین کی تخمینی تعداد	مسودہ اجمالی میں نہیں لکھی
الاشتات	متفرقات	تسوید تفصیلی۔ ۲۰ جمادی الاولیٰ سنہ ۱۳۴۳ھ کو شروع ہوکر ۲۸ جمادی الاولیٰ بروز جمعہ کو تمام ہوئی۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ نحمدہ و نستعینہ و نستغفرہ و نؤمن بہ و نتوکل علیہ و نعوذ باللہ من شرور انفسنا و من سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ و من یضللہ فلا ھادی لہ و نشھد ان لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ و نشھد ان سیدنا و مولانا محمداً عبدہ و رسولہ صلی اللہ علیہ و علیٰ الہ و اصحابہ و بارک وسلم **امابعد** فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَ صَابِرُوْا وَ رَابِطُوْا وَ اتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۲۰۰﴾ (اے ایمان والو (تکالیف پر خود

صبر کرو اور (جب کفار سے مقابلہ ہو تو مقابلہ میں) صبر کرو اور (احتمال مقابلہ کے وقت) مقابلہ کے لئے مستعد رہو اور (ہر حال میں) اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو تاکہ تم پورے کامیاب ہو جاؤ)

یہ آیت سورۂ آل عمران کے خاتمہ کی ہے سورۂ آل عمران میں حق تعالیٰ نے مختلف ابواب کے احکام بیان فرمائے ہیں جیسا کہ ان کی تفصیل مطالعہ سے معلوم ہو سکتی ہے ان سب احکام کو بیان فرما کر خاتمہ پر انہی احکام کے متعلق چند ضروری امور بیان فرماتے ہیں جن پر ان کی تکمیل موقوف ہے اور جس طرح یہ تکملہ ہیں ان احکام کا اسی طرح ان کی تسہیل کرنے والے بھی ہیں اور یہاں سے آپ کو قرآن کا حسن ختام معلوم ہوگا کہ جس طرح قرآن کے مضامین بے نظیر ہیں اسی طرح اس کا اختتام اور افتتاح بھی بے نظیر ہے عموماً خاتمہ سورت پر جو مضمون ذکر کیا جاتا ہے وہ تمام سورت کا خلاصہ اور اس کے احکام کا تکملہ اور ان کو سہل کرنے والا ہوتا ہے اور اس میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ شانہ، کو اپنے بندوں پر بہت ہی شفقت ہے کہ جن مضامین کو تسہیل میں کچھ بھی دخل ہے ان کو چھوڑا نہیں بلکہ احکام بیان فرما کر ان کی تسہیل کا طریقہ بھی بیان فرما دیا ہے اور یہی فرق ہے وحی اور غیر وحی میں کلام غیر وحی میں اتنے دقائق کی رعایت نہیں ہو سکتی کیونکہ جب متکلم غیر صاحب وحی ہوگا تو اس کی نظر جو کہ مدار ہے کلام کا ضرور قاصر ہوگی اور اس کے کلام میں یہ بڑی کمی ہوگی کہ اس میں دقیق شقوں پر نظر نہیں ہوتی اور صاحب وحی کی نظر محیط ہوتی ہے۔ اس لئے اگر خود اس کا کلام بھی ہو تب بھی امداد وحی سے اس کی نظر تمام شقوں پر گہری ہوتی ہے اور اگر اس کے کلام میں کوئی شق دشوار ہوتی ہے تو وہ دشواری کو معلوم کر کے اس کی تسہیل بھی ساتھ ساتھ کر دیتا ہے اور اگر وہ بعینہ وحی کا نقل ہے تو یہ وصف اس میں اعلیٰ اور بالا ولےٰ ہوگا۔ غیر صاحب وحی کو اول تو بوجہ قصور نظر کے یہی معلوم نہیں ہوتا کہ میرے کلام میں کوئی شق دشوار بھی ہے اور اگر معلوم بھی ہو جائے تو وہ اس کی تسہیل پر قادر نہیں ہوتا۔ اور صاحب

وحی کی نظر چونکہ محیط ہوتی ہے اس لئے وہ تمام شقوق کی رعایت کر لیتا ہے اول تو اس کے کلام میں کوئی شق فی نفسہ دشوار بھی نہیں ہوتی اور اگر کسی عارض سے مثلاً یہ کہ مخاطب اب تک آزادی کا عادی رہا ہے پابندی سے گھبراتا ہے کوئی شق ظاہر میں دشوار بھی ہو تو وہ اس کے آسان اور سہل کرنے کا طریقہ بھی بتلا دیتا ہے اور صاحب وحی کے جیسا کہ اوپر بھی اشارہ ہوا ہے دو معنی ہیں ایک تو وحی کا نازل کرنے والا یعنی خدا تعالےٰ دوسرے وہ جس پر وحی نازل ہو یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم۔ سو اگر صاحب وحی سے مراد حق تعالےٰ ہیں تو ان کی نظر کا محیط ہونا ظاہر ہے اور اگر صاحب وحی سے مراد دوسرے معنے کے اعتبار سے نبی منزل علیہ ہیں تو ان کی نظر کا محیط ہونا بھی دلیل سے ثابت ہے کیونکہ آپ کو نبوت و رسالت ایک وہبی صفت بطور منصب کے عطا ہوئی ہے اور مناصب موہوبہ میں نقص نہیں ہوتا جب حق تعالےٰ کی طرف سے ایک وہبی منصب کسی کو عطا ہوتا ہے تو اس کے خواص بھی علی وجہ الکمال عطا ہوتے ہیں دیکھئے دنیا میں اگر کوئی حاکم کسی کو عہدہ دیتا ہے تو اپنے نزدیک وہ انتخاب میں کوتاہی نہیں کرتا پھر اگر انتخاب کرنے والے خدا تعالیٰ ہیں تو اس انتخاب میں غلطی کا بھی احتمال نہیں۔ حکام دنیا اپنی طرف سے گو انتخاب میں کمی نہ کریں مگر ان کے انتخاب میں غلطی ممکن ہے لیکن حق تعالےٰ کے انتخاب میں غلطی نہیں ہوسکتی اور یہی وجہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام علماً و عملاً ہر طرح کامل ہوتے ہیں اسی لئے اہل حق نے انبیاء علیہم السلام کو معصوم کہا ہے جس کا حاصل کمال عمل ہے کیونکہ اگر عصمت نہ ہو اور نبی سے گناہ سرزد ہوسکیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کا عمل ناقص ہے کمال عمل یہی ہے کہ کوئی کام رضاء حق کے خلاف سرزد نہ ہوسکے اور نبی کے لئے یہ کمال لازم ہے کیونکہ ان کو حق تعالےٰ نے ایک منصب عطا فرمایا ہے اور منصب عطا کرنے میں چند امور کا لحاظ ضروری ہے ایک یہ کہ جس کو وہ منصب دیا گیا ہے اس میں اس منصب کی اہلیت ہو تاکہ وہ اسکے فرائض کو بخوبی انجام دے سکے دوسرے یہ کہ وہ منصب عطا کنندہ کا پورا

مطیع وتابعدار ہو مثلاً اگر بادشاہ کسی کو وائسرائے بنا کر بھیجے تو وہ دو باتوں پر نظر کرے گا ایک یہ کہ اس کو انتظام ملکی کا سلیقہ اعلیٰ درجہ کا ہو دوسرے یہ کہ اس میں گورنمنٹ کی اطاعت پوری پوری ہو مخالفت اور بغاوت کا شائبہ بھی نہ ہو کوئی بادشاہ ایسے شخص کو کوئی عہدہ نہیں دیا کرتا جس میں ذرا بھی مخالفت و بغاوت کا احتمال و شائبہ ہو پس اگر کوئی شخص وائسرائے میں قابلیت انتظام کی کمی کا عیب نکالے یا اس کی وفاداری پر اعتراض کرے تو حقیقت میں یہ اعتراض بادشاہ پر ہوگا کیونکہ اسی نے اس کو یہ منصب دیا ہے پس اعتراض کا یہ حاصل ہوگا کہ بادشاہ نے ایک نا قابل کو یا مخالف گورنمنٹ کو وائسرائے بنایا ہے اور اس صورت میں معترض پر توہین شاہی کا جرم قائم کیا جائیگا لیکن وائسرائے پر اعتراض کرنے میں ممکن ہے کہ کسی وقت معترض ہی حق بجانب ہو کیونکہ شاہان دنیا کا علم محیط نہیں اس لئے ان سے انتخاب میں غلطی ہو جانا بعید نہیں لیکن خدا تعالیٰ کے اوپر تو اس اعتراض کی کسی طرح بھی گنجائش نہیں تو جس کو حق تعالیٰ اپنے انتخاب سے کوئی عہدہ دیں اس میں اس عہدہ کی پوری قابلیت اور خدا تعالیٰ کی کامل اطاعت کا ہونا لابدی ہے تو معلوم ہوا کہ انبیاء علیہم السلام کو جو عہدہ دیا جاتا ہے اس میں وہ علماً کامل ہوتے ہیں اور چونکہ خدا تعالےٰ نے ان کو اپنے انتخاب سے ایک منصب دیا ہے تو ان میں مخالفت و نافرمانی حق کا شائبہ بھی نہیں ہو سکتا جس کا حاصل یہ ہے کہ وہ عملاً بھی کامل ہوتے ہیں اور یہی معنے ہیں عصمت کے پس اگر کوئی شخص انبیاء علیہم السلام کے علم و عمل پر کسی قسم کا اعتراض کرے تو درحقیقت وہ خدا تعالیٰ پر اعتراض ہے پس نبوت کے ساتھ مخالفت حق ممکن ہی نہیں اور یہاں سے معلوم ہو گیا کہ عصمت انبیاء علیہم السلام کا مسئلہ محض نقلی نہیں بلکہ عقلی بھی ہے نیز انبیاء علیہم السلام کے علوم میں بھی نقص ممکن نہیں بلکہ ان کے علوم کامل ہوتے ہیں۔ یعنی وہ علوم جنکی اس منصب میں ضرورت ہے کیونکہ حق تعالیٰ ایسے شخص کو کسی عہدہ کے واسطے منتخب نہیں کر سکتے جس میں اس منصب کی قابلیت نہ ہو اور قابلیت کے معنے ہی یہ ہیں کہ اس منصب کو جن علوم کی ضرورت ہو وہ اس شخص کو کامل طور پر حاصل ہوں۔ ہاں یہ ضرور نہیں کہ اس منصب کے علاوہ دیگر امور کا بھی اسے علم ہو کیونکہ تحصیلدار کو انہی علوم کی ضرورت ہے جن کو تحصیلداری سے تعلق ہے یعنی قانون۔ اسی طرح اگر کسی کو طبیب اور معالج بنایا جاوے تو اس کو انہی علوم میں کامل ہونا چاہیئے جن کو طب سے

تعلق ہے یعنی صحت و مرض وغیرہ اسی طرح انبیاء علیہم السلام کا بھی انہی علوم میں کامل ہونا ضروری ہے جو نبوت کے متعلق ہیں اور ان علوم میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ان کی نظر مصالح عبادیں وسیع ہو اس لئے اگر صاحب وحی سے مراد نبی ہے تو اس کی نظر بھی مصالح عباد میں اس وجہ سے وسیع ہونا چاہیئے کہ خدا تعالیٰ نے وہی طور ان کو نبوت کا منصب عطا فرمایا ہے جس کا تعلق مصالحہ عباد سے ہے بہرحال یہ دعویٰ ثابت ہوگیا کہ وحی میں تمام پہلوؤں کی اعلیٰ درجہ کی رعایت ہوگی اسی لئے قرآن میں ہر پہلو کی ایسی رعایت ہے کہ کسی کلام میں ایسی رعایت نہیں ہے قرآن میں صرف ضابطہ کو پورا نہیں کیا گیا اس مضمون کا آپ سہولت سے یوں سمجھیں گے کہ حکام دو قسم کے ہیں ایک وہ جو محض ضابطہ کے پابند ہیں ضابطہ کی رو سے جو کام ان پر واجب ہے، وہ کر دیا اور قانون کے موافق رعایا پر احکام لازم کر دیئے ان کو اس کی ضرورت نہیں کہ دشوار احکام کو قانون سے خارج کریں یا انکے سہل و آسان کرنے کی تدبیر بتائیں۔ دوسرے وہ حکام ہیں جن کو رعایا سے محبت ہوتی ہے اور مخلوق کو راحت پہونچانا چاہتے ہیں وہ حتی الامکان قانون میں کوئی دشوار حکم داخل نہیں کرتے اور اگر کسی مصلحت سے کوئی دشوار حکم رکھتے بھی ہیں تو رعایا کو اس کے سہل کرنے کی تدبیر بھی بتلاتے ہیں اور اس تجویز میں ان پر تعب ضرور ہوتا ہے مگر یہ شفقت پر مبنی ہے اتنی رعایتیں وہی حاکم کر سکتا ہے جس کو رعایا پر شفقت ہو۔ اسی طرح ایک اور مثال سمجھئے کہ نصیحت کرنے والا ایک تو استاد ہوتا ہے اور ایک باپ ہوتا ہے باپ کی نصیحت میں عام لوگوں کی نصیحت سے فرق ہوتا ہے۔ استاد تو ضابطہ پوری کر دیتا ہے مگر باپ ضابطہ پوری نہیں کر سکتا وہ نصیحت کرتے ہوئے اس کا خیال رکھتا ہے کہ بیٹے کو ایسے عنوان اور ایسے طرز سے نصیحت کروں جو اس کے دل میں گھر کر لے کیونکہ وہ دل سے یہ چاہتا ہے کہ بیٹے کی اصلاح ہو جائے اور اس میں کوئی کمی نہ رہ جاوے اور اگر وہ کوئی مشکل کام بھی بتلاتا ہے تو اس کا طریقہ وہ اختیار کرتا ہے جس سے بیٹے کو عمل آسان ہو جائے اور ان سب رعایتوں کا منشا وہی شفقت ہے۔ شفقت ہی کیساتھ تمام پہلوؤں کی رعایت کی جا سکتی ہے اور اسی لئے باپ کا کلام نصیحت کے وقت کبھی بے ربط اور بے ترتیب بھی ہو جاتا ہے مثلاً باپ بیٹے کو کھانا کھاتے ہوئے نصیحت کرے کہ بری صحبت میں نہیں بیٹھا کرتے اور اس مضمون پر وہ مفصل گفتگو کر رہا ہو اسی درمیان میں اس نے

دیکھا کہ بیٹے نے ایک بڑا سا لقمہ کھانے کو لیا ہے تو وہ فوراً پہلی نصیحت کو قطع کر کے کہے گا کہ یہ کیا حرکت ہے لقمہ بڑا نہیں لیا کرتے اس کے بعد پھر پہلی بات پر گفتگو شروع کر دے گا اب جس کو شفقت کی اطلاع نہ ہو وہ کہے گا کہ یہ کیسا بے ترتیب کلام ہے بری صحبت سے منع کرتے ہیں لقمہ کا کیا ذکر مگر جو شخص کبھی کسی کا باپ بنا ہے وہ جانتا ہے کہ یہ بے ترتیب کلام مرتب و مرتبط کلام سے افضل ہے شفقت کا مقتضا یہی ہے کہ ایک بات کرتے ہوئے اگر دوسری بات کی ضرورت ہو تو ربط کا لحاظ نہ کرے دوسری بات کو بیچ میں کہہ کر پھر پہلی بات کو پورا کرے یہی راز ہے اس کا کہ خدا تعالیٰ کا کلام ظاہر میں کہیں بے ربط بھی معلوم ہوتا ہے اس ظاہری بے ربطی کا منشا شفقت ہی ہے کہ حق تعالیٰ مصنفین کی طرح گفتگو نہیں کرتے کہ ایک مضمون پر کلام شروع ہو تو دوسرے باب کا کوئی مضمون اس میں نہ آسکے بلکہ وہ ایک مضمون کو بیان فرماتے ہوئے اگر کسی دوسرے امر پر تنبیہ کی ضرورت دیکھتے ہیں تو شفقت کی وجہ سے درمیان میں فوراً اس پر بھی تنبیہ فرما دیتے ہیں اس کے بعد پھر پہلا مضمون شروع ہو جاتا ہے۔

چنانچہ ایک آیت مجھے یاد آئی جس پر لوگوں نے غیر مرتبط ہونے کا اعتراض کیا ہے۔ سورۂ قیامہ میں حق تعالیٰ نے قیامت کا حال بیان فرمایا ہے کہ انسان اس وقت بڑا پریشان ہوگا اور بھاگنے کا موقعہ ڈھونڈے گا۔ اپنے اعمال پر اسے اطلاع ہوگی اس روز اس کو سب اگلے پچھلے کئے ہوئے کام جتلا دیئے جائیں گے پھر فرماتے ہیں بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰى نَفْسِهٖ بَصِيْرَةٌ وَّلَوْ اَلْقٰى مَعَاذِيْرَهٗ یعنی (انسان کا اپنے اعمال) سے آگاہ ہونا کچھ اس جتلانے پر موقوف نہ ہوگا بلکہ اس دن) انسان اپنے نفس (کے احوال و اعمال) سے خوب واقف ہے (کیونکہ اس وقت حقائق کا انکشاف ضروری ہو جائے گا) اگرچہ وہ (باقتضائے طبیعت) کتنے ہی بہانے بنائے جیسے کفار کہیں گے واللہ ہم تو مشرک نہ تھے مگر دل میں خود بھی جانیں گے کہ ہم جھوٹے ہیں غرض انسان اس روز اپنے سب احوال کو خوب جانتا ہوگا اس لئے یہ جتلانا محض قطع جواب اور اتمام حجت اور دھمکی کے لئے ہوگا نہ کہ یاد دہانی کے لئے یہاں تک تو قیامت ہی کے متعلق مضمون ہے اس کے بعد فرماتے ہیں لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ

لِتَعْجَلَ بِهٖ اِنَّ عَلَیْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ ثُمَّ اِنَّ عَلَیْنَا بَیَانَهٗ
اس کا مطلب یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد فرماتے ہیں کہ قرآن نازل ہوتے ہوئے اس کے یاد کرنے کے خیال سے زبان نہ ہلایا کیجئے ہمارے ذمہ ہے آپ کے دل میں قرآن کا جمادینا اور زبان سے پڑھوا دینا تو جب ہم قرآن نازل کریں اس وقت فرشتے کی قرارت کا اتباع کیجئے پھر یہ بھی ہمارے ذمہ ہے کہ آپ قرآن کا مطلب بھی بیان کر دیں گے۔ اس کے بعد پھر قیامت کا مضمون ہے کَلَّا بَلْ تُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ وَتَذَرُوْنَ الْاٰخِرَةَ۔ کہ تم لوگ دنیا کے طالب ہو اور آخرت کو چھوڑتے ہو پھر فرماتے ہیں وُجُوْهٌ یَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ۔ بعضوں کے چہرے اس دن تروتازہ ہوں گے اپنے پروردگار کی طرف دیکھتے ہوں گے۔ اور لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ (آپ اپنی زبان کو نہ ہلایا کیجئے) سے اوپر بھی قیامت کا ذکر ہے اور بعد کو بھی اسی کا ذکر ہے اور درمیان میں یہ مضمون ہے کہ قرآن پڑھتے ہوئے جلدی یاد کرنے کے لئے زبان کو حرکت نہ دیا کیجئے۔ لوگ اس زبان کے ربط میں تھک گئے ہیں اور بہت سی توجیہات بیان کی ہیں مگر سب میں تکلف ہے اور کسی نے خوب کہا ہے کلامیکہ محتاج یعنی باشد لایعنی ست۔ (جو کلام یعنی کا محتاج ہو لایعنی ہے) تو جس کو حق تعالیٰ کے اس تعلق کا علم ہے جو حق تعالیٰ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہے اس کو آفتاب کی طرح نظر آتا ہے کہ اس کلام کا درمیان میں کیا موقع ہے صاحبو! اس کا وہی موقع ہے جیسے وہ باپ اپنے بیٹے کو نصیحت کر رہا تھا کہ بری صحبت میں نہیں بیٹھا کرتے اور اس کے مفاسد بیان کر رہا تھا کہ درمیان میں بیٹے کو بڑا سا لقمہ اٹھاتے ہوئے دیکھ کر کہنے لگا یہ کیا حرکت ہے لقمہ بڑا نہیں لیا کرتے تو ظاہر میں لقمہ کا ذکر ترتیب کلام سے بالکل بے ربط ہے لیکن جو باپ ہوا ہوگا وہ جانے گا کہ نصیحت کرتے کرتے درمیان میں لقمہ کا ذکر اس لئے کیا گیا کہ لڑکے نے بڑا لقمہ لیا تھا باپ نے فرط شفقت سے درمیان کلام میں اس پر بھی تنبیہ کر دی۔ اسی طرح یہاں بھی حق تعالیٰ قیامت کا ذکر فرما رہے تھے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس خیال سے کہ کہیں یہ آیتیں ذہن سے نہ نکل جائیں جلدی جلدی ساتھ ساتھ پڑھ رہے تھے تو درمیان میں خدا تعالیٰ نے فرط شفقت سے اس کا بھی ذکر فرما دیا کہ آپ

یاد کرنے کی فکر نہ کریں یہ کام ہم نے اپنے ذمہ لے لیا ہے آپ بے فکر ہو کر سنتے رہا کریں قرآن پاک آپ کے دل میں خود بخود محفوظ ہو جائے گا تو اس مضمون کو درمیان میں ذکر فرمانے کی وجہ فرط شفقت ہے اور اس کا مقتضایہ تھا کہ اگر یہاں بالکل بھی ربط نہ ہوتا تو یہ بے ربطی ہزار ربط سے افضل تھی مگر پھر بھی باوجود اس کے یہاں ایک مستقل ربط بھی ہے اور یہ خدا ہی کے کلام کا اعجاز ہے کہ جہاں ربط کی ضرورت نہ ہو وہاں بھی کلام میں ربط موجود ہے چنانچہ جو رسالے ربط کے باب میں لکھے گئے ہیں ان سے اس آیت کا مضمون قیامت سے ربط معلوم ہو سکتا ہے۔ میں نے بھی اپنے ایک رسالہ عربی میں اور اپنی تفسیر کے اندر اردو میں اس کا ماقبل سے ارتباط بیان کیا ہے جو کہ تبرع اور احسان کے درجہ میں ہے ؎

؎ چنانچہ رسالہ سبق الغایات میں اس آیت کا ربط ماقبل سے اول وہی تحریر فرمایا ہے جو اس جگہ بیان ہوا کہ درمیان میں فرط شفقت سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تحریک لسان سے اس لئے منع فرما دیا کہ آپ غالباً اس وقت خود بھی پڑھنے لگے تھے۔ دوسرا ربط نقلاً عن القفال یہ تحریر فرمایا ہے کہ لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب نہیں بلکہ یہ خطاب قیامت میں انسان کو ہوگا کہ نامۂ اعمال کے پڑھنے میں جلدی نہ کر ہم تیرے سب اعمال جتلاتے ہیں تو نامۂ اعمال کو دیکھتا رہ اور ہماری تقریر سنتا رہ الخ اور تفسیر میں لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کو خطاب مان کر ربط یہ بیان فرمایا ہے کہ اوپر یہ معلوم ہو چکا ہے کہ انسان کو قیامت میں اس کے تمام اعمال پر مطلع کیا جائے گا اور اس کا مطلع ہونا جتلانے پر موقوف نہ ہوگا بلکہ علم ضروری کے طور پر وہ خود بھی اپنے نفس کے سب احوال سے خوب واقف ہوگا اس سے دو مضمون مستفاد ہوئے ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ تمام اشیاء کے عالم اور محیط ہیں۔ دوسرے یہ کہ حق تعالیٰ کی عادت ہے کہ وہ کسی حکمت سے بعض دفعہ مخلوق کے ذہن میں بہت سے غائب شدہ علوم کو دفعۃً حاضر کر دیتے ہیں گو ان علوم غائبہ کثیرہ کا دفعۃً حاضر ہو جانا عادت طبعی کے خلاف ہو جیسا کہ قیامت میں ایسا کیا جائے گا جب یہ بات ہے تو آپ نزول وحی کے وقت یاد کرنے کی فکر کیوں کرتے ہیں بلکہ مطمئن ہو کر سنتے رہا کیجئے ہم قرآن کو آپ کے دل میں جما دیں گے اور جب کبھی آپ پڑھنا چاہیں گے آپ کی زبان سے اس کو ادا کرا دیں گے۔ قلت وہذا دلیٰ مما قالہ القفال رحمہ اللہ ۱۲ (بیان القرآن ملخصاً)

یہاں ربط کی ضرورت ہی نہ تھی شاید کسی کو یہ شبہ ہو کہ جب ربط کی ضرورت نہ تھی تو ممکن ہے کہ یہ روابط سب مخترع ہوں پھر ان کی حاجت ہی کیا تھی (کیونکہ تقریر سابق سے یہ معلوم ہو چکا ہے کہ فرط شفقت کا مقتضایہ ہے کہ ترتیب و ربط کا لحاظ نہ کیا جائے بلکہ مخاطب کی ضرورت کے موافق کلام کیا جائے چاہے ربط ہو یا نہ ہو اور قرآن کا طرز کلام یہی ہے تو اس صورت میں جو کچھ ربط بیان کیا جائے گا وہ مخترع ہوگا کیونکہ متکلم نے ارتباط کا لحاظ کیا ہی نہیں ۱۲) اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن میں باوجود طرز تصنیف اختیار نہ کرنے اور شفقت کا طرز اختیار کرنے کے پھر بھی ربط کا لحاظ کیا گیا ہے اس لئے مفسرین کے بیان کردہ روابط مخترع نہیں ہیں اور اس ربط ملحوظ فرمانے کی دلیل یہ ہے کہ احادیث سے ثابت ہے کہ ترتیب نزول آیات اور ہے اور ترتیب تلاوت مصحف اور ہے یعنی قرآن کا نزول تو واقعات کے موافق ہوا کہ ایک واقعہ پیش آیا اور اس کے متعلق ایک آیت نازل ہوگئی پھر دوسرا واقعہ پیش آیا تو دوسری آیت نازل ہوگئی وعلیٰ ہذا۔ تو ترتیب نزول تو حسب واقعات ہے اگر تلاوت میں بھی یہی ترتیب رہتی تو واقعی ربط کی کوئی ضرورت نہ تھی لیکن ترتیب تلاوت خود جناب باری تعالیٰ عز اسمہ نے بدل دی یعنی حدیث میں آتا ہے کہ جب کوئی آیت کسی واقعہ کے متعلق نازل ہوتی تو جبریل علیہ السلام بحکم خداوندی حضور صلے اللہ علیہ وسلم سے یہ کہتے کہ اس آیت کو مثلاً سورہ بقرہ کی فلاں آیت کے بعد رکھا جائے اور اس کو فلاں آیت کے بعد اور اس کو فلاں سورت کے ساتھ وعلیٰ ہذا تو مصحف میں ترتیب آیات ترتیب نزول پر نہیں

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) نزول الآیۃ فی تحریک النبی صلی اللہ علیہ وسلم لسانہ وقت التنزیل مذکور فی الصحیحین فنادیل الآیۃ لغیرہ لاحسن ولیجیبنی ایضاً ما قالہ الاستاذ العلامۃ الفاضل مولانا محمد اسحٰق البردوانی ان ہذہ الآیۃ مرتبط۔ بقولہ تعالیٰ بلی قادرین علی ان نسوی بنانہ یارۃ لما کان سبحانہ وتعالیٰ قادراً علی جمع العظام وہی رمیم وعلی تسویۃ البنان وہی رفات فہو قادر بالاولے علی جمع القرآن الازلی الابدی الذی لایبدل ولایغنی فی قلب حی مثلک یا محمد فلا تعالج من نزولہ شدۃ ولا تحرک بہ لسانک لتعجیل بہ فللہ درہ ما ابہی دررہ واللہ تعالےٰ اعلم وعلمہ اتم واحکم ۱۲ جامع۔

بلکہ اس کی ترتیب حق تعالیٰ نے دوسری رکھی ہے اس سے معلوم ہوا کہ جس آیت کو بھی کسی آیت کے ساتھ ملایا گیا ہے دونوں میں کوئی مستقل ربط اور مناسبت اور تعلق ضرور ہے کیونکہ اگر اب بھی دونوں میں کوئی ربط نہ ہوا تو ترتیب نزول کا بدلنا مفید نہ ہوگا تو عجب بے نظیر کلام ہے کہ باوجود ضرورت ربط نہ ہونے کے پھر بھی اس میں ربط ہے اور پورا ربط ہے پس خدا تعالیٰ کے کلام میں اس مستقل دلیل سے ہم ربط کے قائل ہیں لیکن اگر ربط نہ بھی ہوتا تب بھی قرآن پر اعتراض کی گنجائش نہ تھی ہم کہہ سکتے تھے کہ قرآن میں طرز تصنیف نہیں اختیار کیا گیا بلکہ نصیحت مع لحاظ شفقت اختیار کیا گیا ہے اور اس میں ضرورت مخاطب کے لحاظ سے گفتگو کی جاتی ہے جس کی بے ربطی ہزار ربط سے افضل ہوتی ہے اور یہی شفقت منشا ہے اس امر کا کہ قرآن کی ہر تعلیم کامل ہے جس میں تمام پہلوؤں کی پوری پوری رعایت کی جاتی ہے اور اسی وجہ سے حق تعالیٰ ہر سورت میں بہت سے احکام بیان فرما کر اخیر میں ایسی بات بیان فرماتے ہیں جو سب کی جامع ہوتی ہے اور جس پر عمل کرنے سے تمام احکام مذکورہ میں سہولت ہو جاتی ہے چنانچہ سورۂ آل عمران میں مختلف ابواب کے احکام بیان فرما کر کلام کو ختم نہیں کیا بلکہ اخیر کی آیت میں بطور میزان الکل کے ایک بات ایسی بتلادی جو سب کو جامع ہے یہ ایسا ہے جیسا تفصیلی حساب کے بعد میزان دی جایا کرتی ہے اگرچہ مفصل حساب بیان کرنے کے بعد میزان کی ضرورت نہیں ہوتی مگر ظاہر ہے کہ میزان بیان کر دینے سے ایک قسم کا ضبط و تکرار ہو جاتا ہے مفصل حساب کا یاد رہنا دشوار ہے اور میزان کا یاد رکھنا آسان ہے۔ اسی طرح یہ آیت اخیرہ تمام سورت کی میزان ہے جس میں بالاجماع جملہ احکام مذکورہ داخل ہیں اور دیکھنے میں دو تین باتیں ہیں جن پر عمل بہت سہل ہے خدا تعالیٰ نے اس بات کی رعایت ہر جگہ رکھی ہے یہ طرز سوائے قرآن کے کسی کلام میں بھی نہیں ہے کہ تمام باتوں کو ختم کر کے ایک بات ایسی بتلادی جو سب کو جامع ہے یہ ایسا ہے جیسا شفیق باپ مفصل نصیحتیں کر کے اخیر میں ایک گر بتلا دیتا ہے اور منشا اس کا شفقت ہے کہ لڑکے کو ساری باتیں شاید یاد نہ رہیں یا اتنی باتوں کو سنکر گھبرا جاوے تو اخیر میں ایک گر بتلا دیتا ہے کہ بس اس کو یاد کر لو تو جس نے

دوسروں کو شفقت سکھلائی اس کے کلام میں شفقت کی پوری رعایت کیوں نہ ہوگی غرض اس مقام پر اس آیت میں وہی بات مذکور ہے جو ساری سورت میں بیان کی گئی ہے اور اس میں ابہام نہیں ہے کہ ایک گول بات کہدی ہو جس کا مطلب بھی سمجھ میں نہ آوے بلکہ ساری سورت کا مضمون اس آیت میں اجمال کے ساتھ مذکور ہے (جس کو بلاغت میں ایجاز کہتے ہیں ۱۲ کہ تھوڑے سے مختصر لفظوں میں بڑا مضمون ادا کر دیا جو تفصیل پر دلالت میں کافی وافی ہے اور اجمال کہنے کی یہ وجہ ہے کہ اس آیت میں ایک گونہ کلیت ہے اور ہر چند کہ کلیات کے تحت میں جزئیات سب ہوتے ہیں مگر بالاجمال ہوتے ہیں نہ کہ تفصیلاً۔ یہ ایسی بات ہے جیسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان شرائع اسلام قد کثرت علی فقل لی قولا احفظہ واخذ بہ (او کما قال) کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم احکام اسلام مجھ پر بہت زیادہ ہو گئے آپ مجھے ایک بات ایسی بتلا دیجئے جس کو میں یاد کر لوں اور اسی کے موافق عمل کرتا رہوں۔ آپ نے ارشاد فرمایا قُلْ اٰمَنْتُ بِاللّٰهِ ثُمَّ اسْتَقِمْ کہ تم یوں کہو کہ میں اللہ پر ایمان لایا پھر استقامت کے ساتھ رہو۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ساری شریعت ابتداء سے انتہا تک اس ایک جملہ میں بھر دی حالانکہ سائل نے ابتداء سے سوال بھی نہ کیا تھا پس اٰمَنْتُ بِاللّٰهِ (میں اللہ پر ایمان لایا) میں آپ نے بالاجمال تمام اعتقادیات کو بیان فرما دیا اور ثُمَّ اسْتَقِمْ (پھر استقامت کے ساتھ رہو) میں اعمال کے اندر استقامت کی تعلیم دی جس میں نماز روزہ حج زکوٰۃ معاملات ومعاشرات سب آ گئے (کیونکہ استقامت واعتدال اعمال شرعیہ کی خاص صفت ہے ان سے تجاوز کر کے عمل میں اعتدال باقی نہیں رہ سکتا ۱۲) استقامت کی ہر جگہ ہر عمل میں ضرورت ہے (تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سائل کو ایسی بات بتلا دی جس سے وہ ہر عمل کا جواز وناجواز دریافت کر سکے پس جہاں استقامت واعتدال موجود ہو وہ شرعی عمل ہے اور جہاں یہ صفت مفقود ہو وہ شریعت سے خارج ہے ۱۲) باقی یہ مطلب تو ہو ہی نہیں سکتا کہ سائل کی درخواست یہ تھی کہ مجھے ایسی بات بتلا دیجئے کہ تمام احکام کو بھلا کر میں اس ایک بات کو یاد کر لوں بلکہ اس کا مطلب یہ تھا کہ مجھے ایسی بات

بتلا دیجئے جس کی تمام شریعت میں رعایت کروں اور جس سے ہر حکم کا شرعی وغیر شرعی ہونا معلوم کر لیا کروں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی کے موافق ایسی بات بتلادی جو شریعت کا موضوع ہے یعنی اعتقاد عظمتِ الٰہی واستقامت افعال واحوال۔ اور ظاہر ہے کہ موضوع علم معلوم ہو جانے سے اس کے تمام مسائل دوسرے علوم کے مسائل سے ممتاز ہو جاتے ہیں اور جس کو موضوع کا علم ہے گویا بالاجمال اسے تمام مسائل کا علم ہے کیونکہ اب جو مسئلہ اس کے سامنے آئے گا وہ بآسانی معلوم کرلے گا کہ یہ مسئلہ اس علم کا ہے یا نہیں چنانچہ اسی لئے ہر فن میں موضوع کی تعیین کی جاتی ہے مثلاً طب میں چونکہ مسائل کثیرہ منتشرہ ہیں جن کا ضبط دشوار ہے اور حفظ مسائل کے ذریعہ سے تمام جزئیات میں یہ امتیاز مشکل ہے کہ کونسا مسئلہ طب کے متعلق ہے اور کونسا نہیں مثلاً یہ بات کہ اتنے اونچے مکان کی بنیاد کیسی گہری اور چوڑی ہونا چاہیئے یہ طب کا مسئلہ ہے یا نہیں محض مسائل کے پڑھ لینے سے معلوم نہیں ہوسکتی کیونکہ کتابوں میں تمام جزئیات کا احصا نہیں کیا گیا اور نہ ہوسکتا ہے تو اب جن جزئیات کا کتاب میں ذکر نہیں یا ہم کو یاد نہیں ان کی بابت یہ کیسے معلوم ہو کہ ان کو طب سے علاقہ ہے یا نہیں اس کے لئے حکماء نے طب کا ایک موضوع قرار دیا وہ کیا بَدَنُ الْاِنْسَانِ مِنْ حَیْثُ الصِّحَّۃِ وَالْمَرَضِ یعنی طب کا موضوع بدن انسانی ہے بحیثیت تندرستی اور بیماری کے یہ موضوع معلوم کر لینے کے بعد تمام مسائل کا امتیاز ہوگیا اب اگر سنا کہ بنفشہ زکام کو نافع ہے فوراً سمجھ میں آگیا کہ یہ مسئلہ طب کے متعلق ہے اور اگر یہ سنا کہ اتنی گہری بنیاد ہو تو اتنا اونچا مکان بنایا جا سکتا ہے تو سنتے ہی سمجھ میں آجائے گا کہ یہ مسئلہ طب کے متعلق نہیں ہے۔ اسی طرح اگر یہ سنا کہ بدن انسان حادث ہے جب بھی سمجھ لیں گے کہ یہ طب کا مسئلہ نہیں ہے کیونکہ گو اس میں بدن انسان کی ایک حالت مذکور ہے مگر اس حالت کو صحت و مرض سے کچھ واسطہ نہیں اور موضوع طب بدن انسان مطلقاً نہیں ہے بلکہ صحت و مرض کی حیثیت سے ہے غرض جس کو موضوع معلوم ہوگا وہ ہر جگہ ہر مسئلہ میں اس کی رعایت کرلے گا۔ اسی طرح اس جگہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سائل کو شریعت کا موضوع بتلا دیا جس کے حفظ سے گویا تمام

مسائل بالاجمال اسے محفوظ ہو گئے اور اب وہ ہر بات کے متعلق یہ معلوم کر سکے گا کہ اس کو شریعت سے تعلق ہے یا نہیں کیونکہ وہ اس موضوع کی ہر جگہ رعایت کرے گا ایسے ہی اس مقام پر حق تعالیٰ بھی تمام احکام کو ذکر کر کے اخیر میں ایک ایسا گر بتلاتے ہیں جو گویا تمام سورت کا موضوع ہے جس کو اس کے سب احکام سے تعلق ہے چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ اے ایمان والو (تکالیف پر) خود صبر اور (جب کفار سے مقابلہ ہو تو مقابلہ میں صبر کرو اور (احتمال مقابلہ کے وقت) مقابلہ کے لئے مستعد رہو اور (ہر حال میں) اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو (حدود شرعیہ سے باہر نہ نکلو) تاکہ تم پورے کامیاب رہو (آخرت میں تو ضرور ہی اور اکثر اوقات ان اعمال پر محافظت کی بدولت دنیا میں بھی پوری کامیابی ہوتی ہے) جن باتوں کا اس آیت میں ذکر ہے یہ وہ چیزیں ہیں کہ ان کو اس سورت کے احکام سے تو تعلق ہے ہی میں ترقی کر کے کہتا ہوں کہ جس قدر بھی احکام شرعیہ ہیں سب سے ان کا تعلق ہے اور اس سے آگے میں اور ترقی کرتا ہوں کہ اتفاق سے ہم کو یہ بات بھی ثابت ہو گئی ہے کہ جیسے ان کو احکام شرعیہ سے تعلق ہے اسی طرح تمام دنیوی مصالح معاشیہ سے بھی ان کو تعلق ہے مگر نہ اس وجہ سے کہ یہ شریعت کا موضوع و مقصود ہے بلکہ اس لئے کہ شریعت تکمیل آخرت کے ساتھ ہماری دنیا کی بھی تکمیل ساتھ ساتھ کرتی ہے اس لئے احکام شرعیہ اس طور سے مقرر کئے گئے ہیں جو تبعاً مصالح دنیویہ کو بھی متضمن ہیں آجکل احکام شرعیہ میں مصالح دنیویہ بیان کرنے والوں کی جماعتیں ہیں کہ ایک تو وہ جو اصل چیز مصلحت دنیا ہی کو سمجھتے ہیں اور احکام شرعیہ کو انہی مصالح پر مبنی سمجھتے ہیں چنانچہ یہ لوگ مصالح دنیا کی تحصیل کی طرف اول ترغیب دیتے ہیں پھر ان کی تائید احکام شرعیہ سے کرتے ہیں اور اس طرز تقریر سے اکثر لوگوں کو ان کے حامی دین ہونے کا دھوکہ ہو جاتا ہے حالانکہ وہ اثر کے اعتبار سے ماحی دین ہیں چنانچہ اس وقت کثرت سے اس قسم کے مضامین اخباروں اور لکچروں میں دیکھنے میں آتے ہیں کہ اتفاق ایسی چیز ہے کہ شریعت میں اس کا اس قدر اہتمام ہے کہ پانچ وقت کی نمازیں خدا تعالیٰ نے جماعت کو اسی لئے واجب کیا تاکہ ہر محلہ کے سب مسلمان دن میں پانچ دفعہ کم از کم ملتے رہیں ہر شخص کو ایک دوسرے کی حالت کا

علم ہوا اور میل جول پر اتفاق بڑھے پھر ہفتہ میں ایک بار تمام بستی میں آدمیوں کے باہمی اجتماع کے لئے جمعہ کی نماز مقرر کی تاکہ تمام بستی کے مسلمانوں سے شناسائی ہو اور ایک دوسرے کی ہمدردی کا موقع ملے پھر بعض مسلمان ایسے ہیں جو شہر سے بھی دور رہتے ہیں ان کے اجتماع کے لئے عیدین کی نماز مقرر کی تاکہ سال بھر میں دو دفعہ آس پاس کے دیہاتی مسلمانوں سے بھی ملاقات ہو جایا کرے پھر ساری دنیا کے مسلمانوں کو یکجا کرنے کیلئے حج کی عبادت مشروع کی گئی کہ عمر بھر میں ایک دفعہ تو سب طرف کے مسلمان ایک جگہ جمع ہو کر تبادلۂ خیالات کر لیا کریں۔ اس مضمون کو آج بڑے افتخار کی ساتھ بیان کیا جاتا ہے اور بہت سے بھولے بھالے ایسے مقرروں کو شریعت کا راز داں سمجھتے ہیں کہ بس یہ شخص شریعت کے اسرار کو سمجھ گیا اور کہتے ہیں کہ دیکھئے علم اس کو کہتے ہیں کہ نقلی بات کو عقلی بنا دیا اور شریعت کے اسرار کو زمانہ کے موافق بیان کر دیا مگر واللہ اس کی وہ مثال ہے ؎ چوں ندید ند حقیقت رہ افسانہ زدند (جب حقیقت کا پتہ نہ چلا تو ڈھکوسلوں کا راستہ اختیار کیا) نہ یہ کچھ راز ہے اور نہ اس میں سمجھنے والوں کا کچھ کمال ہے بلکہ اس طرز تقریر میں زہر بھرا ہوا ہے جو اس کو جان لے گا وہ سمجھ جائیگا کہ یہ لوگ ایسے اسرار بیان کر کے اسلام کے ساتھ دوستی نہیں کرتے بلکہ دشمنی کرتے ہیں اور یہ لوگ حامی اسلام نہیں بلکہ اسلام کے نادان دوست ہیں اور ؎ دوستی بیخرد چوں دشمنی است۔ (بے عقل کی دوستی دشمنی ہوا کرتی ہے) اب میں آپ کو بتلاتا ہوں کہ اس تقریر میں زہر کیا ہے اس مضمون کا حاصل یہ ہے کہ بس اصل چیز تو اتفاق ہے اور جماعت پنجگانہ اور جمعہ و عیدین و حج اسی اتفاق کے پیدا کرنے کے واسطے ذرائع و وسائل ہیں تو عجب نہیں کہ بعض لوگوں پر اس کا یہ اثر ہو کہ وہ ان احکام کو مقصود بالذات نہ سمجھیں اور اگر کبھی کسی دوسرے طریق سے اتفاق ممکن ہوا تو وہ بہت آسانی سے جماعت اور نماز دونوں کے چھوڑنے پر آمادہ ہو جائیں گے کیونکہ ان کے خیال میں تو یہ سب احکام حصول اتفاق کیلئے مقرر ہوئے ہیں اور ان کو کلب میں جانے اور تھیٹر میں ملکر شریک ہونے سے بھی یہ بات حاصل ہو سکتی ہے جہاں راحت سے آرام کرسی اور گدی تکیوں پر جگہ ملتی ہے تو وہ خواہ مخواہ مسجد میں کیوں آنے لگے اور وضو اور نماز کی مشقت کیوں برداشت کرنے لگے چنانچہ اس وقت ان تقریروں کا یہ ضرر نمایاں ہو رہا ہے۔ اخباروں میں ایک شخص کا قول شائع ہوا تھا کہ وضو کی ضرورت ابتداء اسلام میں تھی آجکل نہیں ہے کیونکہ اس وقت بدوی لوگ پاک

صاف نہ رہتے تھے جنگل کے کاروبار سے غبار آلود آتے تھے اس لئے ان کو وضو کا حکم کیا گیا اور ہم لوگ آجکل صفائی کا بہت اہتمام رکھتے ہیں ہر وقت موزے اور دستانے چڑھائے رہتے ہیں جن کی وجہ سے ہاتھ پیر گرد سے محفوظ رہتے ہیں ہم کو وضو کی ضرورت نہیں یہ نتیجہ ہے ایسے اسرار بیان کرنے کا کہ اب ہر شخص اس قسم کی مصلحتوں ہی کو مقصود سمجھنے لگا اور اس شخص سے کچھ تعجب نہیں کہ وہ نماز کو بھی چھوڑ دے اور یہ کہے کہ نماز کی ضرورت ابتدائے اسلام میں اس لئے تھی کہ اس زمانے کے لوگ جاہلیت کی وجہ سے بڑے متکبر و سرکش ہوتے تھے اور ان کو مہذب بنانے کے لئے یہ افعال تواضع وخشوع کے تعلیم فرمائے گئے تھے اور ہم لوگ تعلیم یافتہ ہیں ہمارے اندر تعلیم سے تہذیب پیدا ہوگئی ہے ہم کو نماز کی کیا ضرورت ہے۔ اسی طرح قربانی کے متعلق ایک شخص نے جو کہ مسلمان ہیں انگلستان سے مجھ کو لکھا تھا کہ قربانی شریعت کو مقصود نہیں اور یہ بالکل عقل کے خلاف ہے کہ ایک دن میں اتنے جانوروں کو ذبح کیا جائے جن کا گوشت آدمیوں سے کھایا بھی نہ جائے چنانچہ اسی لئے منیٰ میں قربانی کرتے ہی جانوروں کو کھتوں میں ڈالدیا جاتا ہے عضب یہ ہے کہ آجکل خدا پر بھی عقل کی حکومت ہونے لگی افسوس میں کہتا ہوں کہ اگر ایک جج کسی مجرم کو سزا دے اور مجرم یہ کہے کہ یہ سزا تو عقل کے خلاف ہے تو کیا وہ اس بات کی سماعت کریگا ہرگز نہیں بلکہ وہ صاف یہ کہیگا کہ قانون پر تمہاری عقل کی حکومت نہیں بلکہ قانون عقل پر حاکم ہے اور اس کے اس جواب کو سب عقلا تسلیم کرتے ہیں مگر حیرت ہے کہ قانون الٰہی کو آجکل کے مسلمان اپنی عقل پر حاکم نہیں مانتے بلکہ اس کو اپنی عقل کے تابع کرنا چاہتے ہیں اور یہ جواب علیٰ سبیل التنزیل ہے ورنہ قانون الٰہی تو بالکل عقل کے مطابق ہے بشرطیکہ عقل سلیم ہو یہ کیا ضرور ہے کہ ہر شخص کی عقل میں

ف ان حضرت نے منیٰ میں کھتوں کے اندر جانوروں کے دبانے کی جو یہ وجہ بتلائی ہے کہ اتنا گوشت آدمیوں سے کھایا نہیں جاتا یہ بالکل غلط ہے کیونکہ موسم حج پر جتنے آدمی جمع ہوتے ہیں سب کے سب مالدار نہیں ہوتے اور نہ سب قربانی کرتے ہیں بلکہ حجاج میں زیادہ تر غربا ہوتے ہیں۔ ہم دعوے سے کہتے ہیں کہ اگر منیٰ کی قربانی کا سارا گوشت حجاج میں اور بدویوں میں تقسیم کردیا جائے تو وہ ہرگز سب کو کافی نہ ہوگا بلکہ بہت سے لوگ پھر بھی محروم رہجائیں گے بلکہ منیٰ میں قربانی کے جانوروں کو محض ڈاکٹروں کی رائے سے دبایا جاتا ہے پس اس خلاف عقل حرکت کے جواب دہ وہ ڈاکٹر ہیں جن کی رائے سے ایسا کیا جاتا ہے ۱۲ ظ

اس کی حکمتیں آجایا کریں آخر پارلیمنٹ کے عقلا رجو قوانین تجویز کرتے ہیں کیا ہر عامی کی عقل اس کی مصالح وحکم کو خاص خاص حکام ہی سمجھتے ہیں۔ پھر قانون الٰہی کی حکمتوں اور مصالح کو ہر شخص اپنی عقل سے کیوں معلوم کرنا چاہتا ہے اور یہاں یہ کیوں نہیں کہا جاتا کہ قانون الٰہی عقل کے مطابق ضرور ہے مگر ہماری عقلیں اس کے سمجھنے سے قاصر ہیں۔ خاص خاص لوگ ہی اس کو سمجھ سکتے ہیں اور بالفرض اگر کسی قانون کی حکمت خاص لوگوں کی عقل میں بھی نہ آئے تو قانون کے بدلنے کا کسی کو اختیار نہیں کیونکہ قانون پر عقل حاکم نہیں بلکہ اس کی ماتحت اور اس کی تابع ہے غرض ان حضرت نے مجھے لکھا کہ قربانی خود شریعت کو مقصود نہیں بلکہ اصل مقصود غرباً کی امداد ہے اور ابتدا اسلام میں لوگوں کے پاس نقد کم تھا مویشی زیادہ تھے اس لئے یہ طریقہ اختیار کیا گیا کہ جانور ذبح کر کے غربا کو گوشت دیدو اور اس زمانہ میں نقد بھی بہت موجود ہے غلہ بھی موجود ہے پس آجکل بجائے قربانی کرنے کے نقد روپیہ سے غربا کی امداد کرنا چاہئے۔

رتو اس شخص نے قربانی کی حکمت امداد غربا سمجھ کر جب یہ دیکھا کہ یہ حکمت دوسرے طریقہ سے بھی باآسانی حاصل ہو سکتی ہے قربانی چھوڑنے کا ارادہ کر لیا حالانکہ یہ حکمت مقصود ہی نہیں کیونکہ مقصود تو تعمیل حکم ہے اگر یہ حکمت مقصود ہوتی تو اس کی کیا وجہ کہ غربا کو زندہ جانور دینے سے واجب ادا نہیں ہوتا اگر اس زمانہ میں نقد اور غلہ کم تھا اور مویشی زیادہ تھے اس لئے جانوروں کے ذریعہ سے غربا کی امداد کا طریقہ مقرر ہوا تھا تو اس کے کیا معنے کہ جانور کو ذبح کر کے غربا کو گوشت ہی دیا جائے تو واجب ادا ہوا اور زندہ جانور کسی غریب کو دیدیں تو واجب ادا نہ ہو پھر کیا پہلے زمانہ میں مسلمانوں پر نقد کی وسعت کبھی نہ ہوئی تھی بالکل غلط۔ تاریخ اٹھا کر دیکھو تو معلوم ہو کہ صحابہ نے جس وقت کسریٰ و قیصر کے خزانے فتح کئے ہیں تو مسلمانوں کے پاس نقد سونا اور چاندی اس قدر تھا کہ آجکل تو اس کا عشر عشیر بھی نہ ہوگا پھر اس وقت صحابہ کو یہ بات کیوں نہ سوجھی جو اس شخص کو انگلستان میں بیٹھ کر سوجھی اور صحابہ نے بجائے قربانی کے نقد امداد کو کیوں نہ اختیار کیا دوسرے اگر یہ حکمت قربانی سے مقصود بالذات ہوتی تو اس کا مقتضا یہ تھا کہ قربانی کے گوشت میں سے کسی حصہ کا تصدق ضرور واجب ہوتا حالانکہ شریعت میں یہ بھی حکم نہیں بلکہ اگر کوئی شخص سارا گوشت خود ہی کھالے اور غریبوں کو حبہ برابر بھی نہ دے تو قربانی

میں کچھ قصور نہیں آتا اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ امداد غربا، قربانی سے مقصود بالذات نہیں بلکہ مقصود کچھ اور ہے مگر آپ نے دیکھ لیا کہ اس قسم کے اسرار بیان کرنے کا نتیجہ کہاں تک پہنچا ہے کہ ہر شخص اپنی مخترع حکمتوں پر احکام کا مدار سمجھنے لگا ۱۲) اور اس خیال کا اثر یہ ہوا کہ چندہ بلقان میں یہ مادہ پھوٹ ہی پڑا آخر اہل جرات نے یہ فتویٰ دے ہی دیا خدا ان کو ہدایت کرے کہ اگر مسلمان اس سال قربانی نہ کریں اور بلقان کے چندہ میں جانور کی نقد قیمت دیدیں تو یہ زیادہ بہتر ہے اور اس طرح بھی قربانی ادا ہو جائے گی کیونکہ قربانی سے مقصود غریب مسلمانوں کی امداد ہے اور اس وقت ترکوں کو نقد امداد سے زیادہ فائدہ ہو سکتا ہے اس کا جواب ایک عامی آدمی نے خوب دیا ہے اس نے کہا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بھی غزوات ہوئے تھے یا نہیں اور اس وقت بھی غازیوں کے لئے نقد امداد کی ضرورت ہوتی تھی یا نہیں تو کبھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی یہ تجویز کیا کہ اس سال قربانی کو موقوف کر کے مسلمان نقد روپیہ سے غزوات میں امداد کریں۔ اس کا جواب کسی کے پاس کچھ نہ تھا تو جب قربانی کے متعلق بعض لوگوں کو ایک خیال فاسد ہوا تھا جو بالآخر پھوٹ کر رہا۔

اسی طرح اور احکام کی حکمتوں میں بھی جو رنگین مضامین آجکل لکھے جاتے ہیں ان کا بھی اثر یہی ہے کہ لوگ ان مصالح اور حکمتوں کو مقصود بالذات سمجھنے لگیں گے اور جب وہ حکمت کسی اور طریقہ سے حاصل ہوتی ہوئی دیکھیں گے فوراً احکام کو چھوڑنے پر آمادہ ہو جائیں گے اس کی ایک اور نظیر مجھے یاد آئی اس وقت سب لوگ مانے ہوئے ہیں کہ اتفاق ضروری ہے اور کچھ ٹھوکریں کھا کر یہ بھی ان کو ثابت ہو گیا ہے کہ اتفاق بدون پابندی مذہب کے حاصل نہیں ہو سکتا تو اب عموماً لکچروں میں پابندی مذہب پر بہت زیادہ زور دیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ اس کے بغیر مسلمانوں میں اتفاق و اتحاد نہیں ہو سکتا اور بدون اتفاق کے ترقی نہیں ہو سکتی۔ ظاہر میں یہ بہت ہی خوش کن جملہ ہے مگر اس میں بھی وہی زہر مخفی ہے کہ اصل میں تو مذہب مقصود نہیں بلکہ اتفاق مطلوب ہے مگر چونکہ مذہب اس کا ذریعہ ہے اس لئے مذہب کی بھی ضرورت ہے اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ جب تک ان لوگوں کو اسلام پر رہنے سے اتفاق کی امید ہے اس وقت تک تو یہ اسلام پر رہیں گے اور دوسروں کو

بھی اس کی ترغیب دیں گے اور جہاں یہ امید منقطع ہوئی اسی دن یہ اسلام کو ترک کردیں گے مثلاً فرض کرلو کہ کسی زمانہ میں مسلمانوں پر ایسی کشاکشی کا وقت آپڑے کہ وہ اسلام کو قائم رکھ کر اتفاق نہ پیدا کرسکیں اور ان لوگوں کو یہ ثابت ہوجائے کہ فلاں مذہب اختیار کرلینے سے اتفاق حاصل ہوگا تو یہ فوراً اسلام کو خیرباد کہکر دوسرا مذہب اختیار کرلیں گے کیونکہ ان کے نزدیک تو اسلام محض اتفاق کے لئے مطلوب تھا مقصود بالذات نہ تھا تو یہ بڑا خطرناک مسلک ہے کہ مصالح دنیویہ پر احکام کی بنا قرار دی جاتی ہے اس کا کبھی نام بھی نہ لیجئے سو ایک تو اس مشرب کے لوگ ہیں جو اس درجہ مصالح دنیویہ کا اثبات کرتے ہیں ان کی غلطی تو واضح ہوگئی۔ ایک دوسرا مشرب یہ ہے کہ بعض لوگوں کا گمان یہ ہے کہ مذہب سے فقط دین ہی کی فلاح حاصل ہوتی ہے دنیوی فلاح حاصل نہیں ہوتی تو یہ مصالح دنیویہ کی بالکل ہی نفی کرتے ہیں یہ اس درجہ کا تو غلط نہیں جیسا پہلا مشرب غلط تھا اور اگر نصوص اس کے خلاف نہ ہوتے تو ہم اس کے مان لیتے مگر نصوص اس کے بھی خلاف موجود ہے اس لئے یہ بھی غلط ہے کیونکہ نصوص سے ثابت ہے کہ اطاعت خداوندی سے دنیاوی مصالح اور راحتیں بھی حاصل ہوتی ہیں اور معصیت و مخالفت خداوندی سے دنیوی خسارہ بھی ہوتا ہے چنانچہ ارشاد ہے وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰٓى اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ وَلٰكِنْ كَذَّبُوْا فَاَخَذْنٰهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ (ترجمہ) اور اگر ان بستیوں کے رہنے والے ایمان لے آتے اور پرہیز کرتے تو ہم ان پر آسمان اور زمین کی برکتیں کھول دیتے لیکن انھوں نے تکذیب کی تو ہم نے ان کے اعمال کی وجہ سے ان کو پکڑ لیا اور ایک جگہ اہل کتاب کے متعلق ارشاد ہے وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ یعنی اگر اہل کتاب توراۃ و انجیل پر اور جو (قرآن) آپ پر نازل ہوا ہے اس پر پوری طرح عمل کرتے (اور جیسا کہ ان میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت و اتباع کا امر ہے اس کے موافق آپ کا اتباع اختیار کرلیتے) تو اوپر سے بھی روزی حاصل کرتے (یعنی آسمان سے) اور اپنے پیروں تلے سے بھی (یعنی زمین سے) ایک جگہ ارشاد فرماتے ہیں وَمَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ وَيَعْفُوْا عَنْ

كَثِيْرٍ ۔ کہ تم کو جو کچھ مصائب پہونچتے ہیں یہ تمہاری اعمال کے سبب سے ہیں اور حق تعالیٰ بہت سی باتوں کو معاف ہی کردیتے ہیں ان کے علاوہ اور بہت سی نصوص ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ طاعت سے دنیوی فلاح بھی ہوتی ہے اور معیشت سے دنیوی خسارہ ہوتا ہے تو ہم اس مشرب کے بھی قائل نہیں ہوسکتے۔ اب سامعین کو شبہ پیدا ہوا ہوگا کہ جو لوگ احکام میں دنیوی مصالح بتلاتے ہیں ان کے مشرب کو بھی غلط کردیا اور جو نہیں بتلاتے ان کے مشرب کو بھی غلط کردیا یہ دونوں غلط کیونکر ہوسکتے ہیں ان میں سے ایک بات تو صحیح ہونی چاہیے تو ہاں صاحب میں نے دونوں کو غلط کردیا اور ان میں سے ایک بھی صحیح نہیں بلکہ ان دونوں کے علاوہ ایک درمیانی درجہ ہے وہ صحیح ہے اور ہم اسی کے قائل ہیں وہ یہ کہ احکام شرعیہ سے فلاح دنیوی حاصل تو ہوتی ہے مگر احکام شرعیہ سے فلاح دنیوی مقصود نہیں بلکہ اُن سے اصل مقصود تو رضاء خدا ہے ہاں ساتھ میں تبعًا یہ دنیوی نعمت بھی حاصل ہوجاتی ہے اور اس کی ایسی مثال ہے جیسے حج کے رستہ میں کبئی آتا ہے مگر بمبئی مقصود نہیں تو اب یوں سمجھئے کہ تین مشرب ہوئے ایک تو یہ کہتا ہے کہ حج سے بمبئی کی سیر ہی مقصود ہے تاکہ مسلمانوں کو دنیا کے کاروبار اور تجارت وصنعت کی اطلاع ہوجائے اور ایک یہ کہتا ہے کہ حج سے مقصود زیارت کعبہ ہے اور بمبئی رستہ میں بھی نہیں آتا یہ دونوں غلط ہیں صحیح مشرب تیسرا ہے کہ حج سے مقصود زیارت بیت اور رضاء خدا ہے اور رستہ میں بمبئی بھی آتا ہے مگر وہ مقصود نہیں اسی طرح احکام شرعیہ کو فلاح دنیا سے نہ تو اتنا تعلق ہے کہ وہی مقصود ہو اور نہ اتنی بے تعلقی ہے کہ وہ ان پر مرتب نہ ہو صحیح مذہب یہ ہے کہ احکام شرعیہ پر فلاح دنیا کا ترتب تو ہوتا ہے مگر یہ مقصود نہیں اور اگر کوئی شخص اعمال صالحہ سے دنیا کو مقصود سمجھے گا اور مصالح دنیویہ کے لئے ان کو اختیار کرے گا تو وہ اعمال صالحہ نہ رہیں گے چنانچہ رسول اللہ صلی علیہ وسلم کا ارشاد ہے

إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ وَإِنَّمَا لِكُلِّ امْرِئٍ مَا نَوٰى فَمَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهُ إِلَى اللهِ وَرَسُوْلِهِ فَهِجْرَتُهُ إِلَى اللهِ وَرَسُوْلِهِ وَمَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهُ إِلٰى دُنْيَا يُصِيْبُهَا أَوِ امْرَأَةٍ يَتَزَوَّجُهَا فَهِجْرَتُهُ إِلٰى مَا هَاجَرَ إِلَيْهِ ۔ کہ اعمال کا اعتبار نیت سے ہے اور ہر شخص کو

وہی ملے گا جو اسے مقصود ہے اگر کوئی اللہ و رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطے ہجرت کرے تو اس کی ہجرت تو واقعی اللہ و رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطے ہے اور مقبول ہے اور جو کوئی دنیا کے لئے یا کسی عورت سے نکاح کرنے کے لئے ہجرت کرے تو اسکی ہجرت خدا و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف نہیں بلکہ اسی چیز کی طرف ہے جس کی اس نے نیت کی ہے۔ اس سے صاف فیصلہ ہو گیا کہ دنیا کو اعمال صالحہ میں مقصود سمجھنے سے اعمال صالحہ باقی نہیں رہتے بلکہ صرف اعمال کی نقل رہ جاتی ہے پس اعمال شرعیہ سے دنیا کو غرض بنانا تو ناجائز ہے مگر تبعاً طاعات سے فلاح دنیوی بھی حاصل ہو جاتی ہے اب وہ جملہ آپ کی سمجھ میں آ گیا ہوگا جو میں نے اوپر کہا تھا کہ اس مقام پر حق تعالٰی نے جو احکام کلیہ بتلائے ہیں ان کا تعلق مصالح دنیویہ سے بھی ہے گو وہ دنیوی مصالح مقصود نہیں اب سمجھئے کہ وہ احکام کیا ہیں تو ارشاد فرماتے ہیں یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا الآیہ یعنی اے ایمان والو صبر کرو۔ اِصْبِرُوْا کا تعلق تو اعمال لازمہ سے ہے جن میں دوسروں سے کچھ تعلق نہیں ان میں حکم ہے صبر کا اور ایک صبر دوسرے مقام پر ہے وہ یہ کہ کسی عمل میں مخالفت کی مزاحمت ہو اس کے متعلق ارشاد ہے وَصَابِرُوْا کہ مقابلہ میں بھی صبر کرو یعنی استقلال کے ساتھ رہو آگے ارشاد ہے وَرَابِطُوْا اس کے دو معنے ہیں ایک یہ کہ سرحد کی حفاظت کرو دوسرے یہ کہ مستعد رہو پہلے معنی خاص عمل کے متعلق ہیں اور دوسرے معنے سب اعمال کو عام ہو سکتے ہیں آگے فرماتے ہیں وَاتَّقُوا اللّٰہَ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ ٥ اور اللہ سے ڈرو امید ہے کہ تم کو فلاح حاصل ہو جائے۔ اس ترجمہ سے حاصل ہوا ہوگا کہ اس مقام پر ایک تو صبر کا حکم ہے اور صبر کے دو درجے ہیں۔ اور ایک رباط کا حکم ہے اور ایک تقوے کا تو چار حکم ہوئے ایک پانچویں اور ایک چھٹی چیز اور ہے جن میں سے ایک کا اول میں ذکر ہے اور ایک کا آخر میں اول میں ایمان ہے اور آخر میں فلاح ہے ایک چیز بطور مبدا کے ہے اور ایک صورت نتیجہ میں ہے اور چار حکم درمیان میں ہیں کل چھ ہوئے اور ان کے مراتب

میں فرق ایسا ہے جیسے سفر اور مسافت اور منزل میں فرق ہے کہ سفر کی ایک ابتدا ہوتی ہے اور ایک درمیانی مسافت ہوتی ہے جس کے بُعد کے لئے کچھ مراتب ہوتے ہیں اور ایک نتیجہ ہوتا ہے یعنی منزل مقصود پر پہونچنا پس یہ کلام ایسا ہے جیسے ہم کسی سے یوں کہیں کہ اے مسافر فلاں راستہ سے جانا اور فلاں مقامات پر ٹھہرنا اور چوروں سے اپنی حفاظت رکھنا تو دہلی پہونچ جائے گا۔ اس کلام سے تین باتیں معلوم ہوں گی ایک یہ کہ دہلی پہونچنے کے لئے سفر کی بھی ضرورت ہے کیونکہ یہ وعدہ مسافر ہی سے کیا گیا ہے مگر اس کو بصورت امراس لئے ظاہر نہیں کیا کہ مخاطب خود ہی سفر شروع کر چکا ہے اب اس سے یہ کہنا کہ اے مسافر سفر کر تحصیل حاصل ہے اور بلا ضرورت کلام کو طول دینا ہے بس سفر کی ضرورت اس کو مسافر کہکر خطاب کرنے ہی سے معلوم ہو گئی یہ مختصر کلام ہے اور دلالت اس کی علی التمام ہے غرض ایک تو سفر کرنا ضروری ہوا اور دوسری یہ بات معلوم ہوئی کہ منازل پر سے گذرنا اور اپنی حفاظت کرنا بھی ضروری ہے تیسرا وعدہ ہے کہ اس طرح تم دہلی پہونچ گے تو سفر شرط وصول ہے۔ اور درمیانی باتیں احکام وصول ہیں اور تیسری بات نتیجہ ہے۔ ہر مقصود کے لئے ان تین باتوں کا ہونا ضروری ہے اس کی ایک اور مثال لیجئے مثلاً کوئی کہے کہ اے طالب علم رات کو جاگنا اور محنت کرنا تو علم آویگا۔ اس کلام سے اول تو طلب علم کا ضروری ہونا معلوم ہوا دوسرے رات کو جاگنے اور محنت کرنے کی ضرورت معلوم ہوئی تیسرے نتیجہ کا وعدہ ہے کہ اس طرح کرنے سے علم حاصل ہو جائیگا مگر یہاں بھی طلب علم کو بصورت امراس لئے ظاہر نہیں کیا گیا کہ مخاطب خود ہی طلب میں مشغول ہے اسی طرح یہاں بھی یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا (اے ایمان والو!) سے ایمان کی ضرورت معلوم ہوئی لیکن اس کو بصورت امر اٰمِنُوْا (تم ایمان والو) کہکر اس لئے ظاہر نہیں کیا گیا کہ مخاطب اہل ایمان ہی ہیں ان کو اٰمِنُوْا (ایمان لاؤ) کہنے کی ضرورت نہیں کیونکہ احکام کی دو قسمیں ہیں ایک وہ احکام جو ان لوگوں کے متعلق ہیں جنھوں نے ایمان قبول کر لیا ہے پہلی قسم میں اول ایمان کا حکم کیا جائے گا اور دوسری قسم میں ایمان کا حکم صیغۂ امر سے نہ کیا جائیگا جیسے طالب علم کے متعلق ایک تو غیر طالب علم کو خطاب کیا جائے اور ایک طالب علم کو تو جس وقت غیر طالب علم کو خطاب کیا جائے اس وقت اس کہنے کی ضرورت ہے کہ علم طلب کرو

اور جس وقت طالب علم مخاطب ہو اس وقت اس شرط کے اظہار کی ضرورت نہیں قرآن میں بھی اسی طرح دونوں قسم کے خطاب ہیں اور یہ مثالیں میں نے اس لئے دیدیں تاکہ معلوم ہو جائے کہ قرآن کے مضامین کوئی نئے نہیں ہیں اگر غور کیا جائے تو جس طرح ہم لوگ محاورات میں گفتگو کرتے ہیں اسی طرح قرآن میں بھی کلام کیا جاتا ہے ہاں طرز تعلیم ایسا عجیب ہے کہ دوسرے سے ممکن نہیں کیونکہ قرآن میں تمام پہلوؤں کی پوری رعایت ہوتی ہے بہرحال چونکہ اس صورت میں زیادہ احکام اور اکثر خطابات مومنین کو ہیں اس لئے اٰمِنُوْا (ایمان لاؤ) بصیغہ امر نہیں کہا گیا مگر یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا[۱] سے ایمان کا شرط ہونا ایمان کا شرط ہونا معلوم ہو گیا جیسا کہ اوپر چند مثالوں سے میں نے اس کو سمجھا دیا ہے مجکو اس سے یہ بتلانا مقصود ہے کہ آجکل بہت سے لوگ اس غلطی میں مبتلا ہیں کہ وہ فلاح کے لئے ایمان کو بھی شرط نہیں سمجھتے اس وقت ہم کو دنیوی فلاح سے تو بحث نہیں اس کے متعلق تو ہماری حالت یہ ہے ؎

ما قصۂ سکندر و دارا نہ خواندہ ایم از ما بجز حکایتِ مہر و وفا مپرس

(ہم دارا اور سکندر کے قصہ نہیں پڑھے ہیں ہم سے تو محبت اور وفا کے علاوہ کچھ نہ پوچھو)

ہم دنیوی ترقی سے منع بھی نہیں کرتے مگر اس کے ساتھ ہی ہم کو اس کے احکام بیان کرنے کی بھی ضرورت نہیں تو ہم اس سے بحث نہیں کرتے کہ دنیوی فلاح و ترقی کے لئے بھی ایمان شرط ہے یا نہیں بلکہ اس وقت فلاح آخرت سے بحث ہے تو افسوس یہ ہے کہ بعض مسلمان فلاح آخرت اور وصول اللہ کے لئے بھی اس کو ضروری نہیں سمجھتے چنانچہ بہت لوگ ایسے بھنگڑوں کے پیچھے پھرتے ہیں جن کو نہ ایمان سے واسطہ ہے نہ نماز روزہ سے اور کہتے ہیں کہ درویشی کا رستہ ہی دوسرا ہے چنانچہ اگر کوئی ہندو جوگی آجاوے اور دو چار شعبدے ظاہر کر دے اور کسی پر اس کی توجہ سے کچھ اثر بھی ہونے لگے تو اس کو ولی سمجھنے لگتے ہیں اور بہت سے لوگ معتقد ہو جاتے ہیں۔ کانپور میں ایک عیسائی تھا بالکل سڑی اور مجنون مگر کانپور کے عوام الناس اس کو ولی اور اہلِ خدمت سمجھتے تھے حالانکہ اس کی صورت پر ایسی نحوست برستی تھی کہ الامان مگر ان

---

[۱] اے ایمان والو

بھی لوگ معتقد تھے۔ غرض عوام کے نزدیک ولایت کے لئے کوئی شرط نہیں ہاں ترک شریعت کی البتہ شرط ہے تو یہ ایسا عجیب عہدہ ہے کہ اس کے لئے کسی کورس کے پڑھنے اور پاس کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ اس میں سارے کورس کے چھوڑ دینے کی ضرورت ہے۔ کانپور میں ایک وکیل کہتے تھے کہ ایک بھنگڑ یہاں آیا جو ہمہ اوست کہتا تھا اس نے آکر رنڈیوں میں قیام کیا اور بھنگ پی کر رنڈیوں سے بھی منہ کالا کیا مگر عوام اس کے بہت معتقد تھے کہ بڑا پہنچا ہوا ہے اور اس کے لئے یہ بات یاد کر لی ہے کہ بزرگوں میں ایک فرقہ ملامتی ہوتا ہے جو ظاہر میں ایسے افعال کرتے ہیں جن سے لوگ ان کو برا بھلا کہیں اس بنا پر لوگوں نے ان بھنگڑوں کو بھی ملامتی فرقہ میں داخل کر کے ان کے افعال میں تاویل کر لی ہے میں کہتا ہوں کہ آخر ملامتی کی کوئی جامع مانع تعریف بھی ہے یا اس کا مفہوم اتنا وسیع ہے کہ ہر شخص اس میں داخل ہو سکتا ہے اگر ایسا ہے تو پھر صحابہ نے بڑی غلطی کی کہ تلوار لے کر کفار کو قتل کیا جب ملامتی کا مفہوم اتنا وسیع ہے کہ کفار بھی اس کے تحت میں داخل ہو سکتے ہیں تو صحابہ نے کفار کو ملامتی سمجھ ان کے کفر میں کیوں تاویل نہ کر لی اگر تاویل اتنی ہی سستی ہے تو یوں تو ہر امر کی تاویل ہو سکتی ہے پھر شریعت نے خواہ مخواہ اسلام و کفر کے احکام بیان کئے صاحبو! تاویل تو وہاں کیجاتی ہے جہاں آثار تقویٰ غالب ہوں اور ذرا سی کوئی بات خلاف تقویٰ سرزد ہو جائے تو اس میں تاویل کی جاتی ہے یہ نہیں کہ تاویل اوڑھنا بچھونا ہو جائے کہ سر سے پیر تک تمام افعال ہی میں تاویل کی جائے۔ یوں تو پھر یہ بھی ایک تاویل ہے جو میرے ایک عزیز نے ایک ہندو سے سنی تھی۔ وہ ریاست گوالیار میں ملازم تھے گھر کے قریب کوئی مندر تھا وہاں ایک بت پرست روزانہ صبح کو آکر بت کو پانی دیا کرتا تھا ایک روز جو وہ پانی دے کر لوٹنے لگا تو ایک کتا آیا اور ٹانگ اٹھا کر بت پر پیشاب کرنے لگا تو میرے عزیز نے اس ہندو کو آواز دی کہ پنڈت جی ذرا یہاں تو آؤ وہ لوٹ کر آیا تو کہا کہ دیکھئے یہ کتا آپ کے دیوتا کے ساتھ کیا کر رہا ہے ہندو نے کہا حضور کچھ نہیں یہ بھی دیوتا کو پانی دے رہا ہے اگر تاویل ایسی ہی سستی ہے تو پھر کتے کے موتنے کو پانی دینا کہنا یہ بھی ایک تاویل تھی یہی حال آجکل عوام کی تاویلوں کا ہے کہ چاہے کوئی کافر ہو یا فاسق فاجر ہو اور کیسی ہی بیہودہ حرکتیں کرتا ہو

(باقی ان شاء اللہ تعالیٰ آئندہ)

سب میں یہ تاویل ہے کہ یہ ملامتی بزرگ ہیں آپ کو خبر بھی ہے کہ ملامتی کی تعریف کیا ہے یہ لفظ صوفیہ کی اصطلاحات میں سے ہے اس کے معنی انہی سے دریافت کرنے چاہئیں غضب تو یہ ہے کہ لوگ کسی فن کو حاصل تو کرتے نہیں محض چند الفاظ یاد کرکے ان کو گاتے پھرتے ہیں۔ سنئے ملامتی اس کو کہتے ہیں جو اعمال صالحہ کو سوائے فرائض کے مخفی رکھے اور چھپ چھپ کر نوافل پڑھے کھلم کھلا نوافل کو ادا نہ کرے تاکہ لوگ اس کو معمولی آدمی سمجھیں اسی طرح ایک فرقہ قلندر کہلاتا ہے، قلندر کی تعریف یہ ہے جو اعمال نافلہ کم کرے اور قلب سے ذکر و شغل زیادہ کرے اس کو اعمال ظاہرہ میں فرائض و واجبات کے سوا اور اعمال کا اہتمام نہیں ہوتا بلکہ باطن کا اہتمام زیادہ ہوتا ہے اس سے یہ کہاں ثابت ہوا کہ ملامتی گناہوں کا ارتکاب بھی کرتا ہے یہ تو محض اختراع اور افترا ہے جو شخص کھلم کھلا گناہ کرتا ہو اس کو ولایت سے کیا واسطہ ہاں شیطانی ولایت سے اس کو البتہ واسطہ ہے پس ان بھنگڑوں کو ملامتی کہنا بالکل غلط ہے ہاں اس جگہ ایک سوال باقی رہا وہ یہ کہ بعض بزرگوں سے منقول ہے کہ انھوں نے بعض باتیں خلاف شرع کی ہیں تاکہ لوگ ان کو برا بھلا کہیں تو یہ لوگ بزرگ تھے یا نہیں اگر وہ بزرگ تھے تو یہ بھنگڑ بھی ویسے ہی بزرگ ہیں ہم ان کو بھی ویسا ہی سمجھتے ہیں تو اس کا جواب بھی سنئے اول تو جن بزرگوں سے ایسی ویسی باتیں منقول ہیں وہ محض وضع کے خلاف تھیں شریعت کے خلاف نہ تھیں یہ تو ایسا ہے جیسے میں صرف پاجامہ پہنکر بازار میں چلا جاؤں اس میں کچھ گناہ نہیں البتہ وضع کے خلاف ہے کہ اس صورت سے نکلنے والے کو لوگ بُرا بھلا کہتے ہیں اور اگر کسی نے کوئی کام خلاف شریعت بھی کیا ہے تو وہ محض ظاہر میں ناواقفوں کو خلاف شرع معلوم ہوتا تھا واقع میں خلاف شرع نہ تھا جیسے ایک بزرگ چلے جارہے تھے رستہ میں ایک عورت ملی انھوں نے دوڑ کر اس کا بوسہ لے لیا۔ یہ حرکت دیکھ کر بہت سے مرید برگشتہ ہو گئے مگر چند لوگ پھر بھی ساتھ رہے، آگے چل کر ایک دکان پر پہنچے اور بدون دکاندار کی اجازت کے حلوا اٹھا کر کھانے لگے بعد میں معلوم ہوا کہ وہ عورت ان کی باندی تھی جس کا بوسہ لینا شرعاً جائز تھا اور وہ حلوائی ان کا جان نثار مرید تھا جو شیخ کو آتا ہوا دیکھ کر خود ہدیہ پیش کرنے کی نیت کر رہا تھا اور شیخ کے اس طرح بے تکلف کھانے سے وہ باغ باغ ہو گیا ۱۲) دوسری یہ بات دیکھنی چاہیئے

کہ پہلے بزرگوں نے ایسے اعتراض کے کام کس غرض سے کئے تھے اس کا اصلی منشا کبر کا علاج تھا کہ لوگ ہم کو بزرگ نہ سمجھیں اس وقت یہ غرض رندانہ وضع سے حاصل ہوتی تھی اور ایسی وضع بنانے والے کو سزائیں دیجاتی تھیں اس لئے وہ ایک دو حرکت رندانہ کر لیا کرتے تھے تاکہ عوام معتقد ہو کر پریشان نہ کریں۔ اور اب تو ایسے لوگوں کو عوام قطب وابدال سمجھتے ہیں تو اب یہ غرض رندانہ وضع سے حاصل نہیں ہو سکتی بلکہ اب یہ بات حاصل ہوتی ہے ملانوں کی سی شکل بنانے اور شریعت کی پابندی کرنے سے آجکل جو شخص ملانوں کی سی شکل بنالے تو ساری دنیا اس کو کمالات سے خالی سمجھتی ہے اور یوں کہتے ہیں کہ اس کو سوائے مسئلے مسائل کے کچھ نہیں آتا پس آجکل ملامتی بننے کا طریقہ بھی پابندی شریعت ہی ہے غرض یہ بالکل غلط ہے کہ پہلے بزرگوں نے قصداً خلاف شرع کام کئے ہیں بلکہ اس کی حقیقت وہ ہے جو میں نے ابھی بیان کی خوب سمجھ لو کہ جو شخص شریعت کی مخالفت کرتا ہے وہ کبھی بزرگ نہیں ہو سکتا اور اگر تم کو کسی پر ایسا ہی رحم آتا ہے تو اس کو برا بھلا مت کہو لیکن معتقد بھی نہ بنو کسی کو برا کہنے کا منصب عوام کا نہیں بلکہ یہ علماء کا منصب ہے تم کسی کو کچھ نہ کہو بلکہ یہ کام جس جماعت کا ہے اسی پر چھوڑ دو۔ اور علماء کو فاسقوں کے برا کہنے کا تو منصب ہے ہی ان کو تو یہ بھی حق حاصل ہے کہ اچھوں کو بھی برا کہدیں اگر انتظام شریعت کے لئے اس کی ضرورت ہو چنانچہ شیخ اکبر رحمۃ اللہ علیہ کو ایک بزرگ عالم ساری عمر زندیق کہتے رہے مگر جب شیخ اکبر کے انتقال کی خبر آئی تو رونے لگے اور فرمایا کہ افسوس آج بہت بڑے صدیق کا انتقال ہو گیا لوگوں کو حیرت ہوئی کہ عمر بھر تو ان کو زندیق کہتے رہے اور آج بہت بڑا صدیق بتلاتے ہیں۔ آخر دریافت کیا کہ اگر وہ ایسا عالی مرتبہ شخص تھا تو آپ نے آب تک زندیق کہکر ہمکو اس کی برکات و فیوض سے کیوں محروم رکھا۔ فرمایا واقعی وہ بہت بڑا صدیق تھا اگر تم کو اس سے کچھ نفع نہ ہوتا اگر تم اس کی صحبت میں رہتے تو زندیق ہی بن جاتے کیونکہ اس کے دقیق علوم عام عقول سے بالاتر تھے تم اس کی باتوں کو سنکر اپنی سمجھ کے موافق مطلب نکالتے حقیقت تک نہ پہونچتے اور زندقہ میں مبتلا ہوتے اس لئے میں تم کو اس سے بچاتا رہا اور ظاہر میں زندیق کہتا رہا۔ غرض علماء نے انتظام شریعت کے لئے بعض دفعہ اچھے آدمیوں کو بھی جان کر برا کہا ہے مگر یہ علماء ہی کا منصب ہے عوام کا منصب نہیں تو اگر آپ کو کسی بھنگڑ سنگڑ پر ولایت کا شبہ ہو تو آپ اس کو برا نہ کہئے کیونکہ

برا کہنا آپ پر فرض نہیں ہے حضرت رابعہ تو شیطان کو بھی برا نہ کہتی تھیں اور فرمایا کرتیں کہ مجھے دوست کی یاد سے اتنی فرصت کہاں جو دشمن کا ذکر لیکر بیٹھوں تو اگر آپ کسی کو برا نہ کہیں تو اس پر ملامت نہ کی جائے گی یہ تو اچھی بات ہے بلکہ ملامت اس پر کیجاتی ہے کہ تم ان بھنگڑوں سے دینی نفع یا دنیوی فائدہ حاصل کرنے جاؤ اگر ان میں سے کوئی سچ مچ بھی مجذوب ہو تو تمھیں اس سے کیا نفع۔ دین کا نفع نہ ہونا تو ظاہر ہی ہے دنیا کا بھی ان سے کچھ نفع نہیں لوگ سمجھتے ہیں کہ مجذوب سیف زبان ہوتے ہیں جو کہدیتے ہیں وہی ہو جاتا ہے تو سمجھو کہ ان کی زبان سے نکلتا وہی جو ہونے والا ہوتا ہے انکے کہنے کو وقوع میں کچھ دخل نہیں اس میں بھی لوگوں کی نادانی ہے کہ ان کی باتوں کو وقوع کا سبب سمجھتے ہیں حالانکہ وہ اپنے اختیار سے کوئی بات بھی نہیں کہہ سکتے ان کے منہ سے وہی نکلتا ہے جو ہونے والا ہے اگر وہ نہ کہتے جب بھی اس کا وقوع ضرور ہوتا تو جب مجذوبوں سے نہ دین کا نفع ہے نہ دنیا کا پھر تم مفت میں وہاں جاکر گالیاں کیوں کھاتے ہو عجیب بات ہے کہ جو بزرگ خوش اخلاقی سے ملیں ان سے تو عوام بھاگتے ہیں اور جو بات بات میں گالیاں دیں ان کو لپٹتے ہیں وہی قصہ ہو گیا جیسے ایک شخص کی حکایت ہے کہ اس کی بیوی نہایت حسین تھی مگر وہ اسے منہ نہ لگاتا تھا بلکہ ایک رنڈی سے پھنسا ہوا تھا بیوی کو فکر ہوئی کہ دیکھنا چاہیئے وہ رنڈی کیسی ہے، دیکھا تو صورت میں خاک بھی نہ تھی مگر حالت یہ تھی کہ میاں جب اس کے پاس پہونچتے تو اس نے دو چار جوتے لگائے کہ بھڑوے کہاں تھا اتنی دیر کہاں لگائی وہ جوتے مارتی جاتی اور یہ خوشامدیں کرتا بیوی نے سمجھ لیا کہ اس مرد کے لئے اس انداز کی ضرورت ہے چنانچہ اس کے بعد جو مرد گھر میں آیا تو بیوی نے بھی یہی طریقہ اختیار کیا کہ دو چار جوتے لگائے اور گالیاں برسانے لگی تو وہ مرد ہنس کر کہنے لگا کہ بی تیرے اندر بس اسی کی کسر تھی اب سے میں کہیں نہ جاؤں گا۔ (تو واقعی لات کا آدمی بات سے نہیں مانا کرتا) بعض آدمی اسی کے مشتاق ہوتے ہیں کہ گالیاں کھائیں برا بھلا سنیں سو یہ طریقہ تو سب کو آتا ہے مگر تہذیب مانع ہوتی ہے۔ بعض لوگ مجذوبوں سے دعا کے واسطے کہتے ہیں تو یاد رکھو وہ کسی کے واسطے دعا نہیں کرتے وہاں دعا کا محکمہ ہی نہیں بلکہ وہ تو یہ دیکھتے ہیں کہ حکم کیا ہو رہا ہے۔ مولانا اسکی بابت فرماتے ہیں ؎

کفر باشد نزد شاں کردن دعا کائے خدا از ما بگرداں ایں قضا
(ان کے نزدیک دعا کرنا کفر ہے کہ اے خدا ہم سے اس حکم کو پھیر دے)

خوب سمجھ لیجئے کہ ایک تو کوتوال ہوتا ہے اور ایک ہوتا ہے مصاحب تو کوتوال کی یہ مجال نہیں کہ وہ کسی مجرم کی سفارش کر سکے وہ تو حکم کا تابع ہے جس کے لئے سزا کا حکم ہوا سزا کر دیتا ہے اور جس کے لئے رہائی کا حکم ہو گیا اسے رہا کر دیتا ہے اور مصاحب کو سفارش کا اختیار ہوتا ہے وہ بڑے سے بڑے مجرم کی سفارش کر سکتا ہے تو مجذوبوں کا درجہ کوتوال کا سا ہے وہ سفارش اور دعا نہیں کر سکتے اور سالک کی حالت دوسری ہے یعنی ان میں مصاحبت کی شان ہوتی ہے وہ دعا اور سفارش کر سکتے ہیں گو ان کے اختیارات زیادہ نہیں ہوتے مگر مقبول بھی زیادہ ہیں۔ اس کی ایسی مثال ہے جیسے سلطان محمود کے سامنے ایک تو ایاز تھا اور ایک حسن میمندی حسن میمندی کے اختیارات بہت کچھ تھے کیونکہ وزیر اعظم تھا اور ایاز کے اختیارات باضابطہ کچھ نہ تھے کیونکہ وہ کسی عہدہ پر معین نہ تھا مگر قبولیت اور قرب کی یہ حالت تھی کہ جب محمود کو کسی بات پر غصہ آجاتا تو کسی کو دم مارنے کی مجال نہ تھی اور حسن میمندی کے سب اختیارات رکھے رہ جاتے اس وقت سب لوگ ایاز ہی کی خوشامدیں کرتے تھے کہ اس وقت سلطان سے تمہارے سوا کوئی بات نہیں کر سکتا بس سالکین کی وہ شان ہے جو ایاز کی شان تھی یہ ہر وقت دعا، اور سفارش کر سکتے ہیں تو دنیا بھی انہی کے پاس سے ملتی ہے اور ملنے کے یہ معنے نہیں کہ وہ خود تم کو خزانے دیدیں گے بلکہ مطلب یہ ہے کہ حاکم سے عرض کر دیں گے اور دین تو انہی میں منحصر ہے مگر لوگوں نے عجیب خلط ملط کر رکھا ہے مجذوبوں ہی سے دنیا بھی طلب کرتے ہیں اور دین بھی حالانکہ ان کے اختیار میں کچھ بھی نہیں گو وہ خود صاحب ولایت ہوتے ہیں مگر کسی کو کچھ دے نہیں سکتے اور یہ بھی جب ہے کہ وہ مجذوب ہوں اور صاحب حال ہوں اور اگر صاحب حال نہ ہوں جیسے آجکل عموماً بھنگڑ سنگڑ پھرتے ہیں تو وہ صاحب ولایت بھی نہیں بلکہ ان میں بعض تو پاگل سڑی ہوتے ہیں اور بعضے بنے ہوئے ہوتے ہیں وہ تو پورے شیطان ہیں اور صاحب حال کی پہچان اہل علم کے لئے یہ ہے کہ اس کے پاس بیٹھ کر خدا کی محبت زیادہ ہو اور دنیا کی محبت کم ہو اب دیکھئے ان بھنگڑوں کے پاس جا کر بھی کبھی ایسا ہوتا ہے ہرگز نہیں بس خوب سمجھ لو کہ ہر مجنون مجذوب نہیں اور اگر کوئی

ہو بھی تو وہاں نہ دنیا ہے نہ دین دنیا تو اس لئے نہیں کہ وہ دعا نہیں کر سکتا اور دین اس لئے نہیں کہ اس کے پاس تعلیم نہیں پس ان کی زیارت تو کرو وہ بھی جب کہ ان میں صاحب حال ہونے کی علامت موجود ہو جس کو اہل علم ہی سمجھ سکتے ہیں ورنہ جاہل کو تو مجذوب اور مجنون میں فرق نہیں معلوم ہو سکتا مگر زیارت کے سوا اور کوئی تعلق نہ رکھو حتیٰ کہ میں تو اہل علم کو بھی خاص طور پر یہی کہتا ہوں غرض یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا (اے ایمان والو) سے یہ مسئلہ مستنبط ہو گیا کہ فلاح آخرت کے لئے ایمان یقیناً شرط ہے اور اس سے قرآن کی جامعیت معلوم ہوتی ہے کہ ذرا سے لفظ سے کتنا بڑا مسئلہ ثابت ہو گیا گو یہاں اس پر کوئی زور نہیں دیا گیا نہ صیغہ امر سے اس کو تعبیر کیا گیا ہے مگر طرز خطاب ہی سے یہ لفظ اس مفہوم پر دلالت کر رہا ہے کہ فلاح کے لئے سب سے اول ایمان شرط ہے۔ پس اول درجہ تو ایمان کا ہے دوسرا درجہ اس کے بعد مراتب متوسط کا ہے جن کو اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا وَاتَّقُوا اللّٰهَ (صبر کرو خود تکالیف اور کفار کے مقابلہ پر صبر کرو اور مستعد رہو اور اللہ سے ڈرتے رہو) میں بیان کیا گیا ہے یہ چار چیزیں ہیں اور تیسرا درجہ نتیجہ کا ہے جس کا بیان لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ (تاکہ تم فلاح پاؤ) میں ہے جو شمار میں چھٹی چیز ہے گو ترتیب کا مقتضا یہ تھا کہ میں اول مراتب متوسط کو بیان کرتا لیکن میں ضرورت کی وجہ سے نتیجہ کو مقدم کرتا ہوں کیونکہ آجکل ترقی و فلاح پر بہت گفتگو ہو رہی ہے اور ہر شخص اس کا طالب ہے تو سنئے حق تعالےٰ ایمان اور چند احکام کا بیان فرما کر بطور نتیجہ کے فرماتے ہیں لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝ کہ امید ہے تم کو فلاح حاصل ہو اس سے ایک تو یہ معلوم ہوا کہ اخیر چیز اور مقصود فلاح ہے دوسرے یہ معلوم ہوا کہ اس کا وعدہ ان اعمال مذکورہ پر کیا گیا ہے اور یہاں فلاح مطلق ہے جس کو فلاح دین وغیرہ کے ساتھ مقید نہیں کیا گیا تو اس درجہ میں عموم الفاظ کی بنا پر میں کہتا ہوں کہ اس آیت سے یہ مسئلہ مستنبط ہوا کہ فلاح خواہ دین کی ہو یا دنیا کی ان احکام پر ہی عمل کرنے سے حاصل ہوتی ہے اور یہ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ اعمال شرعیہ سے مقصود تو محض فلاح دین ہے مگر ترتب فلاح دنیا کا بھی ہوتا ہے پس فلاح دین تو اس لفظ کا مدلول مطابقی ہے اور فلاح دنیا مدلول التزامی ہے یعنی اعمال شرعیہ کے لئے فلاح دنیا لازم ہے گو مقصود نہ ہو۔ اب سنئے کہ اس زمانہ میں ہر شخص فلاح کا طالب ہے فلاح دنیوی کے طالب تو بہت کثرت سے ہیں حتیٰ کہ اس کے لئے دین کو بھی برباد کر دیا جاتا ہے اور اکثر لوگ یہ سمجھتے ہیں

کہ جب تک دین کو برباد نہ کریں اس وقت تک فلاح دنیوی حاصل نہیں ہوسکتی چنانچہ بعض لوگوں کو جب گناہوں سے بچنے کے لئے کہا جاتا ہے تو وہ جواب دیتے ہیں کہ صاحب ہم تو دنیادار آدمی ہیں ہم سے تقویٰ طہارت کہاں ہوسکتا ہے اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ دنیادار ہونا تقویٰ طہارت کے منافی ہے گویا یوں کہیے کہ دین کو ترقی دنیا کے لئے مضر اور مانع سمجھتے ہیں اسی لئے کوئی تجارت کرتا ہے تو اس میں احکام شرعیہ کی رعایت نہیں کرتا کوئی زراعت کرتا ہے تو اس میں ناجائز امور سے اجتناب نہیں کرتا اور عام طور پر یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ دیندار ہونے کے معنی یہ کہ تجارت وزراعت وغیرہ سب کو بالائے طاق رکھدے اور ان کاموں میں مشغول ہوکر دیندار بننا مشکل ہے کیونکہ دین ان کاموں میں رکاوٹ پیدا کرتا ہے سو خوب سمجھ لو کہ یہ خیال بالکل غلط ہے دین ہرگز فلاح دنیا اور ترقی دنیا کے لئے مانع نہیں ہے اور دیندار بن کر بھی تجارت وزراعت ہوسکتی ہے مگر اس کی دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ وہ ذریعہ معاش دین کے خلاف نہ ہو تب تو وہ دنیا نہیں ہے بلکہ عین دین ہے کیونکہ حدیث میں ہے کَسْبُ الْحَلَالِ فَرِیْضَةٌ مِّنْ بَعْدِ الْفَرِیْضَةِ (حلال کمائی فرض ہے فرض کے بعد) اس صورت میں تجارت وزراعت بھی باعث ثواب ہے، بلکہ ان کاموں میں مشغول ہوکر دین کی پابندی کرنا یہ نرے ذکر و شغل سے افضل ہے چنانچہ ایک بزرگ کا انتقال ہوا جو بہت بڑے تارک اور زاہد اور صوفی تھے انتقال کے بعد کسی نے ان کو خواب میں دیکھا پوچھا کہ حضرت آپ کے ساتھ کیا معاملہ ہوا فرمایا مجھے بخشدیا گیا مگر بھائی ہمارے پڑوس میں جو ایک مزدور صاحب عیال رہتا تھا وہ ہم سے افضل رہا کیونکہ وہ رات دن اپنے بال بچوں کے لئے محنت مزدوری کرتا اور ذکر و شغل کم کرتا تھا مگر ہر وقت اس کی تمنا یہ تھی کہ فرصت ملے تو میری طرح ذکر میں مشغول ہو حق تعالیٰ نے اس نیت کی برکت سے اس کو وہ درجہ عطا کیا جو مجھے بھی نصیب نہیں ہوا اس سے معلوم ہوا کہ کسب حلال کے ساتھ احکام الٰہیہ کی پابندی کرنا نرے ذکر و شغل ہونے سے بعض دفعہ افضل ہوجاتا ہے مگر اس سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ سب کے لئے یہی طریقہ افضل ہے اور بس ہر شخص اسی طریق کو اختیار کرلے بات یہ ہے کہ مصالح باہم متعارض ہیں کسی کے لئے ایک طریق مصلحت ہے اور کسی کے لئے مفسدہ ہے اس کی ایسی مثال ہے جیسے طب میں ایک ایک مرض کے لئے متعدد دوائیں نافع ہوتی ہیں مگر ہر دوا

ہر شخص کے لئے مفید نہیں ہوتی بلکہ اس میں اس کی بھی ضرورت ہے کہ ہر شخص کے مزاج کا لحاظ کر کے چند دواؤں میں سے ایک کو منتخب کیا جائے اور اس کے ساتھ کچھ اور دوائیں بھی ملائی جائیں جو اس کی مضرتوں کی اصلاح کر دیں اور نفع کو قوی کر دیں چنانچہ طبیب ان سب باتوں کا لحاظ کر کے نسخہ مرتب کرتا ہے اب اگر کوئی مریض حکیم کے نسخہ کو چھوڑ دے اور اس میں سے صرف ایک دوا کو چھانٹ لے تو یہ اس کی غلطی ہے اس طرح وہ کبھی شفایاب نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ خود دوا جو اس نے منتخب کی ہے اس مرض کو مفید ہے مگر اس مریض کے مزاج کے لحاظ سے اس کے ساتھ بدرقہ اور مصلح کی بھی ضرورت تھی جس کے بغیر یہ دوا مرض کو زائل نہیں کر سکتی اسی طرح باطن میں بھی ہر مریض کو شیخ کی تجویز کا اتباع ضروری ہے اپنی رائے سے کسی طریق کے تجویز کر لینے کا اسے حق نہیں ہم نے مانا کہ اشتغال بالکسب بھی بعض دفعہ وصول کے لئے کافی ہو جاتا ہے مگر ہر ایک کو نہیں بلکہ خاص استعداد والوں کو کافی ہوتا ہے اور بدون اس خاص استعداد کے اس سے نفع نہیں ہوتا اس کی ایسی مثال ہے جیسے طلبہ میں مشہور ہے کہ شرح ملا جامی کسی کو اچھی طرح آجائے تو استعداد علوم کے لئے کافی ہے تو ایک طالب علم نے یہ بات سنکر اول ہی سے شرح جامی شروع کر دی اور دس بارہ برس تک اسی میں مشغول رہا تو یہ اس کی حماقت ہے کیونکہ شرح جامی کو استعداد علوم کے لئے کافی ہے مگر خود اس کے لئے بھی تو خاص استعداد کی ضرورت ہے جو میزان منشعب اور نحو میر و ہدایۃ النحو وغیرہ کے بغیر حاصل نہ ہوگی اسی طرح اشتغال بالکسب ضرور کافی ہے مگر اس کے لئے بھی خاص استعداد کی ضرورت ہے اور وہ استعداد حاصل کرنے کے لئے طبیب کامل سے مشورہ کی ضرورت ہے پھر جس کے لئے وہ اشتغال بالکسب تجویز کرے اس کو یہی طریق مناسب ہے، اور جس کے لئے ترک اسباب تجویز کرے اس کے مناسب یہی طریق ہے کیونکہ جس طریق کو شیخ تجویز کرتا ہے حق تعالیٰ اس کو طالب کے مناسب ہی کر دیتے ہیں کسی طریق کا مناسب ہونا یا غیر مناسب ہونا تو در اصل حق تعالیٰ کے قبضہ میں ہے اور وہیں سے سب کچھ ملتا ہے مگر وہ اکثر مشائخ کاملین کے دل میں ہر ایک کے مناسب ایک بات ڈالدیتے ہیں کہ اس مریض کے لئے فلاں طریق تجویز کرنا مناسب ہے ۔

کار زلف تست مشک افشانی اما عاشقاں مصلحت را تہمتے بر آہوئے چین بستہ اند

(خشک افشانی تیرے زلف کا کام مصلحت کی وجہ سے چین کے ہرنوں پر تہمت باندھ دی ہے)

غرض حق تعالےٰ نے ہر ایک کے لئے ایک خاص طریق مقرر کیا ہے کہ اس کو اسی سے وصول ہوتا ہے کسی کو اشتغال بالکسب سے دولت ملتی ہے اور کسی کو ترک اسباب سے پس جس کے لئے جو طریق تجویز کر دے وہ اسی کو اختیار کرے اور اسی پر راضی رہے کسی کے لئے خندہ مناسب ہے اور کسی کے لئے گریہ مناسب ہے اس میں اپنی رائے کو دخل نہ دینا چاہیئے اسی کو کہتے ہیں ؎

بگوش گل چہ سخن گفتہ کہ خندان ست | بعندلیب چہ فرمودہ کہ نالان ست

(گل کے کان میں کیا کہدیا ہے کہ وہ خندان ہے اور بلبل سے کیا فرمادیا ہے کہ وہ نالاں ہے)

مولانا فرماتے ہیں ؎

چونکہ بر میخت بہ بندد بستہ باش | چوں کشاید چابک و برجستہ باش

یعنی جب وہ باندھ دیں بند ہے رہو اور جب کھولدیں کودتے پھرو اگر وہ بیفکری دیں بے فکر رہو۔ اور اگر افکار میں مبتلا رکھیں تو اسی میں خوش رہو کیونکہ افکار و تشویشات سے بھی ترقی ہوتی ہے اور ثواب بڑھتا ہے طلب اسی کا نام ہے اور بدون اس کے کام نہیں چل سکتا اس طریق میں اپنی تجویز کو فنا کر دینا چاہیئے۔ بعض لوگ ان تجویزوں ہی کی وجہ سے پریشان ہوتے ہیں کیونکہ وہ اپنے لئے ایک خاص حالت تجویز کر لیتے ہیں کہ ہم اس حال میں رہیں تو اچھا ہے پھر جب اس کے خلاف دوسری حالت طاری ہوتی ہے تو گھبرا جاتے ہیں۔ میں نے ایک صاحب کو دیکھا جو عالم آدمی معمر ڈپٹی کلکٹر تھے جب ان کی پنشن ہوگئی تو ان کا جی چاہتا تھا کہ الگ بیٹھ کر اللہ اللہ کروں خدا کی قدرت کہ ذکر و شغل شروع کرنے کے بعد ان کے دو بیٹے ایک دم سے مجنوں ہوگئے ایک تو ان کا لڑکا ہے اور ایک لڑکے کا لڑکا ہے تو وہ سخت پریشان ہوگئے کیونکہ اب ان کے علاج معالجہ میں مشغول ہونا پڑا وہ خلوت و یکسوئی فوت ہوگئی اور بعض دفعہ اللہ اللہ کرنا بھی نصیب نہ ہوتا تھا لیکن عارف کے لئے کچھ پریشانی نہیں کیونکہ عارف اپنے لئے کوئی حالت تجویز نہیں کیا کرتا جب تک حق تعالیٰ خلوت میں رکھیں خلوت میں رہتا ہے اور جب وہ خلوت سے نکالنا چاہیں نکل جاتا ہے اور اسی میں راضی رہتا ہے اسی کو فرماتے ہیں ؎

چونکہ بر میخنت بہ بند دبستہ باش	چوں کشاید چابک و برجستہ باش

(جب وہ باندھ دیں بندھے رہو جب کھول دیں کودتے اچھلتے پھرو)

میں کہتا ہوں کہ اصل مقصود تو رضائے حق ہے اور وہ جس طرح خلوت میں ہوتی ہے بعض دفعہ خدمت خلق میں ہوتی ہے تو کیا ان کو مجنون کی خدمت میں ثواب نہ ملتا ضرور ملتا اس صورت میں یہ فکر ہی ترقی کا موجب ہے اس وقت بفکری اور خلوت مقید نہیں بلکہ خلوت میں اللہ اللہ کرنے سے جو ثواب ملتا خدمت مجنوں میں اس سے زیادہ ملتا پھر پریشانی کس لئے۔ ایک شخص حضرت حاجی صاحب قدس اللہ سرہم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ میں بیمار ہو گیا تھا کئی وقت سے حرم میں جاکر نماز بھی نہ پڑھ سکا اس کا بہت رنج ہے۔ حضرت نے فرمایا کہ قرب کے طریقے مختلف ہیں یہ بھی ایک طریقہ ہے کہ گھر پر نماز پڑھو اور حرم کی حاضری کو ترسو۔ جس حال میں وہ رکھیں اسی میں راضی رہنا چاہیئے۔ پھر فرمایا کہ اس کی ایسی مثال ہے جیسے حج کو بمبئی سے بھی جاتے ہیں اور کراچی سے بھی اگر وہ بمبئی سے بلا دیں بمبئی سے چلے جاؤ اور کراچی سے بلاویں تو کراچی سے چلے جاؤ مقصود دونوں حالتوں میں حاصل ہے اسی کو فرماتے ہیں ؎

چونکہ بر میخنت بہ بند دبستہ باش	چوں کشاید چابک و برجستہ باش

(جب باندھیں بندھے رہو جب کھولدیں کودتے اچھلتے پھرو)

اسی طرح اگر حق تعالےٰ کسی کو اسباب میں رکھیں اسباب میں رہو اور ترک اسباب میں رکھیں تو اسی میں رہو چنانچہ اگر کوئی شخص زراعت و تجارت اس طرح کرے کہ وہ دین کے موافق ہو کوئی بات خلاف شرع نہ ہو تو یہ عین ثواب ہے اور اس حالت میں یہ دنیا نہیں بلکہ عین دین ہے ہاں اگر کوئی بات دین کے خلاف ہے تو البتہ یہ دنیا ہے جو دین کو مضر ہے پس یہ خیال غلط ہے جو عام طور پر لوگوں کے دل میں جما ہوا ہے کہ دین کے ساتھ دنیا کے کام نہیں ہو سکتے اور دنیاوی فلاح بدون ترک دین کے حاصل نہیں ہو سکتی خدا تعالےٰ کا کلام اس خیال کو غلط بتلا رہا ہے کیونکہ یہاں حق تعالےٰ نے چند احکام بیان فرما کر لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ (تاکہ تم فلاح پاؤ کامیاب ہو جاؤ) فرمایا ہے جو اپنے عموم سے فلاح دنیوی کو بھی شامل ہے

اس میں غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ یہ اعمال شرعیہ فلاح اخروی کا طریق تو ہیں ہی مگر فلاح دنیوی بھی ان کو لازم ہے لیکن سب سے پہلے فلاح کی حقیقت سمجھنا چاہیئے تو سمجھو کہ فلاح کہتے ہیں کامیابی کو نہ کہ مالیابی کو آجکل لوگوں نے کثرت مال کو فلاح سمجھ لیا ہے یہ غلط ہے دیکھئے قارون کو بہت لوگ صاحب نصیب اور صاحب فلاح سمجھتے تھے وہ بھی اسی خیال کے لوگ تھے جیسے آجکل بعض لوگوں کا خیال ہے چنانچہ جب وہ اپنے حشم خدم لیکر ساز وسامان کے ساتھ نکلا ہے تو ان لوگوں کی رال ٹپک پڑی اور کہنے لگے یٰلَيْتَ لَنَا مِثْلَ مَا أُوتِيَ قَارُونُ إِنَّهُ لَذُو حَظٍّ عَظِيمٍ ۝ کیا خوب ہوتا کہ ہم کو بھی وہ ساز وسامان ملا ہوتا جیسا قارون کو ملا ہے واقعی وہ بڑا صاحب نصیب ہے تو اس وقت جو عقلا تھے انھوں نے ان لوگوں کو ان کی غلطی پر متنبہ کیا اور بتلایا کہ فلاح اور خوش نصیبی کثرت مال سے نہیں ہے بلکہ یہ تو اطاعت خداوندی سے حاصل ہوتی ہے چنانچہ ارشاد ہے وَقَالَ الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ وَيْلَكُمْ ثَوَابُ اللَّهِ خَيْرٌ لِّمَنْ آمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ۚ وَلَا يُلَقَّاهَا إِلَّا الصَّابِرُونَ ۝ اور جن لوگوں کو فہم عطا ہوا تھا وہ کہنے لگے کہ ارے تمہارا ناس ہو (تم اس مال اور سامان پر کیا للچاتے ہو) اللہ تعالیٰ کا ثواب ہزار درجہ (اس سے) بہتر ہے جو ایسے شخص کو ملتا ہے کہ ایمان لائے اور نیک عمل کرے اور وہ (کامل طور پر) انہی لوگوں کو دیا جاتا ہے جو (دنیوی حرص وطمع سے) صبر کرنے والے ہیں۔ اس جواب سے معلوم ہوگیا کہ کثرت مال سے خوش نصیبی اور فلاح نہیں ہوتی بلکہ دنیا کی فلاح اور خوش نصیبی بھی اطاعت الٰہیہ ہی سے حاصل ہوتی ہے اس زمانہ کے عوام عقلاً تو اس جواب سے خاموش ہوگئے ہوں گے مگر شاید کسی کو دلیل حسی کا انتظار رہا ہو تو وہ زمانہ عجیب تھا کہ بات بات کے لئے دلائل وآیات ظاہر ہوتی تھیں چنانچہ حق تعالےٰ نے ایسی نشانی ظاہر کردی جس سے دنیا داروں کو بھی اقرار کرنا پڑا کہ واقعی خدا تعالیٰ کی نافرمانی کرنے والوں کو دنیوی فلاح بھی حاصل نہیں ہوسکتی گو وہ کیسے ہی مالدار ہوں بلکہ دنیا میں بھی خوش نصیب اور صاحب فلاح دیندار ہی ہے حق تعالےٰ فرماتے ہیں فَخَسَفْنَا بِهِ وَبِدَارِهِ الْأَرْضَ فَمَا كَانَ لَهُ مِن فِئَةٍ يَنصُرُونَهُ مِن دُونِ اللَّهِ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُنتَصِرِينَ ۝ وَأَصْبَحَ الَّذِينَ تَمَنَّوْا مَكَانَهُ بِالْأَمْسِ يَقُولُونَ وَيْكَأَنَّ اللَّهَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَن يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ ۝

وَيَقْدِرُ لَوْلَآ أَنْ مَّنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا لَخَسَفَ بِنَا وَيْكَاَنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْكٰفِرُوْنَ ۔ پھر ہم نے قارون کو اور اس کے محلسرائے کو زمین میں دھنسا دیا سو کوئی ایسی جماعت نہ ہوئی جو اس کو اللہ کے عذاب سے بچا لیتی اور نہ وہ خود ہی اپنے آپ کو بچا سکا اور کل جو لوگ اس جیسے ہونے کی تمنا کر رہے تھے وہ (آج دھنستا ہوا دیکھ کر) کہنے لگے کہ بس جی یوں معلوم ہوتا ہے کہ اللہ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہے زیادہ روزی دیدیتا ہے (اور جس کو چاہے) تنگی سے دیتا ہے (یہ ہماری غلطی تھی کہ ہم کثرت مال کو خوش نصیبی سمجھتے تھے بس جی خوش نصیبی اور بدنصیبی کا مدار اس پر نہیں بلکہ یہ تو محض کسی حکمت کی وجہ سے ہے) اگر ہم پر اللہ تعالیٰ کی مہربانی نہ ہوتی تو ہم کو بھی دھنسا دیتا) (کیونکہ جب دنیا کے گناہ میں ہم بھی مبتلا ہو گئے تھے) بس جی معلوم ہوا کہ کافروں کو فلاح نہیں ہوتی (گو چند روز مزے لوٹ لیں مگر انجام پھر ناکامی اور خسران ہی ہے) اس میں حق تعالیٰ نے دنیا داروں کا قول نقل فرمایا ہے کہ آخر کو انھوں نے بھی اقرار کر لیا کہ کافروں کو فلاح اور کامیابی نہیں ہوتی اور یقیناً قارون کی جو حالت آخیر میں ہوئی اس کو دیکھ کر کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ قارون کامیاب تھا ہرگز نہیں، ہاں یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ مالیاب تھا پس معلوم ہو گیا کہ فلاح کامیابی کا نام ہے نہ مالیابی کا اور یہ ضرور نہیں کہ جو شخص مالیاب ہو وہ کامیاب بھی ہو مگر عجیب اندھیر ہے کہ آجکل لوگ تمول ہی کو کامیابی سمجھتے ہیں حالانکہ مال خود مقصود نہیں بلکہ یہ تو مقصود کا وسیلہ ہے مال تو ایسا ہے جیسے بادام کا خول اور مقصود ایسا ہے جیسے بادام کا مغز تو بڑا نادان ہے وہ شخص جو چھلکے کو مقصود سمجھے اور انہی کو جمع کرنے میں ساری عمر گنوا دے اس کے دماغ کو بادام سے خاک بھی قوت حاصل نہ ہوگی اور یقیناً وہ مقصود سے ناکام رہیگا۔ اور جو شخص مغز کو مقصود سمجھے اور اسی کو جمع کرے گو اس کے پاس چھلکا ایک بھی نہ ہو وہ کامیاب ہے اس کے دماغ میں بیشک قوت پہونچے گی اب سمجھو کہ اصل مقصود کیا ہے تو سب جانتے ہیں کہ مال آرام و راحت کے لئے جمع کیا جاتا ہے پس راحت و آرام اصل چیز ہے اور یہی مغز ہے اب میں پوچھتا ہوں کہ اگر کسی کو بدون مال کے آرام و چین حاصل ہو تو وہ کامیاب ہو گا یا نہیں یقیناً وہ کامیاب ہے اور اس کی ایسی مثال ہوگی جیسے کسی کے پاس بادام کی گریاں موجود ہوں گو چھلکے نہ ہوں اور اگر کسی کو باوجود کثرت مال کے آرام و چین نصیب نہ ہو تو بتلائیے وہ

ناکام ہے یا نہیں یقیناً وہ ناکام ہے ۔ اور بے چینی کے ساتھ اس کے پاس مال کا جمع ہونا ایسا ہے جیسے کسی کے پاس خالی بادام کے چھلکے جمع ہوں جن میں مغز کا نام نہ ہو تو میں دعوے کے ساتھ کہتا ہوں کہ مطیع خدا کے برابر دنیا کا آرام و چین بھی کسی کو حاصل نہیں ہوتا اس کو وہ راحت ہوتی ہے جو کسی بادشاہ کو بھی نصیب نہیں مجھے آپ کوئی دیندار دنیوی آسائش سے محروم دکھا دیجئے اور میں دنیادار ہزاروں آرام سے محروم بتلا ہوں جو ہر وقت سینکڑوں تشویشات اور ہزاروں افکار میں مبتلا ہیں میں بقسم کہتا ہوں کہ مجھ کو امیروں پر غریبوں سے زیادہ رحم آتا ہے کیونکہ غریبوں کو اتنے افکار نہیں ہیں جتنے امراء کو ہیں ہمارے اکثر بھائی چند دن میں امیروں کی گردنیں دباتے ہیں اور ان سے زیادہ وصول کرنا چاہتے ہیں کیونکہ ظاہر میں وہ غریبوں سے زیادہ مالدار ہیں مگر مجھے ان پر رحم آتا ہے کیونکہ جیسا مال ان کے پاس زیادہ ہے ویسے ہی ان کے افکار بھی زیادہ ہیں اور خرچ بھی بہت ہیں مثلاً کسی کی آمدنی پانچسو روپیہ ماہوار کی ہے تو اس کے اخراجات سات سو روپئے ماہوار کے ہیں اور خرچ کا آمدنی سے زیادہ ہونا جڑ ہے کلفت اور پریشانی کی اور جو لوگ غریب ہیں ان کی آمدنی اور خرچ عموماً برابر ہے جتنا کما لیا وہی کھا لیا پہن لیا بلکہ اس میں سے بھی بعض دفعہ کچھ بچا لیتے ہیں اس لئے غریب آدمی دس پیسوں میں سے ایک پیسہ بآسانی دے سکتا ہے اور امیر آدمی ایک ہزار میں سے بھی ایک روپیہ نہیں دے سکتا کیونکہ وہ ہزار سے زیادہ کا مقروض ہے وہ اگر ایک روپیہ دیگا تو اس سے بھی قرض میں ہی کچھ اضافہ ہوگا تو جو اس راز کو سمجھے گا وہ امیروں پر غرباء سے زیادہ رحم کریگا مگر لوگ ان کے ظاہری سامان کو دیکھ کر انہی کی گردن دباتے ہیں تو ان بیچاروں کو زیادہ نہ ستانا چاہیئے ۔ دوسری بات یہ ہے کہ غریب آدمی کے اگر اخراجات بڑھتے ہیں تو وہ آمدنی بھی بڑھا دیتے ہیں مثلاً پہلے دو آنہ یومیہ پر مزدوری کرتے تھے کسی سال گرانی ہوگئی تو انھوں نے مزدوری بڑھا دی اب چار آنہ یومیہ پر کام کرنے لگے اور کام لینے والے مجبور ہو کر وہی دیتے ہیں جو مزدور مانگتا ہے تو غریبوں کی آمدنی ان کے اختیار میں ہے اور امراء کی آمدنی ان کے قبضہ میں نہیں ۔ نیز امراء کے تعلقات بھی وسیع ہوتے ہیں غرباء کے تعلقات اس درجہ وسیع نہیں ہوتے غریب کو بہت سے بہت اپنے گھر کا فکر ہے اور بال بچوں کا یا دو چار جانور کا

اور امیروں کو گھر کا الگ فکر احباب اور حکام کی خاطر مدارات کا جدا فکر پھر جائیداد اور زمین کا بھی خیال ہے کوئی بیمار ہو جائے تو طبیب کے بلانے کا بھی اہتمام کرنا پڑتا ہے غربار اول تو بیمار کم ہوتے ہیں اور جو ہوئے بھی تو ویسے ہی دو چار دن پھر پھر اکر اچھے ہو جاتے ہیں غرض امراء کے ساتھ تعلقات بہت لگے ہوئے ہیں اور جتنے یہ تعلقات زیادہ ہوتے ہیں اتنا ہی سوہان روح زیادہ ہوتا ہے حق تعالیٰ فرماتے ہیں وَلَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّعَذِّبَهُمْ بِهَا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا (ان کے اموال و اولاد تم کو تعجب میں نہ ڈالیں اللہ تعالیٰ ان کے ذریعہ سے دنیاوی زندگی میں ان کو عذاب دینا چاہتے ہیں) حق تعالیٰ نے اموال و اولاد کو اس جگہ آلہ عذاب فرمایا ہے اور واقعی غور کر کے دیکھا جائے تو کثرت مال و اولاد کے ساتھ افکار و تشویشات بھی زیادہ ہو جاتی ہیں اور یہی کلفت و پریشانی کی حقیقت ہے جس میں امراء اکثر مبتلا ہیں چنانچہ کسی مالدار کے اولاد نہ ہو تو اس کو اپنے مال کی فکر ہوتی ہے کہ میرے بعد یہ تیرے میرے پاس پہنچے گا اس لئے وہ کسی نہ کسی کو متبنیٰ بناتا ہے اور بعد میں اپنے بھی اولاد ہو جائے تو پریشان ہوتا ہے اور اگر کسی کو مال کے ساتھ اولاد بھی نصیب ہو جائے تو خیر ایک غم تو دھلا اب یہ فکر ہے کہ بچہ بڑا ہوا ہے اس کی تعلیم و تربیت کرنا چاہیئے اور یہ ایسی چیز ہے کہ کسی کے قبضہ و اختیار میں نہیں بعض دفعہ لاکھ کوشش کرو مگر اولاد نالائق اٹھتی ہے اور جو لائق بھی ہوئی تو پھر اس کے نکاح کی فکر ہے۔ سو پریشانیوں کے بعد نکاح بھی ہوا تو اب یہ فکر ہے کہ بیٹے کے اولاد نہیں ہوتی اگر لڑکا بے اولاد رہ گیا تو پھر جائداد کے غیروں کے پاس جانے کا اندیشہ ہے۔ غرض عمر بھر یہی پریشانی رہتی ہے۔ میں نے ایک بڑی بی کو دیکھا جو اپنے بچوں کو بہت چاہتی تھیں رات سب بچوں کو اپنے ہی پلنگ پر لیکر سوتی تھی جب اولاد زیادہ ہوئی تو پلنگ کے بجائے فرش پر سب کو لیکر سوتی تھیں اور رات کو یہ حالت تھی کہ بار بار اٹھ کر سب کو ہاتھ سے ٹٹولتی تھیں کہ سب زندہ بھی ہیں یا نہیں اور اگر کبھی کسی کو ذرا تکلیف ہو گئی تو بس ساری رات کی نیند اڑ گئی تو بھلا اس صورت میں یہ اولاد آلۂ عذاب نہیں تو کیا ہے خدا کی قسم راحت میں وہ ہے جس کے دل میں صرف ایک کی محبت ہو وہ ایک کون خدا تعالیٰ اور یہ حالت ہو ؎

یکے بین دیکے دان دیکے گوئے — یکے خواہ دیکے خوان دیکے جوئے

(ایک ہی کو دیکھ ایک ہی کو جان اور ایک ہی کہو ایک ہی کو چاہ ایک ہی کو پڑھ اور ایک ہی کی تلاش کر)

خلیل آسا در ملک یقین زن — نوائے لا احب الآفلین زن

(حضرت خلیل اللہؑ کی طرح یقین کا دروازہ کھٹکھٹا اور لا احب الآفلین کی صدا بلند کر یعنی میں فانی ہونے والوں کو دوست نہیں رکھتا)

اسی کو ایک عارف فرماتے ہیں ؎

مصلحت دید من آنست کہ یاراں ہمہ کار — بگذارند و خم طرۂ یارے گیرند

(مصلحت یہ ہے کہ دوست ساری جہان کی مصلحتوں کو چھوڑ کر محبوب حقیقی کی طرف متوجہ ہو جائیں)

اور فرماتے ہیں ؎

دلآرامیکہ داری دل درو بند — دگر چشم از ہمہ عالم فرو بند

(جس محبوب سے تمہارا دل بستہ ہے تو پھر تمام جہان سے آنکھیں بند کرلو)

شاید کسی کو یہاں پر یہ شبہ ہو کہ پہلے تو تم یہ کہہ رہے تھے[1] کہ پریشانی میں بھی ثواب ہوتا ہے اور اب پریشانی کی مذمت کرنے لگے تو سمجھو کہ پریشانی دو قسم کی ہے ایک اضطراری۔ ایک اختیاری پہلی قسم کی میں نے فضیلت بیان کی تھی کہ اگر منجانب اللہ کسی کو افکار میں مبتلا کر دیا جائے تو وہ اسی پر راضی رہے اس دقت فکر ہی سے ترقی ہوگی اور ثواب بڑھے گا اور دوسری قسم کی مذمت کر رہا ہوں کہ اپنے اختیار سے پریشانی کو مول لینا سراسر موجب کلفت ہے۔ غرض تعلقات ماسوی اللہ یہ ہیں۔ حقیقت میں تکلیف دہ اسی لئے بعض بزرگوں نے فرمایا ہے کہ سلاسل واغلال جہنم کی حقیقت تعلقات ماسوی اللہ ہیں یعنی سلاسل واغلال جہنم ان تعلقات کی صورت ہیں جو دنیا میں انسان غیر اللہ سے پیدا کرتا ہے جن سے یہاں بھی پریشان ہوتا ہے اور آخرت میں بھی وہ سلاسل واغلال کی صورت میں ظاہر ہوں گے تو کیا ایسے مالدار کو کامیاب کہیں گے جو باوجود کثرت مال کے راحت قلب سے محروم ہو ہرگز نہیں۔ البتہ اگر مال سے قلب کو تعلق نہ ہو تو پھر وہ آلہ عذاب نہ ہوگا اور نہ اس صورت میں کثرت مال کا کچھ حرج ہے۔ غرض اصل مقصود

[1] یہ مضمون صفحہ ۱۱ میں گذر چکا ہے ۱۲ جامع

راحت و آسائش ہے اور وہ دنیا میں بھی دینداروں ہی کو حاصل ہے پس آخرت کی فلاح تو ان کے لئے ہے ہی دنیا کی فلاح بھی ان ہی کے لئے ہے کیونکہ روحانی راحت دنیا میں ان کے سوا کسی کو نہیں بلکہ میں اس سے بھی ترقی کر کے کہتا ہوں کہ دینداروں کو روحانی راحت تو حاصل ہے ہی جسمانی راحت بھی انہی کو حاصل ہے اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ بیمار نہیں ہوتے بلکہ مطلب یہ ہے کہ بیماری اور حوادث میں ان کو روحانی اطمینان کے ساتھ جسمانی اطمینان بھی حاصل ہوتا ہے وہ مصائب میں نہایت استقلال کے اور سکون کے ساتھ رہتے ہیں اور دنیا داروں کو ایسے وقت میں روحانی اطمینان تو ہوتا ہی نہیں جسمانی راحت بھی نہیں ہوتی ان کے چہروں پر ہوائیاں اڑنے لگتی اور باتوں سے گھبراہٹ و بیصبری نمایاں ہوتی ہے مثلاً جب طاعون آتا ہے تو جتنے لوگ دیندار ہیں ان کو پریشانی نہیں ہوتی نہ وہ گھبراہٹ کی باتیں کرتے ہیں نہ مُردوں کی شمار کرتے پھرتے ہیں کہ آج کتنے مرے اور کل کتنے نہ اپنی مجلسوں میں ہر وقت اس کا تذکرہ کرتے ہیں بلکہ اپنے کام میں لگے رہتے ہیں اور نہ وہ اپنے مرنے سے گھبراتے ہیں ان کی طاعون کی پروا بھی نہیں ہوتی کیونکہ ان کا تو مذاق یہ ہے اِنَّا اِلٰی رَبِّنَا مُنْقَلِبُوْنَ کہ مر کر ہم اپنے خدا کے پاس پہونچ جائیں گے تو جو شخص موت کو معراج سمجھتا ہو وہ طاعون سے کیا ڈرے گا بلکہ اہل اللہ تو اس کے مشتاق رہتے ہیں۔ چنانچہ حافظ رحمۃ اللہ فرماتے ہیں

ے خرم آں روز کزیں منزل ویراں بردم راحت جاں طلبم وزپے جاناں بردم
نذر کردم کہ گر آید بسر ایں غم روزے تا در میکدہ شاداں وغزل خواں بردم

(جس دن دنیا سے کوچ کروں وہ دن بہت اچھا ہے راحت جاں طلب کروں اور محبوب حقیقی کے پاس جاؤں میں نے نذر کی ہے کہ اگر یہ دن نصیب ہو جائے تو خوش و خرم اور غزلیں پڑھتا ہوا جاؤں)

وہ تو موت کو ایسا شیریں سمجھتے ہیں کہ اس کے لئے نذریں مانتے ہیں خیر یہ تو بڑے دینداروں کی حالت ہوتی ہے مگر معمولی دینداروں کو بھی آپ دیکھیں گے کہ وہ طاعون سے اس قدر پریشان نہیں ہوتے جتنا دنیا دار پریشان ہوتے ہیں۔ میں نے طاعون میں ایک ہندو کو مرتے ہوئے دیکھا چونکہ وہ سب سے میل جول رکھنے والا تھا اس لئے بیماری میں اس کے دیکھنے کو ہندو مسلمان سبھی جاتے تھے تو میں نے دیکھا کہ وہ ہائے ہائے کرتا تھا اور سخت پریشان تھا حالانکہ بڑا مالدار تھا مگر اس وقت مال نے اس کی پریشانی کو کچھ کم نہ کیا اور ہم نے مسلمانوں کو بھی طاعون میں مرتے

ہوئے دیکھا ہے کہ بڑے خوش و خرم جان دیتے تھے۔ ہمارے یہاں ایک دفعہ طاعون بہت زور کا ہوا تو مولانا فتح محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے مکتب سے پردیسی طلبہ اپنے اپنے وطن جانے لگے کیونکہ مولانا کا اسی طاعون میں وصال ہو چکا تھا تو ان میں ایک طالب علم نور احمد نامی بھی جس کی عمر ۱۸ برس کی تھی گھر جانے کے لئے تیار تھا اسباب بندھا رکھا تھا کہ رات ہی کو اسے بخار ہوا اور گلٹی نمودار ہوئی سب کو بڑا رنج ہوا کہ اس بیچارہ کو اپنے وطن کی کیسی حسرت ہو گی گھر جانے کو تیار بیٹھا تھا اور اب موت کا سامان ہونے لگا تو بعض لوگوں نے تسلی کے طور پر اس سے کہا کہ نور احمد گھبراؤ نہیں انشاء اللہ تم اچھے ہو جاؤ گے اور تندرست ہو کر اپنے گھر جاؤ گے تو وہ کہنے لگا بس اب میرے واسطے ایسی دعا نہ کرو اب تو خدا تعالیٰ سے ملنے کو جی چاہتا ہے یہ دعا کرو کہ ایمان پر خاتمہ ہو جائے اس وقت لوگوں کو معلوم ہوا کہ اسے گھر کی ذرا بھی حسرت نہیں چنانچہ ایک دو روز میں اس کا انتقال ہو گیا تو میں نے دیکھا کہ اس کے جنازہ پر ایک نور تھا۔

صاحبو بھلا ایسے لوگ کیا پریشان ہوں گے جو خدا تعالیٰ کے ہر حکم پر راضی ہیں۔ کھانے کو کم ملے تو اس پر راضی، پہننے کو پھٹا پرانا ملے اس پر راضی، بیماری آوے تو اس پر راضی پھر انھیں کاہے کا غم ان کی طرف سے دنیا میں جو چاہے ہوتا رہے وہ کبھی پریشان نہ ہوں گے کیونکہ وہ سب کو خدا کی طرف سے سمجھتے ہیں اور ؎

ہر چہ از دوست میرسد نیکوست (جو کچھ دوست سے پہنچے اچھا ہے) اور ؎

ہر چہ آں خسرو کند شیریں بود (جو کچھ بادشاہ حقیقی تصرف کریں دل پسند ہوتا ہے)

حضرت بہلول دانا نے ایک بزرگ سے دریافت کیا کہ فرمائیے کہ آجکل کیونکر گذرتی ہے فرمایا اس شخص کی خوشی کا کیا حال پوچھتے ہو جس کی خواہش کے خلاف عالم میں کچھ نہیں ہوتا جو کچھ ہوتا ہے اس کی خواہش کے موافق ہوتا ہے۔ بہلول نے کہا کہ یہ کیونکر فرمایا کہ عالم میں جو کچھ ہوتا ہے یقیناً خدا کے ارادہ کے موافق ہوتا ہے اور میں نے اپنے ارادہ کو ان کے ارادہ میں فنا کر دیا ہے تو اب جو کچھ ہوتا ہے وہ میری خواہش کے بھی موافق ہوتا ہے اھ سو بتلائیے جس نے اپنی خواہش کو خدا کی خواہش میں فنا کر دیا ہو اس کو پھر غم

کا ہے کا اس سے بڑھ کر کسے آسائش ہوگی۔ صاحب آپ کسی اہل کے پاس بیماری کی حالت میں جاکر دیکھئے جو نادار بھی ہوں واللہ آپ ان کو پریشان نہ پاویں گے اس کے بعد کسی والیٔ ریاست کے پاس جاکر دیکھئے تو وہ بیماری میں سخت پریشان ہوگا گو ظاہر میں اس کے خدمت گار اور تیماردار بہت ہوں گے مگر وہ راحت میں نہ ہوگا، نہایت بیچین ہوگا اور ایسا بھی کم ہوتا ہے کہ امراء و رؤساء کو بیماری میں تیماردار اور خدمت گار خیر خواہ نصیب ہو جائیں زیادہ تو یہی دیکھا ہے کہ بیماری میں راحت جسمانی بھی دینداروں کو امراء سے زیادہ نصیب ہوتی ہے ہم نے دیکھا ہے کہ بزرگ بیمار ہوتے ہیں ان کو دل سے خدمت کرنے والے جان نثار خادم بہت میسر ہوتے ہیں اور امیروں کو ایک بھی نصیب نہیں ہوتا ان کے خدمتگار محض اوپر کے دل سے خدمت کرتے ہیں۔ پھر کوئی بزرگ بیمار ہوتا ہے تو ہر مرید اور ہر عالم ان کے لئے دل سے دعائے صحت کرتا ہے اور امیروں کے لئے ایک بھی دل سے دعا نہیں کرتا۔ چنانچہ ایک رئیس بیمار ہوئے اور حکیموں نے نسخے لکھے تو ان کے ورثہ نسخوں کو چھپاتے پھرتے تھے کہ دوائیں استعمال کرکے اگر یہ جی گیا تو سارا مال اور ریاست کا کام پھر اسی کے قبضہ میں رہیگا یہ تو مالداروں کی حالت ہے۔ اور چرتھاول میں ایک مزدور کو ہم نے دیکھا کہ وہ بیمار ہوا تو اس کے سب بچے اور گھر والے وظیفے پڑھ پڑھ کر دعا کرتے اور یہ چاہتے تھے کہ خدا کرے یہ نہ مرے اور کسی طرح اچھا ہی ہو جائے تو بتلایئے کیا اس پر بھی کوئی کہہ سکتا ہے کہ فلاح و کامیابی کثرتِ مال سے ہے ہرگز نہیں بلکہ سچ یہ ہے کہ دنیوی فلاح بھی دین ہی سے حاصل ہوتی ہے اور ایک کھلی دلیل اس کی یہ ہے کہ اہل دنیا دینداروں کے دروازوں پر دنیا کی حاجتیں لے کر جاتے ہیں چنانچہ اہل اللہ کے دروازوں پر آپ ہزاروں دنیا داروں کو جاتا دیکھیں گے معلوم ہوا کہ دنیا دار بھی سمجھتے ہیں کہ دنیا بھی ان دینداروں ہی کے پاس ہے جب تو ان کے پاس دنیا کی حاجتیں لے جاتے ہیں اور آپ نے کسی دیندار بزرگ کو اہل دنیا کے پاس کوئی حاجت لے کر جاتے ہوئے نہ دیکھا ہوگا پس معلوم ہوا کہ اہل دنیا محتاج ہیں اور اہل دین غنی ہیں گو وہ کیسے ہی خستہ حال ہوں یہ تو واقعات ہیں ان

کھلے ہوئے مشاہدوں سے کون انکار کرسکتا ہے اور کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمیشہ یوں ہی ہوا ہے کہ اہل دنیا اہل دین کے محتاج رہے اور دین دار اُن کے محتاج نہیں ہوئے ؎

گدا بادشاہست و نامش گداست

(فقیر بادشاہ ہے اور اس کا نام فقیر ہے)

ہاں اگر کوئی دنیا دار ایسا ہو کہ اس کو خدا تعالےٰ نے دین و دنیا کی دونوں دولتیں دی ہوں جیسے بعض اہل اللہ سلطان وقت ہوئے ہیں تو وہ اپنے وقت کا سلیمان ہے اس کو دین داروں سے استغنا ہوسکتا ہے مگر اس کو بھی استغنار دین کی بدولت حاصل ہوا نری دنیا کے ساتھ اس کو کبھی اہلِ دین سے استغنا نہیں ہوسکتا تھا اور گفتگو اسی میں ہے کہ اگر کسی کے پاس صرف ایک ہی دولت ہو تو دونوں میں کونسی حالت اچھی ہے تو میں اس کو بتلا رہا ہوں کہ اہل دین تو بدون مال کے کامیاب ہیں اور اہل دنیا بغیر دین کے کامیاب نہیں ہوسکتے بلکہ پریشان رہیں گے تو اب ثابت ہو گیا کہ بدون دین کے اختیار کئے دنیا کی راحت بھی حاصل نہیں ہوسکتی۔ اگر کسی کو اس پر یہ شبہ ہو کہ اہلِ یورپ تو بغیر دین کے آرام میں ہیں تو اس کا اصل جواب تو یہ ہے کہ وہ آرام میں نہیں ہے آپ محض ان کے سازوسامان کو دیکھ کر سمجھتے ہیں کہ وہ آرام میں ہیں حالانکہ راحت اصل میں اطمینانِ قلب کا نام ہے اور واللہ وہ بے دین کو کبھی حاصل نہیں ہوسکتی مگر یہ جواب ایسا ہے کہ اس کی حقیقت کو ہر شخص نہیں سمجھ سکتا بلکہ جس کو قلوب کفار کی حالت منکشف ہوگئی ہو وہی اس کو سمجھ سکتا ہے۔ اس لئے میں دوسرا جواب دیتا ہوں وہ یہ کہ اچھا میں فرض کرتا ہوں کہ وہ آرام میں ہیں مگر آپ اپنے کو ان پر قیاس نہیں کرسکتے ان کو بدون دین کے راحت دنیا حاصل ہوسکتی ہیں مگر آپ کو بغیر دین کے دنیا کی راحت ہرگز نصیب نہیں ہوسکتی کیونکہ آپ مدعی اطاعت کے ہیں اور وہ اطاعت کے مدعی نہیں بلکہ کفر اختیار کرکے وہ خدا سے باغی ہوچکے ہیں۔ پس آپ کے ساتھ وہ برتاؤ کیا جائے گا جو مدعی اطاعت کے ساتھ کیا جاتا ہے کہ بات بات پر گرفت ہوگی اور جہاں

ذرا قانون شریعت سے باہر قدم رکھا فوراً سزا ہو گی اور ان سے وہ برتاؤ کیا جا رہا ہے جو باغیوں کے ساتھ کیا جاتا ہے کہ باغی اگر دن میں سو دفعہ قانون کی مخالفت کرے تو اس سے جزوی تعرض نہیں کیا جاتا اس کی ایسی مثال ہے جیسے ایک تو بلقانی ریاستیں سلطان سے باغی ہو کر ان کے احکام کی مخالفت کرتی ہیں اور ایک کوئی ترک سلطان کے کسی حکم کی مخالفت کرے تو بلقانی ریاستوں کی جزوی مخالفتوں پر نظر نہیں کی جاتی بلکہ ان کو بغاوت کی سزا اکٹھی دی جاوے گی اور اس کا کچھ تذکرہ بھی نہ ہو گا کہ بغاوت کے بعد انھوں نے اور کون کون سے کام خلاف قانون کئے تھے کیونکہ بغاوت اتنا بڑا جرم ہے جس نے دوسرے جرائم کو نظر انداز کر دیا۔ اور ترک ذرا سی مخالفت کرے تو فوراً سزا کا مستحق ہوتا ہے کیونکہ وہ اپنے کو مطیع سلطنت کہتا ہے اس لئے اس کی ہر بات پر مواخذہ ہوتا ہے۔ اسی طرح یہاں سمجھئے کہ مسلمان کو ذرا ذرا سی مخالفت پر سزا ملتی ہے اور جہاں اس نے کوئی گناہ کیا فوراً اس کی دنیوی راحت سلب کر لی جاتی ہے گو ظاہری ساز و سامان جلدی سلب نہ کیا جاوے مگر راحت قلب تو فوراً سلب ہو جاتی ہے جو کہ فلاح و کامیابی کی اصل حقیقت ہے کیونکہ وہ اطاعت کا مدعی ہے اور کفار کے جزوی افعال پر نظر نہیں کی جاتی بس ان کو تو بغاوت کی سزا اکھٹی دیجاوے گی جس کے لئے ایک میعاد معین ہے شاید اس پر کوئی یہ کہے کہ اس دعوے اطاعت سے تو بغاوت ہی اچھی کہ روز روز کی گرفت سے تو بچے رہیں گے تو سمجھ لیجئے کہ مطیع کو تو ابھی سزا ہو گئی مگر یہ سزا بھگتنے کے بعد پھر وہ ہمیشہ کے لئے راحت میں ہے۔ جیسے کوئی ترک چوری یا زنا کرے تو اس کو اس وقت کچھ دنوں کے واسطے قید کر دیا جاتا ہے مگر قید کاٹنے کے بعد پھر سلطنت میں وہ کوئی عہدہ لے سکتا ہے اور اپنی زندگی آرام سے گذار سکتا ہے مگر باغی کو چند روز یا چند سال کے لئے گو کچھ نہ کہا جائے لیکن جب پکڑا جائے گا تو اس کی سزا سولی سے ادھر نہ ہو گی۔ اسی طرح جو خدا تعالے سے بغاوت کرے گا وہ چند روز دنیا میں گو راحت سے گزار لے مگر

جب اس کو پکڑا جائے گا تو ابدالآباد کے عذاب جہنم سے ادھر اس کی سزا نہ ہوگی اب اختیار ہے جس کو چاہو اختیار کر لو۔ غرض آسائش کی دو ہی صورتیں ہیں یا تو کوئی بالکل باغی ہو کر رہے تو سزائے بغاوت کے وقت سے پہلے اس کو چین ہے اور یا بالکل مطیع ہو کر رہے تو اس کو ہمیشہ کے لئے چین ہے یہاں بھی اور آخرت میں بھی باقی مطیع و نافرماں دونوں بنکر دنیا کی راحت تو حاصل نہیں ہو سکتی ہاں آخرت میں کچھ سزا بھگتنے کے بعد پھر راحت ہو جائیگی خلاصہ کلام یہ ہوا کہ آسائش کا طریقہ جو کہ اصل ہے فلاح کی بدون دین کی پابندی کے ممکن نہیں اس مضمون کو میں نے اس لیئے بیان کیا کہ آج کل سب لوگ فلاح کے طالب ہیں جن میں زیادہ تر فلاح دنیا کے طالب ہیں تو میں نے بتلادیا کہ فلاح دنیا بھی دین ہی کے اتباع سے مل سکتی ہے اس کے بغیر مسلمان کو تو مل نہیں سکتی اور اس وقت مسلمانوں ہی سے خطاب ہے یہ مسئلہ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ (تاکہ تم کامیاب ہو) سے مستنبط ہوا اور یہاں لَعَلَّ شک کے لئے نہیں ہے بلکہ ترجی یعنی امید دلانے کے لئے ہے اور مطلب یہ ہے کہ یہ اعمال بجالا کر فلاح کے امیدوار رہو لیکن اس سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ اس میں کوئی وعدہ تو ہے ہی نہیں تو شاید ایسا نہ بھی ہو کیونکہ یہ شاہانہ کلام ہے اور بادشاہ کسی کو امید دلا کر نا امید نہیں کیا کرتے۔ شاہانہ کلام میں امیدوار باشند (امیدوار رہو) ہزار پختہ وعدوں سے زیادہ ہوتا ہے پھر رفع شک کے لئے بعض مقامات پر حق تعالٰے نے پختہ وعدہ بھی فرمایا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے حَقًّا عَلَیْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِیْنَ (ہم پر مومنین کی مدد کرنا حق ہے) رہا یہ کہ پھر سب جگہ حَقًّا عَلَیْنَا (ہم پر حق ہے) ہی کیوں نہ فرمایا کہیں لَعَلَّکُمْ کس لئے فرمایا تو اس میں ایک راز ہے جو اہل سنت نے سمجھا ہے وہ یہ کہ پختہ وعدہ کے بعد بعض جگہ لَعَلَّ فرما کر اس پر تنبیہ کی گئی ہے کہ ہم وعدہ کر کے مجبور نہیں ہو گئے بلکہ اب بھی جزا کا دینا اور نہ دینا ہمارے اختیار میں ہے تمہاری مجال نہیں کہ ہم پر تقاضا کرنے لگو اور ہم کو ایفاء وعدہ پر مجبور سمجھ کر کچھ سے کچھ ہانکنے اور بکنے لگو ہماری شان یہ ہے لَا یُسْئَلُ عَمَّا یَفْعَلُ وَھُمْ یُسْئَلُوْنَ (جو وہ کرتا ہے اس سے اس کو نہ پوچھا جائے گا اور ان سے دریافت کیا جائے گا) یہ اور بات ہے کہ ہم وعدہ کر کے ایفا ضرور کریں گے مگر اس پر مجبور بھی نہیں ہیں بلکہ وعدہ کے بعد بھی ویسے ہی مختار ہیں جیسے قبل وعدہ تھے اس لئے تم تو لَعَلَّکُمْ ہی کے مفہوم پر نظر

رھو لِاَنَّ پر ناز نہ کرو گو ہمارے یہاں لَعَلَّ بھی لِاَنَّ ہی کے حکم میں ہے اس نکتہ کو اہل سنت ہی نے سمجھا ہے معتزلہ نے یہاں بہت ٹھوکریں کھائی ہیں وہ خدا پر بھی بعض امور کو واجب سمجھتے ہیں یہاں تک تو جزو اول اور جزو آخیر کا بیان تھا۔ اب میں ان احکام کو بیان کرتا ہوں جو درمیان میں مذکور ہیں جن پر فلاح کو موقوف کیا گیا ہے۔ ارادہ تو تھا ان کے مفصل بیان کا مگر وقت نہیں ہے اس لئے مختصراً بیان کر دوں گا اور گو مفصل بھی پورا پورا تو نہ ہوتا مگر خیر کسی قدر تفصیل ہو جاتی تو سمجھئے کہ وہ چار چیزیں ہیں۔ اِصْبِرُوْا۔ وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا۔ وَاتَّقُوا اللّٰہَ میں نے تمہید میں کہا تھا کہ ان احکام کو تمام سورت سے بلکہ تمام شریعت سے بلکہ تمام مصالح دنیویہ سے تعلق ہے۔ اب میں اس کو بتلانا چاہتا ہوں تفصیل اس کی یہ ہے کہ۔

اعمال دو قسم کے ہیں ایک تو وہ جن کا وقت آگیا۔ ایک وہ جن کا وقت نہیں آیا۔ سو یہاں ایک حکم قسم اول کے متعلق ہے اور ایک حکم قسم دوم کے متعلق ہے۔ قسم اول کے متعلق تو اِصْبِرُوْا ہے یعنی جس عمل کا وقت آجاوے اس وقت صبر سے کام لو یعنی پابندی اور استقلال سے رہو تو حق تعالیٰ نے اس میں اعمال حاضرہ میں مستقل رہنے کا حکم فرمایا ہے اس سے معلوم ہوا کہ دینداری کے یہی معنی ہیں کہ ہر کام کو پابندی اور استقلال سے کیا جاوے۔ آجکل بعض لوگ ولولے اور جوش میں بہت سا کام شروع کر دیتے ہیں پھر نباہ نہیں ہوتا تو یہ دینداری کامل نہیں ہے۔ اسی لئے خدا تعالیٰ نے اتنا ہی کام بتلایا ہے جس پر نباہ ہو سکے واجبات وفرائض وسنن موکدہ پر نباہ کچھ دشوار نہیں اس سے زیادہ کام کرنے میں البتہ بعض سے نباہ نہیں ہوتا تو ان کو اپنے ذمہ اتنا ہی کام بڑھانا چاہیئے جس پر نباہ اور دوام ہو سکے تو اِصْبِرُوْا کا حکم ان اعمال کے متعلق ہے جن کا وقت آگیا ہے پھر ان کی دو قسمیں ہیں ایک وہ جن کا تعلق صرف اپنی ذات سے ہے دوسرے وہ جن کا تعلق دوسروں سے بھی ہے ان کے متعلق صَابِرُوْا فرمایا ہے کہ دوسروں کے ساتھ صبر و استقلال سے کام لو بعض لوگ اپنے ذاتی کام تو کر لیتے ہیں مثلاً نماز وغیرہ مگر دوسروں کے متعلق باہمت نہیں ہوتے اور اگر کچھ ہمت بھی کی تو وہ اسی وقت

تک رہتی ہے جب تک کوئی دوسرا مزاحم نہ ہو اور اگر کوئی مزاحم ہوا تو پھر مستقل نہیں رہتے جیسے نکاح وغیرہ کی رسموں میں اکثر لوگوں کی یہی حالت ہے کہ بیٹے والا بیٹی والوں کی مزاحمت کو برداشت نہیں کرتا بلکہ وہ جس طرح چاہتا ہے ان کو نچاتا ہے پھر یہ دین پر مستقل نہیں رہ سکتے اس کے متعلق صَابِرُوْا میں یہ حکم ہے کہ دوسروں کے مقابلہ میں بھی ثابت قدم رہو اسی طرح اگر کبھی اعداء اللہ دین میں مزاحمت کرنے لگیں تو ان کے مقابلہ میں بھی مستقل رہنے کا صَابِرُوْا میں حکم ہے۔ غرض ایک تو وہ افعال ہیں جن میں کسی سے مقابلہ نہیں کرنا پڑتا ان پر مداومت و استقلال کرنے کا حکم تو اِصْبِرُوْا میں ہے اور جن میں دوسروں سے مقابلہ کرنا پڑتا ہے ان میں ثابت قدم رہنے کا حکم صَابِرُوْا میں ہے یہ تو وہ افعال تھے جن کا وقت آگیا ہے اور ایک وہ افعال ہیں جن کا ابھی وقت نہیں آیا ان کے متعلق حکم رَابِطُوْا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ ان کاموں کے لئے تیار و مستعد رہنا چاہیے اور یہ میں نے اس سے سمجھا کہ لغت میں رِبَاط کے معنے اعداء کے مقابلہ میں سرحد پر گھوڑے باندھنا ہے یعنی مورچہ بندی اور ظاہر ہے کہ مورچہ بندی حفظ ماتقدم کے لئے اور پہلے سے مقابلہ کو تیار و مستعد رہنے کے واسطے کی جاتی ہے عام لغت کے موافق ایک تفسیر تو رباط کی یہ ہے دوسری ایک تفسیر حدیث میں آئی ہے اِنْتِظَارُ الصَّلٰوةِ بَعْدَ الصَّلٰوةِ یعنی ایک نماز پڑھ کر دوسری نماز کے لئے منتظر رہنا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے متعلق بھی فرمایا ہے فَذَالِكُمُ الرِّبَاطُ فَذَالِكُمُ الرِّبَاطُ یہی رباط ہے یہی رباط ہے اور اس تفسیر میں اور پہلی تفسیر میں کچھ منافات نہیں بلکہ اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو اس پر متنبہ فرمایا ہے کہ رباط اعداء ظاہری کے ساتھ ہی مختص نہیں بلکہ جیسے اعداء ظاہری کے مقابلہ میں رباط ہوتا ہے اسی طرح کبھی اعداء باطنی یعنی نفس و شیطان کے مقابلہ میں بھی رباط ہوتا ہے وہ مجاہدہ ظاہری کا رباط ہے اور مجاہدۂ باطنی کا رباط ہے۔ اسی کو ایک حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح ارشاد فرمایا ہے۔

اَلْمُجَاهِدُ مَنْ جَاهَدَ نَفْسَهٗ وَالْمُهَاجِرُ مَنْ هَجَرَ الْخَطَایَا وَالذُّنُوْبَ

(مجاہد وہ ہے جو اپنے نفس سے جہاد کرتا ہے مہاجر وہ جو گناہوں اور خطاؤں سے بچتا ہے)

یعنی مجاہد وہ ہے جو اپنے نفس کے مقابلہ میں مجاہدہ کرے اس سے معلوم ہوا کہ مجاہدہ کی ایک قسم مجاہدۂ نفس بھی ہے اور اس کے لئے بھی ایک رباط ہے جیسے اعداء ظاہر کے مقابلہ کی پہلے سے تیاری کی جاتی ہے اسی طرح نفس و شیطان کے مقابلہ میں بھی مورچہ بندی کی ضرورت ہے کیونکہ یہ بھی بڑے سخت دشمن ہیں جو بدون مورچہ بندی کے قابو میں نہیں آتے اسی کو فرماتے ہیں ؎

اے شہاں کشتیم ما خصمے بروں | ماند خصمے زو تبر در اندروں

(اے بزرگو ہم نے ظاہری دشمن کو تو ہلاک کر دیا مگر ایک دشمن جو اس سے بھی بدتر اور زیادہ ضرر رساں ہے باطن میں رہ گیا جس کو نفس کہتے ہیں)

اور فرماتے ہیں ؎

کشتنِ ایں کارِ عقل و ہوش نیست | شیر باطن سخرۂ خرگوش نیست

(اس باطنی دشمن کو ہلاک کرنا محض عقل و ہوشیاری کا کام نہیں ہے کیونکہ شیر باطن خرگوش کے قابو کا نہیں ہے)

یعنی اس کا زیر کرنا عقل و ہوش کا کام نہیں کیونکہ شیر خرگوش کے پھندے میں نہیں آیا کرتا بلکہ ان کو زیر کرنے کے لئے شارع علیہ السلام کی تعلیم کا اتباع ضروری ہے چنانچہ اسی کا ایک شعبہ یہ رباط ہے یعنی نماز کا انتظار کرنا بعد ایک نماز کے یہ نفس پر سب سے زیادہ گراں ہے کیونکہ اس میں کوئی حظ نہیں ہے۔ بس نماز پڑھ کر خالی بیٹھے ہیں اور دوسری نماز کا انتظار کر رہے ہیں۔ آج کل بعض لوگ سوال کرتے ہیں کہ اس خالی بیٹھے رہنے سے کیا فائدہ میں کہتا ہوں اس میں دو فائدے ہیں ایک تو نفس کو طاعات پر جمانا دوسرے وہ فائدہ ہے جس کو حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں بیان فرمایا ہے۔

اِنَّ الْعَبْدَ فِی الصَّلٰوۃِ مَا انْتَظَرَ الصَّلٰوۃَ کہ بندہ جب تک نماز کے انتظار میں

اس وقت تک وہ نماز میں ہی رہتا ہے یعنی اس انتظار میں بالکل وہی ثواب ملتا ہے جو نماز پڑھنے میں ملتا ہے مگر چونکہ ثواب نظر نہیں آتا اس لئے نفس پر یہ انتظار گراں ہوتا ہے اسی واسطے حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے اس کو رباط فرمایا ہے تو ایک تفسیر رباط کی یہ ہے جو پہلی تفسیر کی بھی موئد ہے اور ان دونوں میں ایک امر مشترک ہے یعنی مستعد اور تیار رہنا اگلی عبادت اور آئندہ کام کے لئے تو رباط کی روح اصل میں تیاری اور استعداد ہے اس لئے میں نے رَابِطُوْا کی تفسیر یہ کی کہ جن کاموں کا وقت نہیں آیا ان کے لئے تیار و مستعد رہنا چاہیئے۔ پس صبر کی ضرورت تو ان افعال میں ہے جن کا وقت آگیا اور رباط کی ضرورت ان کاموں میں ہے جن کا وقت نہیں آیا۔ دین کا خلاصہ یہی ہے کہ جن کاموں کا وقت آگیا ہو ان کو استقلال و پابندی سے ادا کیا جائے اور جن کا وقت نہیں آیا ان کے لئے تیار و مستعد رہے کسی وقت بے فکر ہو کر نہ بیٹھے بلکہ یہ حال ہونا چاہیئے ؎

اندریں رہ می تراش و می خراش　　تا دمِ آخر دمے فارغ مباش
تا دمِ آخر دمے آخر بود　　کہ عنایت با تو صاحب سر بود

(تم کو چاہیئے کہ اس طریق وصول الی اللہ میں ہمیشہ خراش تراش میں لگے رہو آخر دم تک ایک لحظہ بھی فارغ مت ہو کیونکہ آخری وقت تک کوئی تو گھڑی ایسی ہو گی جس میں عنایت ربانی تمہاری ہمراز اور رفیق بن جائے گی یعنی طلب میں لگے رہو تو کسی وقت ضرور وصول الی اللہ ہو جائے گا)

بس دین یہ ہے کہ آدمی کو ہر دم ایک دھن لگی رہے یا تو کسی کام میں لگا ہوا ہو یا کسی کام کی تیاری میں مشغول ہو۔ اے مسلمانو! خدا کے ساتھ وہ حالت تو ہونی چاہیئے جو ایک محبوب مجازی کے ساتھ ہوتی ہے کہ ہر دم عاشق اسی کی دھن میں رہتا ہے گو دنیا کے سارے دھندے بھی کرتا ہے مگر اس کا خیال کبھی دل سے نہیں اترتا بس یہ حال ہوتا ہے ؎

چو میرد مبتلا میرد میسّر چو خیزد مبتلا خیزد
(جب مرتا ہے مبتلا مرتا ہے جب اٹھتا ہے مبتلا اٹھتا ہے)

تو کم از کم طالب خدا کا یہ حال تو ہونا چاہیئے جو ایک مردار کسی کے عاشق کا ہو جاتا ہے کہ وہ کسی وقت دل سے نہیں اترتی ؎

عشق مولیٰ کے کم از لیلےٰ بود ٭ گوی گشتن بہراو اولےٰ بود

(اللہ تعالیٰ کا عشق لیلیٰ کے عشق سے بھی کیا کم ہو اس کے لئے تو کوچہ گردی کرنا اولیٰ اور بہتر ہے)

صاحبو! کیا خدا کی محبت ایک مخلوق کی محبت سے بھی کم ہو گئی اگر نہیں تو پھر کیا وجہ ہے کہ خدا کی ایسی دھن نہ ہو واللہ جو سچا طالب ہو گا اس کے دل کو ہر وقت خدا تعالیٰ کی دھن لگی ہو گی چنانچہ ایسے ہی لوگوں کی بابت ارشاد ہے رِجَالٌ لَّا تُلۡهِيهِمۡ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيۡعٌ عَنۡ ذِكۡرِ اللّٰهِ کہ وہ ایسے لوگ ہیں جن کو تجارت اور خرید و فروخت خدا کی یاد سے غافل نہیں کرتی ایک شخص نے مجھ سے سوال کیا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ہم دنیا کا بھی کام کریں اور اس کے ساتھ خدا کی یاد بھی رہے میں نے کہا یہ ایسے ہو سکتا ہے جیسے آپ کو خدا کے کام کے ساتھ دنیا یاد رہتی ہے۔ اگر ایک کام کے ساتھ دوسرے کی یاد نہیں ہو سکتی تو پھر نماز اور تلاوت قرآن و ذکر میں دنیا کیونکر یاد رہتی ہے اگر دنیا کے ساتھ خدا کا یاد رہنا تعجب کی بات ہے تو اس پر بھی تعجب ہونا چاہیئے اور اگر اس پر تعجب نہیں تو اس کے عکس پر کیوں تعجب ہے بات یہ ہے کہ جو چیز دل میں بس جاتی ہے وہ ہر کام کے ساتھ یاد رہا کرتی ہے۔ چونکہ ہمارے دلوں میں دنیا بسی ہوئی ہے اس لئے خدا کے کام میں بھی وہ یاد رہتی ہے اور اگر کبھی خدا دل میں بس جائے گا تو پھر وہ بھی دنیا کے کاموں میں یاد رہے اور اس کی ایک بڑی نظیر طاعون کی بدولت مل گئی ہے۔ اس سے ایک حدیث پر سے اشکال رفع ہو گیا حدیث میں آتا ہے اِذَا اَصۡبَحۡتَ فَلَا تُحَدِّثۡ نَفۡسَكَ بِالۡمَسَاءِ وَاِذَا اَمۡسَيۡتَ فَلَا تُحَدِّثۡ نَفۡسَكَ بِالصَّبَاحِ وَعِدۡ نَفۡسَكَ مِنۡ اَصۡحَابِ الۡقُبُوۡرِ۔ یعنی جب صبح کرو تو اپنے دل میں شام کا خیال نہ لاؤ اور جب شام ہو تو دل میں صبح کا خیال نہ لاؤ اور اپنے آپ کو مردوں میں شمار کرو۔ یہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے بعض لوگوں کی سمجھ میں یہ بات نہ آتی تھی اور کہتے تھے کہ

ایسا سمجھ بیٹھیں تو پھر دنیا کے کاروبار سب چھوٹ جائیں گے کسی سے کوئی کام دنیا کا نہ ہو سکے گا مگر طاعون نے اس کو حل کر دیا کہ اس زمانہ میں دنیا کا کوئی کام بھی نہیں چھٹا دوکان دار تجارت کرتے رہے کاشتکار کھیتی کرتے رہے ملازمت پیشہ اپنی ملازمت کے کام میں لگے رہے ریل اور تار اور ڈاک اور کارخانے سب بدستور رہے مگر لوگوں کی حالت یہ تھی کہ صبح کو شام کی امید نہ ہوتی تھی اور شام کو صبح کی امید نہ ہوتی تھی ہر شخص کو موت کا خطرہ لگا ہوا تھا تو سارے کام بھی ہوتے رہے اور مراقبۂ موت بھی حاصل ہو گیا بس اسی کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جیسا تم طاعون و ہیضہ کے زمانہ میں ہو جاتے ہو بارہ مہینے ایسے ہی رہو مگر آج تو یہ حالت ہے کہ جہاں طاعون گیا اور بے فکر ہو گئے گویا اب خدا تعالیٰ ان کو مار ہی نہیں سکتے تو جیسے طاعون کے زمانہ میں ہر کام کے ساتھ موت کا دھیان لگا رہتا ہے اور اس سے کسی کام میں رکاوٹ پیدا نہیں ہوتی یوں ہی اہل اللہ کو دنیا کے ہر کام میں خدا تعالیٰ کی یاد بھی رہتی ہے جیسا کہ ارشاد ہے رِجَالٌ لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَلَا بَيْعٌ عَن ذِكْرِ اللَّهِ ط (یہ ایسے لوگ ہیں کہ جن کو تجارت اور خرید و فروخت خدا کی یاد سے غافل نہیں کر سکتی) اور اس سے کسی کام میں رکاوٹ نہیں ہوتی اور یہی حاصل ہے اِصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا کا کہ ہر وقت کے متعلق جو کام ہے اس کو بجا لاؤ اور جس کا وقت نہیں آیا اس کے دھیان میں رہو اور اس کے لئے پہلے سے تیار و مستعد رہو (اور احکام الٰہیہ کے دھیان میں رہنا اور اس کے لئے تیاری کرنا یہی ذکر اللہ بھی ہے اور اسی سے خدا کی یاد دل میں پیوستہ ہو جاتی ہے ۱۲ جامع)

اور اِصْبِرُوْا فرمانے سے ایک اور مسئلہ ثابت ہوا وہ یہ کہ اصل مقصود احکام کی پابندی ہے لذت مقصود نہیں پس اگر کوئی شخص احکام کو پابندی سے بجا لاتا ہو گو لذت اور مزا نہ آتا ہو تو وہ مقصود سے کامیاب ہے اگر ناگواری مطلوب نہ ہوتی تو حق تعالیٰ اِصْبِرُوْا نہ فرماتے پس جا بجا اہتمام کے ساتھ اِصْبِرُوْا فرمانا بتلا رہا ہے۔ کہ لذت مقصود نہیں بلکہ صبر و استقلال مطلوب ہے مگر آجکل اکثر سالکین اس کے شاکی

نظر آتے ہیں کہ ہائے ہم کو طاعات میں مزا نہیں آتا اور اس کو طاعات کے لئے نقص سمجھتے ہیں حالانکہ یہ نفس کا ایک کید ہے کہ اس کو دنیا میں بھی حظ مطلوب ہے حالانکہ طاعات سے دنیا میں حظ مطلوب نہیں بلکہ آخرت میں اس سے حظ حاصل ہوگا لیکن اگر کسی کو بدون طلب کے حظ نصیب ہو جائے تو یہ لذت بیکار بھی نہیں نعمت الٰہیہ ہے اس کی ناقدری نہ کرے کیونکہ بعض کے لئے یہ بہت مفید ہوتی ہے پس جس کو یہ دولت حاصل ہو وہ کلفت کا ثواب سنکر زوالِ لذت کا بھی طالب نہ ہو اور جس کو حاصل نہ ہو وہ اس کے درپے نہ ہو غرض جس حالت میں وہ رکھیں اسی میں خوش رہنا چاہیئے وہ تمہارے لئے جس کیفیت کو مصلحت جانیں وہی بہتر ہے ؎

بگوش گل چہ سخن گفتہ کہ خندان ست

بعندلیب چہ فرمودہ کہ نالان است

(گل کے کان میں کیا کہہ دیا ہے کہ وہ خنداں ہے اور بلبل سے کیا فرمادیا ہے کہ وہ نالاں ہے)

اس کی ایسی مثال ہے جیسے طبیب ایک مریض کو توحب ایارج دے اور ایک کو خمیرہ گاؤزبان دے وہاں کوئی مزاحمت نہیں کرتا کہ اس کو میٹھی دوا اور مجھے کڑوی دوا کیوں دی اس جگہ سب عاقل بن جاتے ہیں کہ بھائی اس کے لئے یہی مصلحت ہے اور اس کے لئے یہی مناسب ہے۔ مگر یہاں طب باطنی میں لوگ طبیب سے مزاحمت کرتے ہیں کہ فلاں کو تو خدا تعالےٰ نے لذت و بسط میں رکھا ہے اور ہم کو کلفت و قبض دے دیا ہے نہ معلوم وہ کیا ان کا عزیز ہے صاحبو! عزیز کوئی نہیں سب غلام ہیں اور غلام کو تجویز کا کوئی حق نہیں۔ غلام کی تو وہ حالت ہونی چاہیئے جیسے ایک غلام کی حکایت ہے کہ اس کو کسی نے خریدا اور گھر لاکر پوچھا کہ تیرا نام کیا ہے، کہا اب تک تو جو کچھ نام تھا وہ تھا آج سے میرا نام وہ ہے جس سے آپ پکاریں۔ پوچھا تم کھاتے کیا ہو کہا اب تک تو جو کچھ بھی کھاتا تھا

آج سے وہ کھاؤں گا جو آپ کھلائیں ۔ اے صاحبو! غلام کا تو یہ مذاق ہونا چاہیئے ؎

زندہ کنی عطائے تو ور بکشی فدائے تو
دل شدہ مبتلائے تو ہرچہ کنی رضائے تو

(زندہ کریں آپ کی عطا ہے اور اگر قتل کریں آپ پر قربان ہو۔ دل آپ پر فریفتہ ہے جو کچھ کریں میں راضی ہوں)

اور یہ مذہب ہونا چاہیئے ؎

خوشا وقت شوریدگانِ غمش | اگر ریش بینند وگر مرہمش
گدایانِ از بادشاہی نفور | بامیدش اندر گدائی صبور
دما دم شرابِ الم درکشند | وگر تلخ بینند دم درکشند

(اس کے غم کے پریشان لوگوں کا کیا اچھا وقت ہے اگر زخم دیکھے ہیں اور اگر اس پر مرہم رکھتے ہیں ایسے فقیر ہیں جو بادشاہی سے نفرت کرنے والے اس کی امید پر فقیری میں قناعت کرنے والے ہر دم رنج و غم کی شراب پیتے ہیں جب اس رنج کی کڑواہٹ دیکھتے ہیں تو خاموش رہتے ہیں)

بات یہ ہے کہ راہ محبت ایسی ہی چیز ہے کہ اس میں طالب کو کسی تجویز کا حق نہیں محبت تو نام ہی فنا کا ہے پھر یہ آواز کیوں نکلتی ہے کہ ہائے یوں ہوتا ہائے ووں ہوتا۔ اور صاحبو! اس وقت تو طاعات میں ناگواری اور بدمزگی ہی ہے آپ ایسے گھبرا گئے یہ کیا چیز ہے اگر کبھی آپ پر وہ امور پیش آتے جو بزرگوں کو پیش آئے ہیں تو حقیقت نظر آجاتی ۔ بزرگوں کو تو اس راہ میں وہ وہ سختیاں پیش آئی ہیں کہ ان کے سامنے یہ ذراسی ناگواری کچھ بھی نہیں۔ ایک بزرگ کو تہجد کے وقت غیب سے آواز آئی کہ کچھ بھی کرو یہاں کچھ قبول نہیں اور اس زور سے آواز آئی کہ ان کے ایک خادم نے بھی سن لی مگر وہ ایسے عاشق تھے کہ وضو کرکے پھر بھی نماز میں لگ گئے۔ اگلے دن پھر لوٹا بدھنا لیکر تہجد کو اٹھے مرید نے کہا حضرت

جب وہ منہ بھی نہیں لگاتے اور کچھ قبول نہیں کرتے تو آپ ہی کیوں مصیبت جھیلتے ہیں۔ لیٹ کر سو بھی رہیئے۔ بس ان بزرگ پر حال طاری ہوگیا اور رو کر فرمایا کہ بیٹا میں ان کو چھوڑ تو دوں مگر یہ تو بتلاؤ کہ ان کے در کے سوا کوئی اور در بھی اس قابل ہے جہاں چلا جاؤں ظاہر ہے کہ اور کوئی در اس قابل نہیں تو پھر میں تو اسی در پر جان دے دوں گا چاہے وہ قبول کریں یا رد کریں اس جواب پر رحمت کو جوش آیا اور پھر آواز آئی ؎

قبول ست گرچہ ہنر نیستت کہ جز ما پناہے دگر نیستت

(قبول ہے اگرچہ تیرا ہنر نہیں ہے اس لئے کہ سوائے ہمارے تیرے لئے دوسری جگہ پناہ نہیں ہے)

اگر آج کسی کو ایسی آواز آجائے تو بس سارا کام چھوڑ چھاڑ کر الگ ہو جائے کیونکہ محبت پوری نہیں ہے۔ اسی طرح ایک بزرگ کو ذکر کے وقت یہ آواز آتی تھی کہ چاہے کتنا ہی کر تیرا خاتمہ کفر پر ہوگا کافر ہو کر مرے گا جب بہت دن اسی قصہ میں ہو گئے اور یہ آواز موقوف ہی نہ ہوئی تو آخر گھبرا گئے مگر کام نہیں چھوڑا گھبراہٹ کا اثر یہ ہوا کہ اپنے شیخ کے پاس حاضر ہوئے اور ان سے یہ قصہ عرض کیا۔ واقعی شیخ کا زندہ ہونا بھی بڑی نعمت ہے۔ شیخ نے فرمایا کہ دشنام محبت ہے محبوبوں کی عادت ہے کہ عاشقوں کو چھیڑ چھاڑ سے تنگ کیا کرتے ہیں اس سے دلگیر نہ ہو۔ اسی طرح ایک بار حضرت شبلی رحمۃ اللہ علیہ مسجد کی طرف چلے جا رہے تھے کہ غیب سے آواز آئی اے شبلی کیا یہ ناپاک قدم اس قابل ہیں کہ ہمارا رستہ ان سے قطع کیا جائے یہ کھڑے رہ گئے، پھر آواز آئی کہ اے شبلی تم کو ہماری طرف چلنے سے کیسے صبر آگیا۔ حضرت شبلی ایک چیخ مار کر بے ہوش ہو گئے کہ نہ چلنے دیتے ہیں نہ ٹھہرنے دیتے ہیں۔

صاحبو! اگر آپ ایسے ایسے شکنجوں میں کسے جاتے تو پھر آپ کا کیا حال ہوتا اب تو اتنا ہی ہے کہ ذکر میں مزا نہیں آتا آپ اس سے ہی گھبرا گئے اول تو اگر اس کلفت پر اجر بھی نہ ملتا تب بھی آپ کیا کر لیتے محبت کا مقتضا یہ تھا کہ بدون اجر کے بھی اس پر راضی رہتے مگر اب تو اجر بھی ملتا ہے پھر ناگواری اور شکایت کیوں ہے اور اگر مزا مطلوب ہوتا تو آپ دنیا ہی میں کیوں آتے مزا تو جنت میں تھا،

وہاں سے جو آپ دنیا میں آئے ہیں تو مزے کے لئے تھوڑا ہی آئے ہیں بلکہ بدمزگی اور کلفت کے لئے آئے ہیں خوب کہا ہے ؎

کیا ہی چین خواب عدم میں تھا نہ تھا زلف یار کا کچھ خیال
سو جگا کے شور ظہور نے مجھے کس بلا میں پھنسا دیا

حق تعالیٰ خود فرماتے ہیں لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ کَبَدٍ ط کہ ہم نے انسان کو مشقت میں مبتلا کر کے پیدا کیا ہے اور جناب آپ تو کیا چیز ہیں اس کلفت سے تو بڑے بڑے بھی نہیں بچے۔ چنانچہ جب سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اول وحی نازل ہوئی ہے تو پھر اس کے بعد تین برس تک منقطع رہی حضور صلے اللہ علیہ وسلم تین سال تک وحی کو ترستے رہے اور شدت حزن کی یہ حالت تھی کہ بعض دفعہ پہاڑ پر سے گر کر اپنے کو ہلاک کرنا چاہتے تھے مگر فوراً حضرت جبریل علیہ السلام نمودار ہو کر آپ کو سنبھالتے تھے تو جب تین برس تک حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو کلفت میں رکھا گیا تو ہم کیا چیز ہیں ہمیں تو اگر تین سو برس تک بدمزگی میں رکھا جائے تو حق ہے دیکھو اگر کوئی حاکم یا اختیار اپنے بیٹے کو کسی ملازمت کے لئے تین برس امیدوار رکھے اور ہم تین روز میں جا کر ملازم ہو جانا چاہیں تو یہ حماقت ہے یا نہیں پس جو لوگ ذکر شغل شروع کرتے ہی بدمزگی اور قبض کی شکایت کرنے لگتے ہیں وہ کم از کم تین برس تو صبر کریں گو حق تو یہ تھا کہ زیادہ مدت تک صبر کریں مگر افسوس آج کل تو لوگ اتنے عرصہ تک بھی صبر نہیں کرتے جتنے عرصہ تک حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو فترۃ وحی میں قبض رہا۔

غرض اول تو مزا مطلوب نہیں۔ دوسرے محبت کا مقتضا یہ ہے کہ مزے کا طالب نہ ہو۔ تیسرے اگر مزا مطلوب بھی ہو تو کم از کم کچھ دنوں تک تو بدمزگی کا تحمل کیا جائے۔ چوتھے اس میں ثواب بھی ملتا ہے۔ اور اس کے علاوہ یہ کہ اس میں باطنی مصلحت بھی ہوتی ہے یعنے اقسام تربیت کے اسی پر موقوف ہیں

کہ طالب کو ظاہراً ناکام رکھا جائے۔ جیسے آپ نے دیکھا ہوگا کہ بعض عورتوں کو اسقاط میں سات آٹھ دن تک طبیب بھوکا رکھتا ہے اور ان کو بھوک بہت لگتی ہے وہ روٹی کے لئے ضد بھی بہت کرتی ہیں مگر اس وقت ان کو ناکام رکھنا ہی تربیت ہے۔ آپ خود سمجھ لیجئے کہ اس وقت ان کو روٹی دینا محبت ہے یا نہ دینا یقیناً نہ دینا ہی محبت ہے اور اسی میں مصلحت ہے پس اسی طرح باطن میں سمجھ لیجیے کہ بعض دفعہ لذت سے محروم کر دینا ہی مصلحت ہوتا ہے ؎

آنکس کہ توانگرت نمی گرداند
او مصلحت تو از تو بہتر داند

(جس نے تجھ کو مالدار نہیں بنایا تو تیری مصلحت کو تجھ سے زیادہ بہتر جانتا ہے)

افسوس کہ کیا اللہ میاں طبیب کے برابر بھی نہیں کہ طبیب بھوکا مارے تو اس کو شفقت سمجھتے ہو اور اللہ میاں لذت سے ترسا دیں تو شکایت کرتے ہو۔ بہرحال اِصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا کا تعلق تو ان اعمال سے ہے جن کا وقت آگیا اور رَابِطُوْا کا تعلق ان اعمال سے ہے جن کا وقت نہیں آیا اب سمجھو کہ اعمال کی دو قسمیں ہیں ایک ظاہر، ایک باطن اور اعمال ظاہرہ کی یہ تقسیم تھی جو میں نے اب تک بیان کی کہ ان میں ایک قسم تو وہ ہے جس کا وقت آگیا اور پھر اس کی دو قسمیں ہیں ایک اپنے متعلق ایک دوسروں کے متعلق اور دوسری قسم وہ ہے جس کا وقت نہیں آیا ان سب اقسام کے احکام تو اِصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا میں مذکور ہوئے اور اس سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ ان احکام کا تعلق تمام شریعت سے ہے کیونکہ کوئی عمل اس تقسیم سے باہر نہیں ہے۔ نیز یہ بھی معلوم ہو گیا کہ مصالح دنیویہ سے بھی ان احکام کو پورا تعلق ہے کیونکہ دنیا کے کام بھی دو ہی قسم کے ہیں۔ ایک وہ جن کا وقت آگیا ان میں استقلال و ثبات قدم کی ضرورت ہے دوسرے وہ جن کا وقت نہیں آیا ان کے لئے تیاری و مستعدی کی ضرورت ہے۔ اب ایک قسم رہ گئی یعنی اعمال باطنہ اس کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں وَاتَّقُوا اللّٰہَ کہ خدا سے ڈرتے رہو یہ تمام اعمال باطنہ کی جڑ ہے مگر اس میں بہت

بسط کی ضرورت ہے جس کے لئے وقت نہیں کتب تصوف سے اس کی تفصیل معلوم ہوسکتی ہے مگر میرا مقصود حاصل ہو گیا وہ یہ کہ اگر آپ کو فلاح کی تمنا ہے فلاح دنیا کی تبعًا اور فلاح آخرت کی قصدًا تو اس کی صورت یہ ہے کہ دین کو اختیار کرو اور ان احکام پر عمل کرو کیونکہ حق تعالیٰ نے فلاح کو انہی پر مرتب فرمایا ہے سو اس مقصود کے لئے اتنی تقریر کافی ہے اور یہاں اِتَّقُوا اللّٰہَ (خدا سے ڈرتے رہو) کو موخر فرمانے میں یہ نکتہ ہے کہ یہ اعمال ظاہرہ اسی وقت مقبول ہیں جبکہ تقویٰ بھی ساتھ ساتھ ہو اور اسی وقت ان پر فلاح کا ترتب ہوسکتا ہے۔ اب میں ختم کرتا ہوں اور اس بیان سے آپ کو اندازہ ہو گیا ہو گا کہ لوگ اس وقت طلب فلاح میں کدھر کدھر الٹے جارہے ہیں اور جو اصلی طریقہ فلاح کا ہے اس پر کسی کو بھی توجہ نہیں پس ان لوگوں کی حالت پر یہ شعر صادق آتا ہے ؎

ترسم نہ رسی بہ کعبہ اے اعرابی　　کیں رہ کہ تو میروی بہ کفرستان ست

(اے اعرابی مجھے خوف ہے کہ تو بیت اللہ نہ پہونچے گا یہ راستہ جس پر تو چل رہا ہے کفرستان کا ہے)

شعر میں تو ترکستان ست ہے مگر میں نے کفرستان ست اس لئے کہا کہ آجکل لوگ کفار کے طریقے اختیار کرکے ہی فلاح حاصل کرنا چاہتے ہیں مگر اس کا انجام فلاح نہیں بلکہ کفر سے نزدیک ہونا ہے۔ بس فلاح کا اگر کوئی طریقہ ہے تو وہ یہ ہے جو سچے فلسفہ سے معلوم ہوا کہ دین ہی فلاح کا طریقہ ہے اور اگر دین ہی نہیں تو خدا کی قسم اگر ساری دنیا کی سلطنت بھی حاصل ہو جائے تو فلاح حاصل نہ ہوگی یعنی راحت واطمینان جو اصل فلاح ہے اب دعا کیجئے کہ حق سبحانہ عمل کی توفیق عطا فرمادیں۔ وصلے اللہ علی سیدنا ومولانا محمد وعلے آلہ واصحابہ اجمعین والحمد للہ رب العالمین